مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت۔ نورالحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۳ - نمبر ۷ | جولائی سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے آکسن محبوب المطابع دہلی

اگر آپ

ہندوستان کی بہترین اردو کتابوں کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہوں تو اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے
اور کتابیں مفت پڑھیے قواعد و ضوابط ذیل
کے پتہ سے طلب کیجیے
مکتبہ جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

نیا نظمِ عالم

(مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے)

(۱)

خیال کیا جاتا ہے کہ اس جنگ کے بعد دنیا کی ایک نئی تنظیم ہو سکے گی جس میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا قتل و غارت جنگ اور کشت و خون کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو جائیگا یہ نیا نظم عالم کیسا ہوگا اس کے متعلق کئی مفکروں نے اپنے اپنے نظریے پیش کئے ہیں ایچ جی ویلز ان مفکروں میں سب سے آگے ہے اس مضمون میں

جب سے یورپ میں انگلستان اور جرمنی کے مابین جنگ کا آغاز ہوا ہے اور دنیا کا امن و چین ہٹلر کی دست درازیوں کی نذر ہوا ہے اس وقت سے انگلستان کے مدبروں اور سیاست دانوں کی زبان سے بار بار اس عزم کا اظہار ہو رہا ہے کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی تمام امن پسند اقوام کے اشتراک عمل سے نظم عالم کا ایک نیا خاکہ اور انسانی تمدن کا ایک نیا نقشہ تیار کیا جائے گا جس کے ذریعہ سے انسانی زندگی کو جنگ و جدل کی لعنتوں اور قتل و غارت کی سفاکیوں سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا ملے گا اور ظلم کی جگہ انصاف تخریب کی جگہ تعمیر بے چینی اور عافیت سوزی کی جگہ سکھ چین اور عافیت پسندی کی فرمانروائی ہوگی اس نئے نظم عالم کے خد و خال کیا ہوں گے جو اولاد آدم کو وحشت و غارتگری کی ظلمتوں سے نکال کر عدل و انصاف کی حکمرانی کے سپرد کرے گا اس کے بنیادی اصول کس طرح تصفیہ پائیں گے اور اس نظام کے لئے قوت نفاذ کہاں سے آئے گی ان سب سوالات کی نسبت رہنما ساکت ہیں اور گویائی عاجز ہے ہاں ایک نئے نظم عالم کا تصور اور ایک نئی تعمیر کا خیال ضرور دلوں میں جاگزیں ہوتا جا رہا ہے ابھی عمل کی منزل تو دور ہے لیکن ذہنی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے اور ہر وہ شخص جو انسانی فلاح کا خواہاں اور نوع بشری

کے مصائب سے متاثر ہے ضرور اپنے دل کی گہرائیوں اور ذہن کی وسعتوں میں اس مسئلہ کا حل تلاش کر رہا ہے۔

ابھی تک جو باتیں اس سلسلہ میں کہی گئی ہیں وہ اس قدر پیش پا افتادہ ایسی عامیانہ اور سطحی اور ذہنی حیثیت سے اس درجہ ناقابل تحلیل ہیں کہ اُن کو موضوع فکر بنانا بے سود ہے۔

اتحادیوں سے جب سوال کیا جاتا ہے کہ اس جنگ کے کیا مقاصد ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو ہٹلر کے آمرانہ استبداد سے نجات دلائی جائے جمہوریت کے وجود و بقا کو جن قوتوں نے معرض خطر میں ڈال رکھا ہے ان کا مقابلہ کیا جائے تاکہ وہ بالکل نیست و نابود ہو جائیں۔ اور اقوام عالم کے تعلقات اور ان کے باہمی نزاعی امور کے تصفیہ میں معرکہ آرائی اور طاقت آزمائی نہیں بلکہ حق و انصاف صداقت پرستی اور مصالحت پسندی کا دور دورہ ہو۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن یہ تو صدیوں کی پرانی بوجھی باتیں ہیں انسان ہمیشہ حق و انصاف کے لئے تڑپا ہے اور ہمیشہ اس سے محروم رہا ہے۔ صداقت پرستی ہمیشہ سے ایک اعلیٰ اخلاقی نصب العین رہی ہے لیکن عملی دنیا میں ہمیشہ صداقت پرستی اور راستبازی کی جگہ طاقت و قوت کی قصیدہ خوانی ہوئی ہے سوال یہ نہیں ہے کہ ہمارا مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ اس کی بابت تو کامل اتفاق ہے نصب العین تو ہمیشہ سے یہی رہا ہے اختلافات کی ساری دنیا حقیقت ان تصورات کی عملی تعبیر ہے جو چیز ایک کے نزدیک حق و انصاف ہے وہی دوسرے کی نظروں میں ظلم و ناحق شناسی کے مترادف ہے۔ جھگڑا تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب حصول مقصد کے ذرائع اور عملی طریقوں کا سوال آتا ہے یا دوسرے الفاظ میں جب صداقت پرستی اور نصفت شعاری کے تصورات کو کارفرما بنانے کے لئے نظامات تجویز کئے جاتے ہیں اور ان نظامات کے نقشے کھینچے جاتے ہیں۔

مغربی اقوام کے لئے اس مسئلہ کا حل دریافت کرنا نہایت دشوار ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مغربی فلاسفہ اور مفکرین بہمہ علم وفضل دنیا کا کوئی ایسا نظام تجویز نہ کرسکیں گے جو انسانی فلاح ومسرت کا ضامن ہو سکے۔ اس کی وجہ بہت صاف ہے۔ جب تک ان اسباب وعلل کا صحیح اندازہ نہ ہو جائے جنھوں نے مغربی اقوام میں کشت وخون کے بازار کو گرم کر رکھے ہیں اس وقت تک کسی صالح تمدن کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی ہے اور یہی چیز اہل مغرب کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ڈرامہ کے ایکٹر کبھی اپنی اداکاری کی حیثیت یا ڈرامہ کے محاسن ومصائب کے متعلق صحیح رائے نہیں قائم کر سکتے ہیں۔ یہ کام تو تماشائیوں کا ہے۔ مغربی اقوام جس کشمکش میں مبتلا ہیں اور جن قوتوں کی آلہ کار بنی ہوئی ہیں ان کے اسباب وعلل کی سراغ رسانی خود انھیں کے افراد کے لئے ناممکن ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو جو نتائج وہ اخذ کریں گے وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتے ہیں ان کی نظروں کے سامنے تعصبات کے پردے حائل ہیں خواہ یہ تعصبات قومیت اور وطنیت کے لباس میں ظاہر ہوں یا معاشی نظریات کا جامہ پہنے ہوں حقیقت نفس الامر سے وہ میلوں کوسوں دور ہیں ان کی نظر خارجی مظاہر سے آگے نہیں بڑھتی ہے۔ اگر آپ بڑے بڑے مغربی فلاسفر اور اہل فکر کی رائے اس بارے میں معلوم کریں گے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ ان کی نظر بالکل محدود ہے۔ یا تو انھیں موجودہ حالات میں معاشی اسباب کارفرما نظر آئیں گے اور وہ اس مسئلہ کا حل کسی نئی معاشی تنظیم میں تلاش کریں گے یا پھر ان کا ذہن اس طرف منتقل ہو گا کہ قومی اقتدار اور حاکمیت کی بے قیدی ان نتائج کی ذمہ دار ہے اور اصلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ مجلس اقوام کی تنظیم نئی بنیادوں پر کی جائے اس طرح سے کہ اس کی گذشتہ خامیاں اور نقائص دور ہو جائیں اور ایک ایسی بین الاقوامی طاقت پیدا ہو جائے جو قومی حکومتوں کے بے قید اختیارات اور ان کی لامحدود حاکمیت پر پابندیاں عائد کرے بس یہی

ان کی فکر و نظر کا دائرہ ہیں کے اطراف میں ان کی عقل گردش کرتی ہے اور جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ جاتی ہے یہ کہتے ہوئے ہمیں نہ مغرب کی علمی ترقی سے انکار ہے اور نہ مغربی فلاسفر کی دقت نظر اور بلندی فکر پر حرف گیری کرنا مقصود ہے حقیقت یہ ہے کہ مغرب کا عقلی مزاج ہی ایسے خمیر سے تیار ہوا ہے کہ خارجی نظامات کے رد و بدل کے علاوہ اہل مغرب کو انسانی مشکلات و مصائب کا اور کوئی علاج ہی نظر نہیں آتا ہے۔ یہ مغرب کی عقلی عادت ہے جس کی تشکیل میں بعض نمایاں تاریخی اسباب و محرکات کا دخل رہا ہے جس تاریخی سبب کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ تھا کہ مغرب کی علمی ترقیات کو جن موانعات اور حریف طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا ان میں سب سے بڑی طاقت مذہب کی تھی جو اس زمانہ میں اپنی بدترین شکل میں نظر آتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی اہمیت کو مغربی دنیا نے بالکل نظر انداز کر دیا کیونکہ یہی چیزیں مذہب کی اساس و بنیاد تھیں علمی حقائق کی تمام توجہ اور کوششیں خارجی مظاہر کی طرف مائل ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے اہل فکر اور فلاسفر حقائق کے صرف خارجی پہلو پر نظر رکھتے ہیں اور باطنی اسباب کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ہیں۔ یہ تو ایک ضمنی بحث تھی اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ہم نظم عالم کا ایک ایسا خاکہ پیش کریں جو انسانی ضروریات کا کفیل اور انسانوں کی امن و عافیت اور سعادت و مسرت کا ضامن ہو۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم مستقبل کی دنیا کی کوئی نئی شکل تجویز کریں یا کسی ایسے نظام عالم کا نقشہ بنائیں جو ہماری دانست میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کو قابل اطمینان طریقہ سے حل کر سکے گا ہمیں موجودہ مغربی تمدن اور اس کے اخلاقی نفسیاتی اور عقلی محرکات کا مطالعہ گہری نظر سے کرنا ہوگا تاکہ ہم ان کمزوریوں کو سمجھ سکیں جنھوں نے اس تمدن کے اندر وہ لازمی مسلمات پیدا کر دیئے ہیں جن کی باہمی کشاکش و تصادم

کا منظر آج ہمارے سامنے ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آئندہ کسی صالح تمدن کی بنیاد اس وقت تک نہیں رکھی جاسکتی ہے جب تک کہ تمدن جدید کے ان بنیادی نقائص کا کوئی واضح تصور نہ حاصل ہو جائے جو یورپ کو اس کی تمام عقلی ترقیات اور مادی کامرانیوں کے باوجود تباہ و ہلاکت کی طرف لئے جا رہے ہیں۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم مغربی تمدن کی تین بڑی خصوصیات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں گے۔ یہ خصوصیات مغرب کی (۱) عقلیت پرستی (۲) افادیت پسندی (۳) خارجیت پسندی ہیں جن سے موجودہ تمدن کی عمارت کا پورا نقشہ تیار ہوا ہے۔

عقلیت پرستی| جدید یورپ اور اس کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس تمدن کی پیدائش میں فتوحات عقل کا بڑا حصہ تھا۔ قرون وسطیٰ میں مغربی ذہن پر ایک زوال پذیر مذہب نے عقلی جمود طاری کر رکھا تھا اور کلیسا نے نہ صرف انسان کے اعمال و کردار پر پابندیاں عائد کی تھیں بلکہ اس نے روایات اور مذہب کو عقلی ترقی کا سب سے بڑا مخالف اور علمی تحقیق کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا تھا اور انسانی فکر کو محدود و مقید کرنے میں بھی کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یورپ میں علمی بیداری پیدا ہوئی تو انسانی عقل کو ان تمام موانعات اور دشواریوں کے خلاف بڑی جد و جہد اور کش مکش کرنا پڑی جو مذہب کے علمبرداروں نے ارتقاء فکر کی راہ میں پیدا کر رکھی تھیں بڑی سخت اور صبر آزما کش مکش کے بعد بالآخر یورپ میں عقلیت کو فتح حاصل ہوئی۔

لیکن اس آویزش و پیکار کا ایک نتیجہ اور ہوا جب وہ تمام زنجیریں ٹوٹ گئیں جنھوں نے انسانی ذہن کو مقید کر رکھا تھا تو عقل اخلاقی قوانین سے باغی ہو گئی کیونکہ مذہب کا دار و مدار انھیں قوانین پر تھا اب ہر وہ چیز اہل فکر کے نزدیک ناقابل تسلیم قرار

دی جانے لگی جس کا قدیم روایات اور مذہب سے ذرا بھی تعلق تھا۔ پھر چونکہ مذہب اخلاقی زندگی کا ایک ضابطہ ہے اس لئے عقل و مذہب کی کش مکش کے نتیجہ کے طور پر مغربی ذہنیت میں اخلاقی پابندیوں سے ایک گہرا تعصب پیدا ہوگیا۔

مذہب اور مذہبی انداز فکر کے خلاف یوروپین مفکرین اور آزاد خیالوں میں ایک نفرت سی پیدا ہوگئی جس کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہ تھی۔ یہ نہ تھا کہ مذہب میں ہر چیز خلاف عقل تھی یا مذہبی انداز فکر ہی میں کوئی بنیادی نقص پایا جاتا تھا اور اس لئے جب مغربی مفکرین کسی چیز کو عقلی معیار پر پرکھتے تھے اور ناقص پاتے تھے تو اس کو رد کردیتے تھے نہیں بلکہ مذہب سے کسی چیز کا متعلق ہونا ہی مغربی مفکرین کے نزدیک اتنا بڑا جرم تھا کہ وہ اس کے غلط و باطل ثابت کرنے کے لئے کافی تھا مغربی فکر میں مذہب اور مذہبی انداز فکر سے یہ تنفر بطور ایک تاریخی اثر کے آج تک کارفرما ہے۔

مذہب کے خلاف اس سراسر غیر عقلی تعصب کے نتائج بڑے گہرے اور دوررس ہوئے اور انھوں نے مغربی تمدن کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ مذہب کے خلاف عقل کی یہ بغاوت صرف علوم طبیعی تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا اثر ان علوم پر بھی پڑا جو اجتماعی زندگی اور انسانی معاشرت و تمدن سے براہ راست متعلق ہیں یہاں پر وضاحت کی خاطر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں اولاً علوم صحیحہ جہاں ہر چیز پی تلی ہوئی ہوتی ہے اور نتائج کے اخذ کرلے میں غلطی کا سرے سے امکان ہی نہیں ہوتا ہے ان علوم میں انسان کے شخصی تاثرات اور نفسی میلانات کو کوئی دخل نہیں ہے اور نہ نتائج کے استنباط میں اس قسم کے اثرات راہ پاسکتے ہیں یہاں تک تو یوروپ کی علمی ترقیات بالکل بے خطا تھیں اور ان میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے مورد الزام قرار دیا جاسکے۔

لیکن علوم کی ایک اور قسم ہے مثلاً تاریخ عمرانیات معاشیات فلسفہ وغیرہ –

یہ وہ علوم ہیں جن کے نتائج علوم صحیحہ کے نتائج کی طرح ہماری زندگی سے بالکل غیر متعلق نہیں ہیں کیونکہ ان کا تعلق ہماری معاشرت ہمارے تمدن اور اصول تہذیب سے ہے۔ یہ حقیقت کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کے متناسب امتزاج سے وجود میں آتا ہے میری اور آپ کی زندگی میں کوئی خوشگوار یا نامطبوع اثر نہیں پیدا کرتی ہے اور ہمارا ذہن اس قسم کے نتائج اخذ کرتے ہیں کامل بے تعصبی اور غیر جانبداری سے کام کرتا ہے۔ لیکن وہ علوم انسانی جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی کے حقائق سے ہے اپنے نتائج میں انسانی زندگی کے لئے بڑے گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ ان علوم میں جہاں تک واقعات کے تجزیہ ان کی ترتیب یا معطیات کی فراہمی کا تعلق ہوتا ہے ہمارا ذہن اسی بے تعصبی کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب استنباط نتائج یا کلیات کی ترتیب اور واقعات کی تعبیر کی منزل آتی ہے تو ہمیں کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک کو مرجح قرار دینا پڑتا ہے۔ یہاں سے عقل کی فرمانروائی ختم ہو جاتی ہے اور شخصی رجحانات یا مباحثی ذوق و پسندیدگی میدان میں اتر آتے ہیں۔

انسانی ذہن کی ایک ناقابل انفکاک خصوصیت یہ ہے کہ واقعات کی تعبیر اور نتائج کے استنباط میں اکثر اوقات غیر شعوری طور سے وہ اپنے نفس و خواہش اور شخصی پسندیدگی کے مطابق آخری فیصلہ کرتا ہے لیکن سمجھتا یہی ہے کہ اس کا فیصلہ بالکل غیر جانبدارانہ اور شخصی تاثرات و میلانات سے بری ہے۔ ان علوم میں جن کا تعلق ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی کی ضروریات سے ہے مغربی ذہن کی وہ خصوصیت جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں (یعنی مذہب اور اخلاقی نظام سے نفرت و تعصب) اپنا کام کرتی رہی اور نتائج کے استنباط میں عقلیت پرستی بالآخر جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ مغربی مفکرین نے اس دائرہ میں ہر اس چیز کو مسترد کر دیا جو ذرا بھی اخلاق و مذہب کے مسلمات کے مطابق تھی اور ہر اس چیز کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا جو اخلاق و مذہب کے اصولوں

سے معارض ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ عقلیت پرستی کا زمانہ تھا اس لئے ان تعصبات کے لئے عقلی دلیلیں ڈھونڈھ لی گئیں اور شخصی ذوق اور جماعتی پسندیدگی کو عقل کی چادر اوڑھا کر دنیا کو یہ فریب دیا گیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی بنیاد سراسر عقلی ہے۔ مثلاً جنسی تعلقات کے مسئلہ کو لیجئے۔ یہ مسئلہ انسان کی معاشرتی زندگی میں جو اہمیت رکھتا ہے ظاہر ہے اس کے صحیح حل پر بڑی حد تک فرد و جماعت کی خوشحالی اور مسرت کا دارومدار ہے۔ مغربی دنیا نے اس بارے میں جو فیصلہ کیا اس میں عقلیت سے زیادہ نفس کی خواہشات اور جماعتی میلانات جلوہ فرما ہیں۔ کیا مرد و زن کے بے روک اختلاط کے لئے کوئی عقلی بنیاد پیش کی جا سکتی ہے۔ کیا سیاست و معیشت کے دائروں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی مسابقت کو ٹھوس علمی حقائق کی بنا پر صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے؟

آج مغربی سوسائٹی میں جو صنعتی انتشار نظر آتا ہے اور خانگی زندگی بحیثیت ایک اخلاقی تربیت گاہ کے جس طرح تباہ و برباد ہوئی ہے وہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اس بارے میں مغربی سوسائٹی نے جو راہ اختیار کی تھی اس میں عقلی دلائل سے کہیں زیادہ جماعتی میلانات اور نفسی رجحانات کے عوامل کارفرما تھے۔ یہی حال تمدن و معاشرت کے دوسرے گوشوں میں ہوا۔ چونکہ مغربی فکر اخلاقی قوانین سے اپنا رشتہ توڑ چکی تھی اس لئے یورپ میں ہر تمدنی مسئلہ کا فیصلہ اسی نہج پر کیا گیا اور جماعتی ذوق و پسندیدگی پر عقل پرستی کا پردہ ڈالا گیا کیونکہ دل جس چیز کو پسند کرتا ہے اور نفس جس شے کے لئے رغبت دلاتا ہے عقل اس کے لئے مناسب دلائل ڈھونڈھ لاتی ہے عقلیت پرستی کا حقیقی نام جذبات پرستی اور شخصی اور اجتماعی میلانات کی پیروی ہے۔

ہمیں عقل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے اور نہ ہم عقلی جمود کو مستحسن قرار دیتے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر بتلایا جا چکا ہے عقلیت پرستی بالآخر خطرناک قسم کی جذبات پرستی پر ختم ہوتی ہے۔ اس لئے جب تک فطرت سلیم ساتھ نہ ہو عقل کی رہنمائی بڑی پرخطر

ثابت ہوتی ہے جذبات جو پوشیدہ طور سے عقل کو حرکت دیتے ہیں اپنے صحیح عمل کے لئے ایک ابدی اخلاقی نظام کے طالب ہیں عقل و اخلاق کو ایک دوسرے کا رفیق و مددگار ہونا چاہئے تب کہیں جا کر ایک صالح تمدن کی تعمیر ہو سکے گی ورنہ خالی عقلیت پرستی کا نتیجہ گمراہی، اور بربادی ہے جیسا کہ مغربی تمدن کا انجام ثابت کر رہا ہے۔ مغربی ذہن علم کے حدود کا صحیح اندازہ نہ کر سکا، اور اس نے عقل پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا۔

کانٹ کے خیالات سے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اول فکر یا عمل ابتدائی طور سے شروع کرتی ہے اور اسے غیر ارادی طور پر اپنے مفروضات و مقدمات پر اعتماد ہوتا ہے۔ دوئم انسانی علم تجربہ کے ساتھ وابستہ ہے اور جب کبھی فکر ان حدود میں داخل ہوتی ہے جو جزواً یا کلاً تجربہ سے ماورئی ہیں تو وہ تناقضات میں مبتلا ہو جاتی ہے وہ فکر کی تشبیہ ایک فاختہ سے دیتا ہے جسے یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ چونکہ ہوا میں پرواز اس قدر آسان ہے اس لئے اگر بالکل خلا ہو تو اڑنا اور بھی آسان ہو جائے گا۔ اسے نہیں معلوم ہے کہ مزاحمت ہی اس کی پرواز کا سبب ہے لیکن مزاحمت ہی اس کی پرواز کو محدود بھی کرتی ہے۔ چونکہ مغربی مفکرین نے علم کے حدود کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا اس لئے وہ ان حقائق سے بھی انکار کر بیٹھے جو حدود تجربہ (اور اس لئے حدود فکر سے ماورا ہیں۔ مذہب کے اکثر و بیشتر تعلیمات ان حقائق پر مبنی ہیں جو ہمارے مشاہدہ اور تجربہ سے خارج ہیں لیکن صرف یہ واقعہ کہ وہ ہمارے حدود علم سے ماوراء ہیں ان کے انکار کو مستلزم نہیں ہو سکتا ہے۔ یورپ جیسے تاریخی اسباب کی بنا پر مذہب اور مذہبی اداروں سے عداوت ہو گئی تھی ان تمام حقائق سے انکار کر بیٹھا جن پر مذہب نے اپنی تعلیم کی بنیاد رکھی تھی اور جن میں اکثر و بیشتر ایسے حقائق تھے جو حدود تجربہ سے خارج تھے۔

مثلاً حیات بعد الممات کے مسئلہ کو لیجئے

دنیا کی ساری علمی ترقیاں اور سائنس کے تمام انکشافات جو آج تک ہوئے

ہیں یہ ثابت نہیں کر سکے کہ موت کے بعد کسی اور زندگی کا وجود ناممکن ہے لیکن محض اس بنا پر کہ یہ چیز ہمارے مشاہدہ اور تجربہ کے حدود سے ماورا رہے یا اس کے لئے کوئی ٹھوس علمی ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم حیات بعد الممات سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ دنیا میں کتنی ایسی چیزیں ہیں جس کا وجود چند سال قبل وہم وخیال میں بھی نہ آتا تھا اور حواس وقت انسانی علم وتجربہ کے حدود سے خارج تھیں لیکن آج وہ حقیقتاً موجود ہیں اگر اس وقت جب ان کا وجود نہ تھا کوئی شخص محض اس بنا پر ان کے آئندہ وجود میں آسنے سے انکار کردیتا کہ وہ ہمارے حدود علم وتجربہ سے خارج ہیں تو اس کے متعلق کیا کہا جاتا۔ لیکن یوروپ نے حیات بعد الممات کے مسئلہ کے متعلق بالکل یہی رویہ اختیار کیا اور کسی عقلی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اپنے جماعتی رجحان کی پیروی میں، در مذہبی انداز فکر سے تعصب کی وجہ سے حیات بعد الممات سے انکار کردیا۔ اخلاقی زندگی پر اس انکار کے جو نتائج ظاہر ہوسے وہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ انسان کے سر سے اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ اتر گیا اور جیسے جیسے حشر ونشر اور معاد پر سے یقین اٹھتا گیا انسان کی جوابدہی کا تصور بھی مضمحل ہوتا گیا یہاں تک کہ اب انسانی اعمال پر حکومت کے خوف اور پولیس کے رعب کے علاوہ اور کسی قسم کی اخلاقی یا اندرونی گرفت باقی نہیں رہی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مغرب کی عقلیت پرستی خالص اور بے آمیز نہ تھی بلکہ اس میں جذبات ومیلانات کی پیروی بھی ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے شامل تھی۔

عقل کا اپنی جائز حدود سے تجاوز کرجانا اور جذبات ومیلانات کا تابع بن جانا ایک ایسے نظام اخلاق کی ضرورت پر شاہد ہے جو عقل کو بھٹکنے اور جذبات کو بھٹکانے سے روک سکے۔ چونکہ مغرب کی عقلیت پرستی اخلاقی قیود سے آزاد ہوگئی اور مغربی فکر نے اخلاقی قوانین سے اپنا رشتہ توڑ لیا اس لئے اہل مغرب فکری گمراہی میں مبتلا ہوگئے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس عقلی بے قیدی اور فکری گمراہی

کو آزاد خیالی کے نام سے پکارا جانے لگا حالانکہ ہیئت اجتماعی کے لئے جس طرح
عمل کی بے قید آزادی خطرناک ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ عقل وفکر کی بے قید
آزادی اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ عملی بے قیدی
اپنے نتائج فوراً سامنے لے آتی ہے اور عقلی بے قیدی کے نتائج ایک عرصہ دراز کے
بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر فرد کو یہ آزادی نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں جس قسم کا
رویہ چاہے اختیار کرے بالحاظ اس کے کہ دوسروں کی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوگا تو اس
کو یہ آزادی بھی نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ فکر وخیال کی جس راہ پر چاہے چل پڑے پہلی قسم کی
آزادی کا نتیجہ سیاسی اور معاشرتی نراج ہے اور دوسری قسم کی آزادی کا نتیجہ فکری نراج ہے
یورپ آج اسی فکری نراج میں مبتلا ہے اور مغربی سوسائٹی کی سیمابی کیفیت اسی بے
قید فکری آزادی کی آئینہ دار ہے۔

اسلامی فکر وعقل کی بے قید آزادی کے خلاف آواز بلند کرنا بڑی جسارت کا کام ہے
لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم انسانی معاملات یا تمدنی اور معاشرتی مسائل میں
اپنی عقل وفکر کو بالکل معطل کردیں یا ہم اس قسم کے عقلی جمود کے حامی ہوجائیں۔ جو قرون
وسطیٰ کا وصف امتیازی تھا اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ہم عقل کی صحیح حدود کو پہچانیں
اور عقل کو زندگی اور اخلاقی قوانین کا تابع رکھیں۔ آزادی خواہ کسی قسم کی ہو بجائے خود
منزل مقصود نہیں ہوتی ہے لیکن عقل پرستی فکری آزادی کو اپنا آپ مقصد قرار دے لیتی ہے
اس کا نتیجہ فکر کی ہرزہ گردی اور بے راہ روی ہے جس طرح دنیا میں عمل کا ایک ہی سیدھا
راستہ ہوسکتا ہے اسی طرح فکر کی بھی ایک ہی سیدھی راہ ہے۔ اگر فکر کو بالکل آزاد چھوڑ دیا
جائے اور اس کے لئے کوئی راستہ متعین نہ کردیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ گمراہی کی وادیوں
میں بھٹکا کرے گی اور منزل مقصود کبھی نہ پاسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مغربی فلاسفہ اور
مفکرین کے خیالات میں کوئی مشترک اساس نہیں پاتے ہیں موجودہ دور کے انگریزی

منکرین مثلاً شاً ایچ جی ویلز اور برٹرینڈ رسل کو لیجئے۔ ان کی تعلیمات میں کہیں کہیں جزوی مماثلت سرور ملے گی مگر جن بنیادوں پر انھوں نے اپنے افکار کی تعمیر کی ہے ان میں کہیں بھی اشتراک نظر نہ آئے گا۔ اس فکری مزاج کا آخری نتیجہ عملی اور سیاسی تراج ہے کیونکہ فکر بالآخر عمل ہی کا تو پیش خیمہ ہے اور فکری ارتقا کی کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر ہماری عملی زندگی پر نہ پڑتا ہو بے قید فکر بالآخر بے قید عمل پر منتج ہوتی ہے یہیں سے ایک اخلاقی نظام کی ضرورت ثابت ہوتی ہے جو عقل کو بے راہ روی اور جذبات پرستی سے روک سکے اور اس کے لئے ایک سیدھا راستہ متعین کردے۔ اس سے عقلی ارتقاء کو ئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑے گا کیونکہ عقل پر ناجائز پابندیاں نہیں لگائی جائیں گی بلکہ اسے صرف ایک سیدھے راستہ پر ڈال دیا جائے گا۔ عمل ارتقاء جاری رہے گا البتہ ارتقا کی راہ متعین ہو جائے گی۔ اس راہ میں عقل جس قدر گہرائی پیدا کر سکتی ہے اور جتنے انکشافات کر سکتی ہے کرے گی۔

مادیت پسندی | اسی عقلیت پرستی کا ایک اور پہلو مغرب کی افادیت پسندی ہے چونکہ مغربی تمدن نے اصول اخلاق کو پس پشت ڈال دیا اس لئے تمدنی اور معاشرتی امور میں معاملات کو افادی نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ مغربی ذہن میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہوگئی کہ خیر و شر اور نیکی بدی کا کوئی ابدی اور اٹل معیار نہیں ہے اور نہ اس کی بنیاد انسانی فطرت کے غیر متبدل قوانین ہیں بلکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو زمان و مکاں کی تبدیلی کے ساتھ بدل جایا کرتی ہیں۔ اس طرح نیکی کا معیار افادہ قرار پایا اب چونکہ افادہ کا معیار زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اس لئے خیر و شر کے تصورات بھی حالات کے ساتھ بدلنے لگے۔ اخلاقی نظام الہامی ہدایت پر مبنی ہونے کے بجائے اب انسانی دستبرداریوں کا شکار ہوگیا۔ گویا جو چیز جماعت کے اغراض کے لئے سودمند ہو وہی خیر کا حکم رکھتی ہے اس طرح افراد پر سے اخلاقی ذمہ داری کا بار اتر گیا کیونکہ جماعت کے

لیے ایک معیار اخلاق اور فرد کے لیے دوسرا معیار نہیں ہو سکتا ہے۔ جب جماعتی اخلاق
کا انحصار افادہ پر ہو گیا تو انفرادی زندگی میں بھی یہی اخلاقی معیار رائج ہو گیا اس طرح انفرادی
و اجتماعی زندگی میں کامل خود غرضی کا چلن ہو گیا۔ ایک جلد جلد بدلنے والا معیار اخلاق
ہاتھ آگیا جو اقوام اور جماعتوں اور ان کے افراد کے فوری اغراض کا ساتھ دے سکے۔ اس کا
نتیجہ دیکھنا ہو تو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے معاشرتی سیاسی اور معاشی
قوانین کے ردوبدل پر غور کیجئے آج ایک قانون بنایا جاتا ہے پھر تھوڑے عرصہ کے بعد
بالکل اس کے خلاف دوسرا قانون وضع ہوتا ہے۔ پھر اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت
محسوس ہوتی ہے اور یہ صرف تفصیلی اور ضمنی امور تک ہی نہیں بلکہ بنیادی امور میں بھی
قانون کی تبدیلی کا یہی حال رہا۔ سوسائٹی سے پائداری اور استحکام رخصت ہو گئے اور
ایک سیمابی کیفیت پیدا ہو گئی انسانوں کے تعلقات کی بنیاد ان کی اغراض ٹھیریں۔ اغراض
کو انسانی تعلقات کی بنیاد تسلیم کر لینے سے ہر جگہ اور ہر شعبہ میں ایک پیکار و تصادم پیدا
ہو گیا کیونکہ اغراض کی موافقت انسانوں کے درمیان کوئی پائدار رشتہ اتصال نہیں بن
سکتی ہے۔ ان کی موافقت بہت محدود اور ان کا اختلاف و تصادم بہت گہرا اور وسیع ہوتا
ہے کسی حد تک یہ ضرور ہوتا ہے کہ عقلمندانہ غرض پرستی رشتہ اتحاد کا کام دیتی ہے لیکن
غرض پرستی کی فطرت ہی میں پیکار و تصادم کے عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں اور تھوڑے
ہی عرصہ کے بعد اغراض کی موافقت ختم ہو جاتی ہے اور ان سے وہ ملانے اور جوڑنے
کی قوت فنا ہو جاتی ہے۔

مغربی تمدن کو سطحی نظر سے دیکھنے والا شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس تمدن
میں جنگ و جدال اور پیکار و تصادم کی قوتوں کا انتہائی شدت کے ساتھ ابھرنا لازمی تھا
چنانچہ آج جو خونی ڈرامہ یورپ کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے وہ انھیں تصادم پیدا کرنے
والے عناصر کا منطقی نتیجہ ہے۔

قومی زندگی کے دائرہ میں تو خیر اور بھی ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اختلاف اغراض کو کسی حد تک روکے رہتے ہیں مثلاً وطن کی محبت نسل و زبان کے رشتے اور تاریخی روایات کا اشتراک اگرچہ کبھی کبھی اغراض کا تصادم ان رشتوں پر بھی غالب آجاتا ہے مثلاً اسپین کی خانہ جنگی کی مثال ہے جہاں اغراض کے اختلاف نے ایک زبان بولنے والے ایک مذہب رکھنے والے اور ایک وطن سے محبت رکھنے والے افراد کو باہم دست و گریبان کر دیا تھا لیکن بین الاقوامی تعلقات کی یہ بنیاد ایک دن بھی مستحکم نہیں رہ سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اگر یورپ کی قومیں پچھلی دو صدیوں تک نسبتاً صلح و آشتی سے زندگی بسر کر لے گئیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی ممالک اور نوآبادیات کی تجارتی منڈیوں نے اغراض و مفاد کے عمل اور ردعمل کے لئے اتنا وسیع میدان فراہم کر دیا تھا کہ ایک عرصہ تک تصادم کا امکان نہیں ہوا لیکن مشرق کی بیداری اور نوآبادیات کی ترقی نے بالآخر اس تصادم کو اس کی انتہائی ہیبت ناک شکل میں ظاہر کر دیا۔

ان واقعات سے اگر کوئی سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اخلاق کا افادی معیار بالآخر پیکار و تصادم اور اس لئے تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے اگر سوسائٹی کو مستحکم اور پائدار بنیادوں پر استوار کرنا ہے تو افادیت پسندی کو بطور ایک اصول عمل کے خیرباد کہنا پڑے گا اور اخلاق کا کوئی ایسا ثابت و قائم نظام بنانا پڑے گا جو اغراض کے تصادم کے لئے ایک روک اور انسانی تعلقات کی ایک مستحکم بنیاد ہو

اگر انسانی زندگی سے اس پیہم کشمکش اور مسلسل پیکار کو دور کرنا ہے جو آج مختلف قوموں اور ان قوموں کے مختلف طبقوں میں جاری ہے تو اس غرض پرستی کو بہت کچھ کم کرنا ہوگا جسے افادیت پسندی کے معصوم نام سے پکارا جاتا ہے اور خیر و شر کے افادی مفہوم سے بھی کفارہ کشی اختیار کرنا پڑے گی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ غرض پرستی کو بالکل نہیں مٹایا جا سکتا ہے اور جن مذاہب نے انسانی فطرت کے بالکل برخلاف خود غرض کے لئے

کسی قسم کی گنجائش نہیں رکھی ہے وہ نتیجۃً ناکام رہے ہیں کیونکہ خود غرض اور غرض پرستی
انسانی فطرت کا ایک ضروری عنصر ہے جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس محرک کو اخلاقی
قوانین کا تابع و محکوم بنایا جائے کہ یہی اس کی فطری حیثیت ہے۔ مغربی تمدن سے جو غلطی
سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ اس نے شخصی اور جماعتی اغراض کو اخلاقی نظام کی گرفت سے بالکل آزاد
کر دیا اور محرکات عمل میں اسے پہلا درجہ عطا کیا حالانکہ اس کی حیثیت ثانوی ہونی چاہئے تھی
اس سے بالاتر اور اس کو جائز حدود میں رکھنے کے لئے ایک اخلاقی اور روحانی نظام
کی ضرورت تھی۔

خارجیت پسندی | مغربی تمدن کی تیسری بڑی کمزوری اس کی خارجیت پسندی ہے۔ اس سے
مراد یہ ہے کہ مغربی مفکرین جب کبھی انسانی اصلاح یا تمدنی اور معاشرتی سود و بہبود کی طرف
متوجہ ہوتے ہیں تو وہ ہمیشہ انسان کے نفسی اور باطنی محرکات کی قوت و قیمت کو بالکل
نظرانداز کر دیتے ہیں اور دنیا کی تمام خرابیوں کا علاج اوپر سے عائد کردہ نظامات میں تلاش
کرتے ہیں یہ صحیح ہے کہ خارجی نظامات مثلاً نظام حکومت نظام معیشت یا نظام تعلیم انسانی
کردار و افعال پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات پیدا کرتے ہیں لیکن جب تک انسانی ضمیر
اور انسان کے باطنی محرکات میں کوئی انقلاب نہ پیدا ہو خارجی نظامات کی تمام طاقت و اثر
فرمائی رائیگاں ثابت ہوتی ہے۔ اصلی اور حقیقی انقلاب حال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے
جب زندگی کے متعلق انسان کا مجموعی نقطہ نظر بدل جائے نیکی اور خیر کی طرف میلان کوئی
چیز نہیں ہے جسے خارج سے عائد کردہ نظامات کے ذریعہ پیدا کیا جائے اس کے لئے
ایک باطنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مغربی ذہنیت ہمیشہ انصاف مساوات اور
راست کرداری کے لئے خارجی محرکات پر تکیہ کرتی ہے۔ مثلاً اشتراکیت کے حامیوں کا
خیال ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی انسانی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جائے
گا اور دولت کی مساوی تقسیم خود بخود انسان کو انصاف پسند اور راست کردار بنا دے گی۔

اسی ذہنیت کے نتیجہ کے طور پر یہ خیال عام ہے کہ موجودہ خرابیوں کا ذمہ دار تمام تر ہمارا نظام حکومت یا نظام معیشت ہے جس کے بدلتے ہی ایک نیا زمین و آسمان پیدا ہو جائے گا مغربی ذہن کا یہ انداز فکر ڈارون کے مخصوص نظریہ ارتقار کا پیدا کردہ ہے۔ ڈارون نے ارتقار کا جو نظریہ پیش کیا اس میں انسان کی موجودہ حالت کو خارجی ماحول کے موثرات اور اس کی قوتوں کے تعامل کا نتیجہ قرار دیا اس طرح سے خارجی ماحول کی تاثیری قوت اور خارجی حرکات کی انقلاب انگیزی مغربی ذہن پر ایسی مستولی ہوئی کہ باطن اور اس کی پوشیدہ قوتیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ پھر جب علم عضویات نے ترقی کی تو اس نقطہ نظر کو اور تقویت پہنچی یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں یہ انداز فکر بالکل عام ہو گیا۔ اس کی ایک مبالغہ آمیز بلکہ مضحکہ خیز شکل اس عقیدہ میں ظاہر ہوتی ہے جس پر ایک زمانہ میں یورپ کے بعض مفکرین نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین رکھتے تھے کہ چونکہ غذا کے اثرات انسان کے اخلاق و عادات پر گہرے ہوتے ہیں اس لئے ہر قسم کی اخلاقی اصلاح غذا کی مناسب تبدیلی سے روبہ عمل لائی جا سکتی ہے۔ بعد میں اگرچہ علمی ترقی کی وجہ سے یہ میلان فکر کم ہو گیا لیکن بحیثیت مجموعی خارجیت پسندی یورپ کے عقلی مزاج کا ایک لاینفک جزو بن گئی۔

حالانکہ اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ خارجی ماحول اور خارجی نظامات جس حد تک انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی حد تک انسان کے اندرونی اخلاقی تقاضے اور اس کی باطنی فطرت خارج پر اپنے اثرات ڈالتی ہے۔ یہ باہمی تعامل کی ایک مثال ہے جس میں کبھی ایک پہلو اور کبھی دوسرا غالب رہتا ہے۔

ایشیائی ذہن سے اس میلان کا مقابلہ کیجئے تو ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے ایشیائی مصلحین نے انسانی زندگی کی اصلاح کے لئے جس قدر کوششیں کیں وہ اکثر و بیشتر اصلاح باطن سے متعلق تھیں۔ ہندو مذہب کی تعلیم لیجئے یا بدھ مذہب کی

عقائد پر غور کیجئے یا پھر عیسائیت کے پند و مواعظ کو دیکھئے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان مذاہب میں سے کسی ایک نے بھی انسانی زندگی کی درستگی کے لئے خارجی نظامات پر اعتماد نہیں کیا بلکہ انھوں نے انسان کی باطنی اور نفسی زندگی پر اپنی توجہات مرتکز کرلیں باطن کی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا اور خارجی نظامات کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان مذاہب کا نظریہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کی سرشت میں نیکی اور انصاف پسندی کی جانب میلان پیدا ہو جائے گا تو وہ تمام مظالم و مفاسد جو زندگی کے خارجی نظامات نے پیدا کر رکھے ہیں خود بخود دور ہو جائیں گے۔ انصاف پسندی راست کرداری اور دیگر اخلاقی اوصاف نہ حکومت پیدا کرسکتی ہے اور نہ ہی کوئی معاشی نظام انھیں وجود میں لاسکتا ہے۔ ایشیائی مذاہب نے نفس کشی، ترک دنیا اور ریاضت و مجاہدات کو انسانی اصلاح کا وسیلہ قرار دیا اور دنیا کی خرابیوں کا علاج انسان کی باطنی اصلاح سے شروع کیا۔ اس کے بالکل برخلاف یورپ کی جانب جس قدر بھی کوششیں ہوئیں وہ ساری خارجی نظامات کے رد و بدل اور ان کے قوانین کی ترمیم و تنسیخ تک محدود رہیں۔ ایشیا کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے خارجی نظامات کی قدر و قیمت کو نہ پہچانا اور اپنی کوششوں میں اس چیز کو نظر انداز کر دیا یورپ کی غلطی یہ ہے کہ اس نے انسان کی باطنی زندگی اور اس کے نفسی محرکات کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے حالانکہ دنیا کی خرابیوں کا علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب خارجی نظامات اور باطنی اصلاح دونوں کا تعاون حاصل ہو اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔

صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ان دونوں پہلوؤں کو مساوی اہمیت دی۔ اس نے ایک طرف اپنے پیروؤں کو سیاست معاشرت اور معیشت کا ایک ایسا نظام عطا کیا جس سے ایک ہمہ گیر تمدن کی بنیاد رکھی اور دوسری طرف اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کے لئے ایک ایسا نظام عبادت تجویز کیا جس میں فرد و جماعت ہر دو کی تسکین اور

اخلاقی ترقی کا سر و سامان موجود ہے یہی نہیں بلکہ ان سے معاشی و معاد مادی ضروریات اور روحانی تقاضوں میں ایسی موافقت پیدا کردی اور ان میں ایسا رشتہ مواصلت قائم کردیا کہ دونوں ایک ہی وحدت کے دو پہلو اور ایک ہی حقیقت کے دو رخ معلوم ہونے لگے اس نے مادہ اور روح خارجی نظامات اور باطنی محرکات میں ایسا گہرا ربط اور تعلق پیدا کیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک سے تغافل برتا جائے اور دوسرا خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ اس لئے مستقبل میں اگر کوئی نظام انسانی فلاح و سعادت کا ضامن ہوسکتا ہے تو وہ وہی نظام ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس دعوے کا کوئی تفصیلی ثبوت پیش کروں اس سلسلہ میں ان نظامات پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالنا پڑے گی جو دنیا کی خرابیوں اور تمدن جدید کے مفاسد کی اصلاح کے دعویدار ہیں۔ یوں تو ان کی تعداد بیشمار ہے مگر ان میں سے چار اہمیت کے لحاظ سے لائق توجہ ہیں۔ یہ چار حسب ذیل ہیں:۔ (۱) قومیت پرستی (۲) مذہب انسانیت (۳) اشتراکیت (۴) ایک بین الاقوامی وفاق جس میں تمام سلطنتیں مشترک امور میں اپنی حاکمیت مطلقہ سے دست بردار ہوجائیں۔

(باقی آئندہ)

کا کام باقی تھا حضرت سلیمان کی ہدایت کے مطابق ان کی نعش کو ایک کمرے میں ایسے کھڑا کیا گیا گویا ابھی وہ زندہ ہیں اور ان کا ڈنڈا اژدہا ہے یہ عصا کے کرشمے ہیں کہیں بیت اللہ کی تعمیر کراتا ہے کہیں نفس انسانی کی تکمیل میں ہاتھ بٹاتا ہے

یوں تو سبھی استاد جسمانی سزا کے خاص طور پر شائق تھے ان کے لئے یہ جنگجویانہ اور سفاکانہ زندگی نہایت ضروری تھی بچوں کے بدن کو مار مار کر دھجیاں اڑا دی جاتی تھیں اور ایک لحاظ سے یہ چیز تھی بھی یونانی اساتذہ حسن کی دلیل سیدھے سادے زیور اس کے پیڑ سے پسند کرتے ہیں کچھ نقش و نگار تھوڑا بہت پھول بنا دیں تو ہو جانا چاہیں قدرت نے بچے کی جلد کو اسی لئے سادہ چکنا اور صاف بنایا کہ استاد اس پر کشیدہ کاری کرتے رہیں اور بیل بوٹے کاڑھتے ہیں اسی لئے تو ایک روسی استاد نے بیٹے سے تنبیہاً یا تنقیداً کہا تھا یاد رکھو تمہاری کھال ویسی ہی یہود اور استادوں کا حصہ تمہارے والدین کا ہے ---

بالعموم مدرسوں کی فضا ایک قبرستان کی فضا کی طرح سنجیدہ اور بوجھل سی ہوتی ہے لیکن ہیملیٹ کا گورکن ایک کاسۂ سر پر بھی پھبتیاں کس لیتا ہے اور بے چارہ استاد اس فضا میں بھی تلخ مزاج کے چند قطرے نچوڑ ہی لیتا ہے اگر عام طور پر استاد اور ساتھیوں کے نام رکھنے میں حیرت انگیز جدت پائی جاتی ہے تو استادوں نے سزا کی اصطلاحات کے سلسلے میں دلچسپ اختراعات کی ہیں۔ یہ اصطلاحات بالعموم عالم حیوانات سے لی جاتی ہیں شاید ان کے وضع کرنے میں استاد کی نفسیات کا ڈارونی پہلو مصوری پہلو کو مات دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

مرغا تو اکثر لوگ سنتے ہی چلے آئے ہیں۔ اس کے تخیل سے استاد کی مزاحیہ اپج اور قوت مشاہدہ ہویدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ اشارات نہیں بلکہ الہامی جدتیں کسی اتفاق کی مرہون منت نہیں یہ صدیوں کے تربیت یافتہ ذہن اور انسانیت کے مزاح آفریں پہلو کے ارتقا کا نتیجہ ہے اس خوبصورت اصطلاح کی قدر ایک بچہ ہی خوب جانتا ہے اگر وقت کے ہاتھوں سے ان نقوش کو آپ کے دماغ کے تختۂ سیاہ سے بقول بعض ماہرین ذہن ایک تختۂ سیاہ

درندہ جبلتوں سے پٹا ہوا وحشی نکلتا ہے خواہ ہٹلر کو (اگر ہمت ہو تو) کھرچ کر دیکھ لو یا کسی معمولی استاد
کو۔ ان سے دونوں ایک ہی نکلیں گے فرق صرف دائرہ عمل کا ہے ایک کے سامنے پورا براعظم یورپ
کیا ساری دنیا بھی سکڑ کر محض کے بازی کا دائرہ بن گئی ہے اور دوسرے کے لئے مدرسے کی چار
دیواری جو پھیلی ہے تو کل کائنات کے مترادف ہو گئی۔

ہمارے مدرسوں میں پڑھائی اور پٹائی کچھ لازم ملزوم سی ہو گئی ہیں۔ یہ دونوں بیساکھیوں کی مانند
ہیں جن کی مدد سے ہمارا نظامِ تعلیم سہارا لئے ہوئے ہے چل نہیں رہا ٹھٹکا ہوا ہے اور اب تو ٹھٹکا ہوا
بھی نہیں بلکہ سہما ہوا کھڑا ہے اور اس کا علم و نشان اس کا سزا دینے والا بید ہے۔ استاد اور بید دونوں
ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ نفسیاتی طور سے بھی اگر دو اشیاء کافی عرصے تک اکٹھی مشاہدے میں رہیں
تو بعد میں ایک کے یاد آنے پر دوسری کی یاد خواہ مخواہ تازہ ہو جاتی ہے اس لئے اگر بید نظر آ جائے
تو ذہن میں آتا ہے کہ اس کے اردگرد ضرور کسی استاد کی روح منڈلا رہی ہو گی اور اگر استاد اکیلا دکھائی
دے جائے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں ادھر ادھر کوئی کھلتی بید تو چھپا ہوا نہیں ہے ورنہ ویسے تو ایک ایسے
استاد کا پورا جسم ایک لرزتا ہوا اور سنسناتا ہوا بید ہے اور بعض وقت تو کچھ استادوں سے جو بید اٹھانا
جس کو ایک فن لطیفہ بنا گئے، پر مصور نہ تھا تو بہت سے مدارج معرفت طے کر گئے مجھے خود ایسے
پہنچے ہوئے استاد کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو خود مسند تدریس تو شدم کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔
بعض اکثر مرتبہ ہوئے لگتا تھا کہ وہ خود ایک مجسم گھونسا ہیں یا ان کا گھونسا وہ آپ ہیں۔ ان کی
صحبت کو پڑھانے والے وہ خود ہیں یا ان کا گھونسا۔ اکثر اوقات جب بچے ان سے کچھ پوچھنے کی
ہمت کرتے تھے تو گھونسا تان کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے کمبخت! مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ان
استاد سے پوچھو اس کی موجودگی میں میں کیا بتاؤں۔"

اللہ اللہ یہ ہے علمی سلوک کی منزل فنا ان کے لئے وہ گھونسا ایک جیتی جاگتی قائم بالذات
شخصیت ہی اور بچوں کے لئے استادی کا نشان اور سچ تو یہ ہے کہ اگر استاد کی جگہ اس کا گھونسہ
ایک گھر سا یا اس کی میز پر ایک بید پڑا رہتا تو بچے اس کا اتنا ہی احترام کرتے جتنا استاد کا بات پر

رہے بھی، بنے محدود انداز میں تقسیم کار کا مسئلہ خوب سمجھتے ہیں اور یہ تقسیم کار ایک زمانہ سے چلی آتی ہے
اکثر ماس اپنے استاد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے زندگی بھر کسی بچے کو نہیں پڑھایا استاد اور
بچوں سے کام کا اچھا خاصہ بٹوارا کر لیا تھا۔ استاد کا کام تھا پٹائی اور بچوں کا رٹائی۔

یہ حال بید استاد کا نشان ہو گیا ہے اور ازمنہ وسطیٰ کے فن کار مصورین یا سنگ تراشوں نے
بید بھی اور بولتا چالتا استعمال کیا ہے تیموری کا رتبول مغل نادر کاری میں شہزادہ کے ہاتھ کا لکھتا
ہوا بچوں یونانی سنگ تراشی میں زیتون کی شاخ ایک پوری سماجی سیاسی اور معاشی زندگی کی رنگین
فلم ہا سے سامنے کھول کے رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ کے نقوش اور مجسموں میں استاد
کا ہر جگہ ایک بید کے ساتھ ہونا بھی اس زمانے کی تعلیم و تعلم پر بڑی تیز تیز اور گرم گرم روشنی
ڈالتا ہے۔

جرمنی کے لاطینی مدرسوں میں تو سزا کے لئے ایک باقاعدہ افسر مقرر کیا جاتا تھا جسے نیلا کہا جاتا
تھا سو وہ ہمیشہ نیلا لباس پہننا پڑتا تھا نیلا کا لفظ ہمیں اندر سبھا کی نیلم پری کا رومانی تخیل دلاتا
ہے لیکن نیلم پری کا نام تو اس کی طور پر اور شفاف جسم کی رعایت سے رکھا گیا تھا جس میں سیلم کی
حلف نمایاں کرتی تھی مگر نیلا، افسر کے جسم کو نیلم پری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا انہیں تو محض اس
لئے نیلا کہتے تھے کہ ان کی التفات سے بچوں کے جسم پر نیلاہٹ کی وہ دردناک جھلک آ جاتی تھی
جس میں رومانیت کا شائبہ بھی نہ تھا

اسکول اور جماعتی ہر قسم کے ضبط کے لئے جرمنی ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ اور سرا
میں تو وہاں کے اساتذہ نے اچھا خاصا چنگیز خانی ریکارڈ قائم کر دیا ہے لطف یہ ہے کہ سزا بھی دیتے
تھے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ باقاعدہ رجسٹر میں اندراج بھی ہوتا جاتا ہے شاید اس کا مقصد وہی عدالتی
کارروائی ہوگی جس کی رو سے اگر کوئی عادی مجرم دوبارہ ماخوذ ہو تو سزا معہ سود مرکب ادا کر دی جائے
ساری مدت تو ہمارے مدرسوں کی سزائیں اصلاحانہ نہیں سب انتقامانہ ہیں اگر آپ کو یقین نہ آئے
تو سزا کے ریکارڈ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو بار بار وہی نام سالوں مہینوں کے دردانگیز وقفوں کے بعد

نظر پڑیں گے اگر سزا کا مقصد سماج کی حفاظت تھی تو یقیناً یہ سزا بری طرح ناکامیاب ہوئی ہے ایک
جانب اس نے ایک انسان کی فطرت کو اور بھی بربریت اور وحشیانہ پن کی طرف رجوع کر دیا اور دوسری
جانب [illegible] ہے ایک گنہگاری کو جو دامن سے ہوا دی ہے تو اس کی لپٹیں آسمان کی خبر لانے
لگیں [illegible] طبعیات [illegible] قوتوں کا کھولتا ہوا دریا ہوتی ہے اور سزا اس کے
[illegible] ہوتی ہے اس کی [illegible] روکنے کے لئے ایک حقیر سی روک کمزور لکڑی کے تختوں کی باڑھ
ہوتی ہے [illegible] کی فطرت [illegible] کو [illegible] روندتی مسلتی اپنی ترنگ میں بڑھے چلی جاتی ہے
ایسی طبیعتوں کے [illegible] اور [illegible] کا کام نہیں کر سکتی اور کمزور طبیعتوں کو سزا کے علاوہ اور ہزاروں
ترکیبوں سے روکا جا سکتا ہے تو پھر سزا دینے کا فائدہ کیا ہوا؟ خیر یہ باتیں تو جملہ معترضہ ہیں مدرسوں میں سزا
کا ریکارڈ رکھنے کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ آخر بادشاہ بھی تو فتوحات فیروز شاہی اور اکبر نامہ وغیرہ
قسم کی تحریریں تیار کراتے تھے کیا استاد انسان نہیں ہیں؟ کیا ان کے دل میں اپنے کارناموں
کو محفوظ رکھنے اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی خواہش نہیں ہے؟ یقیناً اپنے کارناموں کو خود پڑھنا
بھی [illegible] میں ایک [illegible] البتہ [illegible] اور خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہوگا۔ سنا گیا ہے کہ امریکہ کے سرخ انڈین
اپنی کھوپڑیوں کو بطور یادگار فتح مندی کے نشان کے اکٹھا کرتے رہتے تھے [illegible] اساتذہ بچارے
تو محض ریکارڈ ہی رکھتے ہیں ہاں کبھی کبھی شاذ و نادر اگر کسی کا کان زیادہ مسلا گیا تو اس کی نچلی کویل
ہاتھ میں آ جاتی ہے ایسے حالات میں انھیں کپتان جنکن کی طرح اس کو اسپرٹ میں محفوظ رکھ لیا جائے
سکتے ہیں کہ کپتان جنکن کے کان ہسپانوی امیر البحر نے اسی قصور پر کاٹ لئے تھے کہ وہ جزائر غرب الہند
میں ڈاکہ زنی کیا کرتا تھا اس نے پارلیمنٹ میں آ کر جو کان دکھائے تو سب کے کان کھڑے ہوئے
اور پورے انگلستان نے اپنے کانوں کو بچانے کے لئے اسپین بھر کے کان کھینچنے کی تجویز منظور کر دی اس
جنگ کو جنکن کے کانوں کی لڑائی کہتے ہیں اسکولوں کے ریکارڈ میں تو کسی "کان کی جنگ" کا حال
درج نہیں ہاں کبھی کبھی سزا کے مسئلہ پر استاد اور والدین میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے اور کبھی
کبھی اتفاق بھی حسن اتفاق سے ایک لڑکے کے باپ نے اتفاق رائے بلکہ خوشنودی رائے کا

اظہار کیا وہ سننے کے قابل ہے۔

مدرسے کا ہیڈ ماسٹر نیا ہی بدل کر آیا تھا مگر تھا بڑا زبردست ضبط رکھنے والا قد محض پانچ فٹ بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ مگر بلا کا پٹائی کرنے والا تھا۔ معلوم نہیں یہ پٹائی کرنے والے لوگ اپنا قد اکثر چھوٹا ہی کیوں رکھتے ہیں شاید بید لگاتے وقت اچھلنے میں یہ زیادہ موزوں رہتا ہوگا۔ یہ ہیڈ ماسٹر تھا بھی بڑا خوش طبع اور بچوں کو خوب ہی خوب سمجھتا تھا۔ پہلے خوب میں تو وہ بچے کے اس روحانی تیل اور فرشتوں کی سی معصومیت کو پا جاتا جس کے گیت ورڈزورتھ اور ٹیگور جیسے لوگ گاتے چلے آئے ہیں اور دوسرے خوب میں اس کی نگاہ تیران پردوں کو چیر کر بچے کے اس من کے مدھ میں پہنچ جاتی تھی جہاں کبھی کبھی ایک ننھا سا شیطان چھپا ہوتا تھا اس ننھے شیطان کا نکالنا کچھ اسی کا حصہ تھا۔ دوسرے مدرسوں کے درست نہ ہونے والے بچے ان کے ہاں درست ہو جاتے تھے دوسروں کی ٹمٹموں اور وکٹوریا میں پینگیں اچھالنے والے گھوڑے بلکہ گدھے اس کے گھر کھڑے گئے میں بھی ٹھمکی چال دکھاتے تھے وہ طلبا جو کسی کے ہاتھوں مار کھانے کے لئے تیار نہ تھے بے سبب بے دھڑک بغیر چون و چرا مار کھائے چلے جاتے تھے۔

ایک روز مدرسے میں خاص واقعہ گزرا اس دن نواح کے ایک بڑے جگادری قسم کے لڑکے نے مدرسے میں داخلہ لیا تھا نواح کے مدرسوں کا مشہور بھگوڑا اور مدرسوں کی ہڑتالوں اور معلم حادثوں کا مانا ہوا لیڈر۔ مدرسے کی فضا میں اچانک ایسی خاموشی چھا گئی تھی جو آنے والے طوفان کا پتہ دیتی تھی دونوں جانب سے کسی آئندہ آنے والے نامعلوم آشوب کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر نے تو اس بار ہی صرف ہیڈ ماسٹری کا ہی داؤں لگا دیا تھا مگر مچھن میاں کی تو زندگی بھر کی شہرت خطرے میں پڑ گئی تھی ہیڈ ماسٹر صاحب کو تو صرف اپنے مدرسے میں ہی بدنامی کا خطرہ تھا مگر انھیں تو پورے علاقے میں اپنی ساکھ قائم رکھنی تھی۔ وہ اتنے مشکل دنگلوں سے اب تک فاتح و منصور بڑھتے چلے آئے تھے کہ اس پانچ فٹے بالشتیے سے تو پیچھے ہٹنا ہتک ہی نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ انھیں اپنی ساکھ قائم رکھنی تھی اور رکھنی بھی بہت جلد تھی۔ وہ ہٹلر کی طرح دفعتہً اور فوری

کارروائی کے قائل تھے۔ دوسرے دن ہی آشوب ہوگیا گھن ایک استاد سے جان بوجھ کر بد کلامی سے پیش آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے حسب قاعدہ بید لگائے اور انھوں نے بہت خاموشی سے کھائے۔ تو آسمان سے کوئی بجلی گری اور نہ کوئی بم ہی پھٹا۔

ہی دن شام کے وقت ایک پہلوان گاما کی چال ڈھال کا آدمی مدرسے کی چار دیواری میں داخل ہوا۔ لٹھ بردار والا چوڑا چکلا چوتا انسان ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگا اور بھی تو ہیڈ ماسٹر وہ بھاری نہیں ایسے ناپ اور پیمانے کے انسان کے دماغ میں خیال بھی نہیں آتا کہ اتنا چھوٹا سا کھلونا نما انسان بھی ہیڈ ماسٹر ہو سکتا ہے۔

"بھئی میں ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہمارے گھن کو آج مارا ہے"

ہیڈ ماسٹر نے پہلے تو اسے سر سے پاؤں اور دوبارہ پاؤں سے سر تک متانت سے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شاید کسی دوسری جنگ کی تیاری کے سلسلے میں حریف کی جانچ کر رہے تھے اور پھر اطمینان سے بولے "میں نے مارا ہے۔"

یہ بھاری بھرکم انسان باوجود اپنے وزن کے ایک دفعہ اپنی جگہ پر اچک کر رہ گیا اور حیرانی سے استاد پر آنکھیں جما کر کہنے لگا "میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ آپ نے ہی گھن کو مارا ہے؟" "ہاں اور وہ مار کا مستحق بھی تو تھا"

"ارے واللہ تم نے تو خدا کی قسم غضب کر دیا۔ اجی اسے تو میں بھی ہاتھ لگانے سے ڈرتا ہوں اور یہ تو خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ تمہارے جیسا ذرا سا چھوکرا (شکر ہے اس نے چھوکرا نہیں کہہ دیا) اسے پیٹ سکے گا۔ لاؤ۔ ذرا ہاتھ تو لاؤ ادھر۔ یار تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے"

اس پر دونوں نے بے تکلف انداز میں ہاتھ ملایا۔

"بھئی میں تو تمہاری جرات کا آج سے قائل ہو گیا"

اور اس کے بعد دفعتاً بٹوے میں ہاتھ ڈال کر "اور دیکھنا بھئی میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بس یہ لو ایک اٹھنی اس کا کچھ کھا پی لینا"

ہیڈ ماسٹر آدمی تھا سمجھدار، خاموش ہو گیا اور چپکے سے اٹھنی جیب میں ڈال لی۔ ابھی
اس کا دھیان مدرسے سے باہر نکل رہا تھا اور جاتے جاتے بھی کچھ استعجابیہ اور کچھ تعریفی لہجہ میں
یہ کہتا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ہیڈ ماسٹر جماعت میں داخل ہوا۔
"گھسن کھڑے ہو جاؤ۔" گھسن کھڑا تو ہو گیا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں ایک سنسناہٹ سی اپنے
موؤں کے نیچے سے اوپر کو چڑھتی محسوس ہوئی۔
"بھی مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے۔ تمہارے ابا ابھی مجھ سے ملنے آئے تھے اور تمہاری
پٹائی پر ایک اٹھنی انعام دے گئے ہیں اور کہہ گئے اگر آیندہ تم نے ہمیں ایسا کوئی موقعہ دیا تو ہم
ایک روپیہ سے کم کیا کمائیں گے۔"
میاں گھسن تو خیر مار کھانے والے سماجی طبقے کے فرد تھے مگر رسے کا تو ہاک مایا جال
کھلانے والے طبقے کو بھی اکثر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے سنا ہے ایک دفعہ اکبر اعظم نے
شاہزادگی ہیں اپنی بادشاہی کے زمانے میں کسی تہوار کے موقعہ پر زعفرانی رنگ کے کپڑے
پہن لئے تو صدر الصدور مولانا عبد الصمد نے ان کی شریعت کے لٹھ سے نہیں بلکہ ایک اچھے
خاصے موٹی قسم کے مادّی لٹھ سے خبر لی باپ زندہ نہ تھے اکبر نے اماں جان سے شکایت کی تو
انہوں نے کہا کہ بیٹا ان باتوں سے اپنی طبیعت پر ملال مت لاؤ تاریخ کے صفحوں میں تمہارا نام
ان زرّیں حروف میں لکھا جائے گا کہ ایک زبردست سلطنت کے باسطوت و جبروت حکمران
نے ایک معمولی مسجد کے ملّا سے تادیب حاصل کی اور کچھ نہ بولا۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اکبر اعظم نے
کہاں تک اماں کی تشفی آمیز نصیحت سے اتفاق کیا ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مولانا
عبد الصمد نے بعد میں تو اکبر سے شاید آنکھ ملانے کی جرأت نہ کی ہو۔ کیونکہ اگرچہ وہ اس مرتبہ
اکبر کے زعفرانی کپڑے اتروانے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن ان کی بجائے کسی ملّی رنگ چڑھانے
میں ناکام ہی رہے۔ اور تاریخ کے صفحات کے متعلق بھی وہ مبہم سے کلمات کچھ ایسے اطمینان بخش
نہ تھے کیونکہ اکبر کے لئے عصا کی جھنکار تو محض حال کا حقیقی المیہ تھی اور تاریخی شہرت محض مستقبل آنے والی

ستارہ قمر کی مانند تھی جس کا پھوٹا ودہ سیما کے منجم لوگ مہینوں پہلے سے کر رکھتے ہیں اور اکبر تو تھے بھی اَن پڑھ۔ انہیں تاریخ کے وعدوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

اتنا ضرور ہے کہ قانونی لحاظ سے اکبر کی پوزیشن بہت مضبوط تھی وہ چاہتے تو مولانا کے خلاف چارہ جوئی کر سکتے تھے مگر انگلستان کے بادشاہ ہنری ششم کو تو اس پیدائشی حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ پریوی کونسل کی ایک تجویز کی رو سے جو ۱۴۲۴ء میں منظور کی گئی۔

"بادشاہ کا آتالیق ارل آف وارک بادشاہ کو اس کی شرارت یا غلطی کی بنا پر پیٹ سکتا تھا تاکہ وہ اس ڈر اور خوف سے غلطی کم کرے اور علم کی طرف زیادہ متوجہ ہو۔"

ایک جمہوریت پسند ہونے کے لحاظ سے مجھے ہنری ششم کی سزا کا ریکارڈ دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اور غور سے دیکھا جائے تو محض ڈنڈے کا اصول ایک اٹل قانون ہے جس کے سامنے امیر و غریب شاہ و گدا برابر ہو جاتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے ہاں ایک سوابیا کے استاد کی اکاون سالہ اسکولی زندگی میں سزا کا ریکارڈ حسن اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے انھوں نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں ۹۱۱۵۰۰ دفعہ بید کی سزا دی۔ ۱۳۶ دفعہ ڈنڈے سے چوٹیں لگائیں ۲۰۰ دفعہ چپت جمائے ۲۹۰۰ طلبا کو مدرسہ کا وقت ختم ہونے کے بعد روکا گیا۔ ۲۲۷۰۰ مرتبہ زبانی رٹوانے کی سزا دی اور ۱۲ مرتبہ کوڑے لگائے ان کے زندگی کے حالات پڑھ کر مجھے بار بار اسکاٹ کا وہ شعر یاد آتا ہے کہ ایک شاندار نیک نام زندگی کا ایک گھنٹہ بھی گم نام زندگی کے پورے دور سے بہتر ہے۔ مگر تعلیمی تاریخ میں یہ کیا ان سے بھی شاندار ہستیاں ہو گزری ہیں۔ وہ بچوں کو مارنے والے بلکہ دھوآں اڑا دینے والے۔ انسانی جسم کے ساز۔ اف۔ اس قدرت کے شاہکار ساز سے موسیقی کے بے شمار مدھم اور پنچم سُر نکالنے والے۔ کنکٹنی برادری کے قابل فخر آبا و اجداد جن کے نام سے سینکڑوں شاگردوں کی روحیں اُن کی لحدوں میں کانپ اُٹھتی ہیں اِن سب کے سردار ڈاکٹر کیٹ تھے جو ایک زمانہ میں ایٹن کے مشہور پبلک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کی پٹائی کی گونج اب بھی

جیسے کہ بعض پہنچے ہوئے عطائی حکیم ہر مرض کا علاج ایک ہی اکسیر سے کرتے ہیں۔ کیٹ کے لیے
ہر مرض کی دوا ڈنڈے کے استعمال میں مضمر تھی۔ وہ ہر کسی کو پیٹتے تھے اور ہر بات کے لیے پیٹتے تھے۔
ن کا ڈنڈا ایک ایسا جادو گر کا طلسمی چھو منتر والا تکیہ تھا کہ گھمایا اور کام بن گیا۔

روح پرور دل راوی سنا گیا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے مدرسہ کے گرجا میں وعظ فرماتے
ہوئے انجیل مقدس کا جملہ پڑھا "برکت والے ہیں وہ لوگ جو اپنا دل کدورت سے صاف رکھتے
ہیں" یہ کہتے ہی وہ گرجا کا ماحول بھول سا گئے اُن کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی سی چمک
آگئی اور وہ اپنی انگشتِ شہادت کو ہلا ہلا کر گرج گرج کر کہنے لگے یاد رکھو صفائی باطن تمہارا درس ہے
نہایت اہم فرض ہے اور یاد رکھو اگر تم صفائی باطن پیدا نہ کر سکے تو تمہاری ڈنڈے سے خبر لی جائیگی۔
اس کے زمانے میں ایٹن میں سزا دینے کا بڑا اہتمام تھا ہر چیز کے لئے ٹکٹ بنا کرتے تھے انعام کے
لئے بھی اور سزا کے لئے بھی۔ بڑا بھی اور عسکری نظام میں ٹکٹوں کی خاص اہمیت
ہوتی ہے ہر انسان انسان نہیں ہوتا وہ ایک خاص عدد ہوتا ہے یا کاغذوں کی ایک فائل
اس سے بندھے ہوئے تمام عسکری نظام کے ماتحت یہ ٹکٹ جاری کئے جاتے تھے اور ان
کی بہت ضرورت۔ کیٹ کے اسکولی ضبط کا تخیل بالکل عسکری اور جنگی حالت کا تھا۔ بھلا کوئی حکومت
پورے معاشی اور سماجی نظام کو امن کی حالت میں ٹکٹوں کے ذریعہ چلانے کی جرأت کر سکتی ہے؟
کیٹ کے مدرسہ میں بھی صرف ظاہری صورت امن و امان کی تھی مگر گہرے پانیوں کی طرح جو اوپر سے
ساکن اور ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اندر اندر بچوں میں نفرت اور بغاوت کی بے پناہ قوتیں
انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک جماعت انعامی ٹکٹ لے کر ان کی خدمت میں حاضر
ہوئی۔ سوء اتفاق سے یا تو یہ ٹکٹ ظاہری شکل و صورت میں سزائی ٹکٹوں سے ملتے تھے۔ اور یا ہیڈ ماسٹر
صاحب کے طبعی رجحان نے ان میں کچھ ویسی جھلک سی پیدا کر دی تھی۔ بہرحال وہ ایک سرے سے
شروع ہو گئے قمیص کی باہیں چڑھائے ہوئے پسینہ پونچھتے ہوئے انہوں نے تھوڑے سے

اسے کمنٹ کو اس کے آگے بڑھایا۔ کیٹ کو اپنی غلطی کا پتہ چلا تو انھوں نے اس وقت وہی کیا جو ہر باوقار اور سمجھدار آدمی کو کرنا چاہیے۔ اس دخل در معقولات سے ان کا طوفان اور بھی ابل پڑا گرج گرج کر کہنے لگے "معاشو! تمہارا عذر گناہ بدتر از گناہ ہے" اور اس کے بعد انھوں نے اپنی پٹائی برابر جاری رکھی اور پورے گروہ کو ختم کر دیا۔

ایسے با اصول اور استبدادیت پسند حاکم کے زیر سایہ رہنے سے بچوں کو ایک تسلی ضرور رہتی ہے ان کی مدرسے کی دنیا میں کوئی طبقہ وارانہ تفرق نہیں رہتی۔ سب کے سب ایک مساوات میں عقیدہ رکھنے والی مار کھانے والی جمہوریت کے فرد ہوتے ہیں اور مار کھانے کا حق سب کو برابر بغیر کسی ناجائز جنبہ داری کے پہنچتا رہتا ہے۔ اس گروہ میں کوئی طبقے نہیں ہوتے کہتے ہیں کہ جب تاتاری کے جنگلوں میں شیر گایوں کے گلہ پر حملہ کرتا ہے تو سب سینگ جوڑ کر اس پر اکٹھی ہلہ بول دیتی ہیں۔ امڈتے ہوئے دریا کے سیلاب کے سامنے ٹڈلوں کے دل بادل کے درمیان کسان اپنی دائمی رقابتیں اور جھگڑے کچھ لمحوں کے لئے بھول جاتے ہیں۔ مشترکہ مصیبتیں مسرتوں کی نسبت ہمیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب لے آتی ہیں اسی طرح ایٹن کے بچے بھی اس عام خطرے کے خلاف سینگ تو نہیں ہاں جیب چھپاتے ہاتھوں کو اکثر سر جوڑ کر بیٹھے تھے دنیا میں فرانسیسی انقلاب آیا، زار روس کا تختہ الٹ گیا لیکن کیٹ کے جیتے جی ایٹن میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔

ارتقائے اعداد

(محمد کامل صاحب فرنگی محل لکھنؤ)

کامل صاحب کا ایک مضمون فلسفۂ ذات کے عنوان سے ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۱ء کے پرچے میں نکل چکا ہے اس دلچسپ مضمون کو بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے۔ (مدیر)

ممکن ہے کہ گنتی انسانی بولی سے بھی پہلے عالم وجود میں آگئی ہو اور انسان اشاروں سے شمار کرتا ہو بہرحال اس کے پاس گنتی کی بنیاد انگلیاں تھیں جس کا اثر آج بھی ہم بعض قوموں کو انگلیوں سے گنتے وقت دیکھتے ہیں۔ ہمارے اس نظریہ کی تائید بعض وحشی قوموں کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے مثلاً جب اہل زولو "چھ" کہنا چاہیں گے تو کہیں گے "تاتی سی توبا" جس کا مفہوم ہے انگوٹھا شامل کرنا یعنی گننے والا جب ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں گن چکا تو اس نے دوسرے ہاتھ کا انگوٹھا شامل کر کے چھ کا عدد پورا کر لیا۔ بعض سرخ ہندوستانی (Red Indians) قبائل جو امریکہ میں نہر اورینو کے کنارے آباد ہیں اپنی زبان میں پانچ کے لئے کہیں گے "پورا ہاتھ" چھ کے لئے کہیں گے "دوسرے ہاتھ میں سے ایک" اسی طرح دس کے لئے کہیں گے "دونوں ہاتھ" گیارہ کے لئے کہیں گے "پاؤں میں سے ایک" بارہ کے لئے کہیں گے "پاؤں میں سے دو" پندرہ کے لئے کہیں گے "پورا پیر" پھر اسی طرح دوسرے پیر میں ایک پر اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔ اور جب بیس کہنا ہوگا تو کہیں گے "آدمی" پھر کہیں گے "دوسرے آدمی کے ہاتھ میں سے ایک" یعنی اکیس اسی طرح انتالیس تک گنیں گے اور چالیس پر کہیں گے "دو آدمی"

یہ معلوم کر لینے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ گنتی میں "۱۰" کو بنیادی حیثیت کیوں حاصل ہے صرف اس لئے کہ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کا مجموعہ ہے یہ تو ظاہر ہی ہے کہ پرانے آدمیوں نے شروع میں پانچ کے عدد کو بنیادی حیثیت دی تھی کیونکہ یہ بھی تعداد ایک

ہاتھ کی انگلیوں کی ہے اور بعد میں یہ بنیادی حیثیت دس کو حاصل ہو گئی مغربی افریقہ کے
سنگالی حبشیوں میں اب تک بنیادی عدد "پانچ" ہے۔ اگر وہ پانچ کے اوپر گننا چاہیں گے تو
اسی پر اضافہ کر کے کہیں گے "پانچ اور ایک۔ پانچ اور دو۔ پانچ اور تین وغیرہ" جس طرح ہم لوگ
دس پر اضافہ کر کے گیارہ۔ بارہ۔ تیرہ بناتے ہیں۔ اس طرز کا اثر اب تک رومی ہندسوں میں
محفوظ ہے جن سے رومی لوگ ہندی اعداد سے پہلے کام لیا کرتے تھے۔

بعض قوموں بنیادی عدد بیس کو مانتی ہیں جیسے انگریزی میں اسی کے لئے کہیں گے
(Four Score) یعنی چار بیس اسی مفہوم کو فرانسیسی لفظ (Quatre Vinget) ادا کرتا ہے
انگریز کہے گا (Four Score & Three) اور فرانسیسی کہے گا (Quatre Vinget Trois)
یعنی "تراسی"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض پرانے جرمن قبائل "بنیادی عدد بیس" کو مانتے تھے۔
جو ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کا مجموعی عدد ہے ہمارے ہندوستان میں بعض بوڑھی عورتیں بھی
اسی طرح "بیس" کو بنیادی عدد مان کر گنتی ہیں۔ جیسے "دو بیسی پانچ" یعنی پینتالیس یا "تین بیسی"
یعنی ۶۰ تاہم عام طور پر بنیادی عدد "دس" ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی پر ہندسوں کا دارومدار ہے

ہندسے، یہ بدیہی امر ہے کہ جب انسان نے پہلی مرتبہ کسی عدد کو لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا
تو ایک کی علامت کے لئے ایک لکیر اور دو کی علامت کے لئے دو لکیریں کھینچی ہوں گی جو
انگلی کی تصویر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اسی طرح جتنے اعداد لکھنا ہوئے اتنی ہی لکیریں بنا دی
گئیں جیسا کہ امریکہ کے بعض سرخ ہندوستانی آج تک بھی کرتے ہیں۔ عرصۂ دراز تک انسان
نے اسی طرح اپنا کام نکالا خواہ اس کو دہائیوں سے گذر کر سیکڑوں تک لکھنے نوبت آجاتی۔ پھر
اس نے دیکھا کہ اس طرح لکھنے میں زحمت اور دقت ہوتی ہے کہ سو کا عدد لکھنے کے لئے
سو ہی لکیریں بنائیں جائیں تب ضرورت نے ایسی علامتوں کی طرف اس کی رہنمائی کی جن سے
یہ دقتیں دور ہو جائیں اب اس نے یہ کیا کہ پانچ کے لئے علٰحدہ علامت مقرر کی دس
کے لئے علٰحدہ اسی طرح پچاس سو اور ہزار کے لئے بھی۔ جب اس کو پندرہ لکھنا ہوتا تو وہ دس

اعداد	ہیروگلیفی	سیراتی	فینیقی	تدمری	قدیم سریانی
۱۹	∩ ||| ||| |||	[illegible]	¬ |||| ||||| |||	¬ 5 ||||	¬ ۲ ۲
۲۰	∩∩	[illegible]	= z 3 o	3	o
۲۱	∩∩ |	[illegible]	= |	13	1o
۳۰	∩∩∩	Z	H¬	¬3	7o
۴۰	∩∩∩∩	⟶	H H	3 3	c o
۵۰	∩∩∩∩∩	۹	¬H H	¬3	7 o o
۶۰	∩∩∩ ∩∩∩	ـــــ	H H H	333	o o o
۷۰	∩∩∩∩ ∩∩∩	ۇ	¬HHH	¬333	7 o o o
۸۰	∩∩∩∩ ∩∩∩∩	ـــــ	HHHH	3333	o o o o
۹۰	∩∩∩ ∩∩∩ ∩∩∩	[illegible]	¬HHHH	¬3333	7 o o o o
۱۰۰	۹	۹	Z | o || o | ٤	¬3 |	7 |
۲۰۰	۹ ۹	/	|| o | (" ٤)	¬3 ||	7 ۲
۳۰۰	۹ ۹ ۹	[illegible]		¬3 |||	7 ۲ |

ہیروگلیفی ہندسے سب سے زیادہ بسیط ہیں کیونکہ ان میں ایک دس اور سو کے علاوہ کسی دوسرے عدد کے لئے علیحدہ شکل نہیں ہے۔ فینیقی میں بیس کے لئے بھی علیحدہ شکل ہے۔ پھر تدمری میں پانچ اور بیس کے لئے الگ الگ شکلیں ہیں قدیم سریانی میں دو، پانچ اور بیس کے لئے بھی علیحدہ شکلیں ہیں جن کو بہر حال صرف ایک دس اور سو کی شکلوں پر فوقیت حاصل ہے ہندی ہندسوں کی طرف سریانی پہلا قدم ہے بایں معنی کہ اس میں دو کے لئے مخصوص شکل ہے۔ اس سے لازمی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ہندی ہندسے سریانی سے مشتق ہیں یا ان کی ترقی یافتہ

شکل میں

متمدن انسان مدت دراز تک اپنے اعداد و شمار میں مخصوص ہندسوں کی ایجاد سے پہلے کا یا ...تعمال کرتا تھا یعنی ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ جن کی تعبیر ہندی ہندسوں سے کی گئی حروف تہجی مرتب ہو جانے کے بعد ان علامات کے بدلے میں وہ حروف استعمال کئے گئے جو ان اعداد کو بتانے والے الفاظ کے شروع میں ہوتے تھے۔ قدیم یونانیوں نے ایک کے لئے یہ علامت مقرر کی تھی (I) جو طبعی طور پر ایک ہونے کا اشارہ ہے یا ایک انگلی کی بگڑی ہوئی تصویر ہے پانچ کیلئے یہ نشان استعمال کرتے تھے (H) جو اس لفظ (ΠΕΝΤΕ) (پانچ) کا پہلا حرف ہے دس کے لئے نشان (Δ) لکھتے تھے جو اس لفظ (ΔΕΚΑ) (دس) کا پہلا حرف ہے سو کے لئے یہ حرف (H) کام میں لاتے تھے سو نہیں کیوں؟ اس لئے کہ یہ ان کی زبان میں "سو" کا پہلا حرف نہیں ہے ہزار کے لئے یہ علامت (X) مقرر تھی جو (XILIOI) (ہزار) کا حرف اول ہے۔ گمان کیا جاتا ہے کہ یونانی ... علامتوں کو سولن کے زمانہ سے کام میں لا رہے ہیں لیکن وہ خود ان کو ہیرودیان غراماطیقی کی طرف منسوب کرتے ہیں جس نے انہیں دوسری صدی کے آخر میں بتایا

رومیوں نے بھی ہندسوں کی جگہ حروف سے کام لینے میں یونانیوں کا اتباع کیا ہے اگرچہ ان کے حروف عددی کسی لفظ کا پہلا حرف نہیں ہوا کرتے تھے رومی ہندسے ملاحظہ ہوں (۱) I (۵) V (۱۰) X (۵۰) L (۱۰۰) C (۵۰۰) D (۱۰۰۰) M - یہ ہندسے آج تک یورپی قومیں بعض حالتوں میں استعمال کرتی ہیں

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ عبرانیوں کے حروف ابجدی ہندسوں کے بدلے کام دیتے تھے لیکن ان کا اصول یہ تھا کہ ہر حرف کو اس سے پہلے والے حرف کے اعتبار سے نمبر دیا جاتا تھا مثلاً عبرانی میں ۲۲ حرف ہیں تو اس کے آخری حرف "ت" کا نمبر ۲۲ ہو گا بعد میں یہ اصول تبدیل کر دیا گیا اور ابتدائی ۹ حرفوں کو اکائیوں کے نمبر دیئے گئے دسویں حرف سے اٹھارویں حرف تک دہائیاں ہیں پھر ۱۹ سے ۲۲ تک سیکڑے سمجھے گئے اس حساب سے ان کی ابجد میں سے

بڑا عدد ۴۰۰ تھا جو "ت" کو دیا گیا۔ عربی حروف تہجی میں ۶ حرف زائد ہیں پوری ابجد ۲۸ حرفوں پر مشتمل ہے ان کے یہاں آخری حرف کا نمبر ۱۰۰۰ ہے۔ عربی ابجد مع اعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ا ب، ج، د، ہ، و، ز، ح، ط، ی، ک، ل، م، ن، س، ع، ف، ص، ق، ر ش

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۷۰، ۸۰، ۹۰، ۱۰۰، ۲۰۰ ۳۰۰

ت ث خ، ذ، ض، ظ، غ۔

۴۰۰ ۵۰۰ ۶۰۰، ۷۰۰، ۸۰۰، ۹۰ ۱۰۰۰۔

"ہندی ہندسے۔ یہ ہندسے اب تک متمدن دنیا میں استعمال کئے جاتے ہیں اور یورپین ان کو عربی ہندسے کہتے ہیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ ان شکلوں کا استعمال ہندیوں نے کب سے شروع کیا ان میں ممتاز صفت یہ ہے کہ ایک سے نو تک اکائیوں کی مخصوص شکلیں ہیں پھر صفر ہے جس کا اضافہ اکائیوں کے پہلو میں کرکے دہائیاں بنائی جاتی ہیں دو صفروں کا اضافہ کرکے سیکڑے بنائے جاتے ہیں تین صفروں کا اضافہ کرکے ہزار بنتے ہیں اسی طرح غیر محدود اعداد بنتے چلے جائیں گے ان کی بنا اقتصادیات پر ہے کیونکہ ۹ علامتوں پر صفر کا اضافہ کرکے کوئی بھی بڑے سے بڑا عدد جہاں تک تخیل کی رسائی ہوسکتی ہو بنایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حروف ابجد یا کسی دوسرے طریقہ سے ناممکن ہے غالباً ہندسوں کا یہ طریقہ عربوں نے ہندوستانیوں سے معلوم ریاضیہ، نجوم و ہیئت وغیرہ کے ساتھ دوسری صدی ہجری میں سیکھا بعض محققین کی رائے ہے کہ ۳۰۰ھ میں اہل بغداد نے ہندوستانیوں سے سیکھا بہرحال مسلمانوں میں سب سے پہلے ان ہندسوں کی تشریح ابوجعفر محمد خوارزمی نے نویں صدی عیسوی میں پیش کی اس کے بعد ان کی اشاعت مسلمانوں کے دفتری کاموں اور تصانیف میں ہوئی یہاں تک کہ بارہویں صدی عیسوی میں یورپ والوں نے اسپین میں مسلمانوں سے علم حساب حاصل کیا اور خوارزمی مذکور کی کتاب پڑھی تو اس علم کا نام ان کے نام پر رکھدیا۔ رینو مشہور فرانسیسی مستشرق کا خیال ہے کہ لفظ (Algorism) الخوارزمی کا یورپی تلفظ ہے۔ (خوارزم میں واو لکھا جاتا ہے مگر بولا نہیں جاتا) اسی طرح (zero) بھی عربی صفر کا یورپی تلفظ ہے۔ اس سے

پتہ چلتا ہے کہ عرب کو یورپ پر حساب میں فضیلت حاصل ہے۔ جب ہندی ہندسوں کی یورپ میں اشاعت ہوئی تو انھوں نے ان کا نام عربی ہندسے تجویز کیا کیونکہ وہ ان کو عرب ہی سے حاصل ہوئے تھے۔

نقشہ نمبر ۲

	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	
ناناغاٹی ہندسے	—	=	≡	✱		b	7		2	
	—	=	≡	4	h	6	?	4	3	
دیوناگری ہندسے	१	२	३	४	५	६	७	८	९	०
عربی مشرقی ہندسے	۱	۲	۳	۴	8	۶	۷	۸	9	۰
ہماری یا عربی مغربی ہندسے	1	2	3	4	5	6	7	8	9	0
بوتیوس کے ہندسے	I	T	[illegible]	[illegible]	۹	L	Λ	8	9	

مذکورہ بالا نقشہ میں قدیم ہندی ہندسے موجود ہیں جن سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح تدریجاً ارتقا ہوتا ہوا اس وقت تک چلا گیا جب سے عربوں نے ان کا استعمال شروع کیا پھر ان کے دور میں بھی ارتقا جاری رہا۔ اگرچہ موجودہ عربی اور یورپی ہندسوں کی شکلیں پہلے سے بہت مختلف ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اصل ایک ہی ہو گی

نقشہ نمبر ۳

اردو فارسی عربی	۱	۲	۳	۴-۴	۵-٥	۶	۷-۷	۸	۹	۰
انگریزی	1	2	3	4	5	6	7	8	9	0
موجودہ ہندی	१	२	३	४	५	६	७	८	९	०

نانا غانی ہندسے دوسری صدی قبل مسیح میں ہندوستانیوں کے یہاں رائج تھے جن سے مشابہ
وہ ہندوستانی ہندسے ہیں جو کھدائی میں دستیاب ہوئے۔ ان دونوں کی شکلیں پرانے بسیط
ہندسوں سے ملتی جلتی ہیں۔ دیوناگری ہندسوں کو پہلے دونوں پر صفر کی وجہ سے فوقیت حاصل
ہے ان کا ابتدائی سراغ آٹھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے۔ قدیم عربی یعنی مشرقی عربی ہندسے
جو دسویں صدی عیسوی کے آخر میں اصل مکتوب سے شیراز میں نقل کئے گئے موجودہ ہندسوں
سے اگرچہ مختلف ہیں مگر مناسبت پائی جاتی ہے مشرقی ہندسے ان ہندسوں سے مختلف ہیں جنکو اندلس وغیرہ بلاد
غرب کے لوگ کام میں لاتے تھے جیسا کہ غوباری ہندسے دیکھنے سے معلوم ہوگا یورپ نے بارہویں صدی عیسوی
میں غوباری ہندسے سیکھے اس لئے یورپی ہندسے آج تک غوباری یا مغربی عربی ہندسوں سے مشابہ ہیں۔

بوتھیوس پانچویں صدی عیسوی میں ایک رومی فلسفی گذرا ہے جس کی طرف نقشہ نمبر ۲
کی آخری سطر کے ہندسے منسوب ہیں ان سے یورپ والے پانچویں صدی عیسوی میں کام
لیا کرتے تھے پھر یہ فتح اسلامی سے پہلے ہی ناپید ہوگئے تھے اس کے برعکس یورپی لوگوں
کا خیال ہے کہ ہندی ہندسے (یا عربی) جو بارہویں صدی میں ظاہر ہوئے ہرگز وہ ہندسے
نہیں ہیں جو عربوں سے لئے گئے بلکہ بوتھیوس کے ناپید ہونے والے ہندسے دوبارہ دستیاب
ہوکر استعمال میں آنے لگے۔ بعض زیادہ متعصب یورپی حضرات کا خیال ہے کہ عرب و ہنود
نے یہ ہندسے ابتدا میں یورپ ہی سے لئے تھے اس قسم کے خیالات تعصب نے بعض
لوگوں کے دماغ میں پیدا کر دیئے لیکن عام طور پر یورپی مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ
یورپ میں مروج ہندسے عرب سے لئے گئے ہیں جنہوں نے ہندوستانیوں سے سیکھے

رقمیں

رقمیں اعداد سے بالکل مختلف چیز ہیں۔ ان کو نہ تو ہندسوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اور

۔ مد د حرفی میں بلکہ یہ پورے پورے الفاظ ہیں جن کی زود نویسی نے یہ شکل بنا دی مثلاً ایک
َ عربی میں "واحد" کہتے ہیں جب یہ تیزی سے خط شکست میں لکھا جائے گا تو اس کی یہ شکل
وگی (نمصہ) اس رقم (عصم) کی مشابہت خط شکست میں لکھے ہوئے "واحد" سے ظاہر ہے
س ہاتھ زیادہ تیزی کی طرف مائل ہوا تو درمیانی شوشہ غائب ہو کر یہ شکل (عصم) بن گئی جس وقت
، زائد سرعت حرکت عمل میں لائی گئی تو ابتدائی اور انتہائی سرے مل کر یہ شکل (عہ) عالم وجود میں
ی جو عام طور سے رائج ہے۔

اسی طرح دو کو عربی میں "اثنان" کہتے ہیں اس کو خط شکست میں لکھنے سے یہ شکل
یہ ہوئی (مسلہ) اور بعد میں یہ صورت (سلہ) ہو گئی۔ جب ہاتھ کی تیزی زیادہ ہوئی تو درمیانی
شوشہ غائب ہو کر یہ شکل (عہ) رہ گئی۔

مندرجہ ذیل نقشوں سے معلوم ہوگا کہ الفاظ کی کتابت میں کس طرح تغیر ہو کر موجودہ
رقموں کی شکلیں تیار ہوئیں۔

اکائیاں

	ایک	دو	تین	چار	پانچ	چھ	سات	آٹھ	نو
عربی گنتی	واحد	اثناں	ثلث	اربعہ	خمسہ	ستہ	سبعہ	ثمانیہ	تسعہ
شکستہ تحریر	وصد	مسلہ	ثلس	مسعہ	حمسہ	سسہ	سبعہ	ثمسہ	تسعہ
رقم	عسم عصم صہ	عملہ عہ	سے	للعہ	صہ	سے	سعہ	سلے	لعہ

دہائیاں

اردو گنتی	دس	گیارہ	پندرہ	بیس	پچاس	ساٹھ	ستر	اسی	نوے
عربی گنتی	عشرہ	احد عشر	خمسہ عشر	عشرین	خمسین	ستین	سبعین	ثمانین	تسعین
شکستہ تحریر	عسـہ	رہ عسـ	عسـ	عمـہ	سـہ	سعـ	سعـ	سـ	لسعـ
رقم	عـہ	رعـہ	عـہ	عمـہ	صـہ	سـہ	سعـہ	سعـہ	لعـہ

سیکڑے

اردو گنتی	سو	دوسو	پانچ سو	نوسو	ہزار				
عربی گنتی	ماۃ	مائتین	خمساۃ	تسعماۃ	الف				
شکستہ تحریر	مار	ماس	خمسار	تسعار	الفـ				
رقم	ما	مار	خمار	لعمار	الـ				

الفاظ

(عرش تیموری صاحب)

عرش صاحب نے اپنے اس مختصر مضمون میں یہ بات بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کسی ادیب یا فن کار کی صحیح تنقید محض اس کے آرٹ کی ظاہری خوبیوں کا شمار نہیں ہے بلکہ اس کی ان روحانی کیفیات کا احساس کرانا ہے جن کی بدولت وہ آرٹ معرض وجود میں آیا۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ نقاد محض جمالیاتی ڈاکٹر ہو کر رہ جائے بلکہ یہ کہ نقاد محض ظاہری خوبیوں پر ہی نہ رہ جائے بلکہ شاعر یا فن کار کے جذبات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرے۔ (مدیر)

آپ کسی مشاعرے، ادبی مجلس، کالج یونین، کانفرنس یا ہوٹل (تعلیم یافتہ ـــــ بے روزگاروں کا جواء) میں چلے جائیے! ـــــ وہاں یہ تنکے کوئی نظم یا کوئی پارہ سنا دیجیے، تو چند سر ہلائیں گے۔ چند دم بخود ہو جائیں گے۔ آپ ان سے تنقید کے طالب ہوں گے تو وہ آپ سے خالص جمالیاتی اصطلاحات میں اپنے خیال کا اظہار کریں گے ـــــ مثال کے طور پر یہ چند جملے۔

"نہایت جمیل ـــــ" "مرصع ـــــ" یا ـــــ "فصاحت سے بھری ہوئی ـــــ" واہیات وغیرہ

اگر آپ کا دماغ جدت پسند ہے تو آپ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ـــــ لا محالہ آپ سوچیں گے کہ سائنٹفک تنقید کے اس ہندوستان میں فقدان کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ہماری خالق حسن کار، ادیب و شاعر کی کاوش دل و دماغ پر غور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس تہ پارے سے حسن کار کے عقائد و خیالات کا پس منظر دیکھیں اور زندگی کو دریافت کیا جائے اور جب حسن کار کا عالم ذہن متعین ہو جائے تو پھر اس کے فکر کی بلند پروازی سے لطف اندوز ہوا جائے ـــــ اس روح شناسی کا ذریعہ یقیناً الفاظ ہیں۔

ماہرین نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ ہر لفظ کے ساتھ کچھ نفسی ایتلاف (Psychological Association) ہوتے ہیں یعنی جب ایک لفظ سامعہ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا دماغ تک پہنچتا ہے تو ایک معنی سے موسوم ہوتا ہے لیکن دماغ میں ان معنوں کے بطن سے نئے نئے نغمے پیدا ہوتے چلے

جاتے ہیں ـــــــ بسا اوقات یہ ایک اکیلا لفظ مختلف دماغوں پر مختلف اثرات ہی نہیں ڈالتا بلکہ بعض اوقات ان معنوں کا بھی عکس ڈالتا ہے جو اس کے "رواجی" اور "سادہ" معنوں کا ضد ہوتے ہیں

یہ سب بو دت واقعات شخصیت، رجحانات اور اسلوب فکر و غور کی وجہ سے ہوتا ہے -

مثال کے طور پر واقعات کو لیجیے جن کا میں نے تجربہ کیا ہے -

ساون رتیوں کی ایک سہانی رات کو جبکہ چاند آنوسے کی جالدار اور حیدری چدری شال سے جھانک رہا تھا — چند دوست چاندنی نہانے کے لئے نکلے چلتے چلتے میں نے کہا :-

دیکھو دوستو! میں ایک لفظ کہوں گا ـــــ آپ سب حضرات ایمانداری سے کہیں کہ اس لفظ کے سنتے ہی آپ کے دماغ میں کون کون سے تصور آتے ہیں ـــــ اور اس کے بعد میں نے کہا "پہاڑ" ـــــ "اونچائی" ـــــ "سیاہ" ـــــ "دگرا" ـــــ "پتی" اور کوئی لفظ نہیں آتا جوابات تھے

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ رجحانات شخصیت اور اسلوب فکر و غور کی آمیزش سے ایک ہی لفظ سے کیا کیا تصورات پیدا ہو گئے جن کی ان لفظوں سے ترجمانی ہو رہی ہے -

دوسری مثال یہ ہے کہ میرے ایک دوست تھے، جن کے سامنے اگر کسی کے منہ سے لفظ "پانی" نکل جاتا تو مارے خوف کے کانپنے لگتے تھے، یہ وہی خوف ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں WATER Complex کہتے ہیں ـــــ اس خوف کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کو کھیلتے ہی کھیلتے پانی میں ڈوبتے دیکھا تھا ـــــ اس حادثے کے اثر نے لفظ "پانی" کو ان کے لئے بھیانک بنا دیا تھا

آپ کو درسگاہوں میں بھی بہت سی دلچسپ باتیں نظر آئیں گی جیسے کوئی سبق ہو رہا ہے ـــــ اس میں کہیں کسی راجہ اور رانی کا ذکر آ جاتا ہے تو لڑکے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ اور مسکراتے ہیں

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی املا کے اختلاف معانی میں کس قدر فرق پیدا کر دیتا ہے
چنانچہ جب آئرلینڈ کا مشہور شاعر ٹی. ایس. ایلیٹ ایک نظم گینڈا لکھتا ہے تو گویا یہ گینڈا سے
جانور ہی لیتی ہے اور صرف چند آدمی جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں سمجھتے ہیں کہ گینڈے سے مراد
کیا ہے ـــــ یہاں یہ واضح رہے کہ ایلیٹ ان شاعروں میں سے ہے جو ابہام نہیں پیدا
کرتے بلکہ اپنی نظم میں شرح کو بھی پوشیدہ کر دیتے ہیں۔

یہ تمہید جو آپ کے سامنے عرض کی گئی ـــــ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان املاؤں کو نظر
رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ نظم و نثر دور حاضر اور آئندہ کے تجزیہ و تحلیل اور کسی ادیب
و شاعر کی واردات قلب و نظر جانچنے کے لئے موجودہ کتب لغات کے معانی ممد و معاون نہ ہو سکتے
ہیں۔ ہو سکیں گے۔

دوسرے ایک یہ اعتراض بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ املاآت بھی نظم و نثر کے تجزیہ و تحلیل میں
ہلاکت ناک سنگ راہ ثابت ہو رہے ہیں اور ہوں گے تو پھر کیا کیا جائے؟

جدید و آئندہ ادب نظم و نثر کے لئے تنقید کے اصول کیا ہوں؟ اور سخن فہمی کا معیار کیا ہو؟
کیا محض حسن کاری (Abstract Art) کے لئے ذہانت کافی ہے؟

ہمارے ہاں کے بڑے بڑے نقاد اور وہ جو "پڑھے لکھے" مشہور ہیں، جب کسی شاعر کے
کلام کا تجزیہ و تحلیل کرنے بیٹھتے ہیں تو سب سے پہلے ان کا ذہن "معنی" کی طرف منتقل ہوتا ہے
یہ ذیلی چیزیں ـــــ "فصاحت" ـــــ "تشبیہات" ـــــ "استعارے" ـــــ صفائی زبان
اور "اسلوب بیان" وغیرہ

حالانکہ معاف کیجئے، یہ وہ مضحکہ خیز غلطی ہے جو اردو ادب کے ناخدا ابتدا سے اب
تک برابر کرتے آ رہے ہیں

بارہ دری میں بیٹھے ہیں شستہ در بنائیں گے "والی شاعری یا "لا ہاتھ مٹھی کھول یہ چوری
میں نکلی" ختم ہو چکی۔ لیکن اب بھی نقد و تبصرے کا ڈھیر وہی ہے، جو اس "بیمار شاعری"

سے کے وجود نے پیدا کیا تھا۔

مختصر مطلب! ادبیات کا طالب علم جو عصر حاضر اور عصر مستقبل کے ادب عموماً اور شاعری خصوصاً کا مطالعہ اور تجزیہ و تحلیل کرنا چاہئے اسے اسلوب بیان، تشبیہات، صفائی زبان فصاحت اور استعارات سے آنکھیں پھیر لینی چاہئیں

اس کے دماغ میں وہی نفسی ایتلافات پیدا ہونے چاہئیں جو کلیم کے دماغ میں تخلیق کلام کے وقت ہوں گے، ان اثرات سے کمار یکتی ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جن کا جم زندگی کے واقعات، حادثات یا غیر شاعرانہ رجحانات ہوں

اسے محض عقلی و روحانی واردات ہی کو سکا در کرنا چاہئے جس کسی ادیب و شاعر یا شخص نے الفاظ، اسلوب، تشبیہات اور فصاحت و بلاغت کے پردوں کے پیچھے چھپا رکھا ہے

ہر نظم میں دو حصے ہوتے ہیں ——— ایک حصہ شخصی کہلاتا ہے اور دوسرا غیر شخصی یا عکسی۔

شخصی حصے میں کیفیات ذہن یا قلبی و روحانی واردات ہوتی ہیں اور غیر شخصی یا عکسی حصے میں لفظ بیان اور وزن وقافیہ ہوتا ہے لہٰذا تعقیدی تجزیہ و تحلیل کرنے والا کسی نظم و نثر کے عکسی حصے سے نظر و توجہ کو پھیر نہ لے وہ نظم کی اصلی روح پر حاوی نہیں ہو سکتا چنانچہ رچرڈس بھی اپنی کتاب ادبی تنقید کے اصول "Principles of Literary Criticism" میں لکھتا ہے:-

"فن کار سب سے زیادہ اس امر سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ ان واقعات کو محسوس کر کے دوام بخشے جو اس کے نزدیک بہت زیادہ لائق لطف ہیں"

بالفاظ دیگر رچرڈس کا مطلب یہ ہے کہ حسن کار واردات قلب و روح کا بڑے پیمانے پر احترام ہے سہل ممتنع حسن کاری کے تجزیہ و تحلیل کے لئے علمیت یا ذہانت کی زیادہ ضرورت نہیں بلکہ صحیح نفسی ایتلافات خود اپنے نفس میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور جب تک ادبیات کے طالب علم یا نقاد میں ایتلافات صحیح نہ پیدا ہوں گے وہ جدید ادب کی روح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

خودکُشی

(سید امرالدین صاحب شمسی)

[ایک فرانسیسی تمثیل نگار Gabriel Timmory کے ایک ڈرامہ سے ماخوذ قریب
قریب اس کا ترجمہ ہے]

افـــراد

مختار افروز — ایک تمثیل نگار

احمد داؤد — ایک افسانہ نگار

حبیب الرحمٰن حبیب

[منصوری۔ ہوٹل کا ایک کمرہ دائیں جانب غسل خانے کا دروازہ ہے۔ بائیں جانب باہر جانے کا۔
ایک طرف مسہری لگی ہوئی ہے۔ وسط میں لکھنے کی میز لگی ہے میز پر ٹیلیفون رکھا ہے۔
... (پردہ اٹھتا ہے) مختار افروز بیٹھا لکھ رہا ہے توانا آدمی ہے عمر تقریباً ۳۵ سال
ہوگی بائیں آنکھ پر ایک چشمہ ہے۔ بائیں کرسی کے پاس ایک تار رکھا ہے کھلا ہوا سوٹ کیس
پلنگ کے پاس رکھا ہے اس میں رکھا جانے والا سامان اس کے گرد پڑا ہے افروز کا ہیٹ
اور اوورکوٹ پلنگ پر پڑے ہیں]

افروز (لکھ رہا ہے) احمد — "بشیر آمنہ سے ہم تم دونوں مل کر کام نہیں کرسکتے یہ امید کہ کبھی نہ کبھی اتحاد
ضرور ہوگا بیکار ہے۔ میں بالکل ناامید ہوچکا ہوں۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟" بشیر — "میں
بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے" احمد — "لیکن تم کیا
رقم لیکر علیحدہ ہو جاؤگے،" (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے افروز ریسیور اٹھاتا ہے) ارشاد! کیا فرمایا؟
کیا نام؟ محمود؟ اوہ! — داؤد — احمد داؤد؟ جی ہاں' برائے مہربانی ان کو

یہاں جیسے دیکھیے (ریکورڈ) بیت ب اس تصویر کس قدر دام لگے گا؟ ۵۰ ہزار میری جیب
سے تو کچھ جاتا نہیں رہا (لکھتا ہے) اشیزیکا پاس ہزار احمد — بہت مانگ رہے ہو" اور دوا رہے
پریشان ہوں ہے اندر چلے آؤ۔

داؤد۔ ... ہوتا ہے کوئی چالیس سال کی عمر ہے جوش ... معلوم ہوتا ہے لباس سادہ ہے)
کھوسی افروز کیا حال ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت مجھے مصوری تک تم ہی سے
ملانے کو کھینچ لائی ہے۔

افروز لیکن مجھے پتہ تو تھا نہ میں پتہ نہیں چلا کر یہیں یہاں آگیا ہوں؛

داؤد۔ کیا پوچھتے ہو ذرا سی گڑبڑ ہوگئی لیکن بھئی میں تو اس گڑبڑ کو دعا دیتا ہوں کیونکہ
اس کی وجہ سے تم سے ملاقات ہوگئی

افروز۔ تم سے اس طرح اچانک مل کر بہت خوشی ہوئی ہے ایسی گڑبڑ روز ہو تو اچھا ہے۔

داؤد۔ بہت دنوں سے چھٹی لینے کی سوچ رہا تھا تھوڑے دن ہوئے نواب راؤ صاحب نے
یہاں آنے کے لیے سخت اصرار سے لکھا اور تنگئے کو ٹھیلنے کا بہانہ ملا میں فوراً چھٹی لے کل رات
روانہ ہوا ابھی گھنٹہ بھر ہی تو ہوا ہے کہ یہاں پہنچا ہوں۔ نواب راؤ صاحب کو تو جانتے ہو گے؟

افروز۔ ارے میاں اگر میں یہاں کسی کو جانتا ہوتا تو ہوٹل میں آکر ٹھہرتا۔

داؤد۔ واہ بھئی تم بھی کیا آدمی ہو! نواب راؤ صاحب کو نہیں جانتے؟ — بڑے پرلطف آدمی
ہیں کپڑے کا بڑا کاروبار ہے خلوص تو بہت ہے لیکن بھئی ذرا یادداشت خراب
ہے میں چونکہ ان کو اچھی طرح جانتا ہوں اس وجہ سے ان کی کسی ایسی ویسی حرکت سے
ناراض نہیں ہوتا اب ذرا اسی کو دیکھو؛ مجھے تو اس اصرار سے بلایا اور جو کمرہ میرے
لیے مخصوص کیا تھا اس میں ان کے ایک رشتے دار ٹھہرے ہوئے ہیں میں جو پہنچا تو بڑے
گھبرائے اپنی صفائی پیش کرنے لگے حسب عادت بالکل بھول گئے تھے کہ مجھے بلایا
ہے شرم سے پانی پانی ہوئے جاتے تھے میں نے کہا کہ کیا بات ہے میں ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا

افروز۔ اچھا تو آپ اس طرح وارد ہوئے؟

داؤد۔ اجی جناب کیا پوچھتے ہیں۔ ... سے تو ہوٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں وہ
تو قسمت اچھی تھی کہ منیجر صاحب وہیں کھڑے تھے انھوں نے بتایا کہ ایک گھنٹے میں افروز صاحب
جانے والے ہیں۔ اگر آپ اتنی دیر توقف کریں تو وہ کمرہ آپ کے لئے حاضر ہے ... مجھے
تبھی یہ آیا کہ تم یہاں ہو سکتے ہو میں نے ان سے تشریحاً پوچھا۔ تمھارا افروز صاحب سے
... تو نہیں۔ انھوں نے کہا جی ہاں میں نے کہا۔ اگر وہ موجود ہوں تو انھیں میرے آنے کی
اطلاع کر سکیے۔

افروز۔ خیر بھی تم خوب آئے۔ مگر یہ تم ظریفی دیکھو کہ جب میں جا رہا ہوں تو تم آئے!

داؤد۔ لیکن تم واپس کیوں جا رہے ہو؟

افروز۔ اور کروں بھی کیا؟ میرا یا ڈرامہ تمثیل ہونے والا ہے ... اور میں یہ کبھی نہیں برداشت کر سکتا
کہ اس کا خون ہو۔ تار اٹھا کر دکھاتا ہے۔ ذرا دیکھو تو! ... یہ ہے تار جو انھوں نے بھیجا ہے
... بدر سے احمد کے پارٹ کے لیے بات چیت ہو رہی ہے ... ڈرامے تمثیل کرتے
مدت گزر گئی اور یہ نہیں جانتے کہ پارٹ کیسے آدمی کو دیا چاہئے ... تم تو بدر کو جانتے ہو گا؟

داؤد۔ یوں نہیں۔ ایک وقت تا یوسف ہے ... نہایت خوبصورت

افروز۔ بس خوبصورت ہی ہے ... اور حرکتوں سے نسائیت برستی ہے!

داؤد۔ ہاں نسائیت تو ہے لیکن اس سے ایک خاص نرمی پیدا ہو گئی ہے۔

افروز۔ بس یہ نرمی ہی تو سارے ڈرامے کا ستیاناس کر دے گی ... احمد کے پارٹ کے لیے
ایسے اداکار کی ضرورت ہے جس میں کچھ شخصیت ہو۔ جو سنجیدہ پارٹ کر سکتا ہو ... جو کچھ درد
کا اظہار کر سکتا ہو ... اور وہ ایسے اداکار کو کبھی ڈھونڈ کر نہیں نکال سکتے ... جیسے ہی مجھے
ان کا تار ملا میں نے فوراً انھیں جوابی تار بھیجا کہ میں خود آ رہا ہوں ... اگر وہ احمد کا پارٹ بدر کو
دینے پر مصر ہوئے تو میں اپنا ڈرامہ واپس لے لوں گا ... ڈرامہ نویسی بھی بڑی مصیبت ہے

ذرا ذرا سی بات پر ہو کہ آرائی ہوتی ہے۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس جھنجٹ سے
دو چار ہونا نہیں پڑتا .. تم سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہ معمولی معمولی سی باتیں کس قدر پریشان کرتی ہیں

داؤد۔ خدا کا شکر ہے میں بھی ہیں ایسی علتوں سے بچا ہوا ہوں۔

افروز۔ بھئی تم خوب دماغ سے اتار کر لکھتے ہو۔ تمہارا کالم بڑا ہی عجیب ہوتا ہے

داؤد۔ اب تو مجھے اس کی لت لگ رہی ہے۔ بھئی یہ دس سال ہوئے آئے۔ روز ایک کالم لکھتا
ہوں۔ اگر اس کی مشق نہ ہوگی تو بیکار بھی ہوگی۔ سال کے سال ایک ناول لکھ لیتا ہوں
خاصی اچھی طرح گذارہ ہو جاتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ مجھے حیات ابدی تو ملنے سے رہی

افروز۔ تم خوش تو ہو؟

داؤد۔ ہاں بھئی آرام سے کٹ رہی ہے۔ قانع آدمی ہوں۔ لیکن بھئی یہ میری کیسی بدقسمتی ہے کہ
تم ابھی جا رہے ہو اور میں ابھی آیا ہوں۔

افروز۔ لیکن اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے! مجھے خود جانے کا بڑا رنج ہے۔

داؤد۔ (لکھتے ہوئے کاغذ دیکھتا ہے) تم لکھ رہے تھے؟

افروز۔ ہاں بھئی۔ یہ پیشہ ہی جو ٹھہرا! میں دوسرے ایکٹ کا اختتام لکھ رہا تھا۔

داؤد۔ اور میں آکر تمہارے کام میں مخل ہوا۔

افروز۔ جب میرا ڈرامہ تمثیل ہونے والا ہوتا ہے تو مجھے غرض کبھی سکون نہیں مل سکتا۔ آنے جانے
والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اور کبھی قسمت سے اس سے فرصت ملتی ہے تو یہ الجھن کہ
ڈرامہ کیسا تمثیل ہوتا ہے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ تمہارے آنے سے پہلے تین آدمی اور آ چکے ہیں۔

داؤد۔ لیکن میں تمہارا وقت نہیں خراب کرنے کا۔ اب راؤ صاحب کے ہاں سے اپنا سامان
لیے جا رہا ہوں میرے آنے تک تو تم یہیں ہو گے نا؟

افروز۔ بھئی دس منٹ سے زیادہ ٹھہرنا مشکل ہے۔

داؤد۔ (کمرے کو دیکھتا ہے) کمرہ برا تو ہے نہیں۔ اس کے ساتھ غسل خانہ بھی ہے؟

افروز۔ (دوسرے کی طرف اشارہ کرکے) سے! یہ ہے اس کا دروازہ

داؤد۔ ٹھیک ہے۔ اچھا اب چلتا ہوں (ہاتھ سے سلام کا اشارہ کرتا ہے اور چلا جاتا ہے)

افروز۔ (لکھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ہوں! کہاں تک لکھا تھا۔ بشیر۔ پچاس ہزار! احمد۔ "بہت مانگ رہے ہو۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوا احمد جیسی شخصیت کا آدمی کبھی نہیں چکانے کا۔

آخری سطر کی جگہ ایسا فقرہ لکھنا چاہئے جس سے ذرا جان پڑ جائے ہوں! احمد۔ تم پچاس ہزار مانگ رہے ہو میں تمہیں ستر ہزار دوں گا" میرا تو کچھ خرچ نہیں ہو رہا۔ بشیر (متحیر ہوکر) ستر ہزار! یہ تو بہت ہیں' بس ایک سطر احمد کی اور مزے داری (ایک منٹ سوچ کر) احمد۔ واحد مالک بننے کے لئے آدمی جو کچھ بھی دے تھوڑا ہے" اب ٹھیک ہے یہاں ختم کر دینا چاہیے پردہ گرتا ہے۔ (وہ دکا مد لکھنے کررہا ہوتا ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے) ارشاد! حبیب الرحمان صاحب حبیب! کبھی نیاز کا شرف نہیں ہوا اخبار کے نمائندے! آپ یہاں بھیج دیجئے۔ (ریسیور رکھتا ہوا کہتا ہے) پانچویں صاحب آئے (دروازے پر دستک ہوتی ہے) اندر تشریف لے آئیے۔

حبیب (دبلا سا جوان آدمی۔ جیسے پر دری سی ہے ساس پرانا سا ہے لیکن صاف ہے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس ہے) معاف کیجئے گا مختار افروز صاحب ہیں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔

افروز۔ اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آپ تشریف رکھیئے آپ کس اخبار کے نمائندے ہیں!

حبیب۔ افروز صاحب! حقیقت یہ ہے کہ میں کسی اخبار کا نمائندہ نہیں ہوں مجھے اتفاق سے معلوم ہوگیا کہ آپ یہاں ہیں۔ مجھے آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی مجھے علم ہے آپ کس قدر نرم دل ہیں۔ پردرد آواز میں) مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے میں تکلف سے دست بردار ہوتا ہوں مصیبت سب کچھ کرا لیتی ہے مجھے آپ کو تکلیف دینا ہی پڑی میں آداب و اخلاق کی پابندیوں کی پرواہ نہیں کر سکتا۔ میری روئداد ناکامی۔ ۔

افروز (مداخلت کرتے ہوئے اُٹھنا چاہتا ہے) مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں اور زیادہ نہیں ٹھیر سکتا ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے ابھی جانا ہے اور ۔ ۔

جلیب (رقت آواز میں) آپ سُنیں گے ۔

افروز۔ لیکن

جلیب۔ آپ کو سننی پڑے گی

افروز۔ میں آپ سے پھر عرض کرتا ہوں کہ مجھے ابھی ۔

جلیب۔ آپ پہلے یہاں بیٹھ جائیے

افروز۔ لیکن آپ غور تو کیجئے ۔

جلیب۔ (پُر درد آواز میں) تشریف تو رکھئے ! ۔ آپ کا بڑا کرم ہوگا !

افروز (بیٹھتا ہے) کہیے !

جلیب۔ میری روداد یہ ہے (بیٹھ جاتا ہے اور اپنا بکس میز پر رکھ دیتا ہے) میں لکھنؤ کے ایک معزز خاندان کا فرد ہوں ۔ لیکن فلک کینہ ساز کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتا ۔ سب ہی کو یکے بعد دیگرے اپنی گردش میں پیس ڈالتا ہے ۔۔ میرے خاندان کے بھی بُرے دن آگئے ہیں ۔۔ میرے والدین نے

افروز۔ جناب

جلیب۔ مجھے کہنے دیجئے (سلسلہ جاری رکھتا ہے) میری اوائل عمر سے ہی میرے والد نے مجھے فوج میں بھیجنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا ۔ لیکن مجھے فوج کی نوکری سے سخت نفرت ہے ۔ میں ایک صلح پسند آدمی ہوں ۔ آشتی میرا ایمان ہے ۔ میں شہرت چاہتا ہوں لیکن میری بھی آرزو یہی کہ میں ادب کی خدمت کر کے اپنا نام روشن کر دوں مجھے کامل یقین تھا کہ جلیب میر یا غالب سے پیچھے نہیں رہ سکتا ۔۔۔ لیکن یہ سب توہمات تھے ایک سراب تھا جو میرے پیش نظر تھا ایک خواب تھا جو فضا میں منتشر ہو گیا ۔

میرے والد کی رگوں میں فوجی خون ہے ۔ وہ ادب کو لغویات سے تعبیر کرتے ہیں ۔
شاعری اُن کے لیے تضیع اوقات ہے ۔ اساتذہ سے انہیں سخت نفرت ہے ۔۔
تشبیہ و استعارہ سے اُن کا دم اُلجھتا ہے ۔۔ میں نے ہمیشہ انہیں صاف بات کہتے
سنا اور وہ بھی نہایت کرخت لہجے میں ۔ اُن کے سامنے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی
کہ اُن کی مخالفت کرے ۔۔ جب میں نے فوج میں جانے سے انکار کیا تو اُن کے
غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہی ۔ انھوں نے مجھے عاق کر دیا اور قسم کھائی
کہ دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھیں گے ، وہ اپنی بات کے پکے ہیں ۔۔۔ جو بات ایک
دفعہ منہ سے نکل جائے پتھر کی لکیر ہوتی ہے

(فروز: اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اٹھتا ہے) مجھے بہت افسوس ہے لیکن چونکہ وقت ۔۔

حبیب: (بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے نہایت تند و ترش لہجے میں) بیٹھیے ۔ (فروز بیٹھ جاتا ہے) ۔
میں دو سال تک زمانے سے جد و جہد کرتا رہا ۔ بڑی کوششیں کیں کہ کہیں سر گھسانے کی
جگہ مل جائے ہر طرف ہاتھ پیر مارے مگر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا میں نے غزلیں
لکھیں جو کسی رسالے نے شائع کرنی پسند نہ کیں ۔ میں نے ڈرامے لکھے لیکن
کسی نے اُن کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا ۔ کبھی کسی اخبار نے کوئی مضمون چھاپ
بھی دیا تو اجرت اس قدر کم دی کہ لیتے شرم آتی تھی ۔ (اپنے دماغ کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) میں جانتا ہوں کہ میرے پاس کوئی معمولی دماغ نہیں ۔۔ مجھ میں جوہر
ہیں لیکن اُن کا انکشاف ہو تو کیونکر ہو جب کہ سب شائع کرنے والوں نے مل کر قسم
کھائی ہے کہ میرے قلم سے نکلا ہوا ایک حرف بھی نہیں چھاپا جائے گا ! ۔۔ آپ مجھے
اجازت دیں تو اپنی ایک آدھ غزل

فروز ۔ وقت بہت ہو گیا ۔ ۔

حبیب ۔ میں اصرار نہیں کرتا ۔ ۔ میں دراصل سنانا بھی نہیں چاہتا کیونکہ اگر آپ نے کچھ بھی سن لیا

تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ کس ہیرے کو پاش پاش کیا جا رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ ایسا ایک لفظ بھی ہمدردی کا استعمال کریں (ایک ٹھنڈا سانس لیتا ہے اور کہانی جاری رکھتا ہے) جو کچھ بھی تھوڑی بہت رقم میرے پاس تھی سب خرچ ہو گئی۔ میں پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا۔ آ... ی کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی آخر خودداری کا خون کر کے یہاں اپنے ماموں زاد بھائی کے پاس آیا کہ اگر دو ہفتے مجھے اپنے ہاں رکھ لیں تو میں اس اثنا میں ایک ڈرامہ یا ناول لکھ لوں یہ میری آخری کوشش ہوتی مجھے بڑی قوی اُمید تھی کہ میری یہ کوشش ضرور بارآور ہو گی میں نے ڈیڑھ دو دن تک تیسرے درجہ میں سفر کیا میرے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ ریل کا ٹکٹ خرید لیتا۔ ڈیڑھ دو دن سے یہاں تک پیدل آیا۔ تو یہاں قدرت نے ایک نیا گُل کھلایا۔ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا اپنے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔۔ مجھے دروازے کے اندر بھی نہیں گھسنے دیا میری اس قدر تحقیر۔ مجھ میں اب برداشت باقی نہیں کل دوپہر سے اب تک ایک روٹی بھی کھانے کو نہیں ملی۔ (گھڑا ہو جاتا ہے اور دیوانہ وار کہتا ہے)۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میرا کیا حشر ہو گا؟ (یہ دیکھ کر کہ افروز نے اپنے بٹوے میں سے ایک روپیہ نکالا ہے) آپ کیا کرتے ہیں؟

افروز۔ (روپیہ پیش کرتا ہے) چونکہ آپ اس قدر تنگ حال ہیں

حبیب (ترش سی ہنسی ہنستے ہوئے) جی! آپ مجھے ایک روپیہ پیش کرتے ہیں؟

افروز۔ لیکن۔

حبیب۔ ایک روپیہ! مجھے! حبیب کو! جیسے کہ میں خیرات مانگنے آیا ہوں؟

افروز۔ لیکن میرا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ آپ کے جذبات کو ٹھیس لگاؤں

حبیب۔ جی ہاں! اسی کا نام تہذیب ہے؟۔۔ یہی شرافت ہے؟۔۔ اسی طرح سے ایک ادیب سے پیش آیا جاتا ہے؟ اس کی مصیبتیں سن کر اس کو بھیک دی جاتی ہے؟۔۔
نہیں، نہیں! اب تحقیر کی اور گنجائش نہیں رہی رسوائی کی بھی حد ہوتی ہے۔
(اپنے بکس میں سے ریوالور نکالتا ہے)

فروز۔ (خوف زدہ ہو کر) تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ (ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

حبیب۔ ہاتھ نہ بڑھے۔

فروز۔ (ساکن ہو جاتا ہے) لیکن جناب

حبیب میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا یا کسی کو مدد کو لئے بلانا چاہا تو میں آپ کو نشانہ بنا دونگا۔۔۔ سمجھے آپ!

فروز۔ لیکن آخر یہ حرکت کیا ہے؟

حبیب۔ کیا ہے؟ میں آپ کو ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے لیکن پستول کی نالی فرور کے سینے کی طرف ہی رہتی ہے حبیب دروازے کا کھٹکا لگا دیتا ہے) آپ گھبرائیے نہیں آپ کو یہی تشویش ہے نا کہ آیا میں آپ کو قتل کرنے آیا ہوں یا آپ سے کچھ چھیننے آیا ہوں آپ خاطر جمع رکھیے۔ آپ کسی قسم کے خطرے میں نہیں ہیں شکار ہونے والا ہے، لیکن شکاری اور شکار مختلف ہیں

فروز۔ (ڈر رہا ہے) تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟

حبیب۔ اسی لئے

فروز۔ (ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے) لیکن میں آپ کو یہاں خودکشی نہیں کرنے دیے گا!

حبیب (افرور کا نشانہ باندھتے ہوئے) حرکت نہ کیجئے۔ اس گھڑی میں سب کچھ کر گزروں گا۔ کوئی ایسی حرکت نہیں جو مجھ سے بعید نہیں اگر آپ نے حرکت کی تو گولی آپ کے سینے کے پار ہو جائے گی

افروز۔ میرے پاس کیا آپ خودکشی کی ہی غرض سے آئے تھے؟

جلیب۔ ہوں (گردن ہلاتا ہے)

افروز کیا خودکشی کرنے کے لئے یہی جگہ رہ گئی تھی؟

جلیب۔ میری ایک ہی آرزو تھی! ... شہرت! میں نے اُس کے لئے دن رات کام کیا! خون پانی ایک کر دیا ... اس ہی کی وجہ سے بڑی بڑی رسوائیاں برداشت کیں ...۔ میری سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ..... مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا ... اعضا نے ہمت ہار دی ... پیروں نے جواب دے دیا تھا دھار روشنی کی کرن نظر آئی۔ میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا آپ کے سامنے خودکشی کرکے مجھ حقیر کو آپ جیسے ماہر ڈرامہ نویس کی شہرت سے فیض حاصل ہو جائے گا ... انجم کو سورج سے روشنی مل جائے گی۔ ... گُل کو حُسن سے زینت ... ممکن ہے میری خودکشی آپ کو ایک نئے ڈرامہ کا مواد فراہم کر دے ... عوام کو جو کہ میرے نام سے بھی آشنا نہیں مجھ سے دلچسپی ہوگی ... میرے حالات کے معلوم کرنے کا اشتیاق ہوگا اور اخبار والے خوب حاشیے چڑھا کر میری زندگی کے حالات لکھیں گے۔

افروز۔ لیکن سوچیے تو آپ اس کے لئے کس قدر بڑی قیمت دے رہے ہیں!

جلیب۔ شہرت جس قیمت پر بھی خریدی جائے سستی ہے ... میں گمنامی سے نجات پاؤنگا۔

افروز۔ جب آپ ہی نہ ہوں گے تو آپ کو اس شہرت سے کیا حاصل!

جلیب۔ شہرت کا خیال ہی میرے لئے بڑی خوشی ہے ..... میں اطمینان کے ساتھ جان دوں گا ... مجھے یقین ہے کہ میری موت رائگاں نہیں جائے گی جس چیز کو میں زندگی میں نہیں پا سکا موت مجھے اس تک پہنچا دے گی۔ آج لوگوں میں میرا چرچا ہوگا ... کل میرے رد کئے ہوئے مسودے پڑھے جائیں گے۔ ... پرسوں

انہیں شائع کیا جائے گا ۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے قلم میں جوہر ہیں ۔۔ بہت ممکن ہے کہ نقاد مجھے اُستاد کے نام سے ممتاز کر دیں مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں واقعی اُستاد بنا دیا گیا ۔۔ (ریوالور کی نالی کنپٹی سے لگاتے ہوئے) اس کی آواز آپ کو ناگوار تو نہیں ہوگی ؟

فروز ۔ (جلدی سے) ٹھیریئے !

حبیب ۔ کیوں ؟

فروز ۔ آپ ہی تو اپنی زندگی کے مالک نہیں !

حبیب ۔ میں نہیں تو پھر کون ہے ؟

فروز ۔ آپ کو عزیز و اقارب کا بھی تو خیال ہونا چاہیئے !

حبیب کس کا ؟ عزیز و اقارب کا ؟ مصیبت زدہ کا عزیز کون ہوا ہے ! ۔۔ اقارب باپ جس نے عاق کر دیا ۔۔ رشتے دار ۔۔ جو اس کے بھی روادار نہیں کہ میں اُن کی دہلیز میں قدم بھی رکھوں ! ۔۔ بیوی میرے نہیں ! بچے میرے نہیں ۔۔ میں اپنی زندگی کا واحد مالک ہوں ۔۔ میں جو چاہوں کروں !

افروز ۔ جوانی میں خودکشی ؟

حبیب ۔ جوانی ؟ ۔۔ رنج و مصائب نے مجھے ضعیف کر دیا ہے !

افروز ۔ یہ خام خیالی ہے ۔ آپ جوان ہیں تندرست ہیں آپ کو کوئی عارضہ نہیں !

حبیب ۔ مجھے عارضہ ناکامی ہے !

افروز اس کا علاج ہو سکتا ہے !

حبیب ۔ مرض لاعلاج ہو چکا ہے !

افروز ۔ صرف ہمت اور قوتِ ارادی درکار ہے

حبیب ۔ اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا !

افروز - میرے پاس کیا آپ خودکشی کی ہی غرض سے آئے تھے؟
جلیب - ہوں (گردن ہلاتا ہے)
افروز کیا خودکشی کرنے کے لیے یہی جگہ رہ گئی تھی؟
جلیب - میری ایک ہی آرزو تھی، شہرت! میں نے اُس کے لئے دن رات کام کیا! خون پانی ایک کر دیا ... اس ہی کی وجہ سے بڑی بڑی رسوائیاں برداشت کیں ... میری سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ... مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا ... اعضا نے ہمت ہار دی پیروں نے جواب دے دیا تھا دفعتاً رہی کی کرن نظر آئی ... میں اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا آپ کے سامنے خودکشی کر کے مجھ حقیر کو آپ جیسے ماہر ڈرامہ نویس کی شہرت سے فیض حاصل ہو جائے گا انجم کو سورج سے روشنی مل جائے گی گُل کو حُسن سے زینت ممکن ہے میری خودکشی آپ کو ایک نئے ڈرامہ کا مواد فراہم کر دے عوام کو جو کہ میرے نام سے بھی آشنا نہیں مجھ سے دلچسپی ہوگی، میرے حالات کے معلوم کرنے کا اشتیاق ہوگا اور اخبار والے خوب حاشیے چڑھا کر میری زندگی کے حالات لکھیں گے۔
افروز - لیکن سوچئے تو آپ اس کے لئے کس قدر بڑی قیمت دے رہے ہیں؟
جلیب - شہرت جس قیمت پر بھی خریدی جائے سستی ہے۔ میں گمنامی سے نجات پاؤں گا۔
افروز - جب آپ ہی نہ ہوں گے تو آپ کو اس شہرت سے کیا حاصل!
جلیب - شہرت کا خیال ہی میرے لئے بڑی خوشی ہے ..... میں اطمینان کے ساتھ جان دوں گا مجھے یقین ہے کہ میری موت رائگاں نہیں جائے گی جس چیز کو میں زندگی میں نہیں پا سکا موت مجھے اس تک پہنچا دے گی آج لوگوں میں میرا چرچا ہوگا کل میرے رد کئے ہوئے مسودے پڑھے جائیں گے ... پرسوں

ابھیں شائع کیا جائے گا ... مجھے معلوم ہے کہ میرے قلم میں جوہر ہیں ... بہت ممکن ہے کہ نقاد مجھے اُستاد کے نام سے ممتاز کر دیں مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں واقعی اُستاد بنا دیا گیا (ریوالور کی مالی کنپٹی سے لگاتے ہوئے) اس کی آواز آپ کو ناگوار تو نہیں ہوگی؟

افروز۔ (جلدی سے) ٹھیرئیے!

جیب۔ کیوں؟

افروز۔ آپ ہی تو اپنی زندگی کے مالک نہیں!

جیب۔ میں نہیں تو پھر کون ہے؟

افروز۔ آپ کو عزیز و اقارب کا بھی تو خیال ہونا چاہیئے!

جیب۔ کس کا؟ عزیز و اقارب کا؟ مصیبت زدہ کا عزیز کون ہوا ہے! ... اقارب ... باپ جس نے عاق کر دیا ... رشتے دار ... جو اس کے بھی روادار نہیں کہ میں اُن کی دہلیز میں قدم بھی رکھوں! ... بیوی میرے نہیں! ... بچے میرے نہیں ... میں اپنی زندگی کا واحد مالک ہوں ... میں جو چاہوں کروں!

افروز۔ جوانی میں خودکشی؟

جیب۔ جوانی؟ ... رنج و مصائب نے مجھے ضعیف کر دیا ہے!

افروز۔ یہ خام خیالی ہے ... آپ جوان ہیں تندرست ہیں ... آپ کو کوئی عارضہ نہیں!

جیب۔ مجھے عارضہ ناکامی ہے!

افروز۔ اس کا علاج ہو سکتا ہے!

جیب۔ مرض لاعلاج ہو چکا ہے!

افروز۔ صرف ہمت اور قوتِ ارادی درکار ہے

جیب۔ اس سے بھی افاقہ نہیں ہوا!

افروز۔ آپ ہمت نہ ہاریے، وہ چار ہاتھ اور رہ گئے میں

حبیب۔ کیوں؟ کیا میں اپنی قسم توڑ دیں گے؟

افروز مستقبل سے ناامید نہ ہو کیا ہے جو ممکن نہیں!

حبیب مستقبل! (ہنستا ہے) مستقبل تو بہت بڑی مدت ہے مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ رات کیا گزرے گی

افروز اگر میں کسی طرح مدد کرنا چاہوں تو آپ گوارا نہیں کریں گے؟

حبیب (خودداری کے ساتھ) میں بھکاری نہیں ہوں، میں فیصلہ کر چکا ہوں (پستول دکھاتا۔ یہ ہے میری نجات کی کلید (اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتا ہے) کس قدر دلچسپ چیز ہے ۔ دیکھنے میں بالکل بے ضرر ہے ایک کھلونا سا معلوم ہوتا ہے جیب میں ڈال لو تو ذرا سی جگہ میں آ جاتا ہے لیکن مصیبت میں بڑا کام آتا ہے گھوڑے کو ذرا دبایا گولی اور کرۂ دنیا سے ایک فرد کم ہو گیا ایک فرد جس کے دل بھی تھا دماغ میں نئے نئے خیالات بھی تھے جذبات تھے زبان بھی حرکت کرتا تھا جس میں انسانیت کا نفس تھا، یک دم زدن میں عدم کا مکین ہو گیا کس قدر حیرت انگیز

افروز۔ واقعی!

حبیب۔ ذرا اس کی حسن ساخت ملاحظہ کیجیے کس قدر پاکیزہ سا ہوا ہے (افروز کو دکھاتا ہے)

افروز (اٹھاتا ہوا) ... ہاتھ بڑھاتا ہے، ذرا دکھائیے!

حبیب (جلدی سے افروز کا نشانہ باندھ کر) خیال رکھیے آپ کیا کر رہے ہیں (افروز بیٹھ جاتا ہے) آپ قریب آنے کی کوشش نہ کیجیے گا (دوبارہ پستول کو ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے) بعض اس سے بھی زیادہ سادہ ہوتے ہیں لیکن وہ اس قدر اچھا کام نہیں کرتے اکثر گھوڑا اٹک جاتا ہے بعض بہت آواز کرتے ہیں لیکن یہ تو نمونہ ہے قابل ستائش بیک وقت سات گولیاں آ جاتی ہیں اور پرزے اس قدر اچھی طرح جمائے ہیں کہ ایک اشارے پر گھوڑا کام کرتا ہے ۔ آواز بھی بہت

کم ہوتی ہے جیسے چٹکی بجی اس کا تناسب ملاحظہ ہو نالی کس قدر موزوں ہے
دستہ گرفت میں کس قدر اچھی طرح بیٹھتا ہے یہ قیمتی ہتھیار مجھ غریب کے پاس کیسے آگیا۔
آپ بھی سوچ رہے ہیں نا ایک دفعہ اتفاق سے میرے پاس ڈھائی سو روپے آگئے تھے
میرے لیے تو دولت تھے وہ سب میں نے اس سے وقتی میں ضائع کر دیے لیکن اسے مجھے
اس کا افسوس مطلق نہیں ہے دراصل ایسے ہتھیار کا رکھنا تو آپ کو زیب دیتا ہے آپ
صاحب دولت ہیں آپ کو اپنی حفاظت کی بھی ضرورت ہے آپ کے تو اکثر کام آتا لیکن
میں صرف اس سے ایک ہی بار فائدہ اٹھا سکتا ہوں البتہ یہ میری وصیت ہے کہ اس
ریوالور کو میرے بعد آپ لے لیں باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی قضا انتظار کر رہی ہے
پستول کا گھوڑا چڑھاتا ہے) ذرا سی آواز ہو گی۔ گھبرائیے نہیں! (نالی کنپٹی سے لگاتا ہے)

فروز۔ بے اختیاری سے) ٹھہریئے!

حبیب کیا ہے:

افروز آپ ہی نے تو مجھے یہ سمجھائی ہے میری ایک تجویز۔ لیکن آپ برا نہ مانیے گا
آپ کے جذبات کا احساس ہے۔ میں آپ کی خودداری کا احترام کرتا ہوں میں آپ کا بہت
ممنون ہوں واقعی میں بہت لاپرواہ ہوں خبر نہیں کس رات کیا پیش آئے میرے پاس کوئی بچاؤ
کا ہتھیار نہیں آپ اس ریوالور کی بہت تعریف کرتے ہیں تو کیوں نہ میں آپ ہی سے ریوالور خرید لوں
میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ جس قیمت پر آپ نے خریدا ہے میں اتنی ہی رقم آپ کو دے دیتا
ہوں میں آپ کو آپ کی خرید سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں دوں گا۔ کبھی آپ یہ سمجھیں کہ میں آپ کے
پردے میں خیرات دیتا ہوں یہ تو ایک سودا ہے اس میں تو آپ کے احساسات مجروح نہ ہونے چاہئیں

حبیب (ذہنی کش مکش کے بعد) اس کا تو مجھے اعتراف ہے کہ یہ رقم اس وقت میرے بہت کام آئے گی۔

افروز۔ کیوں نہ کام آئے گی؟

حبیب لیکن چند روز بعد—

فروز۔ لیکن چند روز کے لئے تو بندوبست کی ضرورت ہے! صرف چند روز! بدقسمتی کی بھی حد
ہوتی ہے ہم یہ دیکھتے آئے ہیں کہ خوش قسمتی کے عروج کی ایک حد ہوتی ہے اور پھر دفعتاً تنزل شروع
ہو جاتا ہے ز فطرت ہی میں اس کا عمل دیکھئے تخم بوتا ہے پتے نکلتے ہیں پودا بڑھتا جاتا
ہے کلی آتی ہے پھول کھلتا ہے یہ عروج کی انتہا ہوتی ہے ۔ اس کے بعد زوال
کا دور شروع ہو جاتا ہے آپ تو شاعر ہیں آپ کی نظر سے یہ کب نہاں ہو سکتا ہے۔ آپ
اس ہی کو دیکھئے بچپن سے جوانی تک عروج ہے جوانی کے بعد زوال ۔ جو اصول خوش
قسمتی پہ پورا اترتا ہے ضروری ہے کہ وہ اس کی ضد یعنی بدقسمتی پر بھی پورا اترے ۔ آپ بار مصیبتوں
کی انتہا ہو چکی ہے اب بدقسمتی کا دور ختم ہونے آیا قسمت رخ پلٹے گی۔

(باقی آئندہ)

رازِ رازدان

(حضرت نشتر سندیلوی)

رنگ و بوئے گلستاں کو جاوداں سمجھا ہے تو — حیف! اس حد نظر کو آسماں سمجھا ہے تو

وہ چمن ہی ہے حقیقت میں قفس اندر قفس — جس چمن کو آشیان در آشیاں سمجھا ہے تو

ن رہوا ئے گا اس رنگیں نگاہی کا فریب — پرتو رنگ شفق کو گلستاں سمجھا ہے تو!

ے نگاہوں کے لئے دھوکا سراب انقلاب — ریگ کے صحرا کو دریائے رواں سمجھا ہے تو

کیا ہے یہ دور جہاں تیرا سکوں تیرا جمود — بے حسی کو گردشِ دورِ جہاں سمجھا ہے تو

رِ خطر وادی سے لازم ہے گزر مردانہ وار — خارزار زندگی کو گلستاں سمجھا ہے تو

ہے ترقی کی بنا دنیا میں قوموں کا زوال — ہے وہ بیداری جسے خواب گراں سمجھا ہے تو!

ک سلسل بے قراری، ہے تپش زارِ حیات — اضطراب دل کو سعیٔ رائگاں سمجھا ہے تو

مہر ... روں کو بھی تیری خاک کے ذروں پہ رشک — اپنی ہستی کی حقیقت کو کساں سمجھا ہے تو؟

کا ... ن کے عناصر جوشش و احساس و عمل — زندگی کی شوخیوں کو بجلیاں سمجھا ہے تو

توں میں جس کے، دریچے وا ہیں نہ افلاک کے — ہے وہ نغمہ جس کو انداز فغاں سمجھا ہے تو

نشتر ہے خاک ذروں میں رازِ زندگی
یہ اگر سمجھا تو رازِ رازداں سمجھا ہے تو

بگولہ

(جاں نثار اختر، ایم۔ اے علیگ)

دن کا تپتا بھنتا، تمتماتا آفتاب
ڈھل چکا ہے، بن کے سانچے میں جہنم کا شباب

دوپہر کی آتشیں پامال رسائی ہوئی
سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی

وہ جھلستی گھاس، وہ دبلی ندیاں پامال سی
نہر کے لب خشک سے، ذروں کی آنکھیں لال سی

چلچلاتی دھوپ میں میدان کا چڑھتا بخار
آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار

دیکھ وہ میداں میں ہے اک بگولہ بے قرار
آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار

چاک پر جیسے بنائے جا رہے ہوں زلزلے
یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے

ڈھالنا چاہے زمیں جس طرح کوئی آسماں
جیسے چکر کھا کے نکلے توپ کے منہ سے دھواں

مل رہا ہو جس طرح جوشِ بغاوت کو فراغ
جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دماغ

جگمگیں ابرو پہ ڈالے خاک آلودہ نقاب
جنگلوں کی راہ سے آئے سفیرِ انقلاب

یوں بگولے میں ہیں تپتے سرخ ذرے بے قرار
جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرار

کس قدر آزاد ہے یہ روحِ صحرا یہ بھی دیکھ
کس طرح ذروں میں ہے طوفان برپا یہ بھی دیکھ

اٹھ بگولے کی طرح میدان میں گاتا نکل
زندگی کا خون ہر ذرے میں دوڑاتا نکل

رفتار زمانہ

ائی شروع ہوئی تو اس کا بالکل گمان نہ تھا کہ وہ واقعی بڑی شدت کے ساتھ ہوگی خصوصاً
ادی عام اطمینان تھا اور جب یہ خبر آتی تھی کہ آج کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں پیش آیا تو
ہم سمجھتے تھے کہ ادھر سے ایسی ہی خبریں آتی رہیں گی اور خدا کے فضل سے لڑائی ختم ہو جائے
ی فہمیاں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ برطانوی ہواباز جرمنی کی بالائی فضا میں چہل قدمی کرتے تھے
یں جرمنوں کو ایسے ہینڈ بل پڑھنے کو دے آتے تھے کہ جس سے اس کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ
پنے رہنماؤں کی گمراہی سے آگاہ ہو جاتی لیکن جرمن فوج ان کی روک تھام نہ کرتی پھر ہر ہٹلر
ے ناروے پر حملہ کیا اور اتحادیوں کی جو فوج وہاں بھیجی گئی اسے خاصی بے آبروئی سے واپس ہونا
ڑا۔ عام خیال ہوا کہ یہ شکست مسٹر چیمبرلین کی بے پروائی اور بدانتظامی کے سبب سے ہوئی
کہ وہ چاہتے تو ایسا سخت مقابلہ کر سکتے تھے کہ ہٹلر کو اپنی ظالمانہ حرکت پر بڑی پشیمانی ہوتی
ارلیمنٹ میں اس ناکامیابی پر بڑی لے دے ہوئی۔ مسٹر چیمبرلین کو وزارت سے استعفیٰ دینا پڑا، اور
سٹر چرچل کی سرکردگی میں ایک نئی وزارت شروع ہوئی۔ یہی وزارت صحیح معنوں میں قومی تھی
تینوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے اور اس نے بہت جلد ایک قانون منظور کرا لیا جس کی بدولت
حکومت کے اختیارات بہت بڑھ گئے اور اس کا یقین ہو گیا کہ انتظام میں کوئی سستی اور
شمن کا مقابلہ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگی، اسی دوران میں ہر ہٹلر نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ
یا اور جمہوریت کے شیدائیوں اور اتحادیوں کے ہمدردوں کو امید ہوئی کہ جو سزا جرمن
فوجوں کو ناروے میں نہ دی جا سکی تھی وہ اس میدان میں دل کھول کر دی جائے گی

ہر ہٹلر نے جنگ کے شروع میں یہ دھمکی دی تھی کہ ان کے ترکش میں بہت سے تیر ہیں، اور
نہیں یہ خیال تھا کہ اب جو اتحادیوں سے جم کر مقابلہ ہوگا تو وہ انہیں تیروں کے زور سے اتحادیوں

کو عاجز کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بلٹز کریگ (Blitz Krieg) کے جانے
بوجھے طریقے کے سوا، کچھ دیکھنے میں نہیں آیا، یعنی جرمن فوج نے پہلے ہوائی جہازوں اور
ٹینکوں سے حملہ کیا۔ اس کے پیچھے لاریوں اور موٹروں پر سپاہی بھیجے اور جہاں تک ٹینک
پہنچے تھے وہاں پر محاذ قائم کر لیا۔ جرمنوں کا سارا بھروسا اس پر تھا کہ ان کے حملے اتنے سخت
ہوں گے کہ اتحادی فوجیں انہیں روک نہ سکیں گی، اور یہ حملے اس قدر جلد جلد ہوں گے کہ ایک
دشمن یا مورچے کے ادھر ادھر اتحادی فوجوں کو کہیں قدم جمانے کا موقعہ نہ ملے گا۔ محاذ اتنا بڑا
تھا۔ اگر حملہ کسی ایک جگہ روک لیا جاتا تو بھی کچھ کام نہ بنتا، اس لیے کہ جرمن فوج کی رفتار بہت
تیز تھی، اور اگر وہ کسی ایک جگہ بھی حملے میں کامیاب ہوتی تو پوری اتحادی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑتا
ورنہ اس کا اندیشہ تھا کہ جرمن فوج پشت مارے گی اور اسے گھیرے گی۔ افسوس ہے کہ جرمن
لشکر کشی کی یہ ایک تدبیر ایسی کارگر ہوئی ہے کہ جرمن فوج میدان پر میدان جیتتی رہی ہے اور
اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں پہنچ کر بس کرے گی۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جرمنی کا فرانس پر حملہ فون شلیفن کی تجویز کے مطابق ہوا تھا
اس تجویز کی کامیابی کا دارومدار اس پر تھا کہ جرمن فوج کئی حصوں میں بلجیم سے گذر کر پیرس تک
پہنچے، اور اسے چاروں طرف سے گھیرے۔ خیال تھا کہ حملے کی تیزی اور دارالسلطنت کے محاصرے
کا نتیجہ ہوگا کہ فرانس میں مقابلہ کی ہمت نہیں رہے گی اور وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ بلجیم نے خلاف
توقع بڑا سخت مقابلہ کیا۔ فون شلیفن کی تجویز پر عمل کرنے میں غلطیاں ہوئیں اس لئے جرمن فوج
کو پیرس کے سامنے سے پسپا ہونا پڑا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات تھی کہ بلجیم کا شمالی حصہ
جس میں اینٹ ورپ کا قلعہ ہے اور فرانس کا شمالی ساحل جرمن فوج کے قبضے میں نہیں آیا،
انگریز آزادی کے ساتھ فوج اور جنگ کا سامان محاذ تک پہنچاتے رہے اور جنگ بالکل ردّی
کا کھیل ہو گئی۔ اس مرتبہ جرمنی نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پورے ہالینڈ اور بلجیم پر اور
فرانس کی تقریباً تمام شمالی بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا ہے اس کی وجہ سے انگریزوں کو فرانسیسیوں

ی مدد کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، فرانس ان سے مدد کی التجا کرتا رہا اور وہ بس چند ہزار سپاہی بھیج سکے۔

فلانڈرز کی ہولناک جنگ کا سارا حال مسٹر چرچل بڑی سچائی اور وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں، یعنی یہ کہ، امئی کو جرمن فوج نے سیڈان کے سامنے فرانسیسی سرحد کو پار کیا، پھر شمال کی سمت میں ملک کے اندر گھستی چلی گئی، اور چونکہ فرانسیسی دریائے سوم اور دریائے آئن کو پانی دینے پر مجبور ہو گئے تھے، دریائے سوم سے بلجیم تک جرمن فوج آزادی کے ساتھ بڑھ سکتی تھی، فرانسیسیوں کو ان کے محاذ پر مصروف رکھنے کے انتظام کرکے اس جرمن فوج نے اس اتحادی فوج کو جو بلجیم کی سرحد کے پاس لڑ رہی تھی گھیر لیا۔ یہ فوج لڑتی ہوئی ڈنکرک کی بندرگاہوں کی طرف پسپا ہوئی اور یہاں سے اس کو ہر طرح کے جہازوں اور کشتیوں پر سوار کرکے انگلستان پہنچایا گیا کوئی اور معمولی ہمت اور ڈسپلن رکھنے والی فوج اس طرح سے گھر جاتی تو ایسی بھگدڑ مچتی کہ لاکھوں سپاہی مارے جاتے، انگریزی فوج بڑے قاعدے سے پیچھے ہٹی لیکن صورت کچھ ایسی تھی کہ سپاہیوں کی جانیں بچانے کے سوا اور کچھ ممکن نہ تھا اور اسے اپنا پورا جنگ کا سامان دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔

جرمن سپہ سالاروں نے اس کامیابی سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ڈنکرک کی بندرگاہ سے آخری اتحادی سپاہی نکلنے نہیں پائے تھے کہ ۶ جون کو جرمن فوج اس محاذ پر ٹوٹ پڑی جو فرانسیسی جنرل ویگاں نے دریائے سوم اور دریائے آئن کا سہارا لے کر قائم کیا تھا۔ بلجیم اور فلانڈرز میں اتحادی فوج کی پسپائی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کے اور دشمن کے سازوسامان میں کوئی نسبت نہ تھی، وہ نہ جرمن ہوائی جہازوں کا ایسے جہازوں سے مقابلہ کر سکتی تھی نہ ٹینکوں کا اپنے ٹینکوں سے، اور دشمن کے پاس حرب کے تمام آلات بے حساب تھے، مفلسی میں آٹا گیلا ہوا کہ انگریزوں نے جو کچھ توپیں، بندوقیں اور ٹینک بلجیم کو بھیجے تھے وہ سب ہاتھ سے گئے۔ فرانسیسیوں کا اس نئے محاذ پر قدم جمانے رہنا یوں بھی مشکل

تھا جرمن فوج نے جب چار ہزار ٹینکوں اور نہ جانے کتنے ہزار ہوائی جہازوں سے مسلسل حملے
شروع کئے تو سمجھئے فرانسیسیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔

کہا تو یہ جاتا ہے کہ فرانسیسی فوج بڑی بہادری سے لڑی اور فرانسیسی تاریخ اس
کی گواہ ہے کہ لڑنے اور جان دینے میں فرانسیسی کسی سے کم نہیں۔ اتحادیوں کی ہمت اس
سے بندھی رہی کہ محاذ پر کہیں نہ کہیں وہ جرمن کو سخت نقصان پہنچا دیتے تھے، لیکن جرمن فوج
کہیں کہیں ان کے محاذ کو توڑ بھی دیتی تھی۔ ۱۰ جون کو اٹلی نے فرانس اور برطانیہ کے خلاف
اعلان جنگ کر دیا اور چونکہ سینور مسولینی ایسے آدمی نہیں ہیں کہ اپنی فوج کی ہمت اور استعداد
کو خواہ مخواہ آزمائیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرانسیسی محاذ پر جو جنگ ہو رہی تھی اس کا چار پانچ دن
کے اندر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا محض اتمام حجت تھا، اس میں بھی بس ایک ہفتہ
لگا، جرمن فوج ۱۴ جون کو پیرس پہنچ گئی اس کا بایاں بازو جس نے دریائے آئن کی طرف حملہ
کیا تھا، اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ماژی نو لائن قریب قریب گھر گئی، چونکہ مقابلے کا امکان
نہیں رہا تھا، فرانس کے وزیر اعظم موسیو رینو نے ۱۶ جون کو استعفیٰ دے دیا، ان کی جگہ مارشل
پے تیں وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے جرمنی سے صلح کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ وقتی صلح
جرمنی کی بھاری شرطوں پر ہو گئی ہے لیکن انگریز ابھی فرانس کو لڑائی جاری رکھنے کے لئے ابھا
رہے ہیں۔

مستقل صلح کی شرطیں کیا ہوں گی یہ ابھی تک (یعنی ۲۰ جون کو) نہیں معلوم ہے۔ اٹلی نے تو پہلے
ہی سے جنوبی فرانس کے اس ساحلی علاقے کا جس میں نیس کا مشہور شہر واقع ہے اور جو فر
ریویرا کہلاتا ہے اور اس کے علاوہ کورسکا اور فرانس کی تمام افریقی نوآبادیوں کا مطا
کیا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں ہے کہ ہر ہٹلر یہ سب اٹلی کو دلوا دیں گے۔ ہر ہٹلر خود غالباً
السا س لورین کا مطالبہ کریں گے۔ مگر اس سے کہیں زیادہ اہم یہ مطالبہ ہو گا کہ فرانس ک
خارجی سیاست جرمنی کے صلاح مشورے کے مطابق ہو، اور ری اسکال فرانس کا شما

ساحل جرمنی کے قبضے میں رہے۔ ممکن ہے ہر ہٹلر نقد روپیہ بھی مانگیں اور فرانس نے جو سونا حفاظت کے لئے حال ہی میں امریکہ بھجوایا تھا اسے واپس منگوانا پڑے۔ فرانس کا شمالی بیڑا امید ہے کہ برطانیہ کے قبضے میں آجائے گا اور ممکن ہے بہت سے ہوائی جہاز اڑ کر انگلستان بھاگ جائیں، بحر روم میں فرانس کا جو بیڑا ہے اس کو سینور مسولینی دلوچ لیں تو کچھ تعجب نہیں۔ فرانس کو کم سے کم جو نقصان ہوگا وہ یہ کہ اب وہ یورپ کی مقتدر ریاستوں میں شمار ہونے کے قابل نہ رہے گا، اور اس کی سیاسی حیثیت ویسی ہی ہو جائے گی جیسے کہ جنگ سے پہلے ناروے اور سویڈن کی تھی یا اس وقت یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی ہے اس کی تہذیبی حیثیت بعض سمجھتے ہیں کہ مٹ نہیں سکتی بعض کہتے ہیں کہ اس سے بہت پہلے ہی مٹ چکی تھی۔

اٹلی کے جنگ میں شریک ہونے سے برطانیہ کی وہ فوج جو مشرقی افریقہ اور مصر میں تھی مصروف ہو گئی ہے، لیکن مشرقی بحر روم اور بلقان کی سیاست میں جس انقلاب کا خطرہ تھا وہ نہیں ہوا۔ اٹلی نے بلقان کی ریاستوں اور ترکی کو اطمینان دلایا ہے کہ اسے ان سے کوئی عداوت نہیں، اٹلی کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، لیکن صلح کے ایسے اعلان کے جواب میں بھی جنگ کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ترکوں نے غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے معاہدوں کو دیکھتے ہوئے فی الحال اس کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ کسی فریق کا ساتھ چھوڑیں یا کسی کا ساتھ دیں۔ وہ بدستور غیر جانب دار رہیں گے، بلقان کے ملک بھی فی الحال غیر جانب دار ہی رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اٹلی کی طرف سے انھیں خطرہ بہت ہے۔

روس نے البتہ چپکے چپکے کچھ کارروائیاں شروع کی ہیں۔ پہلے خبر آئی تھی کہ اس نے روسی پولینڈ میں اپنی فوج بہت بڑھا دی ہے، ۱۷ اور ۱۸ جون کو معلوم ہوا کہ اس نے لیتھوئینیا، لیتویہ اور استھونیا کو الٹیمیٹم دے کر اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے ساحل پر روسی فوج متعین کرلیں۔ اسی کے ساتھ ان تینوں ملکوں کی وزارتیں بدلیں، لیتھوئینیا کے پریزیڈنٹ نے بھی استعفا دیدیا اور وہ سابق وزارت کے کئی اراکین کے ساتھ سرحد پار کر کے جرمنی

چلے گئے جہاں انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ جرمنی ان تینوں ملکوں اور خاص طور سے لیتھوئینیا میں اپنا اثر بڑھا رہا تھا اور روس نے وقت پر دخل دے کر جرمنی کی اس تدبیر کو الٹ دیا۔ حال میں رومانیہ سے اسامرانا لیسہ اس کا علاقہ لے لیا ہے

روس اور جرمنی کی لڑائی تو ہر ہٹلر کے پروگرام میں ہے سوال صرف یہ ہے کہ کب ہوگی۔ پچھلے سال مارچ تک یہ ممکن تھا کہ جرمنی پہلے روس سے لڑے، لیکن برطانوی سیاست نے پولنڈ کو گیرنٹی دے کر جرمنی کے حملہ کا رُخ بدل دیا۔ اب روس کی سلامتی اس میں ہے کہ وہ جرمنی کو مغربی جنگ سے فارغ نہ ہونے دے اور اسی وقت جرمنی سے لڑائی چھیڑ دے شاید وہ اس انتظار میں ہو کہ جرمنی برطانیہ کی تھوڑی سی مار اور کھالے تب اسے چیلنج دیا جائے، روس کی نیت اگر بدل رہی ہے تو ہر ہٹلر بھی یقیناً اس سے واقف ہوں گے اور ممکن ہے وہ انگلستان سے فیصلہ کن جنگ اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک کہ روس کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے، فی الحال تو آئرلینڈ اور آئس لینڈ خطرے میں ہیں، انگلستان پر حملہ کرنے کی ہمت ہر ہٹلر جب کریں گے تب کریں گے۔
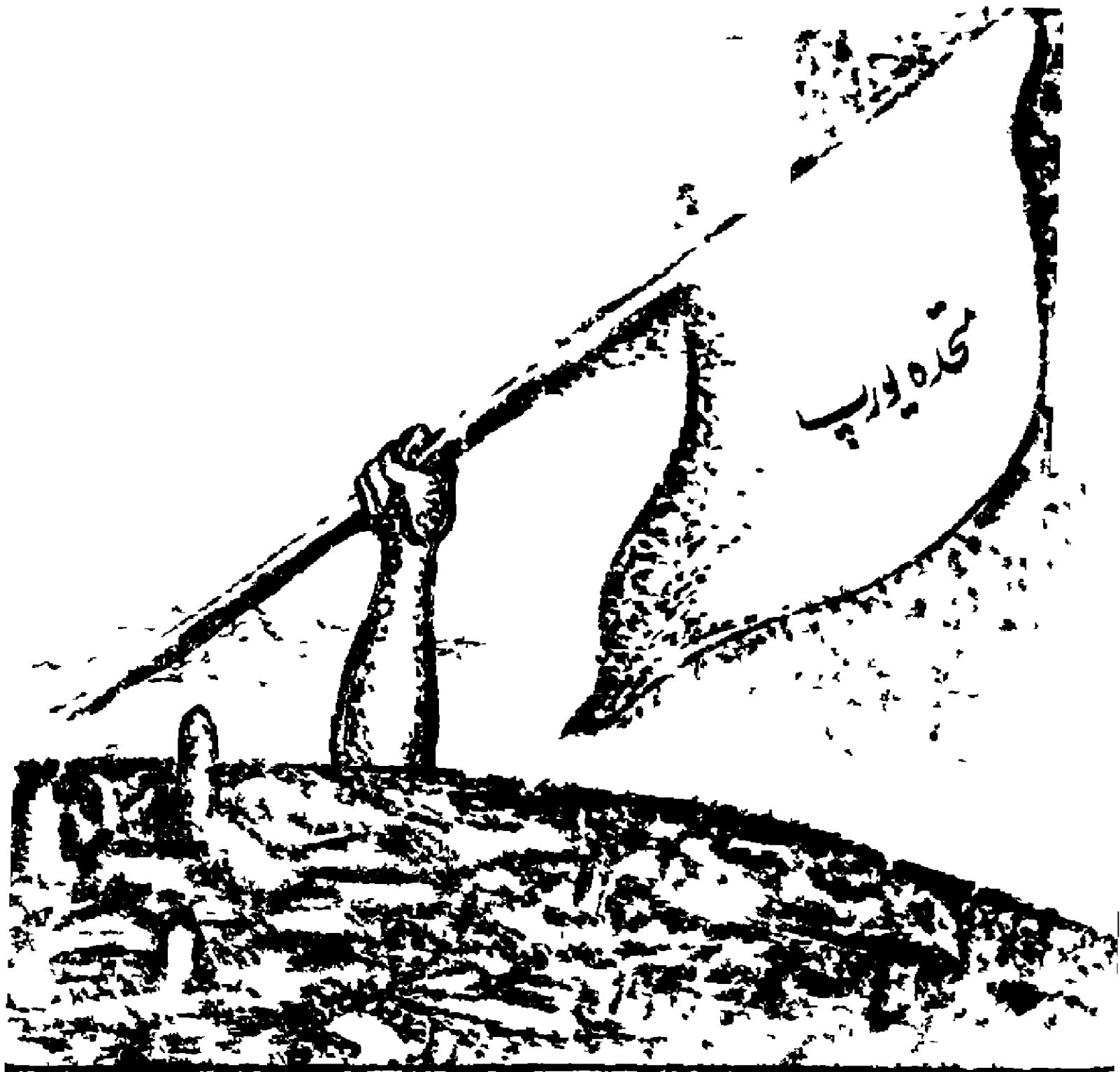
اس وقت جبکہ تمام خزانے خالی ہو جائیں گے اور آخری آدمی مر رہا ہوگا

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

دوشیزۂ صحرا :- مصنفہ صادق الخیری صاحب۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی قیمت عہ

اردو میں ایک عرصے سے جہاں یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اردو میں اچھی کتابیں لکھی جائیں، اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ چھاپی بھی اچھی جائیں جو ناشر کتابیں خوش مذاقی کے ساتھ چھپواتے ہیں وہ اردو کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ کتب خانہ علم و ادب کے منتظمین اسی حیثیت سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ جہاں ایک طرف ایسی اچھی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں وہاں دوسری طرف انہیں خوش مذاقی سے شائع بھی کرتے ہیں

"دوشیزۂ صحرا" ان بہت سی کتابوں میں سے ایک ہے جو تھوڑے سے عرصہ میں کتب خانہ نے شائع کی ہیں یہ کتاب مس جون کون کویسٹ کا ایک انگریزی ناول ہے۔

ناول کا پلاٹ بہت دلکش ہے مصنف نے اپنے پلاٹ کا پس منظر عرب کی رومان پرور سرزمین کو بنایا ہے اور اپنی رنگین قلم سے اس میں وہ آب و رنگ بھرے ہیں کہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں البتہ بعض ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں جنھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار نے بعض نزاکتوں کا احساس نہیں کیا مثلاً ایک سب سے بڑی کمزوری تو یہی ہے کہ ناول کی ہیروئن زہرہ پر ضرورت سے زیادہ رنگ چڑھا ہوا ہے مانا کہ وہ ایک ہسپانوی ماں کی بیٹی تھی تاہم اس کی پرورش تو ایسی فضا میں ہوئی تھی جسے مغربیت سے دور کی بھی نسبت نہیں تھی اس لئے پڑھنے والا یہ توقع کرتا ہے کہ اس کی فطرت میں وہی چیزیں رچی بسی ہوں گی جو عرب کی زندگی کے ذرہ ذرہ پر چڑھی ہوئی ہیں بہرحال ناول مجموعی حیثیت سے بے حد دلچسپ ہے اور صادق صاحب کے طرز کی دلکشی اس کے چھوٹے چھوٹے عیبوں کو نظر کے سامنے نہیں آنے دیتی۔

دام :- مصنفہ راجندر سنگھ بیدی صاحب۔ مکتبہ اردو لاہور۔ قیمت عہ

یہ موجودہ افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو حال میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ بیدی صاحب
ہونہار افسانہ نگار ہیں۔ زندگی کے کافی عمیق مطالعہ کے بعد بیدی صاحب نے جو افسانے لکھے
افسانہ نگاری میں کچھ کم شاندار اضافہ نہیں۔ بعض موجودہ ترقی پسند مصنفین کی طرح وہ
زندگی کے تاریک پہلو کو نہیں دیکھتے۔ وہ ہماری زندگی سے حقارت نہیں کرتے بلکہ ایک
دماغ رکھتے ہیں۔ اسکے ساتھ تحریر میں سادہ پُرکاری اپنی ارتقائی منزلوں میں ہے۔ اُمید
ہے آئندہ افسانہ نگاروں کی صف اول میں آکر بہت جلد ممتاز جگہ حاصل کریں گے۔

ا

اشرف صبوحی صاحب کا کیا ہوا کسی انگریزی ناول کا ترجمہ ہے ناول کا پلاٹ دلچسپ
صاحب کی زبان میں ایک خاص طرح کا لوچ اور بیان میں روانی ہے
ناولوں کی، اور خصوصاً اچھے ناولوں کی بہت کمی ہے اس لحاظ سے کتب خانہ علم و ادب
ستائش ہیں کہ وہ ایسے اچھے ناولوں کے ترجمے شائع کر رہا ہے۔ اگر کتب خانہ اس خدمت
طریقے سے انجام دے تو ادب اور زبان کی اور بھی اچھی خدمت ہوگی ضرورت اس بات
زبانوں کے اچھے اچھے ناولوں کو منتخب کرکے ایک مکمل سکیم بنائی جائے اور رفتہ رفتہ ان
اردو میں کر دیے جائیں اس طرح اردو میں اچھے ناولوں کی جو کمی محسوس کی جاتی ہے کسی حد
اور اردو طبقہ اچھے ناول پڑھنے کا عادی ہو جائیگا۔ کتب خانہ کے حلقہ اثر میں اچھے لکھنے
ترجمہ کرنے والوں کی کمی نہیں اس سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے اٹھانا چاہیئے۔ اس طرح
اور تعداد کا جو ہری اس خوش نما زنجیر کی ابتدائی کڑیاں بن جائیں گی۔
ہری بھی کتب خانہ کی دوسری مطبوعات کی طرح دیدہ زیب ہے کتابت طباعت کاغذ
سب اچھی ہیں ناول کی قیمت عہ ہے۔

(د-ع)

شعرائے عثمانیہ:۔

ادارۂ ادبیات اردو نے حال ہی میں "مرقع سخن" کے نام سے شعرائے دکن کے کلام کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلدوں میں دورِ آصفیہ کے بہتر شاعروں کا کلام مختصر تنقیدوں کے ساتھ شائع کیا جا چکا ہے۔ تیسری جلد میں دولت آصفیہ کے سو شعراء کا تذکرہ اور ان کا کلام شامل ہے یہ کتاب ابھی زیر طبع ہے۔ شعرائے عثمانیہ مرقع سخن کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے ۷۰ پرانے طالب علموں کے کلام کا انتخاب تھوڑی تھوڑی تنقید کے ساتھ چھاپا گیا ہے کتاب ادارۂ ادبیات کی دوسری مطبوعات کی طرح خوش مذاقی سے شائع کی گئی ہے کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے اور ظاہری شکل و صورت بھی کتاب دیکھ کر اسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے لیکن اسے شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد کچھ مایوسی سی ہوتی ہے۔

جن شعراء کا کلام اس مجموعے میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے زیادہ ایسے ہیں جن کا کلام بالکل بے نمک ہے اور بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کا کلام پڑھ کر کوئی لطف محسوس ہوتا ہو۔ اس کتاب کے شائع کرنے کا مقصد مرتب کے نزدیک "عثمانیہ شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ منتشر کلام کی ایک ادبی یادداشت اور شیرازہ بندی ہے" جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے یہ کتاب کافی مفید ہے لیکن آج کل اردو میں ایسی کتابیں شائع کرنے کی ضرورت ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کر سکیں اور یہ کتاب ایک بہت محدود حلقہ کیلئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف وہی لوگ دلچسپی محسوس کر سکتے ہیں جنھیں شعرائے عثمانیہ سے کوئی ذاتی لگاؤ ہے اور اس لگاؤ کی وجہ سے انھیں ان کے کلام میں طرح طرح کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔

ادارۂ ادبیات کے پاس بظاہر کافی سرمایہ ہے اور اس کے منتظمین میں ادبی کام کرنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے کیا اچھا ہو کہ اس سرمایہ اور سلیقہ کو زیادہ مفید کاموں میں صرف کیا جائے

(د۔ ع)

اردو دانی کی کتابیں (پہلا حصہ)

مرتبہ زیر نگرانی مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن قیمت ۳ر پائی

یہ ایک قاعدہ ہے جو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے شعبہ امتحانات کے نصاب کے لیے لکھا گیا ہے۔ خصوصیات اس قاعدہ کی حسب ذیل ہیں۔ (۱) مختلف تصویریں قانون تلازم کے مطابق دی گئی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ الفاظ کی شکلیں ذہن نشین ہو جائیں (۲) ہر لفظ کے ٹکڑوں کو الگ الگ لکھا ہے تاکہ ہجے کی سہولت ہو (۳) الفاظ کی تحلیل کر کے حرفوں کی پوری شکلیں اور ان کے جوڑوں کی شکلوں کی وضاحت کی گئی ہے (۴) رسم الخط ایسا استعمال کیا ہے کہ حرفوں کی اصلی شکلیں حتی الامکان یعنی اصلی حالت پر رہیں اور (۵) ذخیرہ الفاظ کو جملوں میں بار بار استعمال کیا گیا ہے تاکہ خوب مشق ہو جائے یہ قاعدہ ہر لحاظ سے بہت مفید ہو گیا ہے۔

(۲) مثنوی کا ارتقاء۔

مرتبہ عبدالقادر سروری صفحات ۳۴۴ قیمت ۲ روپے سب رس کتاب گھر ادارہ ادبیات خیریت آباد حیدرآباد دکن

مثنوی کے ارتقاء اور اس کی تاریخ پر اردو میں کئی کتابیں نکلی ہیں یہ کتاب جدید ترین ہونے کے باعث کئی لحاظ سے ممتاز ہے دکن کے قدیم شعرا سے آغاز کیا ہے اور نمونوں کے ساتھ حال کے زمانے تک کی مثنویوں پر پُر مغز تبصرہ کیا گیا ہے ساتھ ہی مثنوی کے ارتقاء پر کون کون سے مختلف تاریخی اثرات پڑے کیوں پڑے اور ان کے اثرات کیا ہوئے ان سب کا مفصل ذکر کتاب میں موجود ہے۔ اس میں پنجاب دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی طرز نگارش، ان جگہوں کے مختلف اساتذہ کے اتالیقی امتحانات کا اثر، اصلاح فن کے نتیجے حسن و قبح کلام ہر ایک پر کاوش کے ساتھ تبصرہ کیا ہے یہ کتاب اردو ادب کے طلبا کے لئے ناگزیر ہے۔

حج زینب ا۔

مرتبہ محسن بن شبیر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، قیمت ۲ روپے ۔

ایک نومسلمہ انگریز خاتون لیڈی ایولن کیولڈ زینب نے اپنا سفرنامہ حج میں انگریزی زبان میں

۱۹۳۴ء میں لکھا تھا یہ سفر نامہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ ایک انگریز خاتون کے قلم سے نکلا ہے اور ان کے تاثرات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے کہیں کہیں بیچ بیچ میں قدیم اسلامی تاریخ بھی دی گئی ہے۔ وہ انگریزی پڑھنے والوں کے خیال سے لکھی گئی تھی ترجمہ بھی اچھا کیا گیا ہے کہیں کہیں دکنی محاورے ہیں لیکن زیادہ نہیں سیدہ زینب نے اپنے بیان میں کسی بات کو نہیں چھوڑا ہر بات تفصیل سے بیان کی ہے اس لئے حج کا تمام نقشہ سامنے آجاتا ہے انداز بیان بھی سادہ کہانی کی طرح دلچسپ ہے۔ کتابت طباعت وغیرہ بہت خوب ہے۔

جامعہ اردو آگرہ:۔

محمد طاہر صاحب فاروقی آگرہ سے اطلاع دیتے ہیں کہ اپریل ۱۹۳۹ء سے بزم اقبال کے اراکین نے وہاں ایک جامعہ اردو کی بنیاد ڈالی ہے جس کا مقصد پنجاب کی طرح لسانی طرز پر اردو زبان و ادب کے تین امتحانات جاری کرنا ہے۔ اس جماعت میں یو۔پی کی تمام یونیورسٹیوں کے اردو کے صدر شیخ الجامعہ دہلی، سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی وغیرہ بطور نمائندہ شامل ہیں۔

نومبر ۱۹۳۹ء میں اس کا پہلا امتحان ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کا ہوا۔ لڑکیوں کے لئے ہر سنٹر پر پردہ کا انتظام تھا ادیب کے امتحان کے لئے ۱۱۹، ادیب ماہر کے لئے ۱۹، اور ادیب کامل کے لئے ۴ طلبہ وطالبات شامل ہوئے۔ پہلے سال کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت امید افزا ہے۔ امتحانوں کے لئے سنٹر مختلف جگہوں پر قائم کئے گئے تھے مثلاً آگرہ، اجمیر، الہ آباد، بریلی، بھوپال، ٹونک، جودھپور، جے پور، سنگرامپور، علیگڈھ، کانپور، لکھنؤ، مرادآباد وغیرہ۔ دیگر تفصیلات رجسٹرار جامعہ اردو آگرہ سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

محمد طاہر صاحب فاروقی بے انتہا مبارکبادوں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو کی ترویج و ترقی میں ایسا مفید قدم اٹھایا پہلے ہی سال کی کارگزاری ہمیں امید دلاتی ہے کہ یہ جماعت مضبوط بنیادوں پر بہت جلد کھڑی ہو جائے گی۔ اور یو۔پی و راجپوتانہ میں اردو کے ایک اس قسم کے ادارے کی جو کمی محسوس کی جارہی تھی اور جسے لوگ پنجاب جا کر پورا کرتے تھے اب آگرہ کے اس جامعہ اردو

کی حد مستفید ہو سکیں گے ہماری دعا ہے کہ ان حضرات کی یہ مبارک کوششیں جلد اور خوب بار آور ہوں

پرائمری جماعتوں میں لکھنا سکھانے کا طریقہ۔

ٹرینگ اسکول ا۔دو ریڈر مصنفہ ماسٹر بھول صاحب کرچن ہائی اسکول کھرڑ دپنجاب قیمت ۱۰
ماسٹر بھول صاحب اس ملک میں تعلیم جدید اور نئے طریقوں کے نمائشی علمبردار نہیں بلکہ ایک
حا۔ ہے کار ہیں اس سے بیشتر ہندوستان کے تعلیمی حلقے ان کے نام سے اچھی طرح آشنا ہیں
۔ ی موجودہ کتاب بھی طریق تعلیم کے باب میں ایک مفید اضافہ ہے مصنف کو اس امر کا شدید
حساس ہے کہ ہمارے یہاں کے بہت سے اہل علم جو ملک و قوم کو تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات
سے مستفید کر سکتے ہیں غلط قسم کی ابتدائی تربیت سے لکھنے کو مصیبت سمجھنے لگ جاتے ہیں
س کتاب میں ان طریقوں پر بحث کی گئی ہے جن سے بچے کے دل میں لکھنے کا طبعی ذوق پیدا
ہو جاسے ۔اور جن کی امداد سے استاد بچے کی تحریری قوت اظہار کی تڑپ کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اسے
تیزی سے ارتقائی درجے طے کرنے میں مدد و معاون ہو سکے ۔ اس طریق کے بنیادی اصول بچے
کی دلچسپی شوق اور ماحول کا لحاظ رکھنا اور مطابقت کے طریق کو پیش نظر رکھنا ہے ہمیں یقین ہے کہ
یہ کتاب ابتدائی مدرسوں کے استادوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ (ع ۔ غ)

رسالہ جات :۔

عالمگیر لاہور سالنامہ نمبر قیمت ۸ر صفحات ۴۶۴ ۔

سب معمول خوبصورت شائع ہوا ہے اندرونی تصویریں اکثر پرانی ہیں مضامین کا دلبست اچھا
ہے ۔ عنوانات یہ ہیں سنسکرت پر مسلمانوں کا احسان ، ہندوستانی کا پہلا مسلمان شاعر ، اردو کے
بعض ادیب ، اینگلو انڈین شعرا ، بچے افسانے اور نظمیں بھی کافی تعداد میں ہیں بعض اشتہارات اکثر اردو رسائل
و اخبارات کی طرح فحش ہیں ۔

تصویر ۔ رامپور ۔ مدیر نادر علی صاحب برق ۔ چندہ سالانہ ۱۲ر ۔
اس رسالے نے اب پہلے سے بہت ترقی کر لی ہے ظاہری نمائش اور مضامین کی فراہمی کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ
دی جانے لگی ہے مضامین اور نظمیں خاصی ہیں امید ہے کہ قدردانان ادب اس کی طرف توجہ کریں گے۔

اپنی اصلاح

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم

(جناب غضنفر علی صاحب)

مسلمانوں کی تعلیم کا اولین سرچشمہ کتاب اللہ ہے اور جس پر ہر زمانہ اور ہر دور کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی بنیاد رہی ہے اور رہنا چاہیے لیکن ہندوستان میں جہاں عربی زبان رائج نہیں ہے قرآن کی تعلیمات باوجود تقریباً ہر مسلمان کے قرآن پڑھے ہوئے کے کچھ بھی عام نہ ہو سکیں آپ کو تقریباً ہر مسلمان کا بچہ قرآن سے آشنا ضرور ملے گا۔ آپ کو تقریباً ہر مسجد میں ایک دو حافظ ضرور نظر آجائیں گے آپ قرآن کے فوائد سے کسی کو بھی منکر نہ پائیں گے لیکن پھر بھی اگر کبھی کسی سے یہ پوچھ لیا جائے کہ قرآن کے اندر کیا ہے تو تقریباً سب کی زبانیں گنگ نظر آئیں گی کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا نے ہم کو ایک پیغام دیا اچھی اچھی باتیں بتائیں صحیح راہ و صراط مستقیم کی باتیں بتلائیں اپنے خاص رسول کو ہماری رہنمائی و ہدایت کے لئے بھیجا لیکن ہم ہیں کہ اس کو نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ دوسروں کو سمجھانے کی جب سمجھتے نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے توفیق ہو سکتی ہے اور پھر جب عمل ہی نہیں کریں گے تو دوسری قومیں تہذیب و تمدن میں ہم سے یقیناً بڑھ جائیں گی بغیر خود سمجھے ہوئے ہم دوسروں کو بھی تو نہیں سمجھا سکتے اس طرح تبلیغ کا کام الگ رک جائے گا جیسا کہ رکا ہوا ہے آج کل ہمارے نوجوان مرد عورتوں میں جو بے دینی اور لامذہبی کی لہر پھیلی ہوئی ہے وہ زیادہ تر ہمارے بچوں کی قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت کے باعث ہے مذہب اسلام کی سب مذاہب سے برتری کا جذبہ افسوس ہے گھٹتا جا رہا ہے اور وہ اسے دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب اور دوسرے مذاہب کے برابر سمجھنے لگے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کی تعلیمات بچے بچے کی زبان پر ہوں۔ اسلامی مدرسوں، مکتبوں اور مسجدوں میں جہاں کہیں بھی قرآن شریف بچوں کو پڑھایا جاتا ہے اس امر کا التزام کیا جائے کہ وہ اس کا

ترجمہ بھی پڑھیں اور اس طرح قرآن کو سمجھیں گے تو اپنے کو بھی درست رکھ سکیں گے اور دوسرے مذہب والوں کو بھی اس کی تلقین کرسکیں گے یعنی انی ہر گز نا اور روحانی طور پر اپنے کو بلند و برتر کرنا اس امر سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ قرآن شریف سے ہم محض تعویذ اور گنڈوں کا استنباط کیا کریں اور اس سے اپنے کو اور دوسروں کو نہایت ذلیل دھوکہ دیا کریں موجودہ زمانہ قوموں کی بقا کے لیے اونچی بنیادیں چاہتا ہے جو واقعی مضبوط اور غیر متزلزل ہوں محض ان ہی قرون وسطیٰ والی خرافات سے کام نہ چلے گا ضرورت ہے کہ قرآن کی ٹھوس تعلیمات جلد سے جلد عام ہو جائیں اور ہر ایک مومن کے تمام روح کو منور کر دیں۔

<u>ترتیب وار ترجمہ</u> قرآن شریف کے ترجمے متعدد ہوئے اور ہو رہے ہیں لیکن میرے خیال میں ترجمہ کسی شخص کا ذاتی نہ ہونا چاہئے اکثر موقعوں پر تفسیر میں اختلاف رائے ہو جاتا ہے اس کے علاوہ یوں بہت سے عربی داں ادیب جمع ہو کر اس متبرک کام کو انجام دیں تو ترجمہ بہتر اور مستند ہوگا ضرورت اس کی ہے کہ تمام گذشتہ ترجموں کو پیش نظر رکھ کر ملک کے سربرآوردہ عربی داں حضرات جو ساتھ ہی اردو زبان پر ادیبانہ قدرت رکھتے ہوں ایک جگہ جمع ہوں یا جمع کیے جائیں اور باہم بحث و تمحیص اور تبادلہ خیالات کے بعد ایک مستند اور مکمل ترجمہ قرآن کریم کا پیش کریں تاکہ آج کل جو تذبذب کی حالت رہتی ہے کہ کس کا ترجمہ پڑھیں یا کس کا سب سے بہتر ترجمہ ہے یہ دور ہو جائے گی اور ملک و قوم کے پاس ایک ایسی قیمتی مفید اور مکمل چیز ہو جائے گی جس کی شدت سے زیادہ ضرورت اور حاجت محسوس کی جا رہی ہے یہ ترجمہ گویا سو دو سو برس تک آخری ترجمہ سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ سے ان جامع ناشرین کی بیجا جدوجہد کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو محض اپنے مالی فائدہ کی خاطر ہر سال تھوڑی بہت رد و بدل کر کے ایک نیا اردو کا ترجمہ نکالا کرتے ہیں۔

اسی طرح احادیث کے ایک موزوں اقتباس کی سخت ضرورت ہے ہم میں بہت لوگ ایسے ہیں جو احادیث کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں بہت سے ایسے ہیں جو تمام تر لفظ بہ لفظ مانتے ہیں میرے خیال میں موجودہ زمانہ کے تقاضے کے مطابق وہ احادیث جو ہماری آج کل کی زندگی میں رہبری کریں انھیں سب سے

پہلے لینا چاہئے طلبا اس ایجاز، اختصار سے گھبرا بھی نہ سکیں گے اور بہت جلد ان سے واقفیت حاصل کر کے اپنی روزانہ کی زندگی میں اسے برتنے لگیں گے۔ احادیث کے ترجمے تو اکثر ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ان کا اختصار میری نظر سے نہیں گذرا۔ (ایک دفعہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کی اکثر مسجدوں میں دیکھا کہ جامع مسجد اور دوسرے بڑے بڑے تختوں پر قرآن شریف یا حدیث کی کوئی ایک نصیحت بہت خوشخط چھپوا کر نصب کر دی ہے۔ اور ہر مہینے بدلتے رہتے ہیں مسلمانوں کو ان کی صحیح مذہبی تعلیم دینے کا یہ بہت ہی اچھا طریقہ ہے۔ دوسری جگہوں میں بھی اگر اس قسم کا انتظام کیا جائے تو کم از کم سال بھر میں بارہ باتیں تو مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی معلوم ہو جایا کریں گی)

ان باتوں کے علاوہ فقہ اور اسلامی تاریخ میں ریسرچ کی بہت گنجائش اور ضرورت ہے ہمارے ملک میں کئی ایسی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں ہیں جہاں اسلامی فقہ و تاریخ، قرآن و حدیث دینیات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ اس کا طریقہ تعلیم تمام تر پرانا، جامد اور زمانہ کے تقاضوں سے کلیتہً بیگانہ ہے وہاں کے طلبا جب فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں ان کی جگہ کہاں ہے اور ان کی کہاں کھپت ہو سکتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام زندگی دربدری میں گذرتی ہے ان کی زندگی خود ان کے اوپر اور ان کی قوم دونوں پر بار ہو جاتی ہے۔

ہماری مذہبی تعلیم کا کیا مقصد ہے؟ اگر اس امر کا فیصلہ ہو جائے کہ ہماری مذہبی تعلیم کس لئے ضروری ہے نیز اس سے ہماری قوم کے نوجوانوں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور کیا ہونا چاہئے تو میرے خیال میں ہم اپنی مذہبی تعلیم کی تشکیل بھی بہت آسانی سے کر سکیں گے اب تک جو کچھ ہماری تعلیم کا مقصد رہا ہے وہ اتنا ہے کہ مسلمان بچے ارکان، نماز روزہ سے واقف ہو جائیں طہارت سے واقف ہو جائیں نیز میت کی نماز پڑھ سکیں یا پڑھا سکیں اور زیادہ ہوا تو کچھ مسئلہ مسائل سے واقف ہو گئے کہ فلاں حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

ہماری مذہبی تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہئے میرے خیال میں اس کا مقصد ذیل کے تینوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ ذاتی کیرکٹر کا درست و بلند کرنا اور روح میں اخلاقی استواری و بلندی کا پیدا کرنا۔

۲۔ اپنی قوم کی بھلائی و بہتری یعنی اپنی قوم کی خدمت کا احساس پیدا کرانا۔

۳۔ اپنی قوم و مذہب کی برتری و فوقیت کے جذبے کی تعمیر کرنا۔

۴ تبلیغ کا مادہ اس کی صلاحیت اور اس کا ذوق پیدا کرنا۔

۵ دینیات کی وہ معلومات بہم پہنچانا جس کی ہمیں روزانہ زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔

۶ منتہی طالب علموں کے لئے اور زیادہ اونچے مسائل مثلاً اسلامی نظام ملت کیا ہے۔ دوسرے ادیان سے وہ کیوں مختلف و بہتر ہے۔ اس کا فلسفہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ

۷ ریسرچ کے ذریعہ مختلف فیہ مسائل کو حل کرنا تاکہ بہت سی گتھیاں سلجھ سکیں اور ہماری واقفیت میں اضافہ ہو سکے ساتھ ہی یہ تمام مذہبی تعلیم اس نہج سے ہونا چاہئے کہ مذہب ہماری زندگی میں کوئی بڑا بوجھ یا رکاوٹ بن کر سامنے نہ آئے بلکہ زندگی ہی کا ایک حصہ معلوم ہو جس کے بغیر ہماری زندگی نامکمل سی معلوم ہوتی ہو۔

ذاتی اخلاق کی بلندی اور استواری مذہبی تعلیم کا ایک اہم فریضہ ہے آجکل ہمارے سینکڑوں اور ہزاروں طالبعلم مغربی زندگی کا شکار ہو کر نہ صرف لامذہب ہوتے جا رہے ہیں بلکہ ان میں اخلاقی کمزوریاں بھی بیحد پیدا ہوتی جا رہی ہیں جھوٹ، مکر و فریب، غلط بیانی، دھوکا ان سب امور کو ایک فن کی طرح اختیار کرتے اور برتتے ہیں اور سب سے بڑھ کر افسوسناک بات تو یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں بھی جو پہلے گھر کی اور ماں کی تعلیم کے باعث اخلاقی طور پر لڑکوں سے زیادہ مضبوط اور راسخ العقیدہ ہوا کرتی تھیں اب مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر وہ بھی لامذہب فیشن پرست اور اخلاقی طور پر اسی طرح کمزور اور پست ہوتی جا رہی ہیں جس معیار پر ہمارے نوجوان مغربی تعلیم کے باعث عموماً پہنچ جاتے ہیں اس کی تمامتر ذمہ داری ہمارے ان ماہرین تعلیم پر ہے جو اسلامی درسگاہوں کے مالک ہیں اور ہمارے نوجوان طلباء و طالبات میں جو بے راہ روی اس مغربی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتے

قومی بہتری و بھلائی کا خیال شکر ہے کہ ابھی تک عوام الناس میں تو ہے لیکن ہمارے نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں کم ہوتا جا رہا ہے اور بڑی حد تک کم ہو گیا ہے عام طبقے میں لیکن ایک دقت یہ ہے کہ قوم کی بھلائی کی ترغیبات اچھی ثواب جنت کی ارزانی وغیرہ کی صورت میں دیتا ہوتی ہیں تعلیم یافتہ طبقہ قومی بھلائی کی کوئی مد اپنے حرج میں رکھتا ہی نہیں اس کے یہاں تو صرف اس کی ذات ہے ضرورت ہے کہ ان دونوں کو اس طرح کی مذہبی تعلیم دی جائے کہ ایک کو یہ معلوم ہو سکے کہ ثواب کیا ہے اور دوسرے کو معلوم ہو سکے کہ قوم پہلے ہے اور خود کی ذات بعد کو

تیسری کمزوری جو مغربی تعلیم کے باعث آگئی اور جسے اکثر ایک مخصوص سیاسی نظریہ کے مسلمان اپنی تقریروں

اور تحریروں میں جگہ دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ سب مذاہب برابر ہیں خواہ وہ ہندو مذہب ہو خواہ بودھ خواہ کوئی اور
یہ تعلیمات بالکل غیر اسلامی ہیں، خود قرآن میں کئی جگہ اس قسم کے ارشادات موجود ہیں کہ دین اسلام سب سے
اکمل اور سب سے بہتر مذہب ہے اور یوں بھی عقلی طور پر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جبتک
اس میں اپنی برتری کا احساس نہو کوئی ملت ترقی کی معراج تک نہیں پہونچ سکتی جبتک خود اس میں ایسی برتر
صلاحیتیں موجود نہوں اور اس ملت کو اس کا احساس شدید نہو۔ یہ تعلیم کہ سب مذاہب برابر ہیں مسلمانوں میں
ایک تعطل کی حالت پیدا کر دے گا اور یہ اس کی ملی اور سیاسی دونوں قسم کی زندگیوں کے لئے خطرناک ہے
ضرورت اس امر کی ہے کہ جلد از جلد اس قسم کی کمزور کن تعلیم کا سد باب کیا جائے اور ہماری مذہبی تعلیم کے
پروگرام میں اس برتری کے جذبے کی پوری پوری پرورش کی جائے کیوں کہ ہماری مذہبی برتری ایک ایسی
حقیقت ہے جس کے متعلق خود کلام الہی کی شہادت موجود ہے اور جس کی بنا پر اس میں کسی کو شک وشبہ کی
گنجائش نہیں ہو سکتی ہے۔

ہماری مذہبی تعلیم کا جو تھا مقصد تبلیغ کے فرض کا احساس اور شوق کا پیدا کرانا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان
میں اتنک جو اسلام پھیلا وہ بیشتر ولیوں اور بزرگان دین کے تصرف سے لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اس
ضرورت ہے کہ ہر فرد خود تبلیغ میں دلچسپی لے کم سے کم اس کی صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ اپنے مذہب کی برتری
دوسروں پر ظاہر کر سکے۔ ایسی انجمنوں کے بننے کی سخت ضرورت ہے جو اس ضروری فرض کو باقاعدہ منظم طور
پر انجام دے سکیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب افراد میں اس امر کا احساس ہو اور یہ احساس اسی وقت
پیدا کیا جا سکتا ہے جب ہماری درسگاہیں اس ضروری امر کی طرف توجہ کریں۔

روزمرہ کی دینیات کی تعلیم کے متعلق مجھے کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ یہ تو عموماً ہوتی ہی ہے۔ لیکن جس بددلی
سے طلبا حاصل کرتے ہیں وہ ضرور افسوسناک ہے۔ ان کے لئے یہ ایک قسم کا بار ہوتا ہے جو انہیں مجبوراً کرنا
ہوتا ہے ایک کونین کی شکر آلود گولی ہوتی ہے جو انہیں بصد مجبوری نگلنا ہوتی ہے اس امر میں قصور
ہماری طرز تعلیم کا ہے ان کا اتنا نہیں جو دینی ہمارے معلم اسے کونین کی گولی بنا دیتے ہیں ورنہ اگر وہ اسے
مٹھائی کی ڈلی کی صورت میں پیش کریں تو ہر ایک دلچسپی سے قبول کرے اور عرصہ تک اس کا مزہ یاد رکھے۔

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقہ میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوا ہے اسے منتقل کیا جائے یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانب داری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق:۔

مولوی سید عبدالوہاب صاحب سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد (دکن)

دریافت کیجئے۔ قیمت سالانہ عہ فی پرچہ عہ

گذارش لوال وعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانہ کی تیار شدہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ کارخانہ نے [illegible] ہوتے اب تک [illegible] سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی افسوس ہے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانہ کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے آپ نے ہمارے اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبوات سے پاک ہیں۔

المشتہر: منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنو

چھ آنے والی کتابوں

کے سلسلہ کی ہر ایک کتاب کا مطالعہ کریں اس سلسلہ میں اس وقت تک مندرجہ ذیل کتابیں
شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارے ہاں ہر ماہ اس سلسلہ کی ایک کتاب شائع ہوتی ہے۔

سوشلزم ۔ سوشلزم کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کے اندر انسانیت کے لئے کیا
پیغام ہے؟ اور یہ پیغام حقیقت کی دنیا میں کیا حیثیت رکھتا ہے، انہیں سوالوں کا جواب
اس کتاب میں دیا گیا ہے ۔ مصنف فریڈرک اینگلز جو بانی اشتراکیت کارل مارکس کا دست
راست رہا ہے ۔ کتاب کا ترجمہ کامریڈ باری کے قلم سے ہے ۔ قیمت ۶ر

کمیونسٹ مینی فسٹو ۔ کمیونسٹ مینی فسٹو ۔ بانی اشتراکیت کارل مارکس اور اس کے دست راست
اینگلز کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے جو حیثیت بائبل کو مسیحی دنیا میں حاصل ہے وہی حیثیت
کمیونسٹ مینی فسٹو کو سیاسی اشتراکیت میں حاصل ہے ۔ اس مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہر
[illegible] زبان میں ہو چکا ہے ۔ کتاب کے مترجم باری علیگ ہیں ۔ قیمت ۶ر

سرمایہ داری ۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سرمایہ داری دنیائے انسانیت کو تباہ کر رہی
ہے مگر بہت ہی کم لوگوں کو علم ہے کہ سرمایہ داری اصل میں ہے کیا؟ اور یہ کیا کیا خطرناک
مگر پوشیدہ ہتھیاروں سے مسلح ہے ۔ جناب عبداللہ ملک نے کئی ضخیم اور مشہور و معروف
کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس موضوع کے متعلق یہ کتاب لکھی ہے ۔ کتاب کیا ہے کوزہ
میں دریا بند ہے ۔ قیمت ۶ر

دیگر کتابوں کے لئے مکمل فہرست مفت طلب کریں

ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو، سرکلر روڈ، لاہور

سراغ رسانی کے شہرۂ آفاق ناول

مولفہ

عالی جناب ظفر عمر صاحب بی اے (علیگ) اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس

نیلی چھتری ایک سائنس داں ڈاکو اور علی گڑھ کالج کے ایک قابل طالب علم کا باہمی مقابلہ حیرت کا مرقع اور عجیب وغریب اسرار کا ایک مجموعہ ہے جو مشہور لبلان فرانسیسی افسانہ نگار کی کتاب "پولی سوئی" کو ہندوستانی زبان، اور ہند کی تاریخ وطرز معاشرت کا جامہ پہنا کر نہایت عجیب پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے جس کے پراسرار واقعات سے محض تفریح ہی نہیں ہوتی بلکہ قوائے عقلی وذہنی نشوونما پاتے ہیں۔ ہمت ومردانگی کے جوہر جوش زن ہوتے ہیں تخیل کا خاص ملکہ پیدا ہوتا ہے اور دنیاوی امور میں تجربات کا معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کتاب نے امید سے کہیں زیادہ خراج تحسین حاصل کیا ہے اور ہندوستان وبیرون جات میں اس کی کافی قدر کی گئی ہے یکے بعد دیگرے نوبار طبع ہوکر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکی ہے۔ قیمت عہ

چوروں کا کلب اس کلب کے ممبر دنیا بھر کے لہو ولعب سے سیر ہو گئے ہیں ان کو معمولی مشاغل میں چنداں تفریح نہیں ہوتی۔ کلب کے ممبروں میں والیان ملک کونسل کے آنریبل ممبر، محکمہ فوج اور صیغہ مال کے اعلیٰ افسر، ہر قسم کے لوگ شامل ہیں اور محض دل بہلانے اور چوری کے خطرات سے لطف اٹھانے کے لئے کلب کو قائم کیا ہے۔ کلب کے ایسے ذی شان اور عالی دماغ ممبروں کے کارہائے نمایاں (چوریاں) عجیب وغریب حرکات، حیرت انگیز نتائج ہر شخص کے دل پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے عجائبات کا ایک خزانہ ہے۔ قیمت صرف ۹ر۔ تین بار طبع ہو چکی ہے

تاریخ کی دو اہم کتابیں
حیات جلیل حصہ اول و دوم
مصنفہ ادیب جلیل مولوی سید مقبول احمد
(آصف جاہ سابع تاجدار دکن کی بارگاہ میں نذر قبول)
حصہ اول - بلگرام اور مشاہیر بلگرام کی تاریخ امیرالامراء وقطب الملک
علامہ میر سید جلیل بلگرامی کا مکمل تذکرہ، خاندان و کے احوال، ان کے مراسم، ان کا انجام
و امراء کے ساتھ تعلقات قصائد و مراثی، میر سید محمد شاعر، میر غلام علی آزاد
کے تفصیلی حالات و تصنیفات، اردو اور عربی
حصہ دوم ازواج، اولاد، اعقاب، احباب اخبارات ورسائل نے بہترین تبصرے کئے ہیں
تبصرہ و تنقید، نواب آصف صفحات مع فہرست قیمت مجلد
ملنے کا پتہ
دفتر اخبار کائنات قنوج (۲) سید اولاد علی حمدانی یحییٰ پور الہ آباد
حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کامل
مصنفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب
اس کتاب میں ان تمام سیاسی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کا تعلق ہندوستان کی
سیاسی حالت اور آیندہ ترقی سے ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان کو گذشتہ دو سو سال میں
کس قدر نقصان پہنچا ہے اور یہاں کی کتنی کثیر دولت ممالک غیر کو گئی ہے۔ آخر میں نہرو رپورٹ اور
پارٹیز کانفرنس کے فیصلہ کی تائید مع وجوہ کی گئی ہے۔ قیمت
نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں یوپی

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی چند مطبوعات
نصرتی
گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر ملا نصرتی ملک الشعرا بیجا پور کے حال
اور کلام پر تبصرہ ۔ تالیف لطیف ڈاکٹر مولانا عبد الحق صاحب آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو
علمی تحقیق و تفحص کا بہترین کارنامہ ہے ۔ نصرتی قدیم دکنی استاد کامل گذرا ہے ۔ رزمی اور بزمی
قسم کی شاعری میں کمال رکھتا تھا ۔ گلشن عشق ، علی نامہ ، تاریخ سکندری ، دیوان قصائد وغیرہ
اس کی مشہور تصانیف ہیں ۔ جن میں علی نامہ اور تاریخ سکندری کو عادل شاہیوں کی تاریخ کے
بہترین ماخذوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔
نصرتی کی زبان چونکہ قدیم دکنی ہے اس لئے اب ان تصانیف کا سمجھنا محال
اور مشکل الفاظ کی کرامات سمجھنا چاہیے کہ فاضل مولف نے اس تمام
کے تمام ادق الفاظ کے معنی دریافت کر لئے ۔ کتاب میں مختلف اصناف کلام کے جو نمونے نقل
کئے ہیں ان کے نیچے اشعار کا مطلب صاف اردو میں تحریر فرما دیا ہے ۔ اردو کی تاریخ اور
قدیم زبان کی تحقیق کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔
حجم ۲۵۰ صفحات
قیمت مجلد
غیر مجلد
ملنے کا پتہ ۔ منیجر انجمن ترقی اردو ہند دہلی

افسانہ نگاری: از وقار عظیم صاحب ایم اے۔

اس کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری کے فن پر ہر پہلو سے بحث کی ہے، اور پھر انہیں اصولوں پر اردو کے متعدد افسانہ نگاروں کو جانچا ہے۔ اس اہم کام میں مصنف نے سنجیدگی، دقت نظر اور انصاف سے کام لیا ہے۔ قیمت عہ

ہمارے افسانے: مصنفہ سید وقار عظیم صاحب ایم اے۔

یہ کتاب افسانہ نگاری کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں اردو کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فہرست میں ۲۰ افسانہ نگاروں کے نام درج ہیں جن میں چند الکل نئے اور غیر معروف نام بھی شامل ہیں یہ اس اصول کی پر کیا گیا ہے کیونکہ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت ہے۔ قابل دید کتاب ہے۔ قیمت عمر

مکاتیب مہدی:-

یہ ملک کے مشہور ادیب ایم مہدی حسن کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کو ان کی بیگم صاحبہ نے مرتب کیا ہے۔ یہ خطوط زیادہ تر ملک کے مشہور ادبا اور مصنفین کے نام لکھے گئے ہیں، اور ان میں نئے طرز کی انشا کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ضخامت ۲۰۲ صفحے قیمت ۱۲؎

متاعِ اقبال:- مصنفہ ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن

موصوف نے اقبال کی شاعری اور اس کے پس منظر ان کی ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفہ پر ایک اجمالی بحث کی ہے۔ قابل دید ہے۔ قیمت صر

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ:- اس میں اس تباہ حال طبقے سے بحث کی گئی ہے جس پر ہندوستانیوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں کسانوں کے عام مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے میں برطانوی سامراج اور کسان کے تعلقات پر بحث ہے اور تیسرے میں قومی تحریک اور کسان سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸/

داستانِ غدر:- حضرت ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق نے چشم دید حالات غدر دہلی کے لکھے ہیں۔ آج وہ قصے اور کہانیاں ہیں مگر کچھ ایسے دردناک ہیں کہ دل ہل جاتے ہیں۔ انسان لرز اٹھتے ہیں۔ یہ افسانہ دردخیز اور غم آلود ہیں، مگر درس عبرت کا مرقع۔ قیمت عہ

تاریخ جمالیات:- از مجنوں گورکھپوری۔ اس میں اہل مغرب کے فلسفہ حسن پر ایک مختصر تاریخی تبصرہ ہے کتاب آرٹ کاغذ پر چھپی ہے قیمت ۱۲/

مرآت محمدی:- مصنفہ شیخ غلام محمد صاحب۔ گجرات کی مکمل اسلامی تاریخ۔ ۷۰۰ صفحات بڑی تقطیع۔ قیمت ۴

انی جے نیا:- فاوسٹ کے بعد جرمنی کے فلسفی شاعر گوئٹے کا غیر فانی شاہکار ڈرامہ جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے اور اب پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔

قیمت دس آنے ۱۰/

دلی کی آوازیں:- دہلی کی روزانہ زندگی پر ایک دلچسپ کتاب۔ مصنف نے تمام ضروری حالات افسانے کی زبان میں پیش کیے ہیں عبارت بہت سلیس اور رنگین ہے۔ پڑھنے والا اس کے مطالعے سے اپنے آپ کو دہلی کی فضا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ قیمت ۸/

دیہاتی دنیا

[illegible] اصلاح دیہات و پنچایت ہا ریاست جموں و کشمیر کی سرپرستی میں پابندی وقت سے ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ زمیندار کی اخلاقی، مجلسی، اور رومانی، اقتصادی [illegible] کے ہر شعبہ زندگی اصلاح کی تدابیر کے ساتھ ساتھ اسے [illegible] روشناس کرانا اس کا خاص

نصب العین

ہے۔ [illegible] ضخامت ۴۸ صفحات، سائز ۲۰×۳۰ کتابت عمدہ، [illegible] کاغذ بڑھیا اور سرورق [illegible] پیپر پر ایک دیدہ زیب سہ رنگی تصویر سے مزین ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شمارہ میں کم از کم دیہاتی زندگی کے متعلق آٹھ فوٹو بلاکس کی تصویریں دی جاتی ہیں اور بلند پایہ مضامین نظم و نثر رسالہ کی جان ہوتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں یہ شرف صرف رسالہ دیہاتی دنیا ہی کو حاصل ہے کہ والی ملک کے محل سے لے کر غریب زمیندار کی جھونپڑی تک اسے رسائی حاصل ہے۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا

چندہ صرف تین روپے ہے۔

ملنے کا پتہ

مینیجر رسالہ دیہاتی دنیا جموں سرینگر کشمیر

البیان

امت مسلمہ امرتسر کا ماہوار رسالہ

جبکہ دنیا اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ جب تک کوئی اصول عقل و تحقیق کی کسوٹی پر
پورا نہ اترے قبول نہیں کیا جاتا ایک ایسے علمی اور دینی پرچہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی
جو قرآن حکیم کی تعلیمات کو (RATIONAL) عقلی طور پر مغرب زدہ دماغوں کے سامنے پیش کرے۔
مسلمانوں کے لئے فخر و مسرت کا موجب ہونا چاہیے کہ "البیان" اسی معیار پر کلام عزیز کی خدمت
اشاعت کا فرض سرانجام دے رہا ہے۔ یہ پرچہ تمام ہندوستان میں اپنے رنگ کا واحد پرچہ ہے۔ اہل
علم اصحاب اس کی معقول اور معتدل روش کو دیکھ کر تسکین حاصل کریں گے۔ البیان ہر مہینے کے پہلے
ہفتہ سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور صرف تین روپیہ سالانہ چندہ میں سات سو صفحہ
کے علمی و دینی مضامین کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔

ڈیڑھ ہزار صفحے کا لٹریچر مفت

البیان کا سالانہ چندہ تین روپے ہے اگر آپ اس چندہ کے ساتھ ایک روپیہ شامل کر کے بذریعہ منی آرڈر
ارسال فرمائیں گے تو ہم آپ کو رسالہ کے پچاس پرانے منتخب پرچے جن کا حجم تقریباً ۱۵۰۰ صفحے ہے اور
قیمت [illegible] روپے مفت بھیج دیں گے اور آپ کے نام سال بھر کے لئے البیان بھی جاری کر دیں گے
تمام پرچے قرآن عزیز کے حقائق و معارف، اسلامی و تاریخی معلومات اور علمی و روحانی مضامین
کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ وہ تمام مسلمان جو موروثیت کے دائرے سے باہر ہو کر اسلام کو اس کے صحیح
خدوخال میں پہچاننے کے آرزومند ہیں انہیں یہ رسائل ضرور منگا لینے چاہییں۔

نوٹ: اس عظیم الشان رعایت سے البیان کے نئے اور پرانے تمام خریدار فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ملنے کا پتہ: منیجر رسالہ البیان امرتسر

دی ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قایم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

[illegible] نواب صاحب بھوپال ۔ عالی جناب ہز ہائی نس آغا خاں صاحب

[illegible] .... ساٹھ لاکھ روپے ۶۰۰۰۰۰۰

[illegible] سرمایہ .... پچیس لاکھ ۔ ۲۵۰۰۰۰۰

ادا شدہ سرمایہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ روپیہ

[illegible] کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے ایسٹرن فیڈرل، آگ زندگی، رسل و رسائل موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کے مالی معاوضہ ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمہ کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں۔

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں۔

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قایم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدر آباد (دکن) اور

احمد آباد

درد و انبساط مولانا عبدالودود صاحب درد بریلوی کا مجموعۂ کلام۔ مولانا انتہا سے زیادہ درد گو شاعر تھے، اپنی طبیعت کی افتاد اور درد و ذوق شاعری کے اعتبار سے [illegible] شاعروں میں سے تھے۔ فلسفۂ خیام کی تشریح اپنے مخصوص انداز میں جا بجا کی ہے [illegible] مناظر، آبشاروں کی دلکشی، کہساروں کی خوبصورتی، سیلاب کی مستی، گلوں کی رنگا رنگی، پر معنی خیز اور پاکیزہ نظمیں بھی ہیں۔ حسن قدرت کا مشاہدہ مولانا کا خاص مشغلہ ہے۔ غرض پورا دیوان دیکھنے کی چیز ہے۔ قیمت عمہ

کلام مشیر مجموعہ کلام مشیر حسین صاحب قدوائی وارثی۔ اس مجموعے کے بہت سے اشعار قصہ طلب یا خود موصوف کی واردات ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں [illegible] کہا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ گل کا لفظ التزام کے ساتھ کیوں لایا گیا یا افسردگی کا اشعار میں کیوں غالب ہے۔ یہ موصوف کی یورپ کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ قیمت ۸ر

شاعر کی راتیں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی رنگین و لطیف نظموں کا منتخب مجموعہ۔ قیمت صرف ۸ر

سلسبیل آل احمد سرور صاحب کا تین سالہ مجموعۂ کلام۔ راوی، جہلم، [illegible] اور لیڈر کے منظر خاص طور سے موثر ہیں۔ مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ بھی قابل دید ہے۔ قیمت عمہ

آزادی کی نظمیں مرتبہ سبط حسن صاحب۔ مختلف ادوار کے شعراء کی ان نظموں کا مجموعہ جو ملک کی سیاسی اور معاشی آزادی سے متعلق ہیں۔ یہ مجموعہ صرف نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ احساس غلامی کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم کس منزل پر ہیں۔ ہمارے رجحانات کیا ہیں اور ہماری آئندہ منزل کیا ہوگی۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: **مکتبہ جامعہ قرولباغ دہلی**

افسانے

ہلال اور دوسرے رومانی افسانے مصنفہ شفیق بانو صاحبہ مدیر خاتون مشرق موصوفہ کے ۱۲ افسانوں کا مجموعہ۔ ان افسانوں کی قدر و قیمت اس سادگی [illegible] بیانی [illegible] عیانی اور حقیقت کا ستھری اور سادہ زبان میں ظاہر کر دینا ہی ادبی عمارتوں کی بنیاد ہے۔ قیمت عمر

لمحی جھلکیاں حیات اللہ انصاری ایڈیٹر ہندوستان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ان [illegible] تاثرات کے حامل ہیں جو زندگی کی پیچیدگیوں نے ادب میں پیدا کر دیے ہیں۔ قیمت ۱۲

نئے افسانے از سید حسن ریاض صاحب۔ سابق ایڈیٹر ہمت و نوید۔ یہ افسانے ہندوستانی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے معاملات، معمولات، اعمال، اور جذبات کی تصویریں [illegible] بصرف تصویر کشی کے موقع پر لی گئی ہیں۔ قیمت ۱۲

نظارے مصنفہ کرشن چندر ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ حسین الفاظ اور نازک تاثرات کا ایسا [illegible] امتزاج، مصوری اور موسیقی کا ایسا دل آویز اجتماع، کیف اور رس کا ایسا [illegible] کون ہے جو اسے دیکھے۔ اور پھر دیکھنے کی آرزو اپنے دل میں نہ پائے اسے اور [illegible] پر آواز نہ رہے۔ یہ ہے کرشن چندر اور اس کا آرٹ۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد

سحر فرانس از طاہر ذہنی بی۔ اے بی ٹی۔ موپساں کے بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ترجمے کے متعلق عاشق حسین بٹالوی فرماتے ہیں۔ اردو میں تراجم کثرت سے ہو چکے ہیں اور کثرت سے ہوں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ طاہر صاحب کا انداز تحریر روانی اور دلکشی کی خاصی [illegible] کا حامل [illegible] ایسی [illegible] قبول عام کی سند حاصل کرے گا۔ ضخامت ۲۱۸ صفحے قیمت مجلد عمر

سوز ناتمام عاشق حسین بٹالوی بی اے ایل ایل بی کے بائیس مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ادراک کے [illegible] اسٹوری [illegible] بے قراریاں مغربی اور مشرقی انگریزی اور ہندوستانی تمدن کی آویزش کا [illegible] تماشائی کے الفاظ [illegible] عاشق حسین صاحب نے جا بجا ایسے سیدھے سادے لفظوں میں حیات بشری کے [illegible] [illegible] کی کیفیتوں کو حسن خوبی سے ادا کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کی داد نہ دینا ایک بڑا جرم ہے۔
ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت مجلد عمر

مذہب:-

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے مفید نکات بالتفصیل واضح فرماتے ہیں۔ قیمت صرف ۱۲/

نزول رحمت یا میلاد شریف یہ ۲۴ صفحے کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں ان عورتوں کو مذہبی تعلیم دی گئی ہے جو دینی تعلیم سے محروم ہیں۔ اس میں آنحضرتؐ کی پہلی تجارت، پہلی انجمن، سنگ اسود نصب کرنے کا واقعہ، غار [illegible] نزول وحی، ذکر معراج اور خطبہ وغیرہ کا مفصل ذکر ہے۔ قیمت ۴/

شرح اسماء اللہ الحسنیٰ یہ قاضی محمد سلیمان صاحب مرحوم کی تصنیف ہے۔ جس میں مرحوم نے اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حسنیٰ قرآن کریم اور احادیث نبویہ [illegible] اس انداز میں جمع کئے ہیں کہ اس میں ایک نئی شان پیدا ہو گئی ہے۔ پھر ان کی تشریح، ان کی لغوی تحقیق، ان کی فلاسفی ان کے خواص اور فوائد اس خوبی سے قلمبند فرمائے ہیں کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت عہ/

آیات خلافت مرتبہ جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قادری۔ اس میں قرآن حکیم کی چونتیس آیتوں سے خلافت مقدسہ کا اثبات اور اس مسئلے کے تمام ضروری مباحث کا دلکش بیان ہے۔ قابل دید چیز ہے۔ قیمت ۸/

متفرق:-

گھر گرہستی از سید بشیر حسن صاحب۔ اس میں ہر عمر کی عورتوں کو دلچسپ قصوں اور دلنشیں مثالوں کے ذریعے حلا اور خانہ داری اور اخلاق و معاشرت کی تعلیم دی گئی ہے۔ ضخامت ۲۴۳ صفحے قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۳ - نمبر ۸ | اگست سنہ ۱۹۳۷ء | چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن - محبوب المطابع دہلی

اُردو کی لائبریری
آپ اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان
ہے اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال
میں آپ کی بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار
ہو جائیگی اکادمی کے قواعد وضوابط ذیل کے پتے
طلب کیجئے
مکتبہ جامعہ نئی دہلی

مرحوم اصغر گونڈوی

انداز ہیں جذب اس میں کس شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکسترِ پروانہ

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں
[...]ن طرح آتی ہیں ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی
بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں ممکن ہی نہیں یقین ہے
دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لیے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں
[...]ن عادات سے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔

[...] صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ
[...]ے موقع پر علیگڈھ میں ہوئی تھی عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولنا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی
کے توسط سے ہوئی جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔
[...] وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولنا سہیل سے البتہ پرانی یاد[...]
[...] رات کے آٹھ بجے تھے مولنا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لائے۔ میں
[...]ٹہل رہا تھا سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ
[...] سے کچھ پورے سے ادا [...]ان کرتا آیا اس لیے کہ میں نے مولنا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گو اور [...]
[...] آدمی اب تک نہیں دیکھا ہے وہ عالمانہ نکتوں اور فقروں کو اس لطف و فصاحت کے ساتھ
[...]رے میں سموتے ہوئے برمحل و مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی
[...] جانتا تھا کہ انھوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا اس لیے میں گھر سے

تیار ہوکر نکلا تھا۔

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے۔ کمرہ چھوٹا تھا، دروازے بند اور روشنی مدہم کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ لحظہ سمٹتی جا رہی ہیں دراز قد، متوسط جسم، ستھری و خوش قطع پوشاک، سر پر پٹے، سڈول بھری بھری فرنچ کٹ ڈاڑھی، سر پر بادوں کی اونچی ٹوپی چہرہ پر اجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور میں شرافت متوسط مہذبانہ انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی بیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور بھلمنساہت سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا، مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم ان کی شخصیت کا جزو تھا ان کا مسکرانا لب و دہن کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولنا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا مولنا بولے، لو، ایک انسان لا یا ہوں میں نے کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے لو، لو، اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے، اور بغلگیر ہو گئے۔ اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور رحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولنا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھا لیا جیسے میرے ہاتھ اسے بیچنے والے تھے مجھے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھئے کیا لطف آتا پھر ایک خاص ترنم سے، ہمیشہ دردوں کے نہیں بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بنجائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دنیائیں
بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں۔ لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام
کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔
[illegible] بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ [illegible]
[illegible] بار [illegible] مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے

میں نے کہا مولانا شعر بڑے مزے کا ہے۔ للہ اسے بکس و بستر پر بیٹھکر اور لوٹا ہاتھ میں لیکر
فارغ [illegible] سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا۔ اصغر صاحب ذرا روح نشاط
تو نکالنا، ان کو اشعار سناؤں۔ میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔ جاڑا پڑ رہا ہے
گیٹی آتی ہے کھانا کھا کر جائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائے گا آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے
ہیں [illegible] س سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قائل
[illegible] کے قائل! مولانا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھکر ہنسے، دونوں پاؤں گھٹنے سے موڑ کر
[illegible] پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

ماہرین معاف فرمائیں، ابتہاج، و اہتزاز، ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل
[illegible] لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں خواہ غیر مانوس، ان کے برمحل و
بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق
[illegible] نازک مفہوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس گیا ابلہوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق
[illegible] فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو
[illegible] سے منتج کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا
[illegible] ہم کب چاہتے ہیں کہ آپ نرے احمق اور جاہل بھی ہوں اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے
[illegible] دیے جائیں۔

عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب ہم اپنا اور

اپنوں کا بھی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے۔ ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے اسے گنگنانے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آ گئے انگیٹھی سرد ہونے لگی نوکر نے کوئلے ڈال دیئے۔ نہ اندر سے کسی کی بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطر نیند ابھی سو گئے، بی چاہا بستر ہی پر رقص کرنے لگے۔

مولانا سہیل نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روح نشاط تو نکالیے۔ مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے میں نے کہا مولانا زرا ٹھہریئے، ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا ہے مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے اس کے بعد پینے اور مینا بننے کا سوال آئے گا مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متاع یوسفی مسلم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے رشید صاحب ساغر و میخانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے کلال پیدا کرتے ہیں۔ شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے مسجد، میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی، کمی رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا لیکن یہ تو بتایئے مولانا سہیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی نہ پوچھیئے تمام عمر میخانہ میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب کو نہیں گواہ سرکاری، بھی علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے — مولانا بولے نکالا جاتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا میں نے کہا وہی جواب اصغر صاحب کا ہے اس پر مولانا

اور صغر صاحب دونوں نے قہقہہ لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاط روح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا، آپ نے نشاط روح کا مطالعہ بھی کیا۔ میں نے کہا، اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود ہیں آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے یہ شخص بلا سبب ورا‌ں ہے شعر سے لطف اٹھانے کے بجائے سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ دیکھئے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بزاخفش سے الجھا ہوا ہے کیا اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہئے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا پوری غزل سنیئے شاعر کو اسی طرح سننا چاہئے۔ تصور سے ہمکنار ہو جئے تصویر دیکھکر کیا کیجئے گا پھر یہ غزل سنائی۔ کیا نرم پرتمکین و گوارا لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے — جمال دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی

فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — ادائے رسم بلالی و طرز بولہبی

سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں — حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

دبیا سکا عشق نے بھی شورشیں اٹھائی ہیں — جہاں سے تو نے لئے خندہائے زیر لبی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ لے ساقی — چھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے۔ لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحب فراش رہا اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالاخانہ پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سنتا دروازہ کھلتا، اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے دیکھکر یا محسوس کرکے خوش ہو رہے ہیں۔ سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے

جیسے کوئی خوشخبری سنا رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے۔ بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آنکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے میں نے کہا فرشتوں کو بھی! فرمایا فرشتہ کو شیطان ہوجاتے بھی تو آپ نے سنا ہوگا! میں نے کہا اصغر صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے اصغر صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف سے سنائی۔

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ	اُڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو کہ بتخانہ
یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بتخانہ	اک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ
قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی	تو صورت مستی ہے تو معنیٔ میخانہ
اب تک نہیں دیکھا ہو کیا اس رخ خنداں کو	اک تار شعاعی سے الجھا ہے جو پروانہ
مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمی حسن شمع	اس سے بھی زیادہ ہے سوز غم پروانہ
زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیر ہے	صد رشک طریقت ہے یہ لغزش مستانہ
اک قطرۂ شبنم پر خورشید سے عکس آرا	یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ
اندر رہیں حدت امیں سب شمع شبستاں کے	اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے ہیں بلکہ یوں ہی باہر جا رہے ہیں جب میں صحتیاب ہو کر واپس آگیا تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں میں نے پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی۔ میں نے آپ کو اتفاقاً بھی کبھی فکرمند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں اچھا سنئے

[illegible]

یک لطیفہ سناتا ہوں۔

[illegible] سے مکان واپس آ رہا تھا۔ [illegible] صاحب راستہ میں ملے اور نہایت
[illegible]ناک لہجہ میں بولے کہ اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہو گیا ایسے
تھے [illegible] کر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا میں جانتا
ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے انھوں نے مجھے بدحواس یا بیوقوف سمجھا اور لگے اپنی
[illegible] موثق ذرائع بتانے گنانے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی
[illegible]ت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے وہ نہ مانے میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دیکر
[illegible]یافت کر لیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر
[illegible]پ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا، انھیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب
[illegible] پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ
[illegible] وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے لیکن اردو کے بہت
[illegible]شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رسا طبیعت تھی نئے سے نئے اور پیچیدہ
[illegible] علمی مسائل کی تہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس
[illegible] سے انکا یہ سابقہ پہلے ہی بار پڑا تھا انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فن تنقید کے جدید
[illegible] اصول سے آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے سابقہ
[illegible] آپ کے قلم سے نہایت متوازن مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا
[illegible] پکے مسلمان اور مشرقی تھے لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور جہت
[illegible] کا معترف پایا اردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور، رنگینی اور وزن
[illegible] کے لئے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اردو کے اکثر مستند اہل قلم بھی الف لیلہ کے یکبارہ

سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اسے رہ بھی کہیں تو ہرج نہیں لکھیں گے اس طرح جیسے دوا کا اشتہار لکھ رہے ہیں "ہمدردوا خانے" ڈالتا ہے یا محبوبہ بھاگ گئی ہے۔ مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں خطرناک... رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر انھوں نے "تحفوں" کا ایک سلسلہ بچوں کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دلنشیں انداز سے روشناس کرایا ہے کچھ دنوں ... ہو سکے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اردو کی ... تاریخ" شروع کی تھی کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے اُن کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا، بہت اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔ اُن سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجہ کے مال پر اکتفا کیا ہے ان کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا خفیف فقرے زبان سے نہ نکالتے۔ گفتگو آہستہ کرتے، مسکرا کر کرتے لہجہ ہمیشہ نرم، پُر وقار یا شگفتہ ہوتا میں نے اُن کو کبھی مایوس، منفعل یا مضطرب نہ پایا اُن کے ملنے والے مختلف و متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا منغض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے ذیل میں لب سڑک لے لیا تھا بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے، الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا

ب کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لئے اس جگہ کو چھوڑیے۔ لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ
ہو کہ یا تو [illegible] کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھورے پر چوکا لگانے سے
[illegible] ہے؟ مجھے تعجب ہے اس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک جملہ کیوں نہیں کس دیا۔ اگر
علاج چھوڑنا [illegible] ہو تو ہومیوپیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے
[illegible] نے بات ٹھیک کہی، مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا
آ[illegible]ئی خود مجھے کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اسے فوراً خرید لیتے، دوستوں کو دکھائی جاتی، کوئی پسند کر لیتا تو
اسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ [illegible]
میں میرے ہاں ٹھہر گئے، سینی دکھائی، پوچھا کیسی ہے۔ میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ، "فتوحات"
میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گذر۔ میں نہ ملّا نہ انگریز۔ جو تحفی تو خریدنے
کی ہوتی ہے میں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے، واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، سنا نہیں،

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود

بس یہ آپ کی نذر ہے! وہ سینی اب تک میرے پاس ہے، بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی
ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آ جاتی ہے تو اسے منجوا تا ہوں، اسی میں کھانا منگا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں
غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے
ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جانے والے جاتے ہیں
بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو ماضی کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خط و خال
رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزیں و حسیں نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں!

اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام
کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ ہنسنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں کھل کر
ہموار پڑتے۔ آخر آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلو بڑیہ کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لیا تھا

مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں انہیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا ڈھیلا آبرو کا کرتا، سر پر سپید ٹوپی، ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ تھوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹ کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے، قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہوئے اُن کا باغ باغ ہونا زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

اُن کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہتے رشید صاحب سُنا جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا زیادہ عیاش ہو گیا ہوں ہر طرح کے پان تمباکو فراہم رکھتا ہوں۔ یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگریٹ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب کی صحبتوں میں آتا ہے اسی قسم کی باتیں کہتے مکان پہنچتے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کیا ہے، یہ اُوولٹین کا گلاس ہے یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کو مڑ کے مکھن کھائے ہیں؟ ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمائیے غرضکہ ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے۔ پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہدیا تھا دن قریب ہیں آج اُسے آپ دسترخوان پر چار دن شانے چت پائیں گے۔ یہ مرغ مسلم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپگنڈا کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا یہ برقی قوام ہے۔ وہ زعفرانی پتی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے اُن کے مورث اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام "آبرو" تھا۔ اودھ تو ختم ہے اسے ضرور چکھئے میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن آج

علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جائیے جس کی آبرو خطرہ میں دیکھئے گا دیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لئے تھا جو چیزیں اور باتیں مجھے پسند تھیں انہیں کو المضاعف کرکے اور خود اوڑھ کر پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے ان کی ایسی حکمت عملی کو واپس کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اس کا ایک ٹوکرا مانگ کر دیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لئے کچھ آپ لیتے جائیے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تو تھوڑے انہیں بھی بھیج دیجئے گا۔

مع متعلقین وطن سے علی گڑھ آ رہا تھا۔ راستہ میں چند گھنٹوں کیلئے الہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹیک دیتے اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا سب کے سب دوڑ پڑے کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی۔ بہت دنوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہو گئے تھے بعض لوگوں نے سمجھایا اور کرنے مانگا لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اتارا تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لئے واپس ہوئے شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے ہیں دوست کا بچہ، کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے مجھے کتنی الفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ دل میں بھول گیا کہ بیمار ہوں دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد ہو سے سے زیادہ دلکش اور پیارا ہے ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے میں نے بچو کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ

احمد کے ہوکو زیر کر دیا چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر ومباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی۔

ایک بار خط آیا لکھا تھا "بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں، دیکھیے کیا انجام ہو"

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگائے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے۔ ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے۔ مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی تو اصغر صاحب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہدیا، اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہوگئے کہنے لگے کیا کہوں ان کے گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا گلابوں کے بارہ میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے۔ کمبخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا۔ صاحب الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بد عادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڈھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد ہوا صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹالدینے کی کوشش کرتے رہے جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو کہنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا صبح چلے جایئے گا میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور تا

ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ مرے انکار پر ایسا معلوم ہوا [illegible] مرحوم کے چہرے پر تیغ پڑ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طرح [illegible] میں [illegible] دل شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

ایک ہی دو دن کے بعد ریڈیو سنا۔ آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی!۔

دوسرے دن میں آلہ آباد پہنچا بلو ڈپر کا راستہ سونا تھا طبیعت بے اختیار ہو گئی خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے کچھ اور نہ تھا اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا تاثری خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے یا برے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں سان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دینگے اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو امنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر آیا قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جنکے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہہ تک لوگ

نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحب فکر ہوں یا لوگ بڑی بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا اہلیت لازمی نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے سپرد ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے میرا یہاں مطلب صرف اس تیقنگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصورات سے مرحوم کو تھی اور جن کے حقیف سے خفیف ارتعاش بھی ان کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جاتے۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب سطے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہے گے اور ہی گزریں زندہ رہنے میں ارادہ کو بھی بہت بڑا دخل ہے ہوش میں رہ کر تو میں مروں گا نہیں البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے ہٹ کیجئے چنانچہ ایسا ہی ہوا مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گذرے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انہوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا

آمالی تھا وہ کچھ اور ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا اوباش، قلندر، ارباب علم وفکر صاحب باطن ارباب دول بکو اسی وسبے بہرہ طالب [illegible] بازاری لوگ میں سے ہر ایک کو ان کا قائل پایا ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

[illegible] صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے جن کی قابلیت اور شخصیت مسلم ہے وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو [illegible] یا ناتوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہئے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کرنا عزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا!

جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہو رشید احمد صاحب ایک پاس بیٹھے ہوئے تھو یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لیکر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دئے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے

[illegible] گردم این جانے صد و انجم را — زجوش بندگی پروردگار سے کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غماری کر رہا تھا اور مرشد کے اضطراری عمل کا کیا درجہ ہوتا ہے ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علیگڈھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا کُفر ہے ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر وفکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سینہ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے بڑے کڑھتے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا

بڑا پاس کرتے تھے مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو آنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب
ایسے غیور، عزت پسند، قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا
بہتر سمجھتے ہیں اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے
بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں
اپنی اس افتادِ طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے
عالمِ ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے میں نے ان کو انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں
دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام
آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم
ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی
بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم
کی نظر سے یہ سارے مضامین گذرتے تھے لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا
بھلا کہتے نہ سنا اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہو اور
خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کڑیاں اٹھ جائیں تو دنیا اختلال محض ہو کر رہ جائے
ایک دفعہ انھوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم
ہونے لگتے ہیں لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے حالانکہ
اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہئے
کہ برے غزلگویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں دیکھنا یہ چاہئے کہ اچھے غزلگو کتنی خوبیاں پیدا کر سکے
ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔
مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدِ نظر رکھکر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ جب گھرے از

لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں کاش میرے خیالات و احساسات کوئی [illegible] کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں!

ایک دفعہ میں نے عرض کیا، اصغر صاحب آپ تو جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کیوں [illegible] صرف اول درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک سحر جبری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب یہ آپ نے کیا بات کہی! آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجہ کی بات کہتا ہے! کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اول ہی درجہ کے شعر کہتا ہے۔ سننے والے کے نزدیک وہ اول درجہ کا ہو یا دوم درجہ کا اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اُسے کہدیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گذریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہو جائے۔ بڑے بت شکن تھے کچھ دن اور جیے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الٰہی انھیں براہیم نہ بنا دیتی۔

سر سپرو کا بڑا احترام کرتے تھے کہتے تھے سر سپرو کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گذرنے دیں گے۔ اردو ہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر سپرو اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے بربنائے اردو الفت ہے۔ دونوں میں پرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضعداری ملتی ہے۔

انھی جماعتوں کے مختلف الخیال طلبا اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان

جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میں نے مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی، بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں [illegible] ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف علموں سے ہوتی ہے پھر آپ [illegible] ہیں کتابی اور اخباری علم (مسکرا کر) بزرگوں کے تصرف کا ہمیشہ محتاج رہے گا جب علم، ورزش اور علم نایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے ۔

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ وہ جمال و کمال اور تصورات کی وہ میناکاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انیس کی طرح محبت کرنے والا، رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہولیں گے اقبال آپ کو سرمو، ادھر ادھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال

سے ان موضوع فکر (تعمیم) اور دعوت عمل ہے، اصغر کے ہاں تصورات جمیل اور دعوت دید۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اور اصغر، خانقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کے اہتمام ترصیع میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گذری ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتاسر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خامکاری نہ ملے گی آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رفعتیں اور ان کی ذمہ داریاں ان کے ہاں تفصیل میں تحلیل ہے کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل ہے وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی، کیف و کم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خد و خال نظر آتا ہے عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے، بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعری نہیں دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے قصور اس مقصد اور معیار کا ہے جس کے واضع نہ متعلم نہ مداح!

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے!

رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ)

گراف اسپی

[نام دیکھ کر آپ کو شاید یہ خیال ہو کہ نظم سیاسی ہے، مگر میں کہوں گا اس میں اتنی ہی سیاست ہے جتنی ایک شاعر کو آسکتی ہے]

واقعہ کے حالات انگلستان کے مشہور اور مستند اخبار "مانچسٹر گارڈین" سے لیے گئے ہیں اور اصل واقعہ سے کوئی تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ نظم کا لطف اٹھانے کے لئے واقعات کا جاننا ضروری ہے۔

۱۳ دسمبر کی صبح تھی۔ سنیچر کا دن تھا۔ سمندر پر فضا بالکل صاف اور روشن تھی۔ ایک برطانوی کروزر "ایجیکس"، فرانس کے بڑے جہاز "فارموسا" کو ساتھ لئے ہوئے "پنٹا ڈیل اسٹیٹ" کے اطراف سے گزر رہا تھا۔ اس کے قریب کچھ فاصلہ پر دو اور چھوٹے جہاز "ایکسیٹر" اور "اکیلیز" بھی تھے۔ صبح ۶ بجے اسے افق پر دھواں نکلتا ہوا نظر آیا۔ وہ سمجھا کہ ایک اور جہاز "ایڈمرل شیر" ہے لیکن یہ درحقیقت سلطنتِ جرمنی کا نہایت تیز اور قوی پاکٹ جنگی جہاز "ایڈمرل گراف اسپی" تھا جس نے نو برطانوی بڑے اور چھوٹے تجارتی جہازوں کو غرق کیا تھا اور ان عملے کے ساتھ اکثر سپاہیوں کو قید بھی کیا تھا۔

گراف اسپی کے بیچوں بیچ سربلند آہنی قلعہ تھا جس پر چاروں طرف سولہ انچ سے لے کر گیارہ انچ کی زبردست توپیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ تیز سے تیز تجارتی جہاز بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ اس کی توپوں کی رد تیس ہزار گز تک تھی اور بم کا وزن   پونڈ سے زائد تھا۔

جب جہازوں کے درمیان ۱۲½ میل کا فاصلہ رہ گیا تو گراف اسپی نے "ایکسیٹر" کے اونچے مستول کو دیکھ کر بموں سے اس کا خیرمقدم شروع کیا۔ چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سمندر اور صبح کی معصوم فضا میں اس خیرمقدم نے برطانوی جہازوں کو فوراً مشتعل کردیا۔ پہلے "ایکسیٹر" نے جس پر ۸ انچ کی توپیں تھیں اور جس کی رد میں ہزار گز تھی اپنی قسمت آزمائی شروع کی۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقعات کے لحاظ سے یہ بھی ممکن تھا کہ جہاز بچ کر بغیر جنگ کئے نکل جاتے لیکن اتفاق سے تین برطانوی جہاز

کی قربت سے انہیں گراف سپی جیسے قدیم اور قوی حریف کو محصور کرنے کی سوجھی۔ اجیکس نے فارموسا
کے سامنے دھوئیں کا پردہ ڈال کر کے اپنے ساتھی جہاز کو ساحل کی طرف روانہ کر دیا۔ ایکسیٹر
اپنے قوی حریف کے ساتھ سینہ سپر ہوا۔ اس پر ۸۰۰ پونڈ کے وزنی بم پھینکے گئے۔ ۲۰ جانوں
[illegible] بجے کے ۱/۲ ۲ بجے یعنی ڈیڑھ گھنٹے کی لڑائی میں یہ جنگ کے قابل نہیں رہا اور واپس
ہو گیا اس اثنا میں اجیکس نے دوسری طرف یعنی ساحل کی جانب جا کر گولہ باری شروع کی اس طرف
[illegible] سامنے شروع کئے ان تینوں جہازوں نے نشانہ بازی کا ایک مثلث قائم کیا تاکہ اپنے
قوی حریف کو محصور اور مجبور کریں۔ ان جہازوں پر صرف ۶ انچ کی توپیں تھیں لیکن انہوں نے بڑے
ہی کمال اور استقامت کے ساتھ دن بھر جنگ جاری رکھی۔ اور پانچ مرتبہ گولہ باری کی۔ اس
متفقہ حملے نے جرمن "نوشیرواں" کو اتنا عاجز کر دیا کہ ۱۴ دسمبر کی رات کو بارہ بجے اسے بندرگاہ
مانٹی وی ڈیو (جنوبی امریکہ) میں پناہ لینی پڑی لڑائی میں اجیکس کی توپوں کے ۴ مورچے تباہ
کر دئے گئے ۶۰ جانیں تلف ہوئیں۔ اشیلیز پر بھی سخت جانی نقصانات ہوئے۔

بندرگاہ مانٹی وی ڈیو کے اطراف تین سو میل تک "امن کی سرحد" ہے یہاں حکومت یوراگوئے
کے ارباب حل و عقد نے گراف اسپی کو صرف ۷۲ گھنٹوں کی مہلت دی کہ وہ اپنے آپ کو
درست کر لے خوف یہ تھا کہ زیادہ دیر ٹھہرنے سے کہیں جنوبی امریکہ کے ساحل تک جنگ کی
آگ نہ پہنچ جائے۔ اس اثنا میں تینوں برطانوی جہازوں نے نیوزی لینڈ والوں کی مدد سے اپنی
ترمیم کر لی۔ ایک بڑا جنگی جہاز کمبرلینڈ بھی آ پہنچا اس طرح ایک قوی برطانوی بیڑا اس امر کا انتظار
کرنے لگا کہ گراف اسپی "سرحد" سے باہر آئے۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک قوی حریف اتفاق سے گھر گیا ہے جس کیلئے سوائے جنگ بھاؤ کی
اور کوئی صورت نہیں۔ ایسے نازک وقت میں صرف ۷۲ گھنٹوں کی مہلت اتنی کافی نہ تھی کہ سنبھالا لیکر
کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔

بہرحال وقت مشورہ کے بعد کیپٹن لیا گسڈراف نے جہاز کو باہر نکالا حتی الامکان جنگ

کی لیکن اپنا انجام قریب دیکھ کر پہلے سارے اہل جہاز کی جو ایک ہزار کی تعداد میں تھے اور جن میں ۵۱ برطانوی قیدی بھی تھے جان بچانے کا ارادہ کیا اور انھیں کشتیوں میں سوار کر کے بونس آئرس پہنچا دیا جہاں مملکت ارجنٹائن کے ارباب حکومت نے انھیں نظر بند کر لیا۔

کیپٹن لینگسڈراف نے آخر وقت ایک برطانوی قیدی کیپٹن ڈو و سے جو بعد میں رہا ہو گیا یہ الفاظ کہے "تم انگریز لوگ بڑے چہیتے ہو گئے ہو۔ جب لڑائی ایسی ہو تو ہم تم آپس کا جھاو بھول جاتے ہیں" اس نے قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ایڈن کی یہ روایت قائم رکھی کہ جنگ نہ کرنے والوں کو جانی نقصان نہ پہنچایا جائے

۱۹ دسمبر کی رات کو اس نے دو زبردست یادگار اقدام کئے ایک تو یہ کہ ہٹلر سے یہ اجازت ملنے کے بعد کہ "تم جو چاہو کرو" گراف اسپی کو دریائے "پلیٹ" کے باہر سرنگ لگا کر اڑا دیا، تاکہ وہ حریفوں کے ہاتھ نہ لگے دوسرے ۱۱ر دسمبر کی شب کو اپنے تنہا کمرے میں اس نے پستول سے اپنی جان دے دی۔ اس طرح چھ سات روز کی ایک جان فرسا کشمکش میں یہ دریائی ڈرامہ انجام کو پہنچا]

منظر پہلا

[۱۳ دسمبر بمطابق ۵ بجے صبح سمندر دنیا سے اس طرح مخاطب ہے]

چھایا ہوا ہوں زندگی بے قرار پر — نسبت ہر ایک شے کو مری انجمن سے ہے
ہر ذرۂ زمیں ہے پہنے قبائے نور — یہ خاک رنگدار مرے پیرہن سے ہے
انساں کی جرأتوں کا ہوں دشمن سنا ہوا — تھوڑی سی دوستی مجھے چرخ کہن سے ہے
گو خشک ہے سیاست دنیا سے کم نگاہ — اس میں جو دلکشی ہے مرے بانکپن سے ہے

صبح کا دھندلکا

اک تماشا کرنے والے کا ہوں میں پالا ہوا — ہوں ترے اسٹیج پہ پردہ سا ایک ڈالا ہوا
صبح اولیں ہر روز نئی صبح سے ہر روز نئی شام — دریائے رواں پاس ترے ہے کوئی پیام؟

سمندر

مری ظلمت سے یہ موجیں اپنی عظمت ڈھونڈ لیتی ہیں — مری پہنائیوں میں دل کی دولت ڈھونڈ لیتی ہیں
وہ موجیں جن کے آگے کھیل ہے طوفان سے لڑنا — اسی ذوقِ فنا میں اپنی قسمت ڈھونڈ لیتی ہیں
ایسی [illegible] کی ناز فرمائی — وہ بوندیں جو صدف میں اپنی خلوت ڈھونڈ لیتی ہیں
مری [illegible] پانی کے اندر مچھلیاں بن کر — جانِ درد میں پیغامِ راحت ڈھونڈ لیتی ہیں
نظر آتا ہے ان کو ڈوب کر پرنور ہو جانا — مری شادابیاں جب میری ظلمت ڈھونڈ لیتی ہیں
لگا رکھتا ہوں سینے سے میں اُن رنگیں نگاہوں کو — جو میرے آئینے میں اپنی حیرت ڈھونڈ لیتی ہیں

دھندلکا

اے صبح تو دریا پہ بڑی شان سے آئی — اپنا کوئی پیغام زمانے کو سنا دے
اس عالمِ مغرور کا دل بھی ہو دو پارہ — ایسا کوئی نظارہ جانسوز دکھا دے

صبح اولیں

گو اک گھڑی کی عشرتِ رنگیں سے شاد ہوں — میں تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ ناشاد بن کے جی
باقی نہیں چمن کو تری خوش نوائیاں — اے صید خود فروش تو صیاد بن کے جی
بھونچال، آگ، زلزلہ، طوفان بن کے اٹھ — آباد سرزمیں پہ برباد بن کے جی
الٹا دے ہر اصول غلامی کو یک قلم — اندھا خیال امن کو آزاد بن کے جی

دھندلکا

لو صبح کے دریا کا نظارہ دکھاتا ہوں — تھوڑا سا نگاہوں سے میں پردہ اٹھاتا ہوں

[دور افق سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے جہاز آ رہا ہے]

روحِ نظارہ

اے گھڑ، دور افق پر ہے نظارہ کس کا؟ — ل رہا ہے مری آنکھوں کو سہارا کس کا!

دھندلکا

حیرانی نگاہ کو پھر آزما کے دیکھ — مقصود دیکھنا ہے تو نزدیک آ کے دیکھ!

جرمنی کا بائک جنگی جہاز "گراف اسپی" دھواں اڑاتا ہوا چلا آ رہا ہے اس کی ہر چیز فولاد سے بنی ہوئی ہے بیچ میں سہ منزلہ آہنی قلعہ ہے چاروں طرف گیارہ انچ کے دہانے کی توپیں گردنیں نکالے ہوئے سمندر کے وسیع خلا کو تاک رہی ہیں درمیانی قلعہ کے بالائی منزل پر کھڑکیوں سے کپتان لانگسڈارف دوربین لگا کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے بازو میں بحری فوج کا جنرل کھڑا ہوا ہے پیچھے برقی تار کی ایک چھوٹی سی میز پر ایک شخص وائرلیس کا سامان کانوں سے لگائے ہوئے ہے دوسرا ٹیلیفون لیکر کپتان لانگسڈارف کے احکام دوسری طرف بھیج رہا ہے۔ کپتان آنکھوں سے دوربین ہٹا کر مایوسی کے لہجے میں

کپتان

یہ سمندر دیکھنے دیتی نہیں کچھ بھی مجھ کو — ایسی مجبوری سے ہو خاک تسلی مجھ کو

جنرل

فطرت کے اس غرور سے مدہوش کیوں ہو تم؟ — اس پردۂ خیال سے خاموش کیوں ہو تم؟

دوڑائیں اس فضا میں چلو روشنی کی دھار — باقی رہے نہ دید کا آنکھوں کو انتظار

(ایک ایسی دوربین کے قریب آتے ہیں جس سے برق کی تیز روشنی میلوں دور تک جاتی اور فضا کو منور کرتی ہے جنرل چند کیلئے گھماتا ہے کپتان اسے روک کر)

کپتان

واہ کیا اچھی سیاست ہے کہ ان شعلوں سے — اپنے دشمن کو کمیں گاہ دکھانا چاہو!

جنرل

اور یہ کون دلیری ہے کہ نادان بن کر — موت سے سینۂ دشمن کو بچانا چاہو!

دوسرا منظر

صبح کا اُجالا جہاز پر ہر طرف احتیاط کا آغاز۔ ہر شخص اپنے اپنے مقام پر ہے۔ کپتان، جنرل، سپاہی

[illegible] تمام جنگجوؤں کے چہروں سے رعونت اور خود اعتمادی ٹپک رہی ہے۔ اور سب کے سب ایک [illegible]یت کے عالم میں ڈیوٹی پر ہیں کارروائی کمروں میں ابھی رنگین چراغ جل رہے ہیں۔ لیکن [illegible] پر قبضے پڑے ہوئے ہیں۔ جار کے اور ایک بڑے ہال میں جو چاروں طرف سے بند ہو [illegible] بکا دبی میڈ سکتا ہے۔ سپاہی دوڑ کے ایک حلقے میں کھڑے ہو جاتے ہیں بیچ میں کمانڈر اور اس کے ساتھی رہتے ہیں سب مل کر ایک ترانہ گاتے ہیں پہلے ہوٹی اور گونجتی ہوئی آواز میں پھر جوش کے ساتھ۔

اے سمندر تری موجوں پہ رواں ہوتے ہیں
راستے موت کے اب تجھ پہ عیاں ہوتے ہیں

ہم غلامی کو مٹا کر ہی رہیں گے آزاد
یہ قسم کھاتے ہیں جس وقت جواں ہوتے ہیں

ہم کو روندا ہے بہت اہلِ سیاست نے مگر
آج ہم اہلِ سیاست پہ عیاں ہوتے ہیں

کرکی چھاؤں کو سمجھا ہے رہائے بے امن
کتنے ہم رنگِ یقیں وہم و گماں ہوتے ہیں

ہم نہ منہ آئیں نہ الفاظ یہ مرنے والے
موت کے شعلے بہت تیز رواں ہوتے ہیں

مدتوں سے ہوس زر میں قلم چلتا ہے
جاں فروشوں کے لئے تیر و سناں ہوتے ہیں

کوہ آتش کے نشانے تو سست کسٹے تھے
آج دریا بھی یہاں شعلہ فشاں ہوتے ہیں

اپنے دامن میں لئے پھرتے ہیں موت اور حیات
یہ سفینے جو سب ورد و رواں ہوتے ہیں

ریڈیو کے ذریعہ ایک تیز آواز ہال میں آتی ہے "دشمن، حملہ"! سارے سپاہی تیزی کے ساتھ منتشر ہو جاتے ہیں جہاز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ کپتان یا کمانڈر اور جنرل، دونوں قطب نما اور نقشوں پر جھکے کھڑے ہوتے ہیں چھت پر کانچ کی ٹیوبوں میں سرخ برقی دھاریں تیزی سے دوڑنے لگتی ہیں

(صبح کے ۹ بجے مقابل کا جہاز ۱۲ ½ میل رہ جاتا ہے۔ گراف ایسی سے گولہ باری شروع ہوتی ہے)

سحر کی روشنی

تقدیر کی موجوں پہ زمانہ کی صدا میں
وہ بڑھنے لگا تیز جہاد کا سفینہ

آبادی و کہسار سے قوموں کے ارادے — آنے لگے دریا پہ بھی تانے ہوئے سینہ

انسانوں پہ چھا جائیگی سمندر کی جوانی — ن جائیگی ہر موج روانی ت کا زینہ

آتی ہے جہازوں پہ لئے جنگ یہ پیغام — آزاد ہے قوم کا مرنا ہو کہ جینا

گراف اسی کے آگے ہوتا ایک جو میں قافلہ موت اس پر سوار ہو اور ہنستی ہوئی سب آگے داقوم کو کہہ رہی ہے

موت ہم سے،

کہتے ہیں خوش آمدید ناز سے انساں مجھے — لیتے ہیں آغوش میں شہر و بیاباں مجھے

دیکھ کے خوش ہوتا ہے وقت گریزاں مجھے — دوش پہ لے جاتی ہے گردشِ دوراں مجھے

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست!

شوکت مذہب ہوں شوکتِ افکار ہوں — منزل نادار ہوں، مایہ زردار ہوں

عقل کی مہمیز ہوں علم کی رفتار ہوں — محشر تخریب کا دل سے طلبگار ہوں

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست!

عشق کے ایوان پہ حسن کے آغوش میں — امن و محبت کی ہر منزلِ خاموش میں

خانۂ عقل میں میکدۂ ہوش میں — جاؤں گی میں دہر کی محفلِ پرجوش میں

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست!

عقل بشر کے سفیر، صاحب زر کی پکار — شوکتِ اقوام کے ہوشربا شاہکار

طاقت پرواز کے سلسلۂ بے قرار — اے مرے پیامبر، اے مرے آئینہ دار

تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست!

تیسرا منظر

سلطنت برطانیہ کا جہاز اجیکس، ایک فرانسیسی جہاز جارموسا کے ساتھ جا رہا ہے اس کے قریب قریب دو اور جہاز اکسیٹر اور اشبلیز ہیں۔ بم کا گولہ پانی میں آکر گرے دور سے گرتا ہے پانی پہاڑوں اچھلتا ہے۔ اجیکس پر نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے ایک سپاہی دوسرے سپاہی سے)

سپاہی مبارک وہ نظر آیا حریفِ جاں ستاں
امن کا جس کو پیامِ شادماں سمجھے تھے ہم

دوسرا سپاہی

آہ کیا ٹوٹا ہے قدرت کی لطافت کا طلسم
اس سحر کو جنتِ امن و اماں سمجھے تھے ہم

قطرے قطرے میں نظر آتا تھا رازِ حسن و عشق
صبحِ رنگیں کو نگاہِ دلبراں سمجھے تھے ہم

تھیں شفق کی بزمِ رنگیں میں ازل کی تابشیں
ابر کے جلووں کو شمعِ لامکاں سمجھے تھے ہم

پیغام لانے لگا یہ موت کے شعلوں کے ساتھ
نیلگوں پانی کو روحِ آسماں سمجھے تھے ہم

آج اُس پر بھی ہے اک افسردگی چھائی ہوئی
اِن پرندوں کو قضا کا رازداں سمجھے تھے ہم

اس کے سینے سے نکلتی ہے فغانِ دردناک
موج کے نغموں کو شورِ میکشاں سمجھے تھے ہم

اس تموج کر حواس بم سے ہوا ہے سینہ چاک
ارتعاشِ نور کا اک کارواں سمجھے تھے ہم

وسعتِ دریا میں بھی دستِ اجل کا اژدہے
زیست کی رعنائیوں کو نوجواں سمجھے تھے ہم

(بم پانی میں گرنے سے مچھلیوں کے درمیان ایک پریشانی پیدا ہو جاتی ہے دو مچھلیاں آپس میں باتیں کرتی ہیں)

مچھلی

کون دریا کو مرے زیر و زبر کرتا ہے
کس کے ہاتھوں مری دنیائے سکوں ہے برباد؟

ہے پری خانۂ فردوس سے بڑھ کر یہ چمن
یاں نہ اندیشۂ گلچیں ہے نہ خوفِ صیاد!

چھپ کے بیٹھے ہیں نگاہوں سے فلک کی ہم لوگ
چند سانسوں پہ رہے تا بہ ہماری بنیاد

کون پیدا ہوا اک دشمنِ اہلِ دریا
کانپ اٹھا کس کی نظر سے یہ جہانِ آزاد؟

دوسری مچھلی

سنتے ہیں خاک پہ رہتا ہے کوئی صاحبِ ہوش
جس کی تقدیر کا دنیا میں نہ فردا ہے نہ دوش

عالمِ بے بدل، وہ واقفِ رازِ افلاک؛
خالقِ امن و کرم، مالکِ ہیئتِ بے باک؛

جس کے قانون میں اخلاق کے سنگِ بنیاد؛
جس کی ترغیب سے تعمیرِ جہانِ آباد!

جس کی تہذیب کے دامن میں حیات دائم؛
جس کی تعمیر کے سایے میں محبت قائم!

علم سے جس کے چمکتا ہے دو عالم کا جمال؛ — عشق سے جس کے بھڑک جاتا ہے فانوس خیال؛
جس کی طاقت سے نگونسار قوائے ہستی؛ — جس کی حرمت سے سرا فراز فضائے ہستی؛
جس کو دعویٰ ہے محبت کی جہانبانی کا! — جو طلب گار رہے کونین کی سلطانی کا؛
یہ اسی ساقیٔ امید کے پیمانے ہیں؛ — یہ اُسی اشرف مخلوق کے افسانے ہیں؛

پہلی مچھلی

بے شک اس ظالم و مغرور کا ہے کام یہی — اس کے اقدام سیاست کا ہے انجام یہی
اس کی بیداریٔ افکار سے فطرت مجبور — اس کی آزادیٔ اعمال سے، دنیا مسحور
اس کی تحقیق سے پایا ہے تباہی نے فروغ — اس کی تصدیق سے پُرنور ہوئی بزم دروغ
کرۂ ارض کی تقسیم سیاست اس کی — موجد طرزِ غلامی ہے قیادت اس کی

اس کو ہم "صاحبِ ایمان" کہا کرتے ہیں؛
اس کو دنیا میں ہم "انسان" کہا کرتے ہیں!
[ایک اور بم گرتا ہے دونوں مچھلیاں اس کی زد میں آکر مر جاتی ہیں]

چوتھا منظر

جہاز اکسیٹر آ رہا ہے۔ مگر ابھی اس کے سامنے دھوئیں کا پردہ ہے۔ یہ اکسیٹر کو اپنی پوری توجہ کا مرکز بناتا ہے اکسیٹر کے کپتان اور کمانڈر سپاہیوں کو جو سفید اور نیلی وردیاں پہنے ہوئے ایک اقلیدسی تنظیم کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں، ہدایت کرتا ہے پیچھے بم کے گولے آکر گر رہے ہیں بعض گولوں اور ان کے پرزوں کو سپاہی اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے ہیں۔ کہیں آگ لگ گئی ہے۔ کہیں دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں سپاہی چاروں طرف تیزی سے مصروف ہیں بعض لوگ جہاز پر جمع شدہ پانی خالی کر رہے ہیں۔

برطانوی کمانڈر

بہت آسان ہے لانا تباہی امن عالم پر — بڑا دشوار ہے آنا سلیقہ جاں نثاری کا!

تمہاری عظمتیں مدحت ہیں محرمِ زمانہ کی
تمہاری ہمتیں آئینہ ہیں اندیشہ کاری کا

بتائے تم نے جمہوروں کو آدابِ شہنشاہی
سبق تم نے دیا سب کو دلوں کی پاسداری کا

ہمیں معلوم ہے تم میں روحِ مزدوراں بھی شامل ہے
زمانہ دے رہا ہے تم کو غم سرمایہ داری کا

ابھی کمسن ہے دنیائے سیاست نوجوانوں کی
بھروسہ ہے انھیں جذبات دل کی غمگساری کا

کہ جذبات سے کارِ سیاست چل نہیں سکتا
شفقوں کی چھاؤں میں پلتا ہے شعلہ بیقراری کا

عقیدہ پر ہمارا تجربہ ہے تجربے پایاں
ہے نقشہ سامنے موجِ رواں کی راہداری کا

اگرچہ دست و پا ٹوٹے ہیں لیکن دل نہیں ٹوٹا
یہی پیغام ہے دنیائے غم کو دل فگاری کا

چلو دانشوری سے اپنی ناکامی کا دل تھامو
تمہیں کیا خوف ہے لے شیر مردو گولہ باری کا

[ایک زبردست بم جہاز کے عرشے پر آکر پھٹتا ہے جس سے آگ کے طوفانی شعلے بھڑکتے ہیں]

بم - (شعلوں سے) میری آوازوں میں ہے انسان کے دل کی صدا

شعلہ بولتا ہے میرے سینے میں کوئی آتش نوا

بم میرے بھونچالوں میں قوت کا تصادم دیکھنا

شعلہ میرے شعلوں میں ارادوں کا تلاطم دیکھنا

بم میں قوم کی اک پھونک ہوں اک آہ رسا ہوں

شعلہ میں آتشِ جذبات کا اک جلوہ نما ہوں

بم نفرت کے دھماکے ہیں نہاں میرے دہن میں

شعلہ عزت کی ہے آزردگی میرے چمن میں

بم میں نوعِ بشر کے لئے تفریق کا ساماں

شعلہ میں بےکسیِ علم کا اک منظرِ عریاں

[روحِ نظارہ، صبح سے کہتی ہے]

اس سمندر کی فضاؤں میں یہ محشر دیکھنا
شوکتِ انساں کی بربادی کا منظر دیکھنا

وسعتوں میں اور سکوں میں بھی ہوا شر و فساد — صبح کے جلوے بھی ہیں ہنگامہ پرور دیکھنا

صبح میں اک جلوہ ہوں مجھ سے کام کوئی لے نہیں سکتا — سکونِ دل سے میرا نام کوئی لے نہیں سکتا

چھپے رہتے ہیں انوارِ محبت میرے سینے میں — مگر مجھ سے مرا انعام کوئی لے نہیں سکتا

[ہلکا ہو جاتا ہے]

تیرتے ہیں میرے سینے پر ارادے حوصلے — فتح و ناکامی کی میں ایک شان ہوں تصویر ہوں

میرے دل میں مضطرب ہے آرزوئے فتحِ ارض — میں تمنائے دلِ انساں کی تصویر ہوں

وسعتیں پائی ہیں میں نے خاک سے ذرہ گریاں — وہ تو میرا خواب تھی، میں خواب کی تعبیر ہوں

میرا دریائی عمل ہے وجہ تقسیمِ زمیں — سلطنت والوں کا میں ایک شعلۂ تدبیر ہوں

[چار برطانوی سپاہیوں کی سنگت]

دو سپاہی

ٹوٹنے سے نہیں ٹوٹی ہے ہماری امید — ہم زمانے کو شجاعت کا سبق دیتے ہیں

اہلِ دانش کو خبر ہے کہ جہاں والوں کو — نقد دیتے ہیں سکوں مفت کا غم لیتے ہیں

دوسرے دو سپاہی

پرچمِ شاہی کے پیچھے سر کٹا کر جائیں گے — دھجیاں جور و تظلم کی اڑا کر جائیں گے

ہم سنبھل کر جائیں گے پھر کارزار و حرب میں — کون کہتا ہے کہ ہم دامن بچا کر جائیں گے

[۲۰ جانوں کا نقصان چار ۳۰ گز کی حد میں ہے ڈیڑھ گھنٹے کی گولہ باری کے اندر کام کا نہیں رہتا کپتان کی آواز آتی ہے۔ سب واپس ہو جاؤ]

پانچواں منظر

[کستیری کی جنگ کے ساتھ ساتھ اسکیں اور انتیلز بھی مصروفِ جنگ تھے۔ دوپہر رات تک دونوں

برطانوی چھوٹے جہازوں سے کمال کے ساتھ پانچ مرتبہ گولہ باری کی گئی۔ گرات اپنی موت سے دھوئیں کا پردہ ڈال کے بچ سکنے کا قصد کیا۔ استسلیم برکت جانی نقصانات ہوئے احکیں کے چار توپوں کے مورچے گرا دیے گئے۔ رات کے وقت خفیہ قندیلوں اور وائرلیس کے وسیلے دونوں ... احکیں پر خود سپاہی توپوں کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں دوسرے ... ملاح نہایت سرگرمی کے ساتھ جہازوں کو لڑا رہے ہیں۔

سپاہی

گو ہم سے قوی تر ہے یہ دشمن کا سفینہ — ہم ہاتھ سے ہنگام عمل جانے نہ دیں گے

ممکن نہیں گولوں سے اگر اس کی تباہی — نزدیک ہم اپنے بھی اسے آنے نہ دیں گے

دوسرا سپاہی — یہ توپیں نہیں موت کے دست و بازو — جہنم کو دریا پہ پھیلا رہے ہیں

ہمارے نشانے ہمارے تریچے — فسونکار دشمن کو شرما رہے ہیں

برطانوی کپتان

دوڑو، چلو بڑھو کہ غنیمت ہے وقت تب — پھر صبح زندگی کا اجالا بھی دیکھنا

گو دشمن قوی سے ہمکلی ہے جان زار — ان نیم جانیوں کا سنبھالا بھی دیکھنا

ایک ملاح دوڑ کے — وہ دیکھئے احکن پہ گرے بم کے شرارے

کپتان — ہوتے ہیں اوسان خطا اس سے ہمارے

(دوسرا ملاح زخمی ہو کر گرتا ہے)

ملاح — انعام وہی فرض کی برتنے سے سوا ہے — عیسٰی ترے قدموں پہ مری جان فدا ہے

کپتان (ملاح کی لاش سے اٹھا ہوا)

سخت طوفانی جہازوں کو کیا ندر اجل — ٹکریں گولوں سے لیں اس بار آتشبار نے

دیکھنا ہاتھوں سے لینے پہ کل جائے ۔ ہائے — تو جہازوں کو ڈبو یا ہے اسی غدار نے

ادھر گرات اپنے ... پر کپتان ایا گمشدہ ارف غور سے صورت حال کا مطالعہ کر رہا ہے اسکے سامنے

گرفتاری تجارتی جہازوں کے قیدی، سپاہی، اور کئی گرفتاری عہدہ دار ہیں ان میں کپتان دودمی ہے

یانگسڈارف

جنگ میں آئینِ خودداری دکھانا چاہیے — موت کو معراجِ انسانی پہ لانا چاہیے
گو بہت دشوار ہے ہٹلر کا یہ سنا ہم جیالی — خود اسے رازِ آشنائے غم بنانا چاہیے
دیکھنا ان قیدیوں پر کچھ نہ ہو جور و ستم — ان جوانمردوں کو دامن میں چھپانا چاہیے
اک روایت ، ایڈمل ، کی یاد ہے مجھکو ابھی — زندگی کو موت کے غم سے بچانا چاہیے

ایک کپتان

تین سمتوں سے گراف اسپی پہ برساتے ہیں بم — دشمنوں نے ہم کو گھیرا ہے بڑے انداز سے

یانگسڈارف

جب کہ حسب ہر سمت سے سر پر چلی آتی ہو موت — دیکھتا ہے ستیز اس کو بھی نگاہِ ناز سے

بارہ گھنٹوں کی دست اں دھار جنگ کے بعد - گراف اسپی پر ۳۶ جانوں کا نقصان ہوا - پیچھے کی طرف سوراخ پڑ گئے یانگسڈارف جہاز کو بندرگاہ مانٹی وی ڈیو کی طرف لے جانے کا حکم دیتا ہے -

ایک فوجی عہدہ دار نازیوں سے یہ خجالت کیا اٹھائی جائے گی ؟
کپتان تم نہیں حسرت نئے سر سے نکالی جائے گی
دوسرا عہدہ دار گر وہاں جا کر نئی آفت میں ہو جائیں اسیر ؟
کپتان دیکھئے دکھلائے کیا تدبیرِ ہم یہ چرخِ پیر ؟

اس کا مددگار

کمزور کے گوں کا یہ ہم ہو گئے نشانہ — رہ جائے گا دنیا میں ہمارا بھی فسانہ
ہوتا نہیں اک آن وہ مجبور رجالت — فاتح پہ بھی آتا ہے مصیبت کا زمانہ
ہم شیر ہیں ، اور شیر کو گھیرا ہے اجل نے — ممکن نہیں آغوشِ فنا میں اُسے لانا
اس قلعہٴ آہن پہ نہ ہوگا کبھی قابض — دشمن کو خبر دو کہ یہ ہوتا ہے روانہ

چھٹا منظر

[illegible] رات کے ۱۲ بجے مددگاہ ماتی دی ڈیو کے اطراف ۲۰۰ میل کی حاطی سرحد ایک ہرا [illegible] سامان و متاع لے کر. گراف ایسی ، یہاں داخل ہو گیا، وہ گورنمنٹ کے متعدد ارباب نے اسے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت دی کہ وہ اپنے آپ کو دریائی سفر کے قابل بنا لے. بڑی عجلت [illegible] بعد بھی یہ جنگ کے قابل نہیں ہوا۔

رات کی آواز

ہے سماعت سے پرے میری صدائے دلنواز
روز روشن کی اجل لاتی ہے میری زندگی
[illegible] نسبت دیتے ہیں اہل جہاں
جس نظر کو دن کی تاریکی نظر آتی نہیں
[illegible] ہوتے ہیں عقدے ہستیٔ ناکام کے
دیکھئے اب کیا دکھاتی ہے تماشہ میری زیست
عظمتیں کس کی نظر آتی ہیں میری گود میں

میں خموشی کی صدا ہوں، وقت کی آواز ہوں
میں کسی کی ناگہانی موت کا اعجاز ہوں
درحقیقت میں جہاں میں ایک سوز و ساز ہوں
میں انہیں تاریکیوں کی اک ادائے ناز ہوں
میں جفائے زندگی کی پردہ بردار ہوں
میں تو ان اقوام عالم کے دلوں کا راز ہوں
کس کے انجامِ جفاکاری کا اک آغاز ہوں۔

روح نظارہ۔

انسان کی سیاست، اک رازِ بیخودی ہے
اک سمت سے تباہی، اک سمت سے تحفظ
[illegible] سے کوئی لیتا ہے کارِ نصرت
قوموں کی زندگی میں طفلانہ حکمتیں ہیں
تاروں کی چھاؤں میں ہے ماضی و حالِ دنیا
اس کشمکش میں رفعت چھپتی نہیں چھپائے

یہ خوب زندگی ہے، ناخوب زندگی ہے
اک سمت شور و شر ہے اک سمت خامشی ہے
اک سمت لب پہ ہر دم فریادِ بیکسی ہے
اک صبح کا ہے رونا، اک شام کی ہنسی ہے
انجام کار اس کا پچھلے کی چاندنی ہے
تاریکیٔ دو عالم اس بت کی آرسی ہے

(ایک شہاب ثاقب ٹوٹ کر پانی میں گرتا ہے)

میں اشارہ ہوں کسی ناکامیِ تقدیر کا — میں تماشا ہوں کسی کی شوخیِ تحریر کا
ہے اسی میں قید سارا انتظامِ کائنات — میں کوئی ٹکڑا نہیں ٹوٹی ہوئی زنجیر کا
جاگتا ہے میرے شعلوں سے خیالِ زندگی — نغمۂ دل ہوں میں اک جلتی ہوئی تصویر کا
سرد ہے فطرت مری، برباد ہی صورت مری — گو نظر آتا ہوں شعلہ لذتِ تعمیر کا

(کیپٹن پیانگسدار لب عرشے پر ہے تنہا خاموشی کے ساتھ شہاب ثاقب دیکھ کر)

دیکھنا یہ آسمانی بم ہے کتنا دل نواز — خوش نوا، خوش رنگ لذت خیز نازک اور حسیں
اس کا رستہ ہے یہ اس کی نگاہیں بے گنہ — امنِ انساں کی تباہی اس کی فطرت میں نہیں
ہاں مگر یہ ڈوب کر دیتا ہے اک پیغامِ شوق — عظمتِ ذوقِ فنا یا اک نگاہِ شرمگیں!

(ملاح آکر خبر دیتے ہیں کہ ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ختم ہونے کو ہے گھنٹے باقی ہیں جہاز درست ہو سکا کپتان اطمیان کے ساتھ عرشے کے دیسع حصے پر جاتا اور حکم دیتا ہے کہ سارے برطانوی قیدی اوپر لائے جائیں ایک کیپٹن ڈودسے (جو بعد میں رہا ہو گیا) اس کی باتیں ہوتی ہیں)

برطانوی کیپٹن

غیرتِ قومی ہماری ہے بلائے جانستاں — اس کی سرحد سے نکل جانا بہت دشوار ہے
ان جہازوں میں نہاں ہی قوم کی عظمت کا راز — ہر سفینہ، سوزِ جاں کا آئینہ بردار ہے
یہ زمانہ کے لئے ہیں دعوتِ جوشِ عمل — ایک کروٹ زندگی کی، انکی ہر رفتار ہے

ساتھ دے گو راستبازی ایک ہی فتح و شکست
ناخدائی راستی کی ہو تو بیڑا پار ہے

جرمن کیپٹن

سچ کہتے ہو اے غیرتِ قومی کے گہردار — ہے تم سے بھی پُرجوش مری قوم کا سردار
منّتائے اجل دیکھتی ہے میری جبیں بھی — ابرو پہ مرے رہتی ہے کھنچی ہوئی تلوار

[illegible] موت سے گھائل نہ کروں گا — رحمت مری بن جائے گی قیدی کی مددگار
آ گھیرا ہے ہمیں آشفتہ سری نے — آتی ہے نظر چاروں طرف موت کی دیوار
[illegible] تنہا ہوں یہ دولت آہن — ہو گی نہ کبھی آپ کے ہاتھوں میں گرفتار

[illegible] مارکے نشانہ ہے۔ ورحکم دیتا ہے کہ ان قیدیوں کو دل بہلانے اور لطف اٹھانے کے لئے گراموفون بجائے جگی جار تھوڑی دیر کیلئے رقص و سرود کے نغموں سے معمور ہو جاتا ہے۔

ساتواں منظر

۱۹ دسمبر کل کا دن شام۔ جاز گراف اسپی" دریائے پلیٹ کے اہر ہے یہاں برطانوی امیر البحر [illegible] ۔ اکسیٹر، اشیلیز، اجیکس وغیرہ اس کے نکلنے کے منتظر ہیں "گراف اسپی" کو آتا دیکھ کر انھیں حیرت ہوتی ہے گولہ باری شروع ہو جاتی ہے۔ جب سکوں ہوتا ہے تو ان جاروں پر گانے کی آواز آتی ہے۔

برطانوی جہازوں پر

دیانت کی گودوں میں پلے ہوئے ہیں — یہ نقشے ہمارے ہی ڈالے ہوئے ہیں
سیاست کے خوں سے بھری ہیں یہ جنگیں — بڑی مختصر ہیں ہماری امنگیں
بہت دور بیں ہیں ہماری نگاہیں — بہت دور رس ہیں ہماری یہ راہیں
بھرا ہے بہت اس کے سینے میں کینہ — کہاں جائے گا بچ کے ظالم سفینہ

دکیپٹن لینگسڈارف حکم دیتا ہے کہ سارے اہل جہاز کشتیوں پر سوار کرا کے یونس ایرس پہنچا دیئے جائیں وہ خود بھی ایک کشتی میں سوار ہو کر ان کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ ساحل پر اترتے ہوئے وہ برطانوی قیدیوں سے کہتا ہے

اہل برطانیہ اس عزم سے کرتے ہیں جنگ — گویا اس فرض سے مدہوش ہوئے جاتے ہیں

نیا نظمِ عالم

(پچھلے شمارے میں مظہر صاحب نے مغربی دنیا کے موجودہ قدار عقلیت پرستی، افادیت پسندی اور خارجیت پسندی کا جائزہ لیا تھا جس میں موصوف نے یہ بتلایا تھا کہ انکی عقلیت پرستی کی بنیاد اصل تعصبی جذبات و تعصبات پر ہے اور اس عقلیت پرستی کی اخلاقی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہیں۔ افادیت پسندی دراصل خودغرضی پر قائم ہے۔ اور خارجیت پسندی میں یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ اس میں انسان کی نفسی اور باطنی محرکات کی قدر و قیمت بالکل نظر انداز کردی جاتی ہے۔ ان تمام مفاسد کی اصلاح کے دعویدار خصوصاً اس زمانہ چار نظریے ہیں قومیت پرستی، مذہب انسانیت، اشتراکیت، بین الاقوامی وفاق۔ صاحب مضمون اب ان چاروں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں)

(مدیر)

<u>قومیت پرستی</u> | قومیت پرستی کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے اس کے مفاسد اور خطرات اب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکے ہیں۔ اگر قومیت پرستی سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم و وطن سے محبت کرے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے دل و جان سے کوشاں ہو تو اس قسم کی قوم پرستی بالکل جائز اور فطری ہے۔ لیکن مغربی تمدن نے جس قوم پرستی کو پیدا کیا ہے وہ یہ نہیں ہے۔ مغربی نیشنلزم کا منطقی نتیجہ استعماریت اور ملوکیت ہے جس کا تماشا آج یورپ میں دیکھا جا رہا ہے۔ اس طرح کی قوم پرستی کوئی اخلاقی نظام نہیں قبول کرتی ہے۔ 'میرا ملک غلط یا صحیح' اس کی صدا ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر دوسرے کے مفاد کی قربانی کر دینا اپنے نفع کے لئے ہر قسم کے اخلاقی اصولوں کو توڑ دینا ادنیٰ درجہ کی مصلحت پسندی اور موقعہ شناسی اس کا وصف امتیازی ہے۔ دھوکا فریب

مکر، ور اور بد ترین قسم کے دیگر اخلاقی معائب جنھیں خود ایک قوم کے افراد باہمی معاملات
میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں قومی اور ملکی مفاد کے لئے جائز ٹھیرا لئے جاتے ہیں
[illegible] سیاست ان تمام ناپاکیوں سے گندہ ہو جاتی ہے جن کے تصور سے ایک
[illegible] انسان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اس کا آخری نتیجہ جنگ و جدل خونریزی اور ہلاکت
[illegible] انسانی وحدت اور بین الاقوامی اتحاد کے لئے پیام ہلاکت ہے۔

مذہب انسانیت | اسی وحدت و اتحاد کے قیام کی غرض سے یورپ کے بعض مفکرین نے
مذہب انسانیت کا تصور خلق کیا۔ اس مذہب کا بانی آگسٹ کومتے تھا۔ مختصراً اس کا
مقصد یہ ہے کہ اخوت انسانی کے قیام اور افراد و جماعات کے اتحاد کو مؤثر بنانے کے
لئے ایک نئے خدا کی پرستش ہونی چاہیئے۔ یہ خدا خدائے انسانیت ہے عبادت کا
طریقہ یہ ہوگا کہ ہر دن کسی ایسے خادم انسانیت کے نام سے موسوم کیا جائے گا جس نے
زندگی کے کسی شعبہ میں بھی انسانوں کی بھلائی کے لئے کام کیا ہو۔ اس دن اس برگزیدہ
ہستی کی یاد منائی جائے گی اور اس کی خدمت گذاری ایثار اور انسانیت پروری کے
افسانے دہرائے جائیں گے ساتھ ہی ساتھ ان تمام تاریخی اشخاص پر لعنت بھیجی جائے
گی جنھوں نے کسی طرح بھی انسانیت کو مجروح کیا ہو یا دنیا کو نقصان پہنچایا ہو۔ اس خدا
ئے انسانیت کی پرستش کے ذریعہ انسانی تفریقوں کو مٹایا جائے گا اور انسانی اخوت کو زندہ
کیا جائے گا۔ تاریخی مذاہب نے انسانی نسل کو جن گروہوں اور جماعتوں میں منقسم کر دیا ہے
ان کو توڑ کر سب کو از سر نو ایک ہی رشتہ وحدت میں پرو دیا جائے گا۔ اس تخیل کو پیش
کئے ہوئے ایک عرصہ دراز گزر چکا ہے لیکن آج تک یہ کسی عالمگیر مذہب کی بنیاد نہیں ڈال
سکا ہے اور نہ مستقبل میں اس کی کوئی امید معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرد تصورات
انسانی زندگی پر کوئی دیرپا اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ خدائے انسانیت ایک تصور محض ہے
جو ہر قسم کی زندگی سے خالی ہے۔ دیگر مذاہب نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ ایک

زندہ اور فعال ہستی ہے لیکن خدائے انسانیت سلب جان اور فعلیت سے محروم ہے۔ ایسا خدا انسانی دل و دماغ کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا ہے پھر جن عظیم المرتبت اور برگزیدہ اشخاص کے دن منائے جائیں گے اور جن کے کارنامے بار بار دہرائے جائیں گے وہ اپنے اعمال و کردار اور افکار و تخیلات کے لحاظ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے ہیں بلکہ اکثر اوقات ایک کا اپنایا ہوا راستہ دوسرے کی تجویز کردہ راہ سے بالکل مختلف ہے۔ مذہب انسانیت حضرت عیسیٰؑ مہاتما بدھ مارکس اور لینن کو ایک ہی صف میں بٹھلانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ مارکس اور لینن نے اپنی عمریں اس چیز کو مٹانے میں صرف کیں جس کو پھیلانے کے لئے مہاتما بدھ اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں جن بزرگ ہستیوں کے افسانے دھرانا مذہب انسانیت کی عبادت ہے ان کے نصب العین ان کے مقاصد زندگی اور ان کی عملی روش میں اختلافات کی حد و انتہا نہیں ہے غرضکہ جس پہلو سے بھی دیکھا جائے یہ خود ساختہ مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی تنقید کی روشنی نہیں برداشت کر سکتا ہے۔

اشتراکیت اشتراکیت کے حامیوں کا بڑا پُرزور دعویٰ ہے کہ انسانی فلاح و بہبود اور بین الاقوامی امن و اتحاد اسی تحریک سے وابستہ ہے۔ اشتراکیت کی تعلیمات اس قدر جانی بوجھی ہیں کہ ان کے متعلق تفصیلی طور سے کچھ کہنا بیکار ہے یہ ایک معاشی پروگرام تھا جس نے رفتہ رفتہ ایک ہمہ گیر شکل اختیار کر لی اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ زندگی تراشں لیا لیکن اشتراکیت منجملہ اور تحریکوں کے جو یورپ کی سرزمین سے اُٹھی ہیں اسی بنیادی کمزوری میں مبتلا ہے جس کی طرف میں اس سے قبل اشارہ کر چکا ہوں یعنی خارجیت پسندی۔ اس تحریک کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ اشتراکی حکومت کے قیام اور معاشی زندگی کے اصلاح کے بعد خود بخود انسان منصف مزاج مساوات پسند اور راست کردار بن جائے گا۔ یہ خیال انسانی فطرت کے غلط مطالعہ پر مبنی ہے انصاف اور مساوات کی طرف انسانوں

میں جب تک کوئی فطری اور اندرونی میلان نہ پیدا ہو جائے محض ایک خارج سے عائد
کردہ نظام کے ذریعہ انھیں نہیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ جب تک انسان کا قلب و باطن اور
زندگی کے متعلق اس کا مجموعی نقطہ نظر نہ بدل جائے خارج کی بڑی سے بڑی تبدیلی اور
معاشی زندگی کا بڑا سے بڑا انقلاب اس کے اعمال و کردار کو نہیں بدل سکتا ہے۔ اشتراکیت
انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو یعنی معاشی پہلو کی اصلاح چاہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ صرف
اس پہلو کی اصلاح سے انسان کی مجموعی زندگی اور اس زندگی کے محرکات عمل بدل جائیں گے
حالانکہ حقیقی اصلاح اسی وقت ہو سکتی ہے جب زندگی کے ہر پہلو اور تمدن کے ہر شعبہ کی اصلاح
و درستگی کی جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس سرچشمہ کو صاف کیا جائے جس سے انسان
کے تمام اعمال و افکار پھوٹتے اور بہتے ہیں یعنی زندگی کے متعلق اس کا نقطہ نظر پھر اشتراکیت
اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جو ذرائع اختیار کرتی ہے وہ اپنے نتائج میں خود ان مقاصد
کے لئے مہلک ہیں۔ وہ معاشی مساوات کی علمبردار ہے اور معاشی انصاف کی طالب ہے
اس کا مقصد تو یہ بتلایا جاتا ہے کہ مال و دولت کی محبت انسانی اعمال کی محرک نہ رہے اور
اس کی جگہ خدمت گزاری کا جذبہ اس کے اعمال کو حرکت میں لائے۔ لیکن وہ کرتی کیا ہے؟
وہ آبادی کے ایک کثیر حصہ کو مخاطب کرتی ہے اور کہتی ہے دیکھو! تم پر ایک زمانہ دراز سے
ظلم توڑے جا رہے ہیں۔ تم دولت سے محروم کر دئے گئے ہو دنیا کی تمام نعمتیں اور زندگی
کی ساری مسرتیں تم سے چھین لی گئی ہیں۔ اس لئے اگر چاہتے ہو کہ دنیا میں سکھ چین سے
زندگی بسر کرو تو اٹھو اور اس ظالم حکمران طبقہ کو الٹ دو اور حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ
میں لے لو۔ پھر جب یہ پیٹ کے مارے جن کی فرضی اور واقعی مظلومی کی داستانیں سنا
سنا کر انھیں ابھارا جا رہا ہے حکمران طبقہ کا تختہ الٹ دیں گے تو کیا ان سے توقع کی جا
سکتی ہے کہ وہ ان طبقوں پر وہی ظلم نہ توڑیں گے جو خود ان پر توڑے گئے تھے۔ کیا یہ
امید کی جا سکتی ہے کہ محروموں کی یہ جماعت جس کی ہوس زر اور حرص دولت کو خوب

ابھارا گیا ہے خود آپس میں انصاف وسماحت کے ساتھ معاملات کا تصفیہ کرنے کی؟ اشتراکیت جو عالمگیر انسانی اخوت کی علمبردار ہے اپنی تعلیم کی ابتدا اس طرح کرتی ہے کہ ایک کثیر التعداد طبقہ میں دوسرے طبقات کی طرف سے بغض وحسد اور عداوت ودشمنی کے تمام ادنیٰ جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ یہ اس عالمگیر اخوت کی ابتدا ہے اس کی انتہا جو کچھ ہوگی وہ ظاہر ہے۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ وہ دولت پرستی اور حب زر ومال کو بحیثیت محرکات عمل مٹانا چاہتی ہے مگر اس کا طریقہ عمل یہ ہے کہ وہ انھیں جذبات کو ابتداءً اپنا مخاطب بناتی ہے جنھیں آئندہ چل کر وہ مٹانا چاہتی ہے۔ کیا عقل وخرد کے افلاس کی اس سے زیادہ دردانگیز مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اشتراکیت دنیا میں امن وچین پیدا کرنے کی مدعی ہے مگر اس کا پہلا قدم خونریزی غارتگری اور عداوت کے راستہ پر پڑتا ہے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

مضمون کی طوالت کے خوف سے اشتراکیت کے خلاف دوسرے اعتراضات نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اشتراکیت کا کوئی مستقبل تھا تو اس کو سویٹ روس کی موجودہ روش نے بالکل ختم کر دیا ہے اور دنیا پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اشتراکیت بھی اتنی ہی ظالم ناحق شناس اور زبردست آزار ہو سکتی ہے جتنی کہ سرمایہ داری کی کوئی بدترین شکل۔

<u>بین الاقوامی وفاق</u> ایک تجویز یہ بھی ہے کہ موجودہ قومی حکومتیں باقی رکھی جائیں لیکن ان کے بعض اختیارات بالکل سلب کر لئے جائیں اور انھیں ایک بین الاقوامی وفاق کے سپرد کر دیا جائے اور اس وفاق کو ایسی زبردست فوجی طاقت سے مسلح کر دیا جائے کہ قومی حکومتیں پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ تعجب ہے کہ مجلس اقوام کا جو کچھ حشر ہوا اس کے دیکھنے کے بعد بھی لوگ اس قسم کی تجویزوں پر کان دھرتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مجلس اقوام فوجی طاقت سے محروم تھی اس لئے وہ اپنے فیصلوں کو بجبر منوا نہیں سکتی تھی۔ یہ سراسر غلط نقطہ نگاہ ہے۔ لیگ کے پاس فوجی طاقت نہ سہی معاشی تدارکات

[illegible] تھی لیکن اس کا استعمال کب کیا گیا حبش کے معاملہ میں مجلس اقوام کے اراکین ایک بے گناہ قوم کی تباہی کا منظر دیکھا کیے لیکن قومی اغراض منصفانہ عمل کی راہ میں مزاحم رہے حقیقت یہ ہے کہ جیسا اس سے قبل کہا جا چکا ہے جب تک افراد و اقوام کا مجموعی نقطہ نظر اور وہ محرکات جو ان کے اعمال کا سرچشمہ ہیں نہ بدلیں گے سیاست کا کوئی نظام [illegible] [illegible] کی کوئی شکل انصاف اور حق پرستی پیدا نہیں کر سکتی ہے۔

[illegible] ہے کہ جملہ اقوام عالم کو اس بین الاقوامی وفاق میں شرکت کرنے پر کون مجبور کرے گا۔ اگر بالفرض سب قومیں شرکت پر آمادہ ہو گئیں تو ان کی نمائندگی کا کیا طریقہ ہوگا۔ اگر آبادی اور رقبہ نمائندگی کا معیار قرار پائیں گے تو چھوٹی قوموں کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ معاملات کا تصفیہ اکثریت کی رائے سے ہوگا یا کسی اور طرح سے۔ اگر اکثریت رائے فیصلہ کن ہوگی تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے فیصلے حق و انصاف پر مبنی ہوں گے۔ اگر اکثریت کے فیصلوں سے بعض اقوام کے مفاد ناموافق طور سے متاثر ہوتے ہوں اور وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو کیا چارہ کار اختیار کیا جائے گا۔ قومی مملکتوں میں جب اقلیت اکثریت کے فیصلوں سے غیر مطمئن رہتی ہے اور انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے تو اندرونی انقلاب ہوتا ہے اور دستور حکومت میں بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں یا ایک صورت یہ ہے کہ فریقین کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے اپنا مقدمہ لے جاتے ہیں۔ اب اگر اس بین الاقوامی وفاق میں اکثریت اور اقلیت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور اغراض و مفاد کی ہم آہنگی نے اراکین وفاق کو دو یا زیادہ گروہوں میں منقسم کر دیا تو وہ کونسی بیرونی قوت ہوگی جس کے سامنے یہ مقدمات پیش ہوا کریں گے اگر اراکین کی اقلیت اراکین کی اکثریت کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دے تو پھر جنگ و جدل کی نوبت آ جائے گی جس کا انجام ظاہر ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس بین الاقوامی وفاق کے اراکین میں پیکار و تصادم کے

امکانات بہت زیادہ قوی ہوں گے اور وہ تمام اراکین قومیں جن میں کسی طرح کا جغرافیائی تمدنی یا لسانی اتحاد پایا جاتا ہے یا جن کے اغراض و مفاد مشترک ہیں ایک دوسرے سے قریب آتی جائیں گی یہاں تک کہ ان کی گروہ بندیاں اختلافات کے لیے شمار دروازے کھول دیں گی کسی نہ کسی شکل میں اکثریت اور اقلیت کا سوال پھر ابھر آئے گا۔ اور بین الاقوامی وفاق کے ارکین میں یہ سوال اس سے کہیں زیادہ شدید صورت میں ظاہر ہوگا جتنا کہ وہ کسی ایک قوم میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک متجانس قوم میں اکثریت اور اقلیت کے اختلافات بنیادی نہیں ہوتے ہیں بلکہ سطحی اور عارضی ہوتے ہیں نہ اغراض و مفاد کا تصادم اس قدر سخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثریت اور اقلیت کا تہذیبی اور تمدنی اشتراک ان کے طریق فکر اور فلسفہ زندگی کا اشتراک ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو تمام تفرقہ انگیز قوتوں پر غالب آجاتی ہے اور اس لئے عام طور سے اقلیت اکثریت کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کردیتی ہے اور اکثریت بھی اقلیت کے جذبات و احساسات کو ملحوظ رکھتی ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوتا ہے وہاں اقلیت بغاوت پر آمادہ ہوجاتی ہے پھر ملک کو انقلاب اور خانہ جنگی کے تمام مدارج سے گذرنا پڑتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی مطلق العنان شخص حکومت پر قابض ہوجاتا ہے اور اکثریت اور اقلیت دونوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتا ہے یا پھر دو جداگانہ قومیں وجود میں آجاتی ہیں جن کا باہمی ربط ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال دیکھنا ہے تو آج ہندوستان میں اقلیت و اکثریت کی آویزش پر نظر کیجئے۔ اس بین الاقوامی وفاق میں جو قومیں شریک ہوں گی وہ اپنی تاریخ و روایات اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے طریق فکر و عمل کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوں گی کیا ایسے مختلف الجنس عناصر اور ایسے مختلف زاویہ نگاہ رکھنے والے اراکین میں کسی دیرپا اتحاد کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ قومی اغراض و مفاد اور اپنے ملک و وطن کی محبت بالآخر بین الاقوامیت کو مغلوب نہ کرلیں گے جب تک اقوام عالم میں ایک مشترک اخلاقی شعور نہ پیدا ہوجائے اور چند مسلمہ اصولوں پر

تمام قومیں متفق نہ ہو جائیں اس قسم کے کسی وفاق کا تصور محض سراب نظر ہے۔ اگر بین الاقوامی وفاق کا قیام مقصود ہے تو سرے سے ان محرکات ہی کو بدلنا پڑے گا جو موجودہ دور میں اقوام وافراد کے تعلقات کو متعین کرتے ہیں۔ کیا موجودہ وطن پرستی اور قومی خود غرضی کسی بین الاقوامی وفاق کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ بین الاقوامی وفاق یا اس قسم کا کوئی اتحاد جس کی تجویزیں پیش کی جا [illegible] وقت تک شرمندہ معنی نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قوموں کے نظریہ اخلاق [illegible] کے اصول [illegible] میں کوئی بڑا انقلاب نہ رونما ہو جائے۔ کیا مستقبل قریب میں اس کی کوئی توقع [illegible]

(۲)

مضمون کی تخریبی تنقید ختم ہو چکی ہے۔ اب تعمیری کام کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اس سے قبل میں ان نقائص اور کمزوریوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں جنھوں نے مغربی تمدن میں نامرکزیت پیدا کر دی ہے اور اسے اس نوبت پر پہنچایا ہے جہاں اس کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے ان نظامات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اس زوال پذیر نظام تمدن کی جانشینی کے دعویدار اور آرزومند ہیں۔ [illegible] اگر ایک نیا نظام عالم ترتیب دینا ہے تو اس میں سے ان تمام نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا جس کا تفصیلی بیان اوپر گذر چکا ہے ایک صالح نظام تمدن اور ایک پائدار نظم عالم کی بنیاد رکھتے وقت ہمیں حسب ذیل بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا تاکہ ان خرابیوں کو اس میں داخل نہ ہونے دیا جائے جنھوں نے انسانی عافیت اور جماعتی امن و اتحاد کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔

۱۔ اولاً اس نظام عالم کو چند ابدی اور ناقابل تغیر اخلاقی قوانین اور اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے جنھیں قومی یا جماعتی خود غرضی یا انفرادی اغراض و مفاد کا تابع نہ بنایا جا سکے۔

۲۔ یہ اخلاقی اصول و قوانین انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حکمراں تسلیم کرلئے جائیں تاکہ انسان کی اور تمام طاقتیں اور صلاحیتیں خواہ عقلی ہوں یا جسمانی ان قوانین کی گرفت سے باہر نہ جاسکیں۔

۳۔ سویم یہ نظام صرف خارجی زندگی کی اصلاح تک محدود نہ ہو بلکہ اس کے ذریعہ انسان کی نفسی زندگی اور اس کے باطنی محرکات میں بھی انقلاب پیدا کیا جائے تاکہ خارج کی اصلاح اور باطن کی قلب ماہیت پہلو بہ پہلو جاری رہیں۔

۴۔ چہارم اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اجتماعی اور انفرادی نصب العین پر رکھنی چاہیے جس کو ہر انسان بلا لحاظ قوم و نسل اور ملک و وطن قبول کرسکے اس طرح ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو جغرافی حدود اور نسلی اور وطنی رشتوں سے بالاتر ہو اور جو پھیلتے پھیلتے پوری انسانیت کو سمیٹ سکے

۵۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہو جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ کے لئے ایک اصلاحی پروگرام رکھتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو اصلاحی دستور العمل بھی مرتب کرے ان میں باہمی ربط اور مطابقت بھی پیدا کرتا ہو ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ مختلف شعبہ جات زندگی کے اصلاحی دستور العمل اپنی اپنی جگہ تو درست ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے بے ربط اور متصادم ہوں۔

ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیجئے کہ دنیا نے آج تک جتنے مذاہب اور نظامات پیدا کئے ہیں ان میں کونسا نظام زندگی یا کون سا مذہب ان شرائط کی تکمیل مدرجہ اتم کرتا ہے۔ مغربی تمدن کے متعلق تو میں تفصیل وار بتا چکا ہوں کہ وہ نہ تو کسی اٹل اخلاقی نظام کا پابند ہے اور نہ اس نے زندگی کے باطنی پہلو کی کوئی رعایت رکھی ہے اسی کا نتیجہ وہ انتشار پیدا کرنے والی قوتیں ہیں جن کا ظہور آج اس شدت کے ساتھ ہو رہا ہے قومیت پرستی بحیثیت ایک نظام زندگی کے پیکار و تصادم کی طرف لے جاتی

ہے اور وہ بھی اخلاقی نظام کی گرفت سے آزاد ہے اس کے علاوہ وہ انسانوں کے مابین ایک دائمی تفریق پیدا کرنے کی موجب ہے۔ اشتراکیت زندگی کے صرف ایک پہلو اور تمدن کے صرف ایک شعبہ کی اصلاح کے لئے ساعی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ زندگی کے اور تمام پہلو صرف معاشی زندگی کی اصلاح سے خود بخود درست ہو جائیں گے۔ فسطائیت اور نازیت قوم پرستی ہی کی ایک شدید تر شکل ہے اور اس میں قوم پرستی کے معائب و نقائص دو چند نظر آتے ہیں ایک بین الاقوامی وفاق کا تخیل اس وقت تک لایعنی رہے گا جب تک کہ اقوام عالم کے ضمیر میں کوئی بڑا انقلاب نہ پیدا ہو اور وہ محرکات عمل نہ بدل جائیں جو گذشتہ دو تین صدیوں سے قوموں اور جماعتوں کے طرز عمل کو متعین کرتے رہے ہیں۔

اب ان مذاہب کی طرف آئیے جو مشرق کی سرزمین سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ عیسائیت اور بدھ مذہب کا نقص یہ ہے کہ وہ اصلاح باطن سے آگے نہیں جاتے ہیں حالانکہ باطنی اصلاح کے لئے ایک خارجی نظام اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ خارجی نظامات کے لئے اصلاح باطن ضروری ہے۔ یہ دونوں مذاہب چند اخلاقی مواعظ و نصائح کا مجموعہ ہیں لیکن انھوں نے حکومت یا سیاست کا کوئی خارجی نظام نہیں تجویز کیا ہے جو ان مواعظ و نصائح کا انسان کو پابند بنا سکے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو صرف اخلاقی اصولوں پر قائم ہو اور جس میں کوئی خارجی قوت ایسی موجود نہ ہو جو ان اصولوں کی عملداری قائم کر سکے یا ان کی حمایت میں اپنی طاقت استعمال کر سکے بہت جلد مرکز گریز (Centrifugal) قوتوں کا شکار ہو جائیں گی عیسائیت نے تو صاف کہدیا کہ میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے۔ یہی حال بدھ مذہب کا بھی ہے کہ اس نے بھی فرد و جماعت یا فرد اور حکومت کے تعلقات متعین نہیں کیے۔ پھر ان مذاہب نے زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے کوئی تفصیلی اصلاحی پروگرام بھی مرتب نہیں کیا بلکہ صرف چند اخلاقی اصولوں کو کافی خیال کیا۔ ان بنیادوں پر کوئی ہمہ گیر نظام عالم یا نظام تمدن نہیں قائم ہو سکتا ہے۔ ہندو مذہب بیشک

ایک ایسا مذہب ہے جو ایک خارجی معاشرتی نظام کا حامل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس نے اصلاحِ نفس اور تزکیہ باطن کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے لیکن اس میں بھی ایک عالمگیر نظامِ تمدن کی بنیاد ڈالنے کی صلاحیت مفقود ہے کیونکہ وہ ایک ملکی اور قومی مذہب ہے جس کا نقطہ نظر جغرافی حدود سے مقید ہے اس کی بنیاد عدم مساوات پر رکھی گئی ہے اور انسانی مساوات کا تخیل اس میں بار نہیں پا سکتا ہے۔ عیسائیت اور بدھ مت کی طرح وہ بھی روحانی ترقی اور تہذیبِ نفس کو ترکِ دنیا اور ریاضت و عبادات پر مشروط قرار دیتا ہے۔

اسلام ہی دنیا کا وہ تنہا مذہب ہے جو ان تمام شرائط کی تکمیل کرتا ہے جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کی تمام تعلیمات کی بنیادیں ایک اٹل اور دائمی نظام اخلاق پر استوار کی گئی ہیں جس میں مغرب کی سی افادیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ خیر و شر کا ایک ازلی اور ابدی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوریٰ ہے حالات زمانہ کی تبدیلیوں اور مصلحت وقت کے تقاضوں سے اس کے بنیادی اصولِ اخلاق کو توڑا نہیں جا سکتا ہے ان بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اسلام کے جملہ قوانین تمدن و معاشرت زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے جو اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو یا شریعت اسلامی کے مقاصد اور اسلامی زندگی کے نصب العین کا ساتھ نہ دیتی ہو۔ بنیادی اصولوں اور مقاصد کا یہ ثبات و استحکام اور ان کا اس طرح ناقابلِ تغیر ہونا ایک بہت بڑا تحفظ ہے ورنہ جس طرح مغربی ذہن نے اغراض و مفاد کے تحت ہر اخلاقی اصول کو توڑ ڈالا یہی حال اسلامی اصول و مقاصد کا ہوتا۔ اسلام کے بنیادی مقاصد اور شریعت اسلامی کے اخلاقی اصولوں میں انسانی خود غرضیوں اور کام جوئیوں کے اثرات راہ نہیں پا سکتے ہیں۔ پھر یہ اندازِ اخلاقی نظام مغرب کی عقلیت پرستی (جو جذبات پرستی کا دوسرا نام ہے) کے خلاف سے بڑی حفاظت ہے۔ اسلام کا اخلاقی نظام عقل و فکر کی ترقی کا دشمن نہیں ہے لیکن وہ فکر و تعقل

کی بے قید آزادی کا سب سے بڑا مخالف ہے وہ عقل کو معطل کرنا نہیں چاہتا ہے لیکن اس کو
اخلاقی اصولوں کا تابع ضرور بنانا [illegible] اسلامی نظام زندگی میں عقل کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ
وہ شریعت کے بنیادی مقاصد اور اسلامی زندگی کے مجموعی نصب العین میں کوئی تبدیلی کرسکے
نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اسلام نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لئے جو ہدایات دیدئے ہیں
[illegible]صول ان کے لئے وضع کردیئے ہیں ان میں دخل اندازی کرے ہاں اسے یہ آزادی
ضرور عطا کی گئی ہے کہ وہ تفصیلی امور اور ذیلی قوانین پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ وہ شریعت کے
[illegible] [illegible]م تو نہیں ہوتے ہیں۔ عقل کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بدلے ہوئے حالات
میں اسلامی قوانین اگر اسلامی مقاصد اور اصول کار سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو ان میں مناسب
ترمیم و تنسیخ تجویز کرے۔ اسلامی زندگی میں عقل و فکر کا مرتبہ یہ ہے کہ جب حوادث کے طوفان
اور انقلاب کی آندھیاں زمانہ کا ورق الٹیں نت نئے حالات رونما ہوں پرانا نظام معاشرت
درہم برہم ہو جائے اور زندگی نئے نئے مطالبے پیش کرنا شروع کرے تو وہ کتاب و سنت کی
روشنی میں مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے ان مطالبوں کو پورا کرے اور اسلامی نظام
زندگی کے لئے نئے قوانین اپنی ذاتی بصیرت کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کی بخشی ہوئی بصیرت
کی بنا پر وضع کرے۔ اس طرح اسلام نے عقلی ارتقار کی راہ معین کردی ہے لیکن عمل ارتقا
میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی ہے۔ اس نے فکر کو ہرزہ گردی اور بے راہ روی سے بچا کر ایک
متعین راستہ پر ڈال دیا ہے۔

اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے جو زندگی کے کسی مخصوص پہلو کی اصلاح کو کافی نہیں
خیال کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ اور عمل کے ہر گوشہ کے لئے اپنی اصلاحی تدابیر رکھتا
ہے۔ اس کا ایک مخصوص نظام تمدن ایک الگ نظام معاشرت اور ایک جداگانہ نظریہ سیاست
و حکومت ہے۔ اس لئے زندگی کے معاشی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس کو مناسب
اہمیت [illegible] ہے۔ زندگی کے اور گوشوں کی طرح اس نے یہاں بھی واضح اصول و ہدایات

بنا دیئے ہیں اور بنیادی قوانین وضع کر دیئے ہیں۔

اس لئے خارجی نظامات اور باطنی محرکات پر یکساں توجہ صرف کی ہے اور ایک دوسرے میں گہرا ربط اور تعلق پیدا کر دیا ہے اس طرح کہ ایک سے تغافل دوسرے کی تباہی کا موجب ہو جاتا ہے۔ اسلام میں عبادت کا مفہوم صرف روزہ اور نماز ہی نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک ہر وہ عمل عبادت ہے جو اس کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہو خواہ وہ زندگی کے روزانہ معاملات سے متعلق ہو یا تمدنی اور معاشرتی امور سے تعلق رکھتا ہو۔ اسلام ہی دنیا کا وہ پہلا مذہب ہے جس نے زندگی کا اثبات کیا اور اس خیال کو رد کیا کہ مادی زندگی کی لذات روحانی اور اخلاقی ترقی میں مانع ہیں۔ اس نے ایک طرف انسان کے خواہشات نفس اور اس کے جذبات پر قیود عائد کئے اور دوسری طرف ان حدود و قیود کے اندر انسان کو ہر قسم کی آزادی عطا کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر تم خدا کے مقرر کردہ حدود کو نہ توڑو تو ان حدود کے اندر تم ہر طرح کی لذت اندوزی اور ہر قسم کی مسرت طلبی کے حقدار ہو اور ان حدود میں تمہارا یہ عمل تمہاری روحانی یا اخلاقی زندگی پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ڈالے گا۔ اس نے نفس کشی ترک دنیا اور زندگی سے گریز کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی اور انسان کی نجات کو تمدنی زندگی میں شرکت کرنے اور معاشرتی زندگی میں حصہ لینے پر مشروط کر دیا۔

پھر اسلام ایک ایسا انفرادی اور اجتماعی نصب العین ہے جو قوم و وطن نسل و نسب اور جغرافی حدود سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ایک مضبوط رشتہ اتحاد ہے جو مختلف قوموں اور جماعتوں کو ایک سلسلہ وحدت میں منسلک کر دیتا ہے۔ اس کا دروازہ ہر اس شخص پر کھلا ہے جو اس کے انفرادی اور اجتماعی نصب العین کو دل سے تسلیم کرے خواہ اس کا تعلق کسی قوم کسی ملک نسل یا جماعت سے ہو۔ اس طرح وہ ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جو جغرافی حدود سے بالاتر ہے اور جس کی وسعت و پہنائی پوری انسانیت پر محیط ہو سکتی ہے یہ انفرادی اور اجتماعی نصب العین کیا ہے؟ انفرادی زندگی میں وہ ایک خاص ضابطہ اخلاق اصول

[illegible] اور فرائض وحقوق کا دستور العمل ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے [illegible] جس کا مقصد نیک [illegible] نافت کرداری اور معدلت شعاری کا قیام ہے۔ اس کا اجتماعی [illegible] نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام ہے جو ایک ایسی خارجی طاقت ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان اصول اخلاق اور قوانین معاشرت وتمدن کی نگہبان ہو جو اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے وضع کئے ہیں اور جو ان اصول و قوانین سے نافرمانی اور سرتابی کرنے والے افراد کے [illegible] کرے تاکہ احکام الٰہی اور نوامیس فطری کا احترام دلوں سے مٹنے نہ پائے۔ یہ اس قسم کی لادینی اسٹیٹ نہیں ہے جسے یورپ نے رواج دیا ہے اور جہاں فرد کے [illegible] اصول عمل اور معیار اخلاق ہوتا ہے اور حکومت کے لئے دوسرا جہاں حکومت اور عامۃ الناس کی چیرہ دستیوں بدعملیوں اور ستم رانیوں پر کوئی اخلاقی گرفت نہیں ہوتی ہے اسلام نے اپنی اسٹیٹ پر فرد کو نگہبان اور محافظ بنایا ہے تاکہ جب کبھی اسلامی حکومت اسلامی قوانین اور کتاب وسنت کے بنائے ہوئے اصول اخلاق کے خلاف جائے یا اس کی حفاظت ونگہبانی میں تساہل برتے تو افراد اٹھ کھڑے ہوں اور اس کو تنبیہ کریں یا بدل ڈالیں اور افراد پر اسٹیٹ کو نگہبان مقرر کیا ہے تاکہ اگر کوئی فرد اس ضابطہ اخلاق اور شریعت تامہ کے خلاف عمل کرے جو اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے بنایا ہے تو حکومت اسے سزا دے۔ یہاں افراد حکومت کے محافظ اور اس کے محتسب ہیں، اور حکومت افراد کی نگہبان اور ان کی رہنما ہے۔

اسلامی حکومت کے تحت مذہب اور عقائد پرائیوٹ چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہ حکومت اور ریاست کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیزیں ہیں۔ کیونکہ مذہب درحقیقت زندگی کا ایک فلسفہ اور کائنات کا ایک نظریہ ہے اور انسان کے تمام اعمال اس کے فلسفہ زندگی اور نظریہ کائنات کا عکس ہوتے ہیں خواہ ان اعمال کا تعلق خانگی سے ہو یا سیاست ومعاشرت کے دائرہ عمل سے ہو۔ نظریہ کائنات اور فلسفہ حیات جیسے گہرے اصطلاحات سن کر بعض لوگ

نہیں سکے کہ عوام الناس کا ان فلسفیانہ اموز واسرار سے کیا کام ہے بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے دنیا میں ہر شخص کا ایک فلسفہ حیات اور نظریہ کائنات ہوتا ہے جس کو وہ عقلی استدلال یا منطقی رد و قدح کے ذریعہ سے نہیں بلکہ سوسائٹی کی تربیت ماحول کے موثرات اور خارجی زندگی کے تجربات سے حاصل کرتا ہے۔ یہ بات کہ ایک شخص معاشرتی زندگی معاشرتی کاروبار یا سیاسی امور میں کس قسم کا طرز عمل اختیار کرے گا محض یہ دیکھ کر معلوم کی جاسکتی ہے کہ زندگی کے متعلق اس کا نقطہ نظر کیا ہے آیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ زندگی محض ایک عارضی تماشا ہے جس کے بعد عدم محض ہے یا وہ زندگی کو ایک آزمائشی منزل خیال کرتا ہے جس سے گذر کر وہ ایک وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا آیا وہ جزا و سزا کی حقیقت کا قائل یا اس کو ایک وہم باطل سمجھتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے الگ رکھنا چاہیئے انسانی فطرت سے بے خبری کی دلیل ہے اس کے علاوہ زندگی ایک وحدت ہے۔ جو اصول عمل اور ضابطہ اخلاق انسان زندگی کے کسی ایک شعبہ میں برتتا ہے وہی دوسرے شعبوں میں اس کے اعمال کو متعین کرتے ہیں۔ یورپ اپنی ساری عقلی ترقی کے باوجود ان حقائق کو نہ سمجھ سکا یا اگر سمجھا تو ان سے اغماض کیا۔ اس لئے مذہبی عقائد کو ایک خانگی چیز قرار دیا حالانکہ ہمارے عقائد ہماری معاشرتی خانگی اور تمدنی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ کیا کوئی شخص اس بات کے ماننے کو تیار ہوگا کہ جو شخص اپنی خانگی زندگی میں بدچلن بد معاملہ فریبی اور ناقابل اعتماد ہو وہ پبلک لائف میں ایماندار راست کردار اور قابل اعتماد ہوگا۔ انسانی شخصیت ایک مجموعی وحدت ہے اور یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ خانگی زندگی کے لئے ایک معیار اخلاق ہو اور بیرونی زندگی میں دوسرے معیار اخلاق پر عمل کیا جائے۔ اسلام زندگی کی اس وحدت کو فراموش نہیں کرتا ہے اور اس لئے جو ضابطہ اخلاق اور اصول عمل فرد کے لئے بنائے ہیں وہی اصول و قوانین حکومت کے لئے اور ارباب حکومت کے لئے وضع کئے ہیں۔

اور مختصر میں میرا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک اصول عمل ضابطہ اخلاق عقائد کا ایک مجموعہ

تمدن کا ایک نظام حکومت کا ایک تصور اور معاشرت کا ایک نظریہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ فکر کا صحیح ترین اصول اور عقلی ارتقار کا سب سے سید ھا راستہ بھی ہے اس لئے فکر کی سلامت روی اور عقل کی راستی جو کچھ جہاں کہیں اور جتنی کچھ ہے وہ سب اسی میں ہے اور ... دنیا کے اور تمام نظامات فلسفہ زندگی کے اور تمام نظریئے اور فکر و تعقل کی اور تمام راہیں منزل مقصود سے بھٹکانے ... اجتماعی زندگی کے لئے ہلاکت خیز ہیں۔ صحت اور راستی صداقت اور سچائی جزوی طور سے اور منتشر حالت میں اور بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں مگر ان کی پوری وحدت ان کا کامل اجتماع اور ان کا باربط انضباط صرف اسی مذہب میں پایا جاتا ہے۔

مستقبل کے لئے جتنے نظامات تجویز کئے جا رہے ہیں اور تجویز کئے جا سکتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی بنیادی نقص ضرور ایسا ملے گا جو ان کی ساری خوبیوں اور نفع بخشیوں کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے دنیا اگر ایک پائدار اور مستحکم نظام کی متلاشی ہے اور قیام امن کے لئے بے قرار ہے اگر مالی خوشحالی اور اخلاقی ترقی بیک وقت اس کا مطمع نظر ہیں تو پھر اس کے لئے اور کوئی راہ یا اور کوئی نظام کام آنے والا نہیں ہے بجز اس نظام کے جسے اسلام نے تجویز کیا ہے اور اس راہ کے جس کی طرف پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے رہنمائی کی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

اور اللہ کے نزدیک تو دین میں اسلام ہی ہے

(محمد مظہر الدین صاحب صدیقی)

خودکشی

(گذشتہ سلسلے کا اختصار۔ مسوری کے ایک ہوٹل میں ایک تمثیل نگار اپنی ایک نئی تمثیل کو ختم کر رہا ہے اس کا ایک پرانا دوست اور مضمون نگار داؤد آ کر ملتا ہے اور اپنا سامان دوسری جگہ لے جانے کے لئے چلا جاتا ہے۔ اس اثنا میں ایک نوجوان حبیب نامی فیروز سے ملنے آ پہنچا اور اپنے آپ کو ایک ناامید ظاہر کرتے ہوئے امداد کا طالب ہوتا ہے۔ فیروز دس روپے دیتا ہے جسے وہ حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور بقول اس کے وہیں خودکشی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے ساتھ ہی ریوالور کی تعریف بیان کرتا جاتا ہے جس کو اس نے دو سو پچاس کا خریدا ہے فیروز مبلغ دو سو ریوالور خریدنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کو ناامید نہ ہونا چاہئے اور اپنی بہتری کی ہمیشہ امید رکھنی چاہئے)

حبیب۔ آپ کو امید ہے۔

افروز۔ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں تو آپ کو نہایت ہی جلد باز سمجھوں گا اگر آپ نے اس وقت اپنی زندگی کا خاتمہ کیا جب قسمت خود آپ کے دروازے پہ آن کر دستک دینے والی ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ آپ کے دن پھرنے والے ہیں میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ بہت ممکن ہے کہ آج رات۔۔ آج شام کو شاید ابھی جب کہ آپ باہر جائیں قسمت آپ کے استقبال کو آگے بڑھے آپ پر اپنے منتخب پھول نچھاور کرے اور آپ کی لونڈی بن جائے۔

حبیب۔ انسان بھی کس قدر جلد بدل جاتا ہے میں یہاں مصمم ارادہ کر کے آیا تھا مجھے یقین تھا کہ قدرت کی کوئی طاقت مجھے میرے ارادے سے باز نہیں رکھ سکے گی۔ آپ نے امید کی ایک شعاع دکھا کر میرے ارادوں کو کمزور کر دیا۔

افروز۔ لیکن اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟

حبیب۔ لیکن فرض کیجئے کہ جہاں قدرت نے مجھے اپنی اتنی نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے اگر مجھے اپنے اس اصول سے بھی مستثنیٰ کر دے تو پھر اس وقت تو خودکشی کے لئے ریوالور بھی نہیں ہوگا ..

افروز۔ یہ کوئی منطق نہیں! اگر کبھی ایسی صورت حال آ ہی گئی کہ خودکشی کئے بغیر چارہ ہی نہ ہوا تو کیا خودکشی

[illegible] جوہری سے ہو سکتی ہے اور وہ بھی اتنے قیمتی زیورات سے ؟ میری درخواست کو رد نہ کیجئے

[illegible] بٹوے میں سے نوٹ نکال کر دیتا ہے، گن لیجئے ڈھائی سو ہیں (حبیب دل کا استوٹ لیکر

زیورات دے دیتا ہے [illegible]

حبیب۔ مجھے آپ کا اعتبار ہے میں آپ کا شکریہ (کھڑا ہو جاتا ہے) [illegible]

افروز۔ میں نے جلدی سے زیورات جیب میں رکھ لیا ہے) اس کی کیا ضرورت ہے۔

حبیب۔ (اپنا بکس اٹھاتا ہے) مجھے نہیں علم تھا کہ میں اس قدر بزدل ہوں (دروازے کی طرف چلتا ہے) ضمیر

[illegible] کر رہا ہے (دروازہ کھولتا ہے) میری قوت ارادی (چلا جاتا ہے)

افروز۔ (اکیلا ہے اپنی پیشانی پونچھتا ہے) اوف کیا خطرہ تھا میرے وہم و گمان میں بھی

نہ تھا کہ یہ ہونے والا ہے (اپنے کا عدا کٹھے کر لیتا ہے) کیا واقعی وہ چلا گیا (کھڑکی میں سے

جھانکتا ہے) ہوں وہ جا رہا ہے۔ اگر میں نے بر وقت قسمت کا اصول نہ گھڑا ہوتا

[illegible] وہ تو قدرت ہی نے کچھ ساتھ دیا . . تو یہ یہاں فرش پر پڑا ہوتا اس کا دماغ

پاش پاش ہوتا (کانپتا ہے) یہی غنیمت ہے کہ میں ابھی جا رہا ہوں ورنہ کہیں بار بار اگر نہ ستاتا (کھڑکی

[illegible] سے ہمدرد سے بیٹا جا رہا ہے (نوٹ کہیں میں ڈھونڈتا ہے) میں نے اسپرین

کہاں رکھی ؟ (مل جاتی ہے) یہ رہی تھوڑا سا پانی ہونا چاہئے (غسل خانے میں جاتا ہے)

داؤد۔ (ایک ہینڈ بیگ لئے داخل ہوتا ہے) افو تم تو ابھی یہیں ہو میں تو سمجھا تھا کہ تم چلے گئے ہوگے

افروز۔ ذرا دیر ہو گئی (غسل خانے میں سے ہی)

داؤد۔ میں تو اپنا سامان بھی لے آیا (ہینڈ بیگ کی طرف اشارہ کرکے) یہ دیکھو باقی نیچے ہے! (ہینڈ بیگ رکھ دیتا

ہے اور اسپرین کی شیشی پر نظر پڑتی ہے) کیا تم نے اسپرین کھائی ہے ؟

افروز۔ (غسل خانے سے واپس آتا ہے، یہ دیکھو ! پانی کے ساتھ گولی نگل جاتا ہے)

داؤد۔ کیا سر میں درد ہو رہا ہے ؟

افروز۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ بلا سر کے درد پر ہی ٹل گئی ! (گلاس رکھ دیتا ہے) اجی جناب ابھی ابھی میری ایسے

[illegible] حادثہ سے خلاصی ہوئی ہے کہ [illegible] پھر یاد رکھوں گا [illegible]

داؤد۔ [illegible]

افروز۔ ابھی جب تم نواب پیارے صاحب کے ہاں گئے ہوئے تھے [illegible]

داؤد۔ تمہارا مطلب نواب زادے صاحب سے ہے ؟

[illegible] خبر نہیں کیا بک گیا۔ ابھی تک میرے ہوش و حواس ٹھیک نہیں ہوئے ہیں

داؤد۔ واقعی۔ تم زرد ہو رہے ہو۔ اس کے پاس جاتا ہے تم تو کانپ رہے ہو! تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے ہیں پیشانی پر پسینہ آ رہا ہے آخر تمہارا حال کیا ہے ؟ کیا ہوا ؟

افروز۔ یاد نہ دلاؤ بہت ہی رنجیدہ اور غمناک ہے!

داؤد۔ آخر بتاؤ تو!

افروز۔ ابھی میرے پاس ایک مصیبت زدہ آیا تھا اپنی تصانیف کی بے قدری سے نا امید ہو چکا تھا۔ میں خودکشی کرنے پر تلا ہوا تھا میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آتا تھا میں نے چاہا کہ روپے سے اس کی مدد کروں لیکن یہ اس نے منظور نہیں کیا وہ تو آخری لمحے میں ایک تدبیر آ گئی میں نے اس کا۔

داؤد۔ ریوالور خرید لیا!

افروز۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا ؟

داؤد۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ محمود یہاں مقیم تھے ۔ انھوں نے بھی اسی طرح ایک ریوالور خریدا تھا۔۔ انھوں نے بھی ایسی ہی ایک المناک داستان سنائی تھی ۔ کہ وہ بہت خوددار تھا اور مالی امداد کسی طرح قبول نہ کرتا تھا ۔ ان کے ذہن میں بھی آخری لمحے یہی تدبیر آئی اور انھوں نے بھی اس کا ریوالور خرید کر اس کو خودکشی سے باز رکھا۔ اس کا نام۔ کیا تھا؟

افروز۔ حبیب الرحمان حبیب ؟

داؤد۔ ہاں یہی تھا!

افروز۔ اف (سانس لیکر) اب ذرا جان میں جان آئی ہے!

داؤد۔ دکھاؤ وہ ریوالور کہاں ہے؟

افروز۔ یہ لو (ریوالور دیتا ہے)

داؤد۔ (اس کو دیکھتے ہوئے) بالکل نیا ہی ہے۔ اس کی کیا قیمت دی؟

افروز۔ ڈھائی سو روپے

داؤد۔ ہوں! اس کی قیمت تو سو روپے بھی نہیں لیکن ہاں اس تمام ڈھونگ کی جو اس کے ساتھ پیش کیا جا سکے بہت ہے (ریوالور واپس دیتے ہوئے) لیجئے جناب یہ آپ کو ہی مبارک ہو!

افروز۔ تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ ٹھہرو میں ابھی پولس کو اطلاع کرتا ہوں!

داؤد۔ کس بات کی؟ وہ تم سے خیرات نہیں مانگ رہا تھا اس نے خود تو تم سے ریوالور خریدنے کو نہیں کہا تم ہی نے اسے ریوالور بیچنے پر مجبور کیا اور قانون اس شخص کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کرتا جو خودکشی کا ارادہ کر کے تبدیل کر دے!

افروز۔ لیکن پھر بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔

داؤد۔ لیکن تم اس سے اس قدر ناراض کیوں ہو؟

افروز۔ اگر تم میری جگہ ہوتے

داؤد۔ میں تو بہت لطف اندوز ہوتا۔

افروز۔ اچھا۔ واقعی!

داؤد۔ تم اس کے ساتھ زیادتی نہ کرو یہ کونسا انصاف ہے کہ تم اس کو پولس کے حوالے کرو۔۔۔ ذرا غور کرو تمہیں کئی بار لوگوں نے دھوکا دیا لیکن تم نے انہیں تو پولس کے حوالے نہیں کیا تم ان کی حرکت پر خاموش ہو گئے اور اب تم جیب کو برا بھلا کہہ رہے ہو۔ اس نے تم سے کچھ زیادہ نہیں لیا تمہیں تو اس کی قدر کرنی چاہیے اس نے کیا انوکھا سین تمثیل کیا۔۔ اور کس خوبی سے۔ مکالمہ اور اداکاری دونوں اتنے مناسب تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا۔

اور تمہارے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ یہ سب ڈھونگ ہے تمہیں اس کے ذ
کی رسائی کی داد دینی چاہیئے... اُس کے فن کی تعریف کرنی چاہیئے... بلیم صیتہ
کب ملتی ہیں میں تو اس کی بہت قدر کرتا ہوں

فروز۔ اب تو یہ کہہ گئے ہی، تمہارا واسطہ نہیں پڑا ورنہ اُس نے تمہیں دھوکا نہیں دیا تا،

داؤد۔ وہ اپنے فن کا اُستاد ہے اور اُستاد کی قدر کرنا ہر دلچسپی رکھنے والے کا فرض ہے

افروز۔ اگر وہ مجھے اب کہیں مل جائے .. (اپنا سوٹ کیس بند کرتا ہے)

داؤد۔ تم جیسے کینہ ساز ہو جا رہے ہو؟

افروز۔ (گھڑی دیکھ کر) بہت دیر ہو گئی - اچھا پھر کبھی ملاقات ہو گی! (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

داؤد (ریسیور اُٹھاتا ہے) ارشاد! (افروز جانے والا ہے) احمد داؤد۔ آپ کی تعریف
حبیب الرحمان حبیب!

افروز (اپنا سوٹ کیس رکھتے ہوئے) بڑا بے حیا ہے! اسے یہاں آتے شرم نہ آئی۔

داؤد (ریسیور کو اپنے ہاتھ سے ڈھانکتے ہوئے) اس میں شرم کی کیا بات ہے ، وہ سمجھا
تم چلے گئے ہو۔ کیونکہ تمہارا نام ہوسٹل کی فہرست میں نہیں ہے اور میرا نام تمہارے
نام کی جگہ درج ہو چکا ہے . اُسے پتہ چلا ہو گا کہ مجھے نواب زادے صاحب نے
بلایا ہے، وہ تمہارے پاس سے نواب زادے صاحب کے پاس گیا ہو گا
انھوں نے اُسے یہاں کا پتہ دیا اور یہ دیکھئے وہ یہاں موجود ہے کس قدر
مستعد جوان ہے (یہ دیکھتے ہوئے کہ افروز جا رہا ہے) تم کہاں جا رہے ہو؟

افروز۔ اسے اس کھیل کا مزہ چکھانے

داؤد۔ اس جیسے ماہر فن کو! اس کی یہ قدر! یہ تو آرٹ کا خون ہے (ٹیلیفون پر بولتے ہوئے)
براہ مہربانی حبیب الرحمان صاحب کو یہاں بھیج دیجئے

فروز- آخر تمہارا ارادہ کیا ہے

داؤد جلدی سے اپنا سامان اٹھاؤ (اس کا اورکوٹ اور ہیٹ تو دا اٹھاتا ہے) اور غسل خانے میں چلے جاؤ دروازہ قدرے کھلا چھوڑ دینا اور پھر سننا کہ کیا ہوتا ہے!

فرور- لیکن مجھے بتائیے

داؤد- ایسی کیا جلدی ہے دیر تو ہو ہی چکی ہے .... تھوڑی اور سہی . . جلدی جاؤ اس کے قدموں کی آواز آ رہی ہے۔ جلدی سے افروز اور اس کی چیزوں کو غسلخانے میں پھر دیتا ہے۔ . دروازے پر دستک ہوتی ہے داؤد جلدی سے لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتا ہے اور کچھ لکھنے لگتا ہے) اندر تشریف لے آئیے (علیب داخل ہوتا ہے)

ارشاد! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں!

جلیب- میں نے آپ کو اس وجہ سے تکلیف دی کہ مجھے اتفاق سے معلوم ہو گیا کہ آپ یہاں ہیں .... مجھے آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا ہی مجھے علم ہے کہ آپ کس قدر نرم دل ہیں (پُردرد آواز میں) . مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے! .....میں تکلف سے دست بردار ہو چکا ہوں . . مصیبت سب کچھ کرا دیتی ہے میں اخلاق و آداب کی بندشوں سے دست بردار ہو چکا ہوں . . میری روئداد نا کامی . . (رکتا ہے)

داؤد آپ تشریف رکھیے

جلیب- شکریہ! .... میری روئداد یہ ہے میں لکھنو کے ایک معزز خاندان کا فرد ہوں . . لیکن فلک کینہ ساز کسی کو ایک حالت میں نہیں دیکھ سکتا . سب ہی کو یکے بعد دیگرے اپنی گردش میں پیس ڈالتا ہے . میرے خاندان کے بھی بُرے دن آ گئے میرے والدین نے (ذرا توقف کرتا ہے اس خیال سے کہ مداخلت کی جائیگی)

داؤد- فرمائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں!

حبیب۔ میری اوائل عمری سے میرے والد نے مجھے فوج میں بھیجنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن مجھ
فوج کی نوکری سے سخت نفرت ہے میں ایک صلح پسند آدمی ہوں آشتی میرا ایمان ہے۔

داؤد۔ میرا بھی یہی ایمان ہے

حبیب۔ میں شہرت چاہتا تھا۔ میری یہی آرزو رہی کہ میں ادب کی خدمت کرکے اپنا نام روشن کروں
مجھے کامل یقین تھا کہ میں میر یا غالب سے پیچھے نہیں رہ سکتا لیکن یہ سب توہمات تھے
ایک سراب تھا جو میرے پیش نظر تھا ایک خواب تھا جو فضا میں منتشر ہو گیا میرے والد کی
رگوں میں فوجی خون ہے وہ ادب کو نویات سے تعبیر کرتے ہیں شاعری تو ان کے
لئے تضیع اوقات ہے اساتذہ سے انہیں سخت نفرت ہے تشبیہ و استعارہ سے ان کا دم
گھٹتا ہے میں نے ہمیشہ انہیں صاف بات کہتے سنا اور وہ بھی نہایت کرخت لہجے میں
اس کے سامنے کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کی مخالفت کرے۔

داؤد۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے

حبیب۔ جب میں نے فوج میں جانے سے انکار کیا تو ان کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہی انہوں
نے مجھے عاق کر دیا۔

داؤد۔ آپ تو بڑے خوش ہوئے ہوں گے کہ آپ کی خلاصی ہوئی۔

حبیب۔ جی ہاں اور قسم کھائی کہ دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھیں گے وہ اپنی بات کے پکے ہیں جو بات
ایک دفعہ منہ سے نکل جائے پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔

داؤد۔ آپ کو اور کیا چاہیے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں

حبیب۔ (داؤد سے) کہا جاتا ہے میں بڑی امیدوں سے ساتھ گھر سے نکلا دو سال تک زمانے کے ساتھ
جدوجہد کرتا رہا ہزار ہا کوششیں کیں کہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے کی جگہ مل جائے لیکن جدھر ہاتھ پیر مارے
ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ..

داؤد۔ اب آپ زیادہ تکلیف نہ کیجئے میں جانتا ہوں آپ کیا کہنے والے ہیں آپ مصیبت میں

ہیں آپ کے پاس کمانے کو نہیں

داؤد۔ کل دوپہر سے اب تک ایک روٹی بھی کمانے کو نہیں ملی (یہ دیکھ کر کہ داؤد نے اپنے بٹوے میں [illegible] ہے) تبلہ آپ کیا کیا چاہتے ہیں؟

داؤد۔ آپ کو چونکہ کل سے روٹی [illegible]

حبیب [illegible] روپے؟ مجھے؟ حبیب الرحمان حبیب کو؟

داؤد۔ نہیں پانچ روپے

حبیب آپ مجھے پانچ روپے دینا چاہتے ہیں جیسے کہ میں بھکاری ہوں خیرات مانگنے آیا ہوں ...

جی ہاں اسی کا نام تہذیب ہے، اسی کا نام شرافت ہے؛ اسی طرح ایک ادیب کے ساتھ پیش آیا جاتا ہے؛ اس کی مصیبتیں سن کر اس کو بھیک دی جاتی ہے، نہیں نہیں اب تحقیر کی اور گنجائش نہیں رہی رسوائی کی بھی حد ہوتی ہے (اپنے بکس میں سے ریوالور نکال لیتا ہے)

داؤد۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

حبیب میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں! اسی لئے!

داؤد کیا آپ نے واقعی کو سچ کا ارادہ کر لیا؟

حبیب جی ہاں اب اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔

داؤد۔ اگر آپ نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو شوق سے خودکشی کیجئے میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ کے لئے یہی راہ سب سے اچھی ہوگی آپ ضرور خودکشی کیجئے۔

حبیب آپ میرے لئے خودکشی ہی بہتر سمجھتے ہیں؟

داؤد۔ جی ہاں، میں تو آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں آپ کا استقلال قابل تعریف ہے آدمی کو آپ ہی جیسا ہونا چاہئے آپ میں خودداری ہے قوت ارادی ہے اس پر سونے پر سہاگا قوت عمل ہے آپ کسی طرح کی مدد گوارا نہیں کریں گے میں اگر آپ کو سو روپے پانچ سو روپے یا اس سے بھی بڑی رقم دوں تو کیا آپ اپنے ارادے سے باز آجائیں گے

نہیں، ہرگز نہیں ادب ۔ ادب کی خدمت اس میں شہرت اگر آپ کو شہرت بھی مل جائے
تو بھی ممکن ہے کہ آپ اپنے مقصد پر نہ پہنچیں آپ مجھے ہی دیکھئے، آپ یہی سمجھے ہوئے
ہیں نا کہ میں چونکہ ایک کامیاب ادیب ہوں اس لئے خوش بھی ہوں ۔ اگر واقعی آپ کا یہ
خیال ہے تو آپ بڑی زبردست غلط فہمی میں ہیں حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی مصیبتوں کا
گنجینہ ہے..... ذرا ان تکلیفوں کا تصور کیجئے جو مجھے ہر روز برداشت کرنی پڑتی ہیں ہر روز اخبار
کا ایک کالم لکھنا پڑتا ہے ہر رات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا کل کیا
لکھوں گا؛ رات بھر اسی کاوش میں گذر تی ہے کبھی سکون کی نیند میسر نہیں ہوتی اور یہی
نہیں ہر سال ایک ناول لکھتا ہوں اس کی الجھنیں اور ہی طرح کی ہوتی ہیں اول تو یہ دھڑکا
رہتا ہے کہ پبلشر اسے شائع بھی کریں گے یا نہیں اور اگر شائع بھی ہو گیا تو آیا یہ مقبول بھی ہو گا یا نہیں
اور پھر آئندہ سال کے ناول کا بخار چڑھتا ہے ایک چکر ہے جس سے خلاصی نہیں ہوتی
پھر الگ طرح طرح کے چرکے لگاتے ہیں اگر تم نے ادب میں شہرت حاصل کر بھی لی ... تو یہ
ہے زندگی جو تمہیں بسر کرنی پڑے گی دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں شہرت سے جو بھی
تمہیں توقعات ہیں تھوڑے عرصے کے بعد ہی ٹوٹتے نظر آئیں گے وقت ہر لطف کو کوفت میں
تبدیل کر دیتا ہے ۔ اور اگر ایک بار اس میں داخل ہو گئے تو پھر واپس لوٹ آنا ناممکن ہو جاتا ہے
تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں اس سے دوچار ہونا نہیں پڑا میں تو اس زندگی سے عاجز آ گیا
ہوں میں تمہارا بہت ممنون ہوں کہ تم مجھے اس سے خلاصی دلا دو گے۔

حبیب (پریشان) میرے ممنون؛ ؟

داؤد۔ (سر سے اشارہ کرتے ہوئے) جی ہاں! میں بہت دنوں سے خودکشی کرنے کی سوچ رہا تھا.....
لیکن ہمت نہ ہوتی تھی ۔ آپ نے ہمت بڑھائی اب میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرنے کا
مجھے اپنا راستہ صاف نظر آ رہا ہے زندگی کی معراج موت ہے موت ہی ابدی زندگی ہے
اب بسم اللہ کیجئے جلدی سے آپ کے پیچھے پیچھے میں بھی عدم آباد میں آتا ہوں (حبیب بہت

گھبرایا ہوا ہے ایک رنگ آرہا ہے ایک جا رہا ہے پریشان ہے پیچھے ہٹتا ہے، پیچھے نہ ہٹیے۔ جہاں ہیں وہیں کھڑے رہیے یہاں آپ قالین پر گریں گے۔

میری کرسی لے لیجئے کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کیجئے یہاں زیادہ آرام سے کام انجام دیا جا سکے گا۔ آپ کنپٹی پر گولی چلائیں گے۔؟

یوں ہوں

داؤد۔ اگر آپ دل پر گولی چلائیں گے تو نشانہ خطا ہونے کا بہت کم امکان ہے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

حبیب آپ کا مطلب؟

داؤد۔ نہیں میں دخل نہیں دینا چاہتا آپ اپنی مرضی کے مختار ہیں آپ دل یا دماغ جس کا چاہیں نشانہ بنائیں ہا ہا وہ نظارہ کس قدر بہت افزا ہوگا حبیب آپ کا دماغ پاش پاش ہوا پڑا ہوگا یا آپ کے دل سے خون کا فوارہ جاری ہوگا اور یہ سب ایک انگلی کے اشارہ کا کرشمہ ہوگا گھوڑا دبنے کی ذرا سی آواز پر چشم زدن میں کل نقشہ بدل جائے گا دفعتاً آپ تمام تکلیفوں سے مبرا ہو جائیں گے کوئی کا دش آپ کو نہیں پہنچ سکے گی آپ ابدی سکوت سے ہمکنار ہوں گے بیان نہیں کر سکتا کہ میں اس سال میں کس خوشی سے آپ کے عمل کی تقلید کروں گا مجھے بھی نجات مل جائے گی ہم کس اچھی طرح سے اپنے رقیبوں سے بدلہ لیں گے ہم دنیا کو ٹھوکر مار کر اس کی شہرت سے بے نیاز ہو جائیں گے ہماری لاشیں یہاں پڑی ہوں گی دنیا دیکھے گی کہ ہمارے چہروں پر نفرت کی ہنسی ہو گی ہا نجات کا تصور بھی کس قدر پر لطف ہے جلدی کیجئے آپ کی ہمت کی میں داد دیتا ہوں۔ کس قدر استقلال ہے بس اب بسم اللہ کیجئے گولی چلایئے۔

حبیب۔ لیکن مجھے اپنی زندگی کو ختم کر دینے کا مجاز ہے —

داؤد۔ جی ہاں آپ ہی کے پاس اس کے کل حقوق محفوظ ہیں۔

حبیب۔ لیکن میں اپنے ساتھ آپ کو نہیں گھسیٹ سکتا یہ خون ہو گا
داؤد۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کا استقلال جواب نہ دے جائے آپ کہیں آخری وقت ہمت نہ ہار دیں ریوالور مجھے چلانے دیجئے میں نشانہ ٹھیک لگاؤں گا میں پہلے آپ کا خاتمہ کروں گا۔ اور پھر
حبیب۔ لیکن معاف کیجئے......
داؤد۔ آپ اپنے ارادے سے ہٹ رہے ہیں؟
حبیب۔ نہیں۔
داؤد۔ واقعی؟
حبیب۔ لیکن آپ کا خون میرے سر ہو گا خودکشی ہی بڑا گناہ ہے۔ میں آپ کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔
داؤد۔ آپ تکلف کر رہے ہیں آپ نے تو کہا تھا کہ میں تکلف سے دست بردار ہو چکا ہوں ارادے میں تبدیلی ناممکن ہے۔
حبیب۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا میں آپ کے خون کا باعث نہیں ہونا چاہتا۔
داؤد۔ اچھا (ٹھنڈا سانس لے کر) مجھے تو آپ کی خاطرداری منظور ہے آپ اجازت نہیں دیتے تو پھر میں زندگی کی مصیبتیں ہی جھیلوں گا لیکن آپ کے پاک ارادے آپ کی نجات آپ کی خوشیوں میں سد راہ نہیں ہوں گا۔
حبیب۔ آپ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ خودکشی نہیں کریں گے۔
داؤد۔ میں قسم کھاتا ہوں مجھے آپ پر رشک آتا ہے آپ کس قدر خوش قسمت ہیں خدا حافظ (بیٹھ جاتا ہے اور گردن جھکا لیتا ہے پھر گردن اٹھاتا ہے) کیا! آپ ابھی زندہ ہیں؟
حبیب۔ (ریوالور کی طرف اشارہ کر کے) اس کی وجہ۔
داؤد۔ وقت ضائع نہ کیجئے جس قدر جلد ہو سکے سکون ابدی کے پہلو میں پہنچ جائیے گولی چلائیے
حبیب۔ (امید کی جھلک چہرے پر آتی ہے) میرا ریوالور کام نہیں کرتا۔

داؤد۔ یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے؟

حبیب۔ اب کیا کروں؟

داؤد۔ گھبرایئے نہیں (اپنی جیب میں سے ریوالور نکال کر) آپ میرا ریوالور استعمال کر سکتے ہیں۔

افروز۔ (غسل خانے کا دروازہ کھول کر اس میں سے اپنا ہاتھ نکالتا ہے جس میں دوسرا ریوالور ہے) یہ ریوالور بھی

آپ کی خدمت کر سکتا ہے (اپنا سر نکالتا ہے)

حبیب۔ (گھبراتے ہوئے) تمہارا افروز صاحب

داؤد۔ یہ دیکھئے ریوالور تو دو دو ہیں آپ جو چاہیں استعمال کریں۔

حبیب۔ (بڑی مایوسی کے ساتھ) پردہ فاش ہو گیا ۔ اب پروپرائٹر کیا کہے گا؟

داؤد۔ کون پروپرائٹر؟

حبیب۔ دوکان کے پروپرائٹر جس کا میں نوکر ہوں

افروز۔ (ہنس کر) تو وہ تم کو یہاں بھیجتے ہیں تم خودکشی کا دھوکہ دے کر ریوالور بیچتے ہو؟

حبیب۔ جی ہاں افروز صاحب

افروز۔ تمہارا پروپرائٹر بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔

حبیب۔ لیکن اسے تو اس کا علم بھی نہیں ۔ یہ ترکیب تو میں نے نکالی ہے۔

افروز۔ تمہاری ہے؟ تو اور بھی قابل تعریف ہے۔

داؤد۔ (قہقہہ لگا کر) یہ ریوالور بیچنے کا بڑا نرالا طریقہ ہے ہوں تو آپ خردہ فروش ہیں؟

حبیب۔ جی نہیں میرا اصلی پیشہ اداکاری ہے۔

داؤد۔ آپ ایکٹر ہیں ایکٹر تھیٹر کے؟

حبیب۔ جی ہاں بچپن سے یہی کام کیا ہے اب تھیٹروں کے تماشے کون دیکھتا ہے ۔ ۔
نوکری کہیں ملتی نہ تھی پیٹ بھرنے کے لئے میں نے یہ ترکیب نکالی تین چار ریوالور
دن میں بیچ لیتا ہوں اور اس طرح بڑی اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔

افروز۔ اب تو آپ کو کوئی دوسرا کام ڈھونڈنا پڑے گا۔

داؤد۔ آپ تھیٹر میں دوبارہ کیوں نہ نوکر ہو جائیں۔

حبیب کس تھیٹر میں؟

داؤد۔ کسی میں بھی، افروز صاحب آپ کا تعارف کرا دیں گے۔ تو آپ کو

افروز۔ میں کبھی بھی تعارف نہیں کرانے کا۔!

داؤد۔ ہیں، ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا بندۂ قدر قسمت سے خود آن کر تمہارے دروازے پر دستک دی ہے اور تم چاہتے کہ دروازہ نہ کھولو تم ایکٹر کی تلاش میں تھے ایکٹر خود تمہارے پاس آ گیا اس میں شخصیت ہے کس قدر سنجیدگی سے پارٹ کرتا ہے درد کا کس اچھی طرح اظہار کرتا ہے یہ تمہارے ڈرامے کو چار چاند لگا دے گا

افروز۔ میں دیکھنے کے بعد دیکھوں میں پارٹ پڑھوا کر دیکھوں گا میں وعدہ نہیں کرتا

حبیب۔ (بہت خوش ہے) افروز صاحب میں آپ کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا میں آپ کی خوشنودی کے لئے کوئی چیز نہیں اٹھا رکھوں گا میں اپنی جان لگا دوں گا اگر آپ کو میرا پارٹ پسند نہ آئے ـــــ

داؤد۔ تو تم خودکشی کر لوگے!

حبیب۔ (خلوص سے ساتھ) اگر نہ کروں تو ـــــ

داؤد۔ (ہنس کر) ابھی آپ کے دماغ سے خودکشی نہیں اتری۔

افروز۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پردہ

سید ناصرالدین صاحب شمسی

امواجِ تغزّل

(از حضرت فراق گورکھپوری)

چھلک ساغر میں یہ شوخی کہاں — آنکھیں تری پگھلی ہوئی بجلیاں

کر تو چکا عشق بھی شرحِ و بیاں — رہ نہ گئی بات جہاں کی تہاں

بعدِ ستم اُن پہ پشیمانیاں — ہے وہی تیری روشِ امتحاں

لالہ و گل انجم و مہتاب و مہر — سب ہیں ترے حسن کی پرچھائیاں

عالمِ اسباب سے تقدیر دیکھ — مجھ کو ملیں سب بے سروسامانیاں

حسن کو کچھ نیند سی آئی ہوئی — خواب سے ملتی ہوئی بیداریاں

چل گئی کیا جانیئے کیسی ہوا — آج مجھے دل سے بھی اٹھا دھواں

مست جوانی کی ادا بن گئیں — ابر میں لہرائی ہوئی بجلیاں

بہر طلب سیکھ لے کچھ جہل بھی — کام نہ آئیں گی ہمہ دانیاں

جتنے بگڑتے گئے بنتے گئے — پوچھ نہ کچھ عشق کے سود و زیاں

اب وہ کہاں بےخودیٔ حسن بھی! — اب وہ محبت کا بھی عالم کہاں

جو بھی ہو، تو ہو کہ ترا حُسن ہو — کوئی مگر آ ہی گیا درمیاں

تیرگیٔ محفلِ مے پر نہ جا — کر دیں چراغاں نہ سیہ کاریاں

کچھ وہ سناتے ہوئے چپ ہو گیا — اور سے اب اور ہوئی داستاں

اس کے قریب خود کو نہ محسوس کر — دور رہو بچ جائیں گی رسوائیاں

دکھتے دلوں سے یہ ہوئے انقلاب — چوٹ کہاں تھی اُبھر آئی کہاں

آج کچھ آہٹ تو دلوں کو ملی — مدتوں ویران رہیں بستیاں

پا نہ سکی بھید یہ مست آنکھ بھی — یاد رہیں گی تری ہشیاریاں

حسن کے کچھ اور ہی خواب و خیال — عشق کے کچھ اور ہی وہم گماں

چارۂ غم کی بھی تمنا نہیں — پوچھ نہ کچھ عشق کی لاچاریاں

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

کیا وجود اور کہاں کا عدم — کوئی نہیں میرے ترے درمیاں

پار ہوا پار ہوا بحر غم — ڈوب چلیں ڈوب چلیں کشتیاں

گردش پیہم میں نگاہوں کی دیکھ — گھٹتی ہوئی بڑھتی ہوئی مستیاں

دام تو سمٹے دل ناکارہ کے — بک تو گیا پوچھ نہ ارزاں گراں

اپنی جگہ عشق اجڑتا رہا — اپنی جگہ بستی رہیں بستیاں

شوخیوں کا رنگ لئے شرم یار — شرم کے آثار لئے شوخیاں

حسن میں اور عشق میں اب میل ہے — ختم ہوئیں معرکہ آرائیاں

سمع نوازی ہے کہ آتش زنی — باتیں تری ہیں کہ یہی بجلیاں

آج تو خاموش نہیں عشق بھی — آج تو ہے اس کے بھی منہ میں زباں

کچھ ہے شکیبا دل بے تاب بھی — کچھ نگہ شوخ بھی ہے مہرباں

اب تو جہاں بھر سے وہ مانوس ہو — اب وہ نہیں عشق کی بیزاریاں

آ ہی گئیں تجھ میں سمٹ کر تمام — عالم ایجاد کی رعنائیاں

کہہ گئیں کیا کیا دل پرشوق سے — شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائیاں

آ نہ گئی آ نہ گئی تیری یاد — چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں

واسطۂ دار و رسن عشق کو — اور نہ کر اور نہ کر بدگماں

جیسے سیہ خانۂ غم میں فراق
کوندتی ہوں چاروں طرف بجلیاں

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

پیام [illegible] احمد صاحب احسان بی اے۔ ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ قیمت [illegible]
[illegible] کی غزلوں اور چند نظموں کا مجموعہ ہے۔ احسان صاحب اپنی نثر کی وجہ سے
کافی معروف [illegible] رسائل میں آپ کے علمی مضامین نکلتے رہے۔ لیکن یہ شاید زیادہ لوگوں کو نہ معلوم
ہو کہ آپ شاعر بھی ہیں اور اچھے شاعر ہیں چونکہ مزاج میں انکساری اور کسر نفسی بہت ہے اس لئے
آپ کا کلام اب تک اس سے پیشتر شائع نہ ہو سکا۔

شروع میں خود ہی دیباچہ لکھا ہے اور اپنی کمزوریوں کی طرف خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں
"فلسفہ [illegible] میں بالکل ناآشنا ہوں ایک معمولی لکھا پڑھا دنیا کا انسان ہوں اس لئے میری
بزم سراپوں میں کلیاتہ اسرار و معارف اور دقیق نکات کی جستجو فضول ہے ایک معمولی قوت تخیل رکھنے
والا شاعر ہوں۔ نظم کی قوت بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے تاہم طرز ادا کی پختگی اور صفائی کا حتی الوسع لحاظ
رکھتا ہوں وقت آفرینی اور مشکل گوئی کی میرے دماغ میں بہت کم صلاحیت ہے۔ البتہ میرے کلام
سے ناظرین کسی حد تک دل کی تپش اور احساس کی گرمی کا اندازہ کر سکتے ہیں" مرزا صاحب نے
یہ اپنا اندازہ بہت صحیح لگایا ہے۔

جہاں تک کلام کا تعلق ہے صفائی اور پختگی بہت زیادہ ہے مضامین پاک منزہ اور بے لوث
ہیں رکاکت یا سخافت آپ کے کلام میں کہیں نہ ملے گی تغزل جو فی زمانہ عریانیت کی طرف مائل
ہے آپ کے یہاں اصغر کے رنگ میں بہت پاک اور سنجیدہ نظر آئے گا ہوں باوجود پیام کے کچھ
پابند بیاباں ہی رہے یعنی خلش دل کے باوجود آپ صفائی کلام کی طرف زیادہ خیال رکھتے ہیں۔
بہ نسبت گرمی کلام کے۔ اور غالباً یہ بہت زیادہ ضبط دل کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ دل کی تپش اور

[illegible] احساس کی گرمی صرف کسی حد تک آشکارا ہو سکی ہے۔ پھر بھی حسن بندش اور صفائی کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ ایک نادر تحفہ ہے ایک غزل ملاحظہ ہو۔

ہم ایسے محو لذت دردِ نہاں رہے — دنیا سے بے نیاز رہے ہم جہاں رہے
یوں [illegible] راہ محبت تو لطف ہے — دل میں بھرا ہو درد مگر چپ زباں رہے
پامالی چمن ہو نگاہوں کے سامنے — اور اس پہ حکم یہ ہے کہ ضبط فغاں رہے
[illegible] غم سے ہو نہ سکا بے نیاز میں — ہر چند میرے حال پہ وہ مہرباں رہے
لٹتا رہا قفس کے قریب اپنا آشیاں — ہم تھے کہ پھر بھی مائل ہوا و گراں رہے

اے چشم شوق آج ہو یوں عرض مدعا
ہر جنبش نگاہ میں اک داستاں رہے

کتاب کی کتابت وطباعت بہت خوب ہے مصنف سے مل سکتی ہے۔

رہنمائے تاریخ اردو۔ مولفہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب ریٹائرڈ وکیل بنارس قیمت ۱۲/ نام سے اردو زبان کی تاریخ معلوم ہوتی ہے لیکن در اصل یہ فن تاریخ گوئی سے متعلق ہے مؤلف نے بہت محنت سے تاریخ گوئی کے تمام قواعد اور تمام مشہور شاعروں کی تاریخیں اور ان کی وفات کی تاریخیں مجتمع کر دی ہیں۔ اردو میں یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا ہے تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب بہت مفید اور پر از معلومات ثابت ہوگی۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے اور مولف سے مل سکتی ہے۔

زندگانی محمد۔ از محمد حسین ہیکل تقطیع چھوٹی ضخامت ایک سو اٹھائیں صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱ر۔ ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

محمد حسین ہیکل مصر کے مشہور عالم اور وہاں کے روزانہ اخبار السیاستہ کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے آنحضرت کی سیرۃ پر ایک کتاب لکھی تھی موجودہ کتاب اس کا مقدمہ ہے جو عربی سے فارسی میں منتقل ہوا اور اب عرشی صاحب امرتسری نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے اس

مقدمے میں ان تمام اعتراضات کے جواب ہیں جو مستشرقین اسلام پر وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ جوابات تمام تر عقلی اور تاریخی دلائل پر مبنی ہیں آخر میں خود عرشی صاحب کا ضمیمہ ہے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب الٰہی ترتیب ہے۔ ترجمہ صاف دلیس ہے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے۔

رسالہ جات:۔

ساقی (دہلی) افسانہ نمبر صفحات ۲۰۰۔ ملنے کا پتہ دفتر ساقی کھاری باولی۔ قیمت عہ

ساقی نے حسب معمول اپنا افسانہ نمبر اس سال بھی نکالا ہے اور اردو کے بہت سے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کئے ہیں۔ افسانے تقریباً تمام دلچسپ اور دل خوش کن ہیں کرشن چندر، عظیم بیگ چغتائی صادق الخیری، راجندر سنگھ بیدی اپندر ناتھ اشک کے افسانے خصوصیت سے دلچسپ ہیں۔ سید رفیق حسین صاحب کا افسانہ شیریں فرہاد اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔

ندیم (گیا، بہار نمبر) صفحات ۴۵۲ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ندیم گیا (بہار) قیمت عہ

شاید ہی کسی رسالے کا اتنا ضخیم اور اتنے کثیر مضامین پر مشتمل کوئی نمبر نکلا ہو۔ نثر و نظموں کی تعداد سو سے اوپر ہے اور تقریباً ۴۵ بلاک کی تصویریں ہیں۔ مضامین نگار حضرات میں تقریباً سب بہار ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اور مضامین بھی زیادہ تر بہار ہی سے متعلق ہیں۔ مقالات اعلیٰ اور بلند پایہ کے ہیں مضامین و منظومات کی ترتیب بہت مناسب ہے اشتہارات میں بھی سنجیدگی کو دخل دینا چاہئے تھا ذیل کے مضامین خاص کر بہت اہم ہیں۔

۱۔ مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں	از علامہ سید سلیمان ندوی۔
۲۔ فاتح بہار و بنگالہ محمد بن بختیار خلجی	از ابو النظفر ندوی
۳۔ عمدۃ الملک نواب داؤد خاں قریشی	از سید رضا قاسم۔
۴۔ مہاراجہ کلیان سنگھ	از سید حسن عسکری
۵۔ فردوسی و دقیقی	از پروفیسر طاہر رضوی
۶۔ غالب کی خود داری	سید علی حیدر

تاریخ کی رفتار

۱- رومی سلطنت کے بھی کیا عروج کے دن تھے ... ستے فتح وظفران کے جلو میں ہوتی ——— لیکن یہ پوری سلطنت شروع صدی عیسوی میں وحشی قوموں خصوصاً ہنوں کے حملوں سے تباہ و برباد ہو گئی۔

۲- روم کے زوال پر یورپ کی شیرازہ بندی بکھر گئی اور مسلمان فاتحین کی تکبیریں اسپین و فرانس میں گونجنے لگیں ——— لیکن ۷۳۲ء میں پوئٹرس پر ان کی قسمت نے پلٹا کھایا اور وہ یورپ کو کھو بیٹھے۔

۳- فرانسیسی بادشاہ نپولین نے گزشتہ رومی سلطنت کو پھر زندہ کرنا چاہا مشرق میں پولینڈ کو فتح کیا جنوب میں روم تک سب کو کاٹ ڈالا ——— لیکن اس کے مرنے پر اس کے مقبوضات دوسروں کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔

۴- انگریزوں نے بھی پلانٹیجنٹ بادشاہوں کے عہد حکومت میں فرانس کو ہڑپ کر لینا چاہا ——— لیکن جان آف آرک نے ۱۴۲۹ء میں آرلینس پر ان کے حوصلے پست کردیے اور انگریزوں کو اپنے جزیرے پر واپس جانا پڑا۔

۵- پندرہویں صدی عیسوی میں فاتح عثمانی ترک یورپ میں بڑھتے چلے گئے تمام بلقان ان کے قبضہ میں آگیا ——— لیکن وائنا سے آگے نہ بڑھ سکے۔
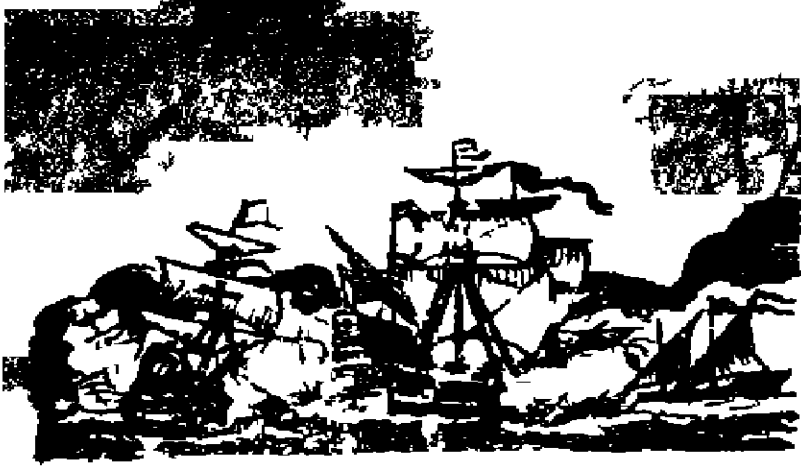
سپین کے ہیپسبرگ خاندان نے شادیوں
اپنی سلطنت بہت وسیع کرلی لیکن
شکست نے ان کے تمام حوصلے پست کر دیئے
۷۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے پیٹر اعظم نے بحیرہ
بالٹک کی تمام ریاستوں پر قبضہ کرلیا سویڈن والوں کو بھی
پولٹاوا پر شکست دی۔۔۔ لیکن یہ سلطنت کچھ ہی دنوں قایم رہی
اور ۱۸۱۰ء کے درمیان نپولین نے
اٹلی جرمنی۔ اسپین بلجیم ہالینڈ، ڈنمارک اور پولینڈ لے لیا
۔۔۔ لیکن واٹرلو نے اس ڈرامہ پر جلد پردہ گرادیا
۹۔ میں قیصر جرمنی نے جرمن سامراج
۔۔۔ لیکن مغربی محاذ پر جرمنی کی
قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔
۱۰۔ اب ہٹلر تمام یورپ پر چھا جانے کی فکر میں

مسلمان اور انجمن اتحاد باہمی

آج ہندوستان میں ہمارے کسان بہت ہی غربت و افلاس میں ہیں۔ آج سے ایک سو سال پہلے یورپ میں بھی اسی طرح غربت و افلاس تھی کسان اور مزدور مفلسی کے مارے پریشان تھے سرمایہ داروں اور مہاجنوں کے ہمیشہ مقروض رہتے تھے غریب کسانوں کی مدد کرنے کے لئے انیسویں صدی کے وسط میں جرمنی کے ایک شخص رے فیسن نے ایک نئے طریقہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام کوآپریٹو (یعنی انجمن اتحاد) رکھا شروع شروع میں تو یہ طریقہ ایک بہت محدود دائرہ میں رہا۔ دس بیس کسان مل کر ایک انجمن امداد باہمی بنا لیتے اس میں اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ جمع کر دیتے اور اس میں سے حاجتمند ممبر کو کچھ روپیہ کم شرح سود پر قرض دیدیتے اس طرح سے ہر ممبر اپنی مالی ضروریات پوری کر لیا کرتا تھا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوا کہ مہاجن کے پنجوں سے نجات ملی بلکہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ تمام ممبران مجموعی ضمانت پر کسی بنک یا مہاجن سے کم سود پر روپیہ قرض لیکر اپنی ضرورتیں پوری کر لیا کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ امداد باہمی کی انجمنیں اقتصادیات کے دیگر شعبوں میں بھی رائج کی جانے لگیں۔ مثلاً بیس کسان مل کر ایک انجمن بناتے جس کا کام عمدہ بیج یا زراعت کا دیگر سامان مہیا کرنا ہوتا تھا۔ بعض انجمنیں اس غرض سے بنائی گئیں کہ وہ پیداوار کو فروخت کریں۔ گاؤں میں سے بڑھ کر یہ طریقہ شہروں اور دیگر ملکوں میں بھی رائج ہونے لگا آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں یہ طریقہ رائج نہ ہو اور اسے فروغ نہ دیا جا رہا ہو۔ اکثر اقتصادیات کے ماہرین کا یہ خیال ہے کہ اس طریقہ کو سرمایہ داری اقتصادی نظام کا بہترین بدل قرار دیا جائے دنیا میں سے آہستہ آہستہ سرمایہ داری نظام کو ختم کر کے کوآپریٹو کے طریقہ کو رائج کیا جائے۔ امریکہ میں اس کی بہت کچھ کوشش ہو رہی ہے۔

ہندوستان کی حکومت نے بھی اس طریقہ کو پسند کیا اور سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے انجمن ہائے امداد باہمی قائم ہونے لگیں لیکن ہندوستان میں بعض خرابیوں کی وجہ سے یہ طریقہ بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا ایک خرابی تو یہی ہے کہ حکومت کے حد سے زیادہ دخل نے اس کی صحیح روح فنا کر دی ہے دوسرے اس کو صرف مالی ضروریات تک محدود کر رکھا ہے اقتصادی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسے بہت کم رائج کیا گیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ کوآپریشن کا طریقہ ایک بہت ہی عمدہ طریقہ ہے خصوصاً مسلمانوں کے لئے اس میں بہت ہی فائدے ہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے کے کاروبار میں لاکھوں روپیہ لگانے کی ضرورت ہے مسلمانوں کے پاس اتنا روپیہ نہیں۔ لہذا وہ کاروبار سے علیحدہ رہتے ہیں۔ دوسرے مسلمان سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں کاروبار [illegible] لین دین کئے نہیں ہو سکتا ہمارے مذہب میں چونکہ سود ناجائز ہے اس لئے ہم کاروبار نہیں کرتے [illegible]یات زندگی کا تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اگر مسلمان کوآپریٹو طریقہ (Cooperative System) کو سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں تو یقیناً یہ کمی دور ہو جائے گی صرف یہی نہیں بلکہ اس میں ایک اور فائدہ ہے موجودہ [illegible] ملک کی اقتصادی یکجہتی (Economic Nationalism) اس بات کی متقضی ہے کہ مل اور کارخانوں کو بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر چلایا جائے کیونکہ مال کی نکاسی کے لیے اب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ملک میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود کفیل (Self - Sufficient) ہو۔ اس چیز کا اثر ہندوستان پر بھی پڑے گا بہت ممکن ہے کہ حکومت کارخانوں کی وسعت پر پابندیاں عاید کر دے۔ ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ کوآپریٹو طریقہ کو [illegible] سے زیادہ فروغ دیا جائے گا۔ اگر مسلمان اس طریقہ پر اب سے کاربند ہو جائیں تو بہت فائدے میں رہیں گے

[illegible] کوآپریشن کو اقتصادی زندگی کے ہر شعبہ میں داخل کیا جا سکتا ہے لیکن میں اس وقت اس کوآپریٹو [illegible] ایک شکل بیان کروں گا جس کو مسلمان بہت آسانی کے ساتھ عملی جامہ پہنا کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کوآپریٹو اسٹور | کوآپریشن کا یہ ایک بالکل نیا طریقہ ہے جس کو دنیا بہت پسند کر رہی ہے کچھ آدمی مل کر ایک انجمن بنا لیتے ہیں تھوڑا تھوڑا سا سرمایہ جمع کر کے اپنی ضروریات زندگی کی چیزیں تھوک قیمت پر بازار سے لے آتے ہیں اور بازار کے بھاؤ اپنے بازاروں اور محلوں میں فروخت کرتے ہیں۔ تمام ممبر بھی اسی اسٹور سے اپنی ضروریات خریدتے ہیں۔ کوآپریٹو اسٹور کی یہ ابتدائی شکل ہے جب ممبروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور کچھ تھوڑا بہت نفع بھی ہونے لگتا ہے تو کام بڑھایا جاتا ہے ایک دوکان خریدلی جاتی ہے اس کے بعد کئی چھوٹے کوآپریٹو اسٹور مل کر ایک کوآپریٹو اسٹور بنا لیتے ہیں۔ جو براہ راست کارخانوں اور بڑی دوکانوں سے سامان لیتا ہے اور بازاری قیمت پر یا اس سے کچھ کم قیمت پر چھوٹے اسٹوروں کو دیدیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مسلمان کوآپریٹو اسٹور کس طرح قائم کریں | فی الحال تو مسلمانوں کو ان چیزوں کے کوآپریٹو اسٹور کھولنے چاہئیں جو ضروریات

زندگی ہیں۔ مثلاً اناج، کپڑا، شکر وغیرہ وغیرہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس محلہ یا مقام کے لوگوں کی کیا کیا ضروریات کی
چیزیں ہیں۔ جہاں مسلمان کی دوکان موجود ہو وہاں اُس چیز کا اسٹور نہیں کھولنا چاہیئے جو وہ فروخت کرتا ہے۔ ان
باتوں کا گاؤں اور شہروں میں غرض ہر جگہ خیال رکھا جائے محلہ یا اس مقام کے کسی تعلیم یافتہ یا قدرے سمجھدار انسان
کو چاہیئے کہ لوگوں کو ایک جگہ جمع کرے اور ان کو کوآپریٹو طریقہ کے فائدے سمجھائے جب وہ خوب سمجھ جائیں تو پھر ان کو
ممبر بنائے ممبر جہاں تک ہو سکے زیادہ بنائیں لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ ممبر دور دراز کے رہنے
والے نہ ہوں بلکہ قریب قریب کے دو یا تین محلوں میں رہتے ہوں کم از کم تین ممبر ہوں ہر ایک ممبر سے ممبری کا
ایک یا دو روپیہ چندہ لیا جائے۔ یہی چندہ کوآپریٹو اسٹور کا سرمایہ ہوگا اگر ضرورت محسوس کی جائے تو کچھ روپیہ مجبوری ضمانت
یا کم شرح سود پر یا بغیر سود پر قرض سے لیا جائے جس چیز کا آپ کو اسٹور کھولنا ہے پہلے اس کا تھوک داموں پر خرید
لیجئے۔ شروع شروع میں تو کوئی چھوٹی سی کوٹھری کرایہ پر لے لیجئے۔ وہاں یہ سامان رکھ دیجئے اور ممبروں ہی میں
سے کوئی دیانت دار آدمی فروخت کا کام بغیر دام دے لے۔ جب کام میں ترقی شروع ہو تو باقاعدہ کرایہ کی دوکان
لے لیجئے اور کوئی اچھا سا آدمی ملازم رکھ لیجئے جو حساب کتاب بھی جانتا ہو۔ فروخت بالکل نقد ہو ادھار کسی کو نہ دیا جائے
اگر کام بڑا ہو جائے اور ممبروں میں سے بعض ملازم پیشہ ہوں تو کچھ روز کے ادھار پر بھی مال فروخت کیا جا سکتا ہے۔

تمام چیزیں بازار کے بھاؤ پر بیچی چاہئیں ممبروں کو مال کے خریدنے پر دو پیسہ کمیشن دیا جائے اس سے ممبروں
کو فائدہ بھی ہوتا رہے گا اور اسٹور کی بکری بھی بڑھتی جائے گی کیونکہ جتنا زیادہ کوئی خریدے گا اتنا ہی زیادہ اس کو کمیشن کی صورت
میں فائدہ ہوگا جو ممبر دو دو چار چار آنے روز کا سودا خریدیں ان کا دو دو چار چار آنے کا حساب جمع کیا جاتا رہے مہینے کے
بعد جتنے روپیہ جمع ہوں ان پر دو پیسہ فی روپیہ کے حساب سے انہیں کمیشن دیدیا جائے۔ وہ خریدار جو ممبر نہ ہوں ان کو
کمیشن نہ دیا جائے جب تک وہ ممبر نہ بن جائیں۔

اسٹور کا انتظام کرنے کے لئے پانچ آدمیوں کی ایک اسٹور کمیٹی قائم کی جائے۔ اس کا کام اشیاء کو کم سے کم
قیمت پر خریدنا، ان کی بازار کے مطابق قیمتیں مقرر کرنا، اسٹور کی دیکھ بھال کرنا، ملازم وغیرہ کو تنخواہ دینا اور اسٹور کا تمام روپیہ جمع کرنا
وغیرہ وغیرہ ہوگا کمیٹی اس بات کی تلاش میں رہے کہ مال عمدہ اور کم سے کم قیمت پر ملے خرید فروخت کا روزانہ حساب کرتی رہے
اسٹور کھولنے کے بعد ہی ممبروں میں سے پانچ ارکان چن لئے جائیں۔ ایک مہینے تک یہ کام کریں مہینے کے

...ن میں سے تین ارکان کی بجائے دوسرے تین ارکان چنے جائیں اور یہ نئے تین منتخب شدہ ارکان پہلے دو
ممبروں کے ساتھ مل کر کام کریں پھر ایک مہینے بعد اسی طرح تین نئے ممبروں کا تین پرانے ممبروں کی جگہ انتخاب ہو جائے
... ایسے ممبروں میں دونوں وہ ممبر ہوں جو پچھلے مہینے میں باقی رہ گئے تھے اور ایک وہ ہو جو اس مہینے میں منتخب ہوا تھا۔ اسی
طرح سے ہر مہینے باقاعدہ انتخاب ہوتا رہے اس طریقہ سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ اتحاد کی صحیح سپرٹ
موجود رہے گی۔ دوسرے پچھلے مہینے کے دو ممبر نئے تین ممبروں کو اپنے پچھلے تجربہ کا حال بتا دیا کریں گے اس طرح
سے ایک تسلسل قائم رہے گا ایسا نہ ہوگا کہ ہر کمیٹی کی عمارت نو ساخت ہو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک ممبر کو اسٹور
کمیٹی کا باری باری ممبر بنایا جائے۔ اسٹور کمیٹی کا ممبر لائق آدمی کو بنانا چاہئے فرض کیجئے اگر ایک لائق آدمی پہلی مرتبہ
منتخب ہو گیا ہے تو وہ دوبارہ سہ بارہ بھی منتخب ہو سکتا ہے مہینہ کے آخر میں انتخاب کے ساتھ تمام ممبروں کو پچھلے
مہینہ کی پوری کارروائی سنا دی جائے۔

کمیشن دینے کے بعد بھی یقیناً اسٹور کو کچھ نہ کچھ منافع ضرور ہوگا اس منافع کو شروع شروع میں تو اسٹور کو وسیع
کرنے میں صرف کیا جائے پھر اس میں سے کچھ حصہ ناگہانی نقصان کو پورا کرنے کے لئے محفوظ رکھا جائے اس کے
بعد کچھ بچے تو وہ ممبروں میں تقسیم کر دیا جائے اگر منافع کے تقسیم کی نوبت آئے تو سالانہ ہو۔

جب شہر یا قصبہ میں مختلف محلوں میں بہت سارے چھوٹے اسٹور قائم ہو جائیں اور وہ چلنے لگیں تو پھر تمام
اسٹور مل کر ایک بڑا اسٹور قائم کریں جو بلا واسطہ بڑی دکانوں اور کارخانوں سے تھوک قیمت پر مال خریدے مال چھوٹے
اسٹوروں کی ضروریات کے مطابق خریدے اور قیمت خرید سے کچھ زیادہ قیمت پر ان کے ہاتھ فروخت کرے اس زیادہ
قیمت سے اپنا خرچ پورا کرے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ روپیہ منافع کی صورت میں جمع نہ ہونے پائے اگر منافع جمع
ہو بھی جائے تو چھوٹے اسٹوروں میں تقسیم نہ کرے بلکہ ناگہانی نقصان پورا کرنے کے لئے قائم رکھے۔

اس اسٹور کی بھی ایک اسٹور کمیٹی ہوگی ہر چھوٹا اسٹور اپنی اسٹور کمیٹی میں سے ایک ممبر چن کر بھیجے اس کمیٹی کا بھی
وہی کام ہوگا جو چھوٹے اسٹور کمیٹی کا ہے۔

اگرچہ اس طریقہ کو اسی طرح اور وسیع کیا جا سکتا ہے مگر میرے خیال میں ابھی اتنا ہی کافی ہے کیا ہمارے کالج
کے پروفیسر اور طلبا بھی تعطیل کا کچھ حصہ اس چیز کے پروپیگنڈا کرنے میں صرف کریں گے؟

(محمد یونس متعلم ایم اے)

شذرات

پچھلے جون کے مہینے میں ایک نئے عنوان "ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب اور ان کا تمدن کیا ہے" کا آغاز کیا گیا تھا اور اس سلسلہ میں ہر نقطۂ خیال کے لوگوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے افکار سے ناظرین جامعہ کو مستفید ہونے کا موقع دیں۔ لیکن ہمیں بہت تعجب اور افسوس ہے کہ کسی اہل فکر نے اس طرف توجہ نہ کی یا تو موضوع کو اس قابل نہیں سمجھا یا اس پر کچھ سوچنے کی فرصت نہ ملی اور نہ ارادہ کیا، ذہنی کاہلی جسے شان استغناء کہئے مانع رہی بہرحال ہم اپنے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے انھیں انتظار میں رکھا ستمبر سے ہمیں امید ہے کہ ان کی خدمت میں اس عنوان پر مسلسل مضامین پیش کرتے رہیں گے۔

گزشتہ مہینوں میں دو ایک موتیں بہت افسوسناک ہوئیں ایک تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے داعی اجل کو لبیک کہا آپ دکن کے مستعد صدر اعظم رہ چکے تھے آپ کو عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے واقفیت تھی اردو فارسی میں اکثر غزلیں کہتے رہیں مذاق بہت شستہ تھا وضعداری اور پرانی شریفانہ خصوصیات کا نمونہ تھے ہمیں ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

دوسری وفات خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی ہے خواجہ صاحب ان پرانے لوگوں میں سے تھے جو لکھنؤ کے پرانے وضعدار لوگوں میں سے تھے لکھنؤ میں لکھنوی نثر لکھنے والوں کی فی زمانہ یوں ہی کمی ہے مرحوم کی وجہ سے لکھنؤ کا بہت کچھ بھرم قائم تھا وہاں کی بول چال محاوروں اور روزمرہ کو خوب برتتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے اور وہاں کے لوگوں کو انکی سی نثر لکھنے کا شوق دے۔

مرحوم نے اودھ کی خصوصاً لکھنؤ کی طرزِ معاشرت رسم و رواج اور وہاں کی تہذیب کے نمونے اپنی مختلف تحریروں میں اچھے پیش کئے ہیں۔ قواعد زبان اور فن شاعری پر بھی کچھ رسالے یادگار چھوڑے ہیں

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار
ترجمان سرحد
(۱) سنہ ۲۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام
پشاور سے زیر ادارت ملک امیر عالم خاں (اعوان، ہزاروی رجامی) شائع ہوتا ہے۔
(۲) آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔
(۳) صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔
(۴) سرحد میں اصطلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد
کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے + سرحد کی قومی تحریکات کا پیش
ارگن رہا ہے۔
سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد
کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور سے آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد، علاقہ
آزاد، افغانستان، اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں
کے لئے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔
رعایتی چندہ سالانہ للعہ
ششماہی عہ
المشتہر
مینیجر ترجمان سرحد پشاور

گذارش احوال واقعی
ورارت ہمارے کارخانہ کی تیار شدہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے
۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز
کی۔ ز کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے
گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں
مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے
تیار کردہ ان اشیار کی فروخت کا فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے
اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے
سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس
آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے۔
اس لئے
اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور
خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ
خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے)
نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہمارے عطریات اور روغن انگریزی
یات سے پاک ہیں۔
منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر خانہ بلڈنگ لکھنؤ

اتحاد بین المذاہب کا واحد ماہانہ رسالہ
میل ملاپ
منظور شدہ از محکمہ تعلیمات گورنمنٹ بہار
ہر انگریزی ماہ کی ۱۵ کو ٹھیک وقت پر نصف اردو اور نصف ہندی میں نہایت آب و تاب سے
شائع ہوتا ہے مضامین اردو اور ہندی کے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اس کے دو ایڈیٹر ہیں ایک ہندو
ایک مسلمان۔ ملک میں فساد اور جھگڑے پھیلنے کے بہت سے ذرائع پیدا ہوگئے ہیں لیکن جھگڑے
دور کرنے اور یکجہتی اور رواداری پیدا کرنے کے لئے اس وقت تک بے لوث اور ہر مذہب و
قوم کا ہمدرد کوئی رسالہ یا اخبار نہیں شائع ہوتا ہے اس لئے بہار تھیاسوفیکل فیڈریشن پٹنہ نے یہ
خدمت اپنے ذمہ لے کر میل ملاپ کا اجرار کرنا طے کر لیا ہے اس کا مقصد ہندو مسلمان شیعہ سنی
مزدور اور سرمایہ دار، زمیندار اور کسان، امیر و غریب اور ہر آپس میں جھگڑنے والی جماعت
اور ریاست و رعایا میں میل ملاپ اور خوشگوار رشتہ پیدا کرانا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس
تحریک پر میل ملاپ کلب اور کانفرنس وغیرہ کی بنیاد شروع ہو چکی ہے۔
میل ملاپ میں علوم روحانی اور جدید روحانی تحقیقات، روحانی طاقت بڑھانے کے اصول
روحانی طاقت سے بیماریوں کا اچھا کرنا، مرنے کے بعد کے واقعات اور دنیا کی زندگی کے صحیح
واقعات درج کئے جاتے ہیں جسے ہر شخص بذات خود طاقت پیدا کر کے معلوم کر سکتا ہے، روحانی
علوم کے سلسلہ میں جو سوالات موصول ہوتے ہیں اس کا تشفی بخش جواب بھی تفصیل سے دیا جاتا ہے
چندہ سالانہ صرف عہ
بہار تھیاسوفیکل ہیڈ کوارٹر بلڈنگ بانکی پور پٹنہ (بہار)

دیہاتی دنیا

یہ رسالہ محکمہ اصلاح دیہات و پنچایت ہائے ریاست جموں و کشمیر کی سرپرستی میں پابندی وقت کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ زمیندار کی اخلاقی، مجلسی و روحانی اقتصادی غرض کہ اس کے ہر شعبہ زندگی کی اصلاح کی تدابیر کے ساتھ ساتھ اسے علم کی فضیلت سے روشناس کرانا اس کا خاص

نصب العین

ہے۔ اس کی ضخامت ۴۸ صفحات، سائز ۲۰ × ۳۰، کتابت عمدہ، کاغذ بڑھیا اور سرورق آرٹ پیپر پر ایک دیدہ زیب سہ رنگی تصویر سے مزین ہے۔ اس میں ہر ماہ کم از کم آرٹ پیپر پر دیہاتی زندگی کے متعلق آٹھ فوٹو بلاکس کی تصویریں دی جاتی ہیں اور بلند پایہ مضامین نظم و نثر رسالہ کی جان ہوتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں یہ شرف صرف رسالہ دیہاتی دنیا ہی کو حاصل ہے کہ والی ملک کے محل سے لے کر غریب زمیندار کی جھونپڑی تک اسے رسائی حاصل ہو۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا سالانہ

چندہ صرف تین روپیے (۳/-) ہے

ملنے کا پتہ

مینیجر رسالہ "دیہاتی دنیا" جموں، سرینگر کشمیر

طاقت اور جوانی قائم رکھنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا
OKASA اوکاسا
اوکاسا کی گولیاں
معدہ میں پہنچ کر فوراً حل ہو جاتی ہیں اور ان
کے اجزا خون میں مل کر جسم کے تمام حصوں میں
اپنا اثر کرتے ہیں
اوکاسا دل و دماغ، گردوں، معدہ اور ہاضمہ میں سے ہر ایک پر پورا پورا اثر رکھتا ہے۔
اوکاسا کا اصلی اثر غدود پر ہوتا ہے اس سے تمام جسمانی طاقت اور قوت مردانگی از سر نو پیدا ہونے
لگتی ہے۔ عورتوں پر بھی اثر ہوتا ہے جس سے ان کا بانجھ پن اور عام کمزوری اور حیض کا نہ آنا اور اس قسم کی
تمام شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔
اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے
اوکاسا ایسے اجزا سے بنی ہوئی ہے جو آپ کے جسم میں موجود ہیں اس لئے آپ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔
مردانہ طاقت بحال رکھنے کے لئے آج ہی سے اوکاسا شروع کیجئے
خرید کرتے وقت مردوں کے لئے اوکاسا (سلور) اور عورتوں کے لئے اوکاسا (گولڈ) طلب کیجئے
اوکاسا ہر دوا فروش کے یہاں ملتا ہے
اوکاسا کمپنی برلن لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۶ بمبئی
پارک منشن، دہلی یا براہ راست

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی چند نئی مطبوعات

معمار اعظم جدید یورپ کے نامور تمثیل نگار اِبسن کے مشہور ڈرامے (The Master Builder) کا ترجمہ، جو عزیز احمد صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) نے نہایت سلیس زبان میں تحریر کیا ہے۔ یہ ڈرامہ پڑھنے کے لائق ہے۔ فاضل مترجم نے ابتدائی چالیس صفحوں میں مصنف کے سوانح اور اس کی تصانیف پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحے قیمت بلا جلد ۱۲؍ مجلد عہ۔

اضافیت آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی عام فہم تشریح از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،

عام طور پر نظریۂ اضافیت کو ایک دقیق مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف دس بارہ ریاضی داں ایسے ہیں جو اس انقلاب انگیز نظریہ کو سمجھنے کے قابل ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بالکل مہمل نظریہ ہے لائق مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ ہر وہ ریاضی داں جو ریاضی کی ابتدائی شاخوں کا باضابطہ مطالعہ کرے اس نظریہ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے

طرز بیان سادہ اور عام فہم رکھا گیا ہے اور اصطلاحات سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحے۔ قیمت بلا جلد ۱۲؍ مجلد عہ

اقبال انجمن کے رسالہ اردو کا اکتوبر ۱۹۳۸ء کا نمبر "اقبال" نمبر کے نام سے شائع کیا گیا تھا یہ اس قدر مقبول ہوا کہ چند ہی روز میں اس کی یہ اشاعت ختم ہو گئی لیکن فرمائشیں برابر آتی رہیں اس لئے احباب شوق کے اصرار پر اس نمبر کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا انتظام کیا گیا یہ کتاب ۲۲×۱۸ کے ۳۰۰ صفحوں پر چھپی ہے قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (للعہ) غیر مجلد عار۔ رسالہ شاہکار لاہور کے مدیر کی رائے "اقبال نمبر" کے متعلق ملاحظہ ہو

آج تک کافی تعداد میں اقبال نمبر نکل چکے ہیں اور اقبال کی شاعری کے متعلق مضامین تو عام طور پر رسائل پر نکلتے رہتے ہیں لیکن رسالہ اردو کے اقبال نمبر نے تمام پر فوقیت حاصل کر لی آج تک اس قسم کے سیر حاصل مضمون شائع نہ ہوئے

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

سراغ رسانی کے شہرۂ آفاق ناول
مولفہ
... صاحب بی اے (علیگ) ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس
...ری
ایک سائنس داں ڈاکو اور علی گڑھ کالج کے ایک قابل طالب علم کا باہمی مقابلہ، حیرت کا مرقع اور عجیب و غریب اسرار کا ایک مجموعہ ہے جو مشہور فرانسیسی افسانہ نگار کی کتاب "پوئی سوئی" کو ہندوستانی زبان اور ہند کی تاریخ و معاشرت کا جامہ پہنا کر نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے جس کے پراسرار واقعات سے محض تفریح طبع ہی نہیں ہوتی بلکہ قوائے عقلی و ذہنی نشو و نما پاتے ہیں۔ ہمت و مردانگی کے جوہر جوش زن ہوتے ہیں، تخیل کا خاص ملکہ پیدا ہوتا ہے اور دنیاوی امور میں تجربات کا معتدبہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کتاب نے امید سے کہیں زیادہ خراج تحسین حاصل کیا ہے اور ہندوستان و بیرونجات میں اس کی کافی قدر کی گئی ہے۔ یکے بادیگرے نو بار طبع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکی ہے قیمت ۱۲؍
چوروں کا کلب
اس کلب کے ممبر دنیا بھر کے لہو و لعب سے سیر ہو گئے ہیں۔ ان کو معمولی مشاغل میں چنداں تفریح نہیں ہوتی۔ کلب کے ممبروں میں والیان ملک، کونسل کے آنریبل ممبر، محکمہ فوج اور صیغہ مال کے اعلیٰ افسر ہر قسم کے لوگ شامل ہیں اور محض دل بہلانے اور چوری کے خطرات سے لطف اٹھانے کے لیے کلب کو قایم کیا ہے۔ کلب کے ایسے ذی شان اور عالی دماغ ممبروں کے کار ہائے نمایاں (چوریاں) عجیب و غریب حرکات، حیرت انگیز نتائج ہر شخص کے دل پر اپنا

اٹلس اور جغرافیہ

مصور تاریخی اٹلس مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری ایم۔ اے۔ بی ٹی اس میں تین رنگین نقشے ہیں اور ہر نقشہ کے ساتھ تاریخ کے ضروری نوٹ بھی بلاک میں چھاپے گئے ہیں۔ طلبا کے لئے بہت مفید ہے عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ قیمت صرف ۶ر

مصور اردو اٹلس مرتبہ سید شرف الدین قادری صاحب ایم اے بی ٹی اس میں ۱۶ رنگین صحیح نقشے ہیں اور بہت سی تصویریں ہیں۔ قیمت صرف ۶ر

جیبی اٹلس تاریخ و جغرافیہ مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ اردو زبان میں ایک ایسی اٹلس ہے جو زیادہ سے زیادہ صحیح اور ... ہونے کے علاوہ طلبا اور عام شائقین کے علمی مذاق کے مطابق ہے اور جغرافیہ اور تاریخ جیسے مضامین میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں ۴۴ عدد چار رنگی اور ۲۷ عدد ایک رنگی نقشے اور تصویریں شریک ہیں یہ تمام نقشے اور تصویریں بہ صرف کثیر عکسی بلاک پر چھپی ہیں۔ حصہ دوم میں ان نقشوں کی مکمل تشریح لکھ دی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ر

مصور جیبی دنیا مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے بی ٹی۔ یہ اٹلس شروع سے آخر تک عکسی بلاکوں کے ذریعے قیمتی آرٹ کاغذ پر بہت ہی آب و تاب کے ساتھ کلکتہ میں طبع کرائی گئی ہے۔ سب نقشہ جات و تصاویر رنگین بلاکوں میں چھپے ہیں طالب علموں کے لئے ہر حیثیت سے مفید کارآمد ہے۔ قیمت ۶ر

مرقع عالم مرتبہ سید شرف الدین صاحب قادری۔ ایم اے بی۔ ٹی۔ اسے برسوں کی کتب بینی اور غور و فکر کے بعد اہل ملک کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ہاف ٹون بلاک کی رنگین و سادہ ۲۴ تصویریں ہیں دوسرے حصے میں لائن بلاک کے ۶۴ رنگین نقشے ہیں اور تیسرے حصے میں دونوں کا خلاصہ بہ شکل مضمون دیا گیا ہے اب تک تاریخ جغرافیہ اور معلومات عامہ کے لئے کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی قیمت مجلد ۱۲ر

مکتبہ جامعہ قرولباغ دہلی

ہندوستانی جہازراں کمپنی "حج لائن" کے تیز رفتار
اور آرام دہ جدید جہازات
"المدینہ"، "الہند" اور "انگلستان"
سے سفر حج کیجئے
ان جہازوں میں آپ کو نہایت آرام دہ اور تفریح گاہ اور
بحری نظارے کیلئے خوبصورت برآمدے ملیں گے۔ ڈیک کے مسافروں کیلئے برقی پنکھے۔
مذہبی اور ادبی کتب کا دارالمطالعہ۔ باجماعت نماز کیلئے کشادہ اور پاک صاف علیحدہ جگہ
کا اعلیٰ انتظام۔ حسب مذاق عمدہ اور لذیذ کھانا اور میٹھا پانی دن رات بافراط
وغیرہ وغیرہ
عید الفطر کے بعد ہمارے جہازات تھوڑے تھوڑے وقفہ سے
روانہ ہوتے رہیں گے
دی سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ
بلارڈ اسٹیٹ بمبئی

جدید مطبوعات جامعہ

خندان۔ حضرت ڈاکٹر بھی ہیں اور شاعر بھی مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ڈاکٹری زیادہ دلچسپ ہے یا ان کی شاعری۔ اسی قسم کے کرداروں نیز زندگی کے دوسرے دلچسپ پہلوؤں پر پروفیسر رشید احمد صاحب کا اعلیٰ مزاح، لطیف ترین طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر محظوظ کرنے والی تحریریں اگر آپ کو دیکھنا ہوں تو موصوف کی یہ نئی تصنیف ملاحظہ فرمائیے۔ یہ چالیس مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

رگبی کی زندگی۔ طامس ہیو کی شہرۂ آفاق تصنیف ''ٹام براؤنس اسکول ڈیز'' کا ترجمہ۔ انگلستان کے مشہور ماہر تعلیمات ڈاکٹر طامس آرنلڈ کے اصول تعلیم کی نہایت صحیح تعبیر ہے جسے ان کے شاگرد رشید طامس ہیو نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ثانوی تعلیم کے نظام میں ایک انقلاب سا ہوگیا تھا۔

یہ کتاب ہے تو افسانے کے طرز پر لیکن اس میں طامس آرنلڈ کے ان تمام بنیادی اصولوں کی تشریح کی گئی ہے جن پر انھوں نے اپنے رگبی کے مدرسۂ ثانوی کے نظام کی بنیاد ڈالی تھی اور بعض ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ اسے ''لیونارڈ و گرٹروڈ'' اور ''سارٹر سارٹس'' جیسی معیاری کتابوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ قیمت [illegible]

جوہر عبدالحق نمبر۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کی سترویں سالگرہ کے موقع پر مکتبہ جامعہ نے طلبہ جامعہ کی انجمن اتحاد کے آرگن ''رسالہ جوہر'' کا عبدالحق نمبر شائع کیا ہے جس میں اردو ادب و زبان پر ملک کے سربرآوردہ اصحاب قلم مثلاً سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر حمیداللہ افسر وغیرہ کے تنقیدی، ادبی اور تاریخی مضامین کے علاوہ مولانا عبدالحق صاحب کے حالات اور خدمات پر ایسے لوگوں کے مضامین ہیں جو مولانا کی خلوت و جلوت کے شناسا اور واقف کار ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے سربرآوردہ رہنماؤں اور قائدین ملت کے پیغامات بھی شریک ہیں۔ قیمت مجلد [illegible]

مضامین محمد علی حصہ دوم۔ یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی پوری تاریخ ہے جو [illegible] سے
شروع ہو کر ۱۹۳۰ء پر ختم ہوتا ہے۔ سر سید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں
کو تمام سیاسی [illegible] سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے؟ اسلامی سیاست کا مسلک وفاداری
[illegible] کا قیام کہاں اور کیسے عمل میں آیا۔ لیگ انگریزی دوستی سے ہٹ کر
[illegible] کانگریس سے [illegible] پھر کس طرح دونوں کی راہیں الگ الگ
ہوئیں؟ وغیرہ۔ قیمت [illegible]

مبادی سیاسیات۔ مصنفہ نواب میر ہارون خاں شیروانی ایم اے (آکسن) ایف آر ایچ ایس
بیرسٹرایٹ لا۔ صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

[illegible] ملک میں لوگوں کی سیاسی معلومات اتنی کم ہیں کہ شاید کسی متمدن ملک میں یہ حالت
ہو۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کسی سیاسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک جذبات سے الگ ہو کر علمی
گفتگو نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خود ہماری مادری زبان میں علم سیاست پر اچھی
کتابوں کا فقدان ہے۔

مبادی سیاسیات اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ذرا تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی
تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت اور روس کی اشتراکیت پر بھی
خاص طور پر تنقید کی ہے۔ دوران بحث میں دوسرے ملکوں کی حکومتی اداروں کا بھی ذکر ہے۔
مصنف کی خاص کامیابی یہ ہے کہ اس نے اصطلاحات کے اشکال کو تشریح کی مدد سے
عام فہم بنا دیا ہے۔ قیمت [illegible]

انگلستان کا طریقہ حکومت۔ ہر ملک کا اپنا طریقہ حکومت ہوتا ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے
دستور کی موٹی موٹی باتیں مبتدیوں کیلئے آسان اردو میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ نئی دہلی

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹیڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال — عالیجناب ہز ہائینس آغا خانصاحب

منظور شدہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپیہ ۶۰۰۰۰۰

جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ ۲۵۰۰۰۰

ادا شدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچیس ہزار نو سو پانچ روپیہ

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کے مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمہ کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ایک ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن) اور احمد آباد

ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن

اسلامی تمدن کے متعلق علی العموم اور مسلمانان ہند کے تمدن کے متعلق بالخصوص ایک عرصہ سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ یہ تمدن جس کے متعلق اس قدر شور و غوغا بلند کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ کانگریس کی رو میں سے اس کے وجود کو خطرے میں ڈال رکھا ہے کن خصوصیات کا حامل ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں آیا اس کا کوئی وجود بھی ہے یا یہ صرف فرقہ پرستوں کا ایک واہمہ ہے جس کا نام لے لے کر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف سے بدظن کیا جا رہا ہے اور آزادئ وطن کی راہ میں مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے تو حسب معمول ایک جگہ اس مسئلہ کا تصفیہ کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اسلامی تمدن شمالی ہند کے مسلمانوں کے اونچے طبقوں کی بعض خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً ایک خاص طرح کا پاجامہ ایک خاص طرح کا ڈاٹا، ترکی ٹوپی لمبی داڑھی اور خشخشی موچھیں غرضکہ اسی قسم کے چند خصائص ہیں جنھیں اسلامی تمدن کا معزز لقب دے دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جلد یا بدیر فنا ہو جائیں گی نہ یہ کوئی ایسی بیش بہا متاع ہے جس کے ضائع ہو جانے پر کوئی عقلمند شخص ماتم کرے گا۔

اس قسم کی سطحی باتیں صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھیں سیاسیات کے ہنگاموں سے اتنی فرصت نہیں ملتی ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر گہری نظر ڈال سکیں یا اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکیں کسی قوم کا تمدن اگر صرف ایسی ہی خصوصیات سے مرکب ہوا کرتا جن کا بیان اوپر گذر چکا ہے تو دنیا میں ایک تہذیبی وحدت کا قائم کرنا کوئی دشوار امر نہ ہوتا اور ہر قوم کے لئے آسان ہوتا کہ وہ ایک مشترک عالمی تہذیب کی خاطر اپنی ان خصوصیات سے دست بردار ہو جائے۔ جس چیز کو تمدن کہا جاتا ہے اس کی حقیقت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے آداب معاشرت، رسوم و شعائر، زبان، لباس ان سب کو زیادہ سے زیادہ تمدنی مظاہر کہا جا سکتا ہے

اگر دراصل تمدن انہیں عناصر کے مجموعہ کا نام ہوتا تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوتے کہ مغرب میں ایک تمدن نہیں بلکہ اتنے ہی تمدن ہیں جتنی وہاں قومیں بستی ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم فرانسیسی تمدن، انگریزی تمدن، جرمن تمدن، روسی تمدن اور اطالوی تمدن کا نام نہیں سنتے ہیں اس کے بجائے ہم ایک جامع لفظ مغربی تمدن استعمال کرتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ تمدن سے ہماری مراد یہ ظاہری صفات خصوصیات نہیں ہیں بلکہ اس کا سرچشمہ کوئی ایسی شے ہے جو مغرب کی تمام قوموں میں مشترک ہے۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے The true seat of Culture is the mind of man یعنی ہر قسم کی شائستگی اور تہذیب کا اصلی محل انسان کا ذہن ہے تمدن کی حقیقی تعریف یہی ہے کہ وہ ایک مخصوص ذہنی میلان یا انداز فکر کا نام ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کے مطابق اُس کے افراد قوم پر حالات و واقعات کا ایک خاص ردعمل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مغربی قوموں کے محسوس وظاہر اختلافات کے باوجود ہم انہیں ایک ہی تمدن کے حامل کی حیثیت سے جانتے ہیں کیونکہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے ان کی سرشت کا خمیر تیار ہوا ہے وہ سب ہیں یکساں اور مشترک ہیں۔ جب مسلمان اپنے تمدن کو خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے تو دراصل اُس کے دل و دماغ میں یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ اس کا اسلامی ذہن خطرہ میں ہے یعنی وہ ذہن جو اُس کی مخصوص تہذیب و شائستگی کا محل ہے۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اسلامی تمدن کو مٹا دینے کے لئے کوشاں ہے تو ہماری مراد یہ نہیں ہوتی ہے کہ ہمارے آداب و اطوار ہمارے رسوم و شعائر لباس و زبان اور ہمارے علوم و فنون پر حملہ کیا جارہا ہے یا اُن کے مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ زبان کے مسئلہ نے جو اہمیت اختیار کرلی ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ زبان کا معاملہ بجائے خود

اہم ہے بلکہ اُس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوگئی ہے کہ اور چیزوں کی بہ نسبت ہمارے اسلامی
ذہن سے اُس کا تعلق زیادہ قریب اور زیادہ گہرا ہے۔ جس چیز کے تحفظ کے لئے ہم واقعتاً مضطرب
و بیقرار ہیں وہ وہی ہمارا اسلامی ذہن ہے۔ اگر یہ ذہن محفوظ و سلامت رہنے دیا جائے تو شاید
ہمیں اپنے آداب و لباس، مراسم و شعائر اور زبان کے مٹ جانے پر کوئی افسوس نہ ہو۔ جو کچھ
کشمکش ہے وہ اسی ذہن کو باقی رکھنے کے لئے ہے اور یہی ہمارے تمدن کی روح ہماری تہذیب
کی جان اور ہمارے کلچر کی بنیاد ہے یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک خالص سیاسی جدوجہد
سے ہمارے اسلامی ذہن کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب بہت صاف اور سیدھا سا ہے اور
وہ یہ کہ یہ جدوجہد جو ابتداءً خالص سیاسی نوعیت رکھتی تھی اب اپنا قالب بدل چکی ہے اور اس
کا سیاسی پہلو اب اتنا قوی نہیں رہا ہے۔ اس جدوجہد نے ایک تہذیبی کشمکش کی شکل اختیار
کر لی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر اب صرف آزادی ہی نہیں چاہتے ہیں وہ یہ بھی چاہتے
ہیں کہ اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات ہندوستان کی پوری آبادی پر مسلط کر دیں
وہ ایک خاص نظام تصورات (Ideology) کے داعی اور مبلغ بن گئے
ہیں کی خواہش یہ ہے کہ ہر فرد قوم بلا امتیاز نسل و مذہب اس نظام تصورات کو قبول کر لے۔ یہاں
پر ہمارا اسلامی ذہن درمیان میں آجاتا ہے کیونکہ اس نظام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے
بلکہ اپنا ایک جداگانہ نظام تصورات رکھتا ہے جس کے علاوہ کسی دوسرے نظام پر عمل پیرا ہونے
پر راضی نہیں ہے مثال کے طور پر عدم تشدد کے عقیدہ کو لیجئے بنیادی قومی تعلیم کی
اسکیم میں اس عقیدہ کو بھی تعلیم کا ایک جزو قرار دے دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ
ہر طالب علم کو جو اس اسکیم کے تحت تعلیم حاصل کرے گا خواہ وہ مسلمان ہو یا کسی مذہب سے تعلق
رکھتا ہو اس عقیدے پر ایمان لانا پڑے گا کہ عدم تشدد تشدد سے بہر حال بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے
کہ طالب علموں پر اس عقیدہ کی نسبت کوئی جبر کیا جائے گا لیکن جب انھیں تعلیم ہی یہی دی
جائے گی کہ عدم تشدد سے اعلیٰ تر اصول زندگی اور کوئی نہیں ہے تو انہیں غیر شعوری طور سے

اس کی صداقت پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی ذہن سے کلی مغایرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس عقیدہ کی بھی تلقین کی جائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں اور کسی ایک مذہب کے پیروؤں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب سے فائق و برتر خیال کریں۔ جہاں تک مسلمان لڑکوں کا تعلق ہے اُن کے لئے اس تعلیم میں یہ خطرہ ہے کہ اُن میں سے اسلام و کفر کے امتیاز کا ضروری احساس مٹ جائے گا۔ آگے چل کر میں یہ بتاؤں گا کہ اس امتیاز کو برقرار رکھنا مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لئے کیوں ضروری ہے۔

اسلامی ذہن نے جس تمدن کو پیدا کیا ہے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں جو اسے دوسرے تمدنوں سے جدا کرتی ہیں۔ اس کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ یہ پورا تمدن خدا پرستی کی روح سے معمور ہے۔ یہ روح اس تمدن کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہے اسی کے اضمحلال سے اسلامی تمدن کو مائل بہ انحطاط کر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کا سبب بھی یہی ہے کہ اُن کی اکثریت خدا پرستی کی روح سے بیگانہ ہو گئی ہے، اس کے باوجود اب بھی مسلمانوں کی زندگی میں اُس کے مظاہر و علامات کثرت سے نظر آتے ہیں۔ ایک مسلمان بچہ جس وقت بطنِ مادر سے اس فضائے آب و گل میں پہلی مرتبہ قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلی آواز جو اُس کے کانوں میں پڑتی ہے وہ یہی خدا پرستی کی آواز ہے جو خدا کی عظمت و کبریائی کے اعتراف اور رسالت کے اقرار پر ختم ہوتی ہے۔ پھر جب تک وہ اس دنیا میں رہتا ہے ہر روز پانچ وقت یہی آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ صبح و شام ہر موقعہ اور ہر محل پر مختلف طریقوں سے اُس کو خدا پرستی کا سبق دہرانا پڑتا ہے ہر کام کی ابتدا وہ خدا کے نام پر کرتا ہے۔ کھانا کھاتا ہے یا پانی پیتا ہے تو الحمد للہ کہہ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنا کوئی ارادہ ظاہر کرتا ہے تو انشاء اللہ کہہ کر خدا کی قدرت کو تسلیم کرتا ہے۔ صبح اٹھتا ہے تو کلمہ طیبہ پڑھتا ہوا اور رات کو بستر پر لیٹتا ہے تو خدا کو یاد کرتے ہوئے سوتا ہے غرضکہ اُٹھتے بیٹھتے

لئے پیتے نہاتے دھوتے ہر وقت وہ کسی نہ کسی شکل میں اس سبق کو دہراتا ہے۔ یہ سب سے بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ مسلمان کی زندگی اور اُس کے تمدن کی بنیاد بھی خدا پرستی کی روح ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے یہ تمام اعمال اب میکانکی اور بے روح ہو گئے ہیں اور ان میں خدا پرستی اور یزداں طلبی کا حقیقی ولولہ سرد پڑگیا ہے لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کا تمدن اپنے پورے عروج پر تھا مسلمانوں کے یہ شعائر اُن کی روح خدا پرستی کو کیسی تقویت بخشتے ہوں گے۔ جس تہذیب و تمدن میں خدا پرستی کی یہ شدت ہو وہ اُن لوگوں کے ملکوں میں کیونکر نہ کھٹکے گا جو عدالت میں صرف اس لئے حلف لیتے ڈرتے ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے خدا کا نام زبان پر لانا پڑتا ہے جس حکومت کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی اس کے تحت مسلمانوں کے مذہبی عقائد و اعمال کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے اس کے بعد بھی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تمدن کی طرف سے جو خطرات لاحق ہیں وہ بے اصل و بے بنیاد ہیں۔ اسلامی تمدن کی ایک اور بڑی خصوصیت اس کی حقیقت پسندی (REALISM) ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ وہ دنیا میں اعلیٰ ترین نصب العین اور شریف ترین مقاصد رکھنے کے باوجود ہر جگہ حقائق سے مطابقت پیدا کرلیتا ہے مجرد فلسفیانہ تصورات اور افسانہ آمیز خیالی کے لئے اس نظام تمدن میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اپنے ضابطۂ اخلاق میں، اپنے شرعی قوانین میں، اپنے معاشی اور عمرانی نظریات میں غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں وہ نفس انسانی کے داعیات اور انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا ہے جو اُس کی فطرت کے خلاف یا اُس کے امکان اور طاقت سے باہر ہو اسلامی تمدن میں رقیت (Sentimentalism) کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس تمدن کا مقصد امن و امان کا قیام اور جنگ و خونریزی کا انسداد ہونے کے باوجود وہ کبھی اس فریب میں مبتلا نہیں ہوا کہ خالی عدم تشدد سے

دنیا میں امن قائم کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ اگر ظلم و ستم کا جواب خاموشی اور صبر و رضا سے دیا جائے تو ہمیشہ کے لئے زمین کا خاتمہ ہو سکتا ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک چیز جنگ و خونریزی بھی زیادہ بُری ہے اور وہ فساد ہے اُس کے مٹانے کے لئے تم کو تلوار ضرور اُٹھانی پڑے گی خواہ اس میں کتنے ہی بندگانِ خدا کی جانیں تلف ہو جائیں۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ انسانی ضمیر کی آزادی کے لئے لڑائی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے اگر خدا کی عبادت کرنے احکام شرعی بجا لانے اور حق بات کہنے میں تمہاری مزاحمت کی جائے تو تم پر لازم ہے کہ جنگ کرو یہاں تک کہ تمہاری مذہبی آزادی بحال ہو جائے۔

رقیت (Sentumentalism) سے اس تمدن کو جو بُعد ہے وہ مسلمانوں کے معاشرتی تعلقات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اسلامی تمدن میں عورتوں کی ملکیت کا پورا پورا حق دیا گیا ہے اگر اس حق سے فائدہ اٹھا کر کوئی عورت دولتمند بن جائے تو اس کے لئے ضروری نہیں ہے اور نہ اس پر وہ مجبور ہے کہ وہ اپنی دولت کا کوئی حصہ اپنے شوہر کے حوالے کر دے۔ بلکہ مسلمانوں کی زندگی میں ایسی صورتِ حال بھی پیش آ سکتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر اتنا غریب ہو اور خود عورت اتنی دولت مند ہو کہ وہ زکوٰۃ کا روپیہ فقراء اور مساکین کے بجائے اپنے شوہر کو دے دے۔ یہی حال مرد و زن کے دوسرے تعلقات کا ہے۔ جو لوگ زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر ایک خیالی شرافت کے تصور میں گُم رہتے ہیں وہ اس حقیقت پسندی کے متحمل نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کی ان معاشرتی خصوصیات پر معترض رہتے ہیں۔ ہندوستانی تمدن کے تحت زندگی بسر کرنے والے افراد کی نظروں میں تو یہ خصوصیات سراسر عیوب میں داخل ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک شرافت کا معیار یہ ہے کہ مرد و زن کے تعلقات میں عورت اپنے جذبات و داعیات کو شوہر کی مرضی پر ہمیشہ کے لئے قربان کر دے۔ اسی لئے ہندوؤں میں طلاق ناجائز ہے اور خود یورپ میں جب تک عیسائیت کا کچھ بھی اثر باقی رہا طلاق کو ایک ناقابل تصور ذلّت خیال کیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر بڑی لے دے

[illegible] کہ انھوں نے ایسی معیوب چیز کو روا رکھا ہے۔

اسلامی تمدن کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں دوسری قوموں کے تمدن پر اپنے تمدن کی فوقیت و برتری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تمدن کو آج تک یہ خطرہ کبھی پیش نہیں آیا کہ وہ دوسرے کسی تمدن سے مغلوب ہو کر اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھے یا رفتہ رفتہ اس میں ضم ہو جائے۔ یہ احساس امتیاز کفر و اسلام کی شکل میں ہر مسلمان کے دل میں موجود رہتا ہے۔ مخالفین اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس احساس کے ذریعہ مسلمانوں اور دوسری قوموں میں باہم نفرت و عداوت کا بیج بو دیا گیا ہے لیکن یہ اس کی غلط تعبیر ہے۔ ہر قوم کے لئے جو اپنے تمدنی وجود کو باقی رکھنا چاہتی ہے اپنے تفوق کا احساس ضروری ہے۔ اگر اسلام بحیثیت ایک تمدن، دوسری تمام تہذیبوں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا ہے تو پھر اس کے وجود کی کوئی علت ہی باقی نہیں رہتی پس یہ کفر و اسلام کا امتیاز اسلامی تمدن کے لئے بہرحال ایک ضروری چیز ہے اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے مسلمانوں کو بعض ایسی ظاہری علامات و خصوصیات قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جو مسلمانوں کو دوسری اقوام سے اول نظر میں ممتاز کر دیتی ہیں یہ علامات اسلامی تمدن کی شناخت کا کام دیتی ہیں انہیں کا نام شعائر اسلامی ہے جن کی پابندی مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان شعائر کی اہمیت جو کچھ ہے محض اس لئے ہے کہ یہ امتیاز کفر و اسلام کے احساس کو زندہ رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور مسلمانوں کو دوسری قوموں میں ضم ہو جانے سے بچاتے ہیں ورنہ بجائے خود ان شعائر کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہے اسی امتیاز کفر و اسلام کو برقرار رکھنے کے لئے مسلمان شعائر اسلامی کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ شعائر اسلامی کو خطرہ میں دیکھ کر مسلمان کے مذکورہ بالا احساس پر کس قدر کاری ضرب لگتی ہے اور اس کو اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں اسی طرح وہ تمام علامات جو اس کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں رفتہ رفتہ مٹ نہ جائیں اور اس کا وجود دوسری تہذیبی وحدتوں میں گھل مل کر فنا

نہ ہو جائے جس کا باقی رکھنا وہ اپنی فلاح و بہبود کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ کفر و اسلام کے امتیاز کا احساس مسلمان اسی مقصد کی خاطر زندہ رکھنا چاہتا ہے

یہاں پر یہ کہہ دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تمدن کی جو خصوصیات اوپر بیان کی جا چکی ہیں وہ ہر ملک کے مسلمانوں میں مشترک طور سے پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی ممالک کی تمدنی زندگی میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ اختلافات صرف ظواہر و فروعات تک محدود ہیں مثلاً مسلمانوں میں زبان اور آداب معاشرت کا اختلاف پایا جاتا ہے یا لباس اور طرز زندگی میں بھی آپ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے جدا پائیں گے لیکن ان اختلافات سے اصل حقیقت نہیں بدل جاتی ہے جہاں تک اسلامی ذہن کا تعلق ہے وہ ہر ملک کے مسلمانوں میں یکساں طور سے مشترک ہے اور جیسا کہا جا چکا ہے اسلامی تمدن کا حقیقی سرچشمہ بھی ذہن ہے پھر وہ تمام اخلاقی اور عقلی محرکات جن سے اسلامی تمدن کی ترکیب عمل میں آئی ہے پوری دنیا کے مسلمانوں کو بلا امتیاز نسل و زبان ایک تہذیبی وحدت میں منسلک کئے ہوئے ہیں اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں ان محرکات عمل سے خالی نہیں رہ سکتے،

محمد مظہر الدین صدیقی بی۔اے

ڈومینین اسٹیٹس

ڈومینین درجہ مبہم اور گول مول سی اصطلاح ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ اس درجہ کا نام ہے جو دوسری نوآبادیات کو حاصل ہے۔ یہ درجہ ان مشاورتوں اور کانفرنسوں کی سلسلہ در سلسلہ کڑیوں کا نتیجہ ہے جو آئین ویسٹ منسٹر کی شکل میں نمودار ہوا۔ شاہی کانفرنس ۱۹۲۶ء کے ریزولیوشن کے مطابق آئین مذکور نے برطانیہ عظمیٰ اور نوآبادیات کو ایسے ممالک تسلیم کر لیا جو "سلطنت کے اندر خود اختیارانہ حیثیت رکھتے ہیں، درجہ میں مساوی ہیں اور کسی صورت سے ایک دوسرے کے ماتحت نہیں، نہ اپنے خانگی نہ اپنے بیرونی معاملات میں"۔ بظاہر خود اختیاری حکومت میں جو اس انداز سے بیان کی گئی ہو اور سوراج میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ درحقیقت جہاں تک داخلی امور کا تعلق ہے نوآبادیات یکسر آزاد ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے قوانین بھی بنا سکتی ہیں خواہ وہ شاہی احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی قانون بغیر ان کی مرضی کے ان کے سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ خانگی امور میں وہ شاہی حکومت کے دست نگر نہیں ہیں مگر لطف یہ ہے کہ خارجی معاملات میں نوآبادیاتی خود مختاری کی اصل صورت کو ایک تھکا دینے والی ضابطگی میں بڑی حد تک چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً نوآبادیاں جب چاہیں عہدنامے کر سکتی ہیں اور اگر چاہیں تو اپنے نمائندے مقرر کرنے کا حق بھی رکھتی ہیں۔ اپنے مادری ملک سے اشتراک عمل اور مراسلت کرنے کی انہیں صرف اس صورت میں ضرورت ہوگی جب بیرونی تعلقات کے مسائل سامنے آ جائیں۔ مگر عملی طور پر نوآبادیات کی خارجی حکمت عملی ہمیشہ شاہی حکومت کے اشارہ کی منتظر رہی ہے، اور نوآبادیات نے ایسے حالات میں اپنے حقوق پر اصرار بھی نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک اس کا سبب ان کی اپنی کمزوری ہو لیکن اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ برطانوی دفتر خارجہ اور ان کے مابین کسی اہم

مسئلہ میں کوئی سخت اختلاف رائے پیدا ہی نہیں ہوا۔ البتہ حال میں متعدد نوآبادیات میں بے اطمینانی اور اضطراب کے جذبات پیدا ہوئے اس لئے کہ شاہی کابینہ نے معاملات میں نوآبادیات سے مشورہ لئے بغیر خود ہی سب کچھ طے کر دیا۔ دور و دراز نوآبادیات کے بعد حکمت خارجی کا تعین دشوار نظر آتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کوئی فوری ضرورت درپیش ہو حکمت عملی میں اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے اس کے حل کا کوئی طریقہ دفعات وضع کر کے نہیں بتایا گیا۔ اسی طرح آئین ویسٹ منسٹر او بہت ضروری سوالات کا جواب دینے سے عاری نظر آتا ہے مثلاً برطانوی جنگ میں حق غیر جانبداری حق علحدگی اور اسی طرح کے مسائل، جواب سے تشنہ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ جنرل ہرٹزاگ اور دوسرے مدبرین نے اسی قسم کے حقوق کا مطالبہ کیا ہے اگرچہ برطانیہ نے ان کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ موجودہ حالات کی روشنی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نوآبادی کو علحدگی سے روکا نہیں جا سکتا اگر علحدگی اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہو۔ ممکن ہے کہ یہ سوال اس وقت تک نہ پیدا ہو جب تک کہ نوآبادیات کے جذبات کا لحاظ رکھا جائے۔ ڈومینی درجہ اپنی عملی حیثیت میں خود کافی لچک دار ثابت ہو چکا ہے اور اس بارہ میں آئرلینڈ کی مثال سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ کیا کوئی شخص تصور کر سکتا تھا کہ خود اختیاری حکومت کے اس ملک کے لئے انجام کار کیا معنی ہوں گے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ اور نوآبادیات کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے والے حالات اب تک کافی وسیع ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ علحدہ کرنے والی زبردست قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ تمدنی اور اقتصادی اسباب نے ان ملکوں میں سلطنت برطانیہ سے علحدگی کے رجحانات پیدا کر دئے ہیں ہر ملک کو اس کے مخصوص مقامی حالات نے ایک زبردست معاشی جذبۂ قومیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ بعض ملکوں، خصوصاً جنوبی افریقہ اور فرانسیسی بولنے والے حصۂ کینیڈا میں، اور اس سے کم درجہ پر دوسرے حصوں میں ایک

تمدنی جذبۂ قوم پرستی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ بجائے سلطنت کی بنیادوں کو سیاسی اور اقتصادی یکسانیت اور جذبہ اور نصب العین کی ہم آہنگی پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باہمی مادی نفع کا لحاظ بھی سب سے ضروری چیز ہے، کیونکہ دنیا میں کوئی ملک اپنے حیاتی اور مرکزی معاملات کو خواہ ان کا تعلق معیشت سے ہو یا سیاست سے، صرف خیالی [illegible] اخلاقی یا نظریۂ اتحاد کی خاطر قربان کرکے زیادہ دنوں تک بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

اب لوٹ کر ذرا ہندوستان اور ہندوستان کے معاملات کی طرف نظر ڈالئے۔ [illegible] کی طرح کو ہندوستانی حکومت کی منزلِ مقصود سرکاری طور پر لارڈ اردن نے اس بیانِ ابتدائی میں قرار دیا تھا جو انھوں نے قانونِ حکومت سنہ ۱۹۱۹ء کی [illegible]ت کے لئے شائع کیا تھا۔ ہندوستان کی آئینی تاریخ ایسی اصطلاحات سے بھری پڑی ہے جو اس منزل تک پہنچانے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان کی قومی بیداری کا وہ طوفان جو فطری حالات سے پیدا ہو کر موجیں مار رہا ہے، محض درجۂ نوآبادیات کی تسلی سے دھیما پڑ سکتا ہے؟ وہ قوتیں جو برطانیہ اور ہندوستان کو متحد کئے ہوئے ہیں یقیناً کمزور ہیں، ان قوتوں کے مقابلہ میں جو برطانیہ اور دوسری نوآبادیات کی باہم شیرازہ بندی کر رہی ہیں۔ تاریخی روایات، جذبات کی ہم آہنگی اور اختلافِ نظریہ کی خلیج بہت وسیع ہے عوام کے بہت بڑے حصہ اور خصوصاً روشن خیال طبقہ میں یہ میلانِ طبع یکسر ناپید ہے، اور اس معاملۂ خاص میں اہل الرائے کے وزن اور وقعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان ہی میں سے اکثر عوام کی رہنمائی کرنے والے پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہندوستان کی ایک مخصوص تہذیبی قومیت کی تعمیر ہو چکی ہے جو اپنی قوت میں آئرلینڈ اور جنوبی افریقہ سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ تہذیب ان صدیوں کی گود میں پلی ہے جو ہندوستان کے مختلف قسم کے باشندوں کو اس ملک میں رہتے گذریں اور صدہا برس کی روایات نے اس پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ اور ہر چند کہ اس میں مغربی تہذیب سے دوچار ہونے

کے باعث بہت بڑی بڑی تبدیلیاں ہوگئی ہیں لیکن اب بھی ہندوستان اور مغربی تہذیبوں کے اختلاف کافی نمایاں ہیں۔ برطانوی جمہوریت کے پرجوش حامی یہی کہتے رہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ جمہوریت پر باہم ایمان لے آنا ہندوستان اور برطانیہ کو متحد کردیگا۔ مگر یہ دلیل اب وزنی نہیں ہے۔ خود جمہوریت کی ایک مخصوص صورت ہے جس میں وہ جلوہ فرما ہوتی ہے اور برطانوی جمہوریت ہندوستانی روشن خیال طبقہ کے دل کو ہمیشہ نہیں لبھا سکتی۔ محض اپنے سامراجی خط و خال کی وجہ سے۔ ناانصافی ہوگی اگر اس ضمن میں برطانیہ کے جمہوری اداروں اور روایات آزادی کی تعریف نہ کی جائے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ حقیقی جمہوری روایات کو اس نے دوسرے نوآبادیات سے قطع نظر کم از کم اپنے وابستہ ملکوں کے طرز عمل میں کبھی روا نہیں رکھا۔ دنیا کے دوسرے وسیع مسائل میں بھی ہندوستانی تاثرات نے ہمیشہ برطانیہ کی حکمت عملی کا ساتھ نہیں دیا۔ پس معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ کے نظریوں میں اختلاف، سیاست کے بنیادی اصولوں کے سبب سے ہے۔

اقتصادی اور سیاسی حالات نے ہمیشہ ان ملکوں کے تعلقات کو متعین کرکے گویا ان کی حد بندی کی ہے۔ کوئی ملک، اپنے حقوق کو فرضی اصولوں پر بھینٹ چڑھانا زیادہ دنوں تک گوارا نہیں کرے گا اور نہ اس مطمح نظر میں زیادہ عرصہ تک کوئی کشش باقی رہتی ہے جو قیام اتحاد کے لیے بنایا گیا ہو۔ جب لوگ برطانیہ سے نکل کر کنیڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ تجارت کی غرض سے روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت اُن کے مادری ملکوں کے حقوق میں کوئی تصادم نہ ہوا۔ مگر اُن کے نوآبادیات میں بس جانے کے بعد حالات بدلتے گئے۔ برطانیہ سے مقابلہ کی وجہ سے ان نوآبادیوں میں ایک قسم کا اقتصادی جذبۂ قومیت پیدا ہوگیا جس نے اپنے آپ کو حکومت خود اختیاری یا آزادی کے مطالبہ کی صورت میں پیش کیا۔ اقتصادی جذبۂ قومیت ہندوستان میں بھی اسی طرح حقوق کے تصادم سے پیدا ہوا ہے یہ تاریخ کا ایک ناقابلِ انکار اور ساتھ ہی ساتھ افسوسناک واقعہ بھی ہے کہ یورپی تاجروں نے اپنی تجارتی

غرض کی خاطر ہندوستان کو سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بڑی حد تک جان بوجھ کر پامال
کیا گیا یہ لوگ ہندوستان میں اور نوآبادیات کی طرح رہ نہیں پڑے یعنی وہ ہندوستانی نہیں
[illegible] چاہتے تھے۔ برطانیہ اور ہندوستان کا تعلق تاجر اور گاہک کا تعلق
[illegible] تک رشتہ کی یہی صورت موجودہ زمانہ کے لگ بھگ باقی رہی۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے اقتصادی مسائل میں کبھی باہم مماثلت پیدا
نہ ہو سکی۔ اور معاملات کا تصادم اب بھی اپنی جگہ قائم ہے گو اس کا زور کچھ کم ہو گیا ہے۔ بلاشبہ
حالات کے اسی پہلو نے خود اختیاری حکومت کی اس تحریک کو وہ جارحانہ قومی رنگ بخشا ہے
جس میں ہمیں وہ آج نظر آتی ہے۔

حالات کی کشمکش کا یہ عالم ہونے کے باوجود بہت سے لوگوں کے خیال کے مطابق
سلطنت کی محافظت ہندوستان کے لئے بے انتہا ضروری ہے اور یہاں اسی وجہ سے
درمیانی درجہ کی صورت میں صرف داخلی اختیارات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اگر خاص عملی
نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں سلطنتِ برطانیہ میں رہ کر حکومت خود اختیاری
قبول کر لینا سب سے بڑی مصلحتِ وقت نظر آتی ہے۔ ہندوستان کا سلطنتِ برطانیہ
سے تعلق جاری رکھنا باوجود اپنی خامیوں اور محدود فائدہ کے اپنے اندر چند بڑے بڑے
نفع رساں امکانات بھی رکھتا ہے۔ بین الاقوامی لاحکومیت کے اس دور میں کسی بڑی
طاقت سے قریبی نسبت خود ایک بڑا بیش بہا سہارا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی کمزوری
اس کا جغرافیائی لحاظ سے ایسی جگہ واقع ہونا جہاں سے حملہ آسانی سے ممکن ہے اور خاص
طور پر ایسی صورت میں جب کہ دوسری سامراجی قوتیں ہندوستان کے مغرب اور مشرق
دونوں جانب اپنے پنجۂ آز کو برابر دراز کر رہی ہیں۔ شاید طاقتور فوجی حفاظت کا طالب
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوال کیا جائے کہ اپنی کمزوری میں خود ہندوستان کا کیا قصور ہے؟
گر یہاں [illegible] کے اس پہلو سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر سے

برطانیہ کی محافظت یہاں کے معتول اور امن پسند باشندوں کے لئے بڑی نعمت ہوگی۔ اور چونکہ ڈو مینی درجہ عملی حیثیت سے کافی لچکدار ثابت ہوچکا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ قومی جذبات کی بچینی کو اس سے تسلی نہ ہو۔ قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈومینی درجہ کے ماتحت ہندستانی حکومت دوسری نوآبادیات کی طرح، اپنے مطالبات اور ضروریات میں آہستہ آہستہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

ہندوستان کو خود مختارانہ حکومت دینے کی جو کارروائیاں کی جارہی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی رفتار بہت سست ہے حالانکہ سرکاری اعلانات اور وعدوں کے ذریعہ ہندوستان کا مقصد ڈومینی درجہ بہت دفعہ قرار دیا جاچکا ہے۔ مگر شاید ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ جب کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ دوسری قوم کے ہاتھ میں ہو تو ایسی صورت میں موخرالذکر سے جو حقوق خود اختیاری آئینی قوانین کے ذریعہ ملتے ہیں، قدرتی طور پر اس فیاضانہ لطف وکرم کی بخشش بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے لمبی لمبی کانفرنسوں، معاہدوں اور اعلانات کا صبرآزما سلسلہ جو ایک صدی سے جاری تھا آخر اب جاکر قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ اس وقت دستوری مسئلہ سے قطع نظر کرکے کہنا صرف یہ ہے کہ "ہندوستانی ہوم رول کے ایک قدم" کے لحاظ سے یہ قانون پچھلے قوانین سے کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھتا۔ بیرونی معاملات اور دفاع جس نے مالیہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہضم کرلیا ہے، محض محفوظ موضوعات کے لئے علاحدہ رکھ لئے گئے ہیں اور ملک کے قدامت پرستانہ اور جاگیردارانہ عناصر کی آواز مجالس قانون ساز میں غیر ضروری طور پر بڑھادی گئی ہے سیاست دانی کی ان شوخیوں کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ان حالات میں جمہوری خود اختیارانہ حکومت بالکل ناممکن الوقوع ہو کر تو نہیں رہ گئی؟ اس قانون نے بے اطمینانی کی ایک عام لہر ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک دوڑا دی تھی، یہاں تک کہ لبرل جماعت بھی، جس کی ڈومینی درجہ کے لئے حمایت، اب روائتی حیثیت اختیار کرچکی ہے

اس سے خوش نہیں ان حالات میں قدرتی طور پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کو اس نصب العین تک پہنچنے کی جس کا باضابطہ اعلان برابر ہوتا رہا ہے کبھی اجازت دی بھی جائے گی یا یہ طفل تسلیاں یوں ہی جاری رہیں گی؟

ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کا مسئلہ موجودہ آئینی مباحث کے دوران میں پھر اٹھا ہے۔ ہندوستان کی لبرل جماعت کی طاقت اور اثر اب کم ہو چکا ہے اور انتہا پسند عناصر پیدا ہو کر مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور برطانوی تعلقات کے بالکل منقطع ہو جانے کا دوسرا نام مکمل آزادی ہے۔

آزادی کی یہ تحریک نتیجہ ہے اس زبردست اور جارحانہ جذبۂ قومیت کا جو معاشی اور تہذیبی دونوں اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس کے پردے میں بڑی بڑی نفسیاتی قوتیں کارفرما ہیں۔ اور اس کو تقویت اس ردِعمل سے ہوئی جو آئینی اصلاحات کی اس "آہستہ خرام بلکہ مخرام" جیسی رفتار اور شہنشاہی پارلیمان کا اپنے اختیارات تفویض کرنے میں تامل کے باعث پیدا ہو چکا ہے۔

لیکن کیا موجودہ حالت میں ہندوستان کے لئے مکمل آزادی عملی حیثیت سے سودمند ثابت ہوگی؟ شاید اس سوال پر انتہا پسند طبقے نے اس توجہ سے غور خوض نہیں کیا ہے، جس کا یہ مستحق ہے۔ مگر کہا یہ جا سکتا ہے کہ سیاست میں عملیت ہی ہمیشہ فیصلہ کن عنصر نہیں ہوتی اور سیاسی تحریکوں کی رہنمائی تو اکثر ایسی تصوریت سے ہوا کی ہے جس میں مشکل سے عملی حیثیت پائی جاتی ہے۔ شہنشاہی تعلقات سے علیحدگی کے یہ معنی ہوں گے کہ ملک کو بڑے خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہندوستان کی کمزوری، اس کا بے موقع محل دقوع، اس کا فرقہ وارانہ مسئلہ۔ ملک کی یہ سب دشواریاں ایسی ہیں جن کی نوعیت دوسرے ممالک کے مسائل سے بہت کچھ مختلف ہے۔ ان دشواریوں، اور کچھ ان حالات نے جو ان سے کم نمایاں اور اہم ہیں، بعض لوگوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ حکومت خود اختیاری کو

نصب العین قرار دینا بھی ہندوستان کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ بعض حلقوں میں حکومت خود اختیاری کو "ہندوستان کے وسیع اور ریخ میل برّاعظم" کے لئے ناموزوں قرار دیا گیا ہے اور ڈومینین درجہ کے وعدہ کو جنگ کا نامعقول پروپگنڈا بتاکر ملامت کی جاتی ہے کیونکہ جنگ ہی کے زمانہ میں حکومت خود اختیاری ہندوستان کا مطمح نظر تجویز کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کی نزاکت کو کم یا نظرانداز ہرگز نہیں کرنا چاہئے ایسا ہوا ہے کہ ان ممالک نے جو اسی نوعیت کے مسائل میں مبتلا تھے، حکومت خود اختیاری یا آزادی حاصل کی ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس آزادی کی کوشش کو برقرار رکھنے کی کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان گوناگوں اور مختلف النوع حالات کے باوجود جو ہندوستانی زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، قومی آزادی کی طرف تحریک اٹھ اور پھیل چکی ہے۔ نوآبادیات کے تجربہ کو سامنے رکھ کر یہ مان لینا نامناسب نہیں کہ ہندوستان کے مخصوص مسائل، مثلاً ملک کی بے طاقتی، حکومت خود اختیاری کے زیر سایہ خود بخود رفع ہوجائیں گے۔ رہا فرقہ دارانہ مسئلہ، سو اس کے متعلق حالات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع قائم کی جاسکتی ہے کہ جب آئینی مسئلہ تسلی بخش طور پر حل ہوجائے گا تو موجودہ لڑائیاں اور تلخیاں خود بخود جاتی رہیں گی، جس طرح دوسرے نوآبادیات، مثلاً کنیڈا یا جنوبی افریقہ میں ہوا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ اپنی اہمیت اور اثراندازی میں وہ اس حد تک نہ پہنچا ہو

ہندوستان کے لبرلوں کا اثر کم ہوجانے سے ڈومینین درجہ کا مرتبہ ہندوستانی سیاست میں بہت گر گیا ہے۔ اب تحریک آزادی ہندوستان میں ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہو رہی ہے قومی رہنما مکمل آزادی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ پنڈت جواہرلال کہتے ہیں کہ "ہم صرف ایک نیا نظام حکومت ہی نہیں چاہتے بلکہ ہم ایک نئی ریاست کے طالب ہیں"۔ اس نظریہ کے مختلف پہلو نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں۔ ہندوستان کی پست حالی قوی اصلاحی توانین چاہتی ہے تاکہ یہ ملک بھی دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہوسکے۔

قدامت پسندانہ اور رجعتی قوتیں اب تک اپنا کام کر رہی ہیں اور پہلے کی طرح آج بھی ملک کی سماجی اور اقتصادی
ترقی میں پوری طرح حائل ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی اکثریت اس بیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی
اپنی پوری قوت کے ساتھ مسلط ہے۔ قومی تحریک ان رکاوٹوں کی مخالف سمت میں اچھی طرح ابھر کر
اپنے آپ کو پھیلا رہی ہے ہندوستان کا بنیادی مسئلہ یہاں کے فاقہ اور افلاس کا مسئلہ ہے
جس میں ملک کے کروڑوں انسانوں کی معاشی زبوں حالی اور بے چینی کا راز پنہاں ہے۔ ہمارے
ملک کا موجودہ نظام اس مسئلہ کے پیدا کرنے کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ ہمیں شاید ملک کی اقتصادی
اور سماجی ترقی کے لئے ہندوستانی سماج کے ڈھانچہ کی نئے سرے سے تعمیر کرنا ہوگی۔ اس سلسلہ
میں بائیں بازو کے عقیدے کے خیالات بھی قابل غور ہیں۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ
اقتصادی اور سماجی آزادی کی اہمیت کسی طرح سیاسی آزادی سے کم نہیں۔ ملک کے معتدل اور صلح پسند
سیاستدان اب تک شہنشاہی پارلیمان کی آئینی کارروائی کی نگاہِ لطف کے امیدوار ہندوستان کی خرابیوں
کے رفع ہو جانے کی آس لگائے بیٹھے ہیں مگر جب حالات ایسے ناگفتہ بہ اور بیماریاں ایسی شدید
ہوں تو کیا صرف اس نوع کا اقدام ہی اس کے جلد اور مؤثر علاج کے لئے کافی ہوگا؟ اب تو ضرورت
اس کی ہے کہ شدید اصلاحی قوانین کو بروئے کار لایا جائے اس کے لئے کم از کم مکمل داخلی حکومت
خود اختیاری کی ضرورت ہوگی ہندوستانی سیاست اور برطانیہ کے مابین مصالحت کی کوئی امید نظر
نہیں آتی جب تک کہ حکومت خود اختیاری کے حق کو تسلیم نہ کر لیا جائے اور ہندوستان کو اس کی اجازت نہ دی جائے
کہ وہ اپنے خانگی مسائل کی گتھیاں خود سلجھا سکے۔ اس مقصد کے لئے بلاشبہ برطانیہ کو بادی قربانیاں کرنا
پڑیں گی اور ہو سکتا ہے کہ برطانوی جمہوریت کو اپنے سرمایہ دارانہ انداز کے تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے
آج سامراجی طرز عمل کو ختم کرنے کے لئے جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اس میں بہت کچھ اصلیت پنہاں ہے جب
تک ایسا نہ ہو، دولت مشترکہ کے پاکیزہ مقصد اور بلند حوصلہ کی گفتگو خیال پرستوں کی بڑ تصور کی جائیگی
یا سامراجی پروپیگنڈا، جس کا طلسم کم ہو جانے کے باوجود اب بھی کچھ نہ کچھ ملک کی فضا پر طاری ہے۔

مقبول الرحمٰن بی اے (آنرز)

افلاطون کی ریاست
اور
اُس کا نظام تعلیم

انسانی زندگی بہر پہلو عمل اور ردعمل کا ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ یہی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ زندگی سے کتنا ہی دور یا کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو کار فرما نظر آتی ہے۔ تعلیمی دنیا کا قانون بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے یونان کی تاریخ تعلیم کا جس مرکز سے آغاز ہوتا ہے وہاں ہم ہمیشہ عمل اور ردِ عمل کی قوتوں کو زندہ و متحرک دیکھتے ہیں اہل اسپارٹا اپنی سیاسی ضروریات کی بنا پر مجبور تھے کہ وہ اپنے ہر فرد کو ریاست کے مفاد کا ذریعہ کار بنائیں۔ خود اہل اسپارٹا تعداد میں نو ہزار تھے لیکن انہیں دو سو پچاس ہزار غلام رعایا پر حکومت کا جوا سنبھالے رکھنا تھا اس لئے کوئی تعجب نہیں جو وہ اپنی عورتوں کو بھی اس جسمانی ورزش کے لئے مجبور کرتے تھے جو مردوں کے لئے مقرر تھی بچے پیدا ہوتے ہی ریاست کی نگرانی میں دیدئے جاتے تھے اور وہ بچے جن کے جوان ہو کر مضبوط سپاہی بننے میں ذرا بھی شک ہوتا تھا ماؤں کی گود سے چھین کر ہلاک کر دئے جاتے تھے الغرض اہل اسپارٹا کی تاریخ تعلیم اول سے آخر تک سماج پر فرد کی قربانی کا ایک افسانہ ہے۔ لیکن جب سماج کی جکڑبندیاں برداشت سے زیادہ صبر آزما ثابت ہوئیں تو ایک قوت نے مخالف رخ میں کام کرنا شروع کر دیا اور یہ قوت انفرادیت کی قوت تھی۔ انفرادیت اہل ایتھنز کے زیر سایہ پلی پوسی لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ انفرادیت بھی اسی قدر تکلیف دہ ایک قوت بن گئی جس قدر کبھی سماجیت تھی۔ سوفسطائی پیدا ہوئے جنہوں نے فرد کو ہر چیز کا پیمانہ قرار دیا ـــــ دنیا کا پیمانہ بھی اور عقبیٰ کا بھی۔ یہ اصول اپنی جگہ برا نہیں لیکن رفتہ رفتہ انفرادیت نے اس شرابی کی حیثیت اختیار کر لی جس کا ہر قدم بہکا ہوا

ہوتا ہے۔ انفرادیت کا پیمانہ بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھ گیا کہ اس میں ہر چیز غرق ہو کر رہ گئی۔ سوفسطائی
جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ زمانہ خود ان کے لئے سازگار تھا۔ عہد جدید کے ایتھنز میں جمہوری
رجحانات کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ قریب کے ممالک سے ربط و ضبط سیاسی اور تجارتی معاملات میں وسعت پیدا کر چکا
تھا۔ نئے زمانے کے نئے طور طریقے تھے اور نئی رسوم و روایات۔ دیوتاؤں کے قصے کہانیوں کے
مافوق الفطرت کو علمی نقطۂ نظر سے واضح کرنے کی کوشش ہونے لگی تھی۔ فلسفہ بھی فطرت سے زیادہ
اب انسان کی قدر و قیمت پر روشنی ڈالنے لگا تھا۔ اسی طرح شعر و ادب میں بھی نادیدہ دیویوں دیوتاؤں
کی جگہ انسان اور انسان کی زندگی کو ملی اور تقدیر سے زیادہ تدبیر پر زور دیا جانے لگا۔ قدامت پسند
یونانی ان نئے سماجی رجحانات کو "انفرادیت کا جنون" کہتے تھے اور ارسٹافینز کے الفاظ میں اسی
انفرادیت کے جذبے ان کے بچوں کو ناپاک، عورتوں کو ایک مستقل عذاب، شوہروں کو نافرض شناس
اور غلاموں کو کاہل بنا دیا تھا۔ سوفسطائی سیر و سیاحت کی بدولت عام یونانیوں سے ذرا زیادہ جہاندیدہ
واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے نیک نیتی کے ساتھ ایتھنز کے نوجوانوں کو بدلتی ہوئی دنیا کے ہاتھ
بدوش چلنے کے قابل بنانا چاہا لیکن جیسا کہ کسی کا قول ہے۔ "ہمارے سب سے زیادہ معصوم ارادے
ہی بعض وقت ہمارے سب سے زیادہ مکروہ گناہ ثابت ہوتے ہیں" سوفسطائی بھی بہت جلد اپنے مقصد
سے دور جا پڑے تعلیم یونانیوں کے لئے محض ایک شغل فرصت تھی سوفسطائیوں نے سب سے پہلے
اسے افادی رنگ میں دیکھنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ورزشیں جن سے کبھی قوت اور صحت مقصود تھی جسمانی
ساخت میں محض جمالیاتی اضافوں کا ذریعہ بن گئیں اور اس لئے وہ یونانی نوجوان جو کبھی پگھلی ہوئی برف
کے چشموں میں کود پڑتے تھے گرم پانی سے غسل کرنے کے شایق ہو گئے شعر و ادب میں جواب تک
مذہب و اخلاق کا دستور سمجھا جاتا تھا۔ قوس قزح کی رنگینیوں کا اضافہ ہوا موسیقی جو کبھی جزو عبادت تھی تفاعلی
پہلو اختیار کر کے یکسر جذبات کی بجلی بن گئی۔ رقص جو کبھی صرف دیوتاؤں کو محظوظ کرنے کا ذریعہ تھا انسان
کے سفلی جذبات کا بھی جنت نگاہ بن گیا اور لائر (...) میں جس میں پہلے صرف سات تار ہوا کرتے تھے آٹھواں
تار لگایا گیا الغرض پہلے جہاں صرف آسمان کا ذکر تھا اب اس کے ساتھ زمین کا ذکر بھی آیا۔ پہلے جہاں

[illegible]ت دیوتا ہی دیوتا نظر آتے تھے اب وہاں انسان کو بھی اذن باریابی نصیب [illegible] اور جیسے حال [illegible]ن ہی دین تھا تو اس دنیا کو بھی جگہ ملنے کا مستحق سمجھا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ علم اور علم دانی جو کبھی یونان ور [illegible] کے یہاں پختہ ذہنی کے معیار پر پرکھی جاتی تھی اب محدود ہو گئی خطابت کے ظاہری شور و غل تک [illegible] منطق کی آڑ میں ایک ہی بات کو کبھی جھوٹ اور کبھی سچ ثابت کرنے تک نتیجہ بقول ارنسٹ بیئر [illegible]نانی دیوتاؤں کے سینے سکڑ گئے اور ان کی زبانیں لمبی ہو گئیں"۔

انتشار اور تنزل کی اس چلتی ہوئی موج کی روک تھام کے لئے کچھ مصلح پیدا ہوئے جن میں تو بعض نے قدیم روایات کی طرف واپسی کا اعلان کیا ان میں عموماً وہ امرا یا ان کے نظریات سے اتفاق کرنے والے تھے جنھیں اپنی سلامتی قدامت پرستی ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ اور بعض نے اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ سماج آگے بڑھ سکتا ہے پیچھے نہیں ہٹ سکتا اپنا فرض یہ سمجھا کہ موجودہ واقعات و حالات کے ماتحت ہی کوئی ایسا اصلاحی لائحہ عمل تجویز کریں جس میں فرد کی انفرادیت بھی اپنے ماحول معلوم کے ساتھ زندہ و باقی رہے اور جس میں سماج کے حقوق بھی پامال نہ ہوں یعنی ایسا نظام جس میں فرد سماج کا محافظ بن سکے اور ساتھ ہی ساتھ سماج فرد کی علو و ترقی کا ضامن قرار دیا جا سکے ایسے مصلحان میں سے ایک زندۂ جاوید مصلح افلاطون بھی تھا۔

افلاطون ایک خیالی ریاست کی تخلیق کر کے یہ تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ سماج میں عدل کی کیا حقیقت ہے اور یہ کہ عدل پر مبنی کسی نظام حکومت کی کیا نوعیت ہوگی اور اس ریاست کے مقاصد کی حصول یابی میں تعلیم کہاں کہاں کام آ سکتی ہے جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس ریاست میں اس کا مقصد منشا یہ تھا کہ وہ فرد کی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اس سے وہ کام لے جو فرد کے لئے عرفان خودی کا درجہ رکھے اور سماج کے لئے بھی باعث منفعت ہو۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے افلاطون نے جو نظام تعلیم تجویز کیا ہے وہ آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ روسو کے الفاظ ہیں "اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ عوام کی تعلیم سے کیا مراد ہے تو افلاطون کی ریاست پڑھو۔ وہ لوگ جو کتابوں کے عنوان سے کتابوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں اسے سیاسی کتابچہ

ہیں گے لیکن یہ تعلیم کے متعلق بہترین رسالہ ہے جو اب تک لکھا گیا ہے۔" افلاطون کی "ریاست" میں باضابطہ تعلیم سات سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ سات سال تک بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی مائیں اور دایہ آیا ہیں۔ افلاطون کے نزدیک تعلیم زیادہ کم عمری میں شروع نہیں ہو سکتی حالانکہ وہ بچے کے دماغ پر اولیں ارتسامات کی اہمیت سے بے خبر نہیں ہے۔ اسی لئے اس نے ماؤں اور آیاؤں کو ہدایت کی ہے کہ وہ بچوں کو ابتدا ہی سے ایسی کہانیاں سنائیں جو اچھا اخلاق پیش کرتی ہوں۔ کہانیاں ایسی ہوں جن سے بچے یہ سبق آموز کہ خدا صرف ان چیزوں کا خالق ہے جو اچھی ہیں نہ کہ ان چیزوں کا بھی جو بُری ہیں اور ایسی کہانیاں تو ہوں جو بچوں کو یہ تو سکھائیں کہ دیوی دیوتا انسان کے ہمدرد ہیں نہ یہ کہ وہ بھیس بدل بدل کر انسانوں کو ستانے میں کوئی مزا لیتے ہیں۔ مذہبی کہانیوں کے علاوہ بہادری اور شجاعت کی ایسی کہانیاں بھی سنائی جائیں جو بچوں میں موت سے بھی زیادہ غلامی کیلئے نفرت پیدا کریں۔ الغرض بچوں کے سامنے کوئی ایسی مثال عمل کی یا خیال کی پیش نہیں کرنی چاہئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ دنیا میں کبھی شریر قسم کے لوگ بھی خوش رہ سکتے ہیں یا زندگی میں فریب کاری بھی کبھی کامیاب ثابت ہو سکتی ہے (آگے چل کر ادب میں یہی چیز "عدل شعری" کا اصول بن گئی)

باضابطہ تعلیم سات سال سے شروع ہو کر سولہ یا سترہ سال کی عمر میں اپنی پہلی منزل پوری کرتی ہے۔ اس ابتدائی تعلیم میں تمام تر زور ورزش اور موسیقی پر دیا گیا ہے۔ ورزش کا مقصد جسمانی نشو و نما اور موسیقی کا مقصد روحانی بالیدگی سمجھا جاتا ہے۔ موسیقی کے باب میں افلاطون کے لئے آرٹ برائے آرٹ والا تخیل کسی حد تک بھی قابل قبول نہیں۔ چنانچہ موسیقی میں ایسی راگ راگنیوں کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیے جو جذبات کے نسائی حد تک نرم و نازک پہلو کو چھو سکیں بلکہ صرف وہ راگ اور گیت شامل ہیں جو انسان کو متحمل مزاج اور شجیع بنائیں۔ اسی طرح جسمانی ورزش کی ساری غرض و غایت موسیقی کے ساتھ ساتھ روحانی تشکیل ہے۔ ورزش اور موسیقی کے علاوہ اگر کوئی بچہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو اسے ریاضی اور ہندسہ وغیرہ جیسی چیزوں سے بھی روشناس کرا دیا جاتا ہے لیکن وہ بھی کسی دنیاوی فائدے کے لئے نہیں کیونکہ افلاطون کے یہاں تمام مفید ہنر سرے سے ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔

[illegible] ابتدائی تعلیم کے دوران میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کون سے بچے تعلیم کی ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور کون کون سے آگے بڑھ سکتے ہیں جو بچے آگے نہیں بڑھ سکتے ان کی تعلیم یہیں ختم کر دی جاتی ہے اور ان کا کام زندگی میں تجارت کر کے اپنی ریاست کو روزانہ کی ضروریات پوری کرنے میں سہولت بہم پہونچانا ہے۔ جو بچے آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انھیں تین سال کی تعلیم کا ادر [illegible] یہ تعلیم ایسی نوعیت میں بیشتر فوجی تعلیم ہوتی ہے اس تین سال کے عرصہ میں یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کون کون سے طلبہ جسمانی فعالی کی طرف زیادہ راغب ہیں اور کون کون سے ذہنی فعالی کی جانب۔ جو جسمانی اعتبار سے ریاست کے حق میں زیادہ کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں انھیں سپاہی بنا کر ریاست کا تحفظ ان کا سب سے بڑا فرض قرار دیا جاتا ہے اور جو طلبہ ذہنی معاملات میں غیر معمولی فراست دکھاتے ہیں ان کے لئے اعلیٰ تعلیم تجویز کی جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی منزل ۲۰ سال سے ۳۰ سال تک کے لیے مقرر ہے اس منزل میں ریاضی، ہندسہ موسیقی اور فلکیات داخل نصاب ہیں لیکن ان مضامین کا وہ مقصد و منشا فلاطون کے پیش نظر نہیں تھا جس کے آج ہم قائل ہیں ریاضی کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کے دماغ میں قوت استدلال کی نشو و نما کرے فلاطون کے نزدیک اعداد و شمار انسان کو مادیت سے ہٹا کر روحانی دنیا تک پہونچا دینے والے زینے ہیں ما بعد الطبیعات کا راستہ ریاضی سے ہو کر ہے، وہ ریاضی کا اس قدر قائل تھا کہ ایک جگہ ریاست میں پوچھتا ہے کیا تم نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو حساب دانی کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں ہر قسم کے علم میں تیز ثابت ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی ریاضی سیکھنے کے بعد اگر کوئی خاص فائدہ اس سے نہیں اٹھا سکے تو پہلے کی نسبت کچھ تیز ضرور ہو جاتے ہیں، علم ہندسہ بھی عملی زندگی سے قطع نظر مختلف اشکال کا باہمی تعلق سمجھنے اور ذہن کو مادی اشیاء کی سطح سے بلند کرنے کے لئے ضروری ہے اشکال پر غور کرتے کرتے افلاطون جس نتیجے پر پہونچا تھا یہ تھا کہ دائرہ ہی فطرت کی سب سے مکمل شکل ہے اور اس لئے اجسام فلکی بھی دائرے میں گردش کرتے ہیں اجسام فلکی کی گردش کے متعلق فلاطون نے اس عقیدے کو اس قدر استحکام دیدیا تھا کہ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے دو سو برس بعد کیپلر کی ضرورت پڑی تھی ہندسے

کی اس [illegible] کو تسلیم کرنے کے باعث ہی افلاطون نے اپنی اکادمی (قائم کردہ ۳۸۰ ق۔م) کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ کرائے تھے۔ جو کوئی علم ہندسہ سے واقف نہ ہو وہ اندر نہ داخل ہو۔ [illegible] ریاضیات کا مقصد بھی کچھ اس سے ملتا جلتا [illegible] کے متعلق تو اس کے یہ الفاظ ہیں۔ انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں ہم آہنگی اور ترنم کی ضرورت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے فی الحقیقت افلاطون کے یہاں موسیقی [illegible] کے اصولوں سے ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اس منزل کے بعد پھر ایک انتخاب کیا جاتا ہے اور ان طلبہ کو جو ان نظری علوم کی حدود سے آگے بڑھ کر مابعد الطبیعات کے معاملات پر غور و فکر کے اہل ثابت نہیں ہوتے سماج میں کچھ ذمہ داریاں دے کر ان کی تعلیم یہیں ختم کر دی جاتی ہے۔ باقی ماندہ طلبہ کو پانچ سال کے لئے تصورات کے سمجھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

افلاطون کا خیال تھا کہ ہر وہ چیز جسے ہم مادی شکل و صورت میں دیکھتے ہیں اپنا غیر فانی اور روحانی اصل Pattern رکھتی ہے اور اگر علم کا کوئی مقصد ہے تو یہ کہ وہ انسان کے دماغ کی نشوونما کرکے اسے مجاز سے حقیقت کی طرف لے جائے۔ افلاطون کے نظریہ تصورات کو مندرجہ ذیل شکل سے اور زیادہ واضح کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت وجود

روحانی دنیا — تصورات

مادی دنیا — مادی اشیا
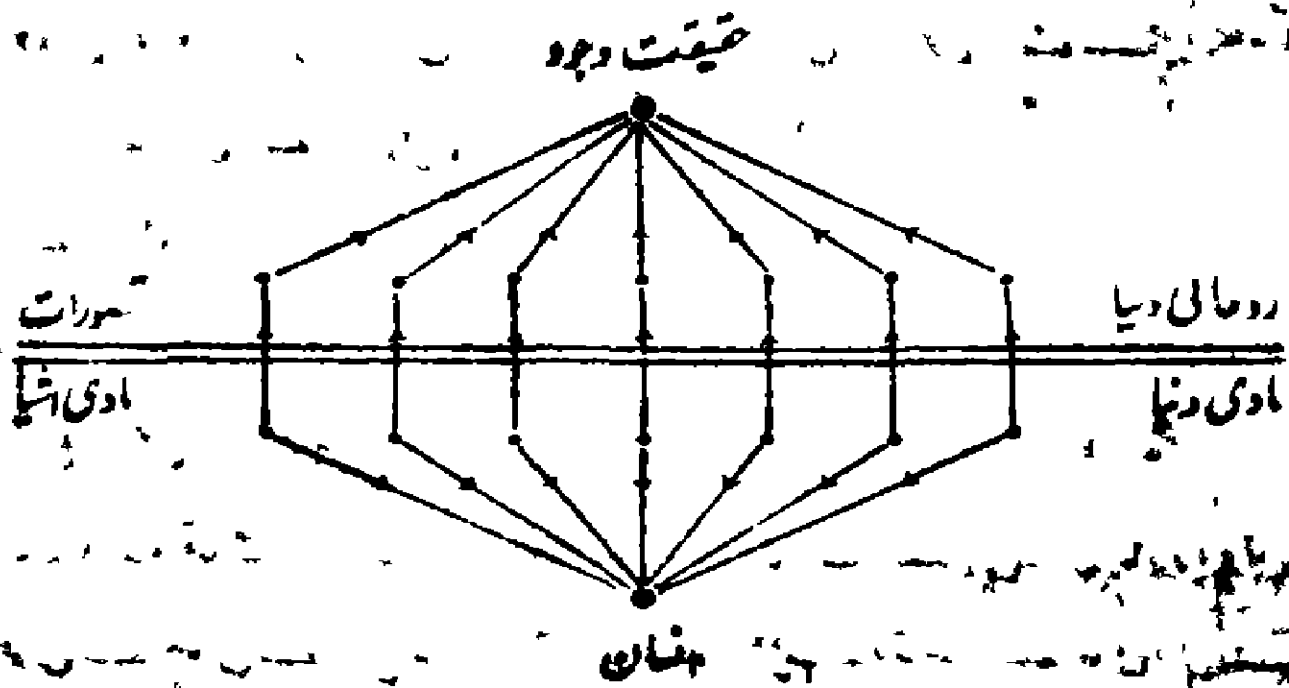
انسان

افلاطون کے خیال کے مطابق تصورات سے قریب تر ہو جانے کا نام حقیقی علم ہے جو طلبہ تعلیم کے اس درجے کو پہنچتے ہیں وہ فلسفی تیار کیے جاتے ہیں گویا افلاطون کے نزدیک انسان جو حقیقت

اپنے اندر لیکر پیدا ہوتا ہے لیکن پیدائش کے وقت یہ جلوہ حجاب در حجاب ہوتا ہے اور تعلیم کا کام انھیں حجابات کو اٹھانا ہے انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ولیم ورڈسورتھ کی مشہور نظم [illegible] Intimations of [illegible] کے اس مصرعے میں

"Our birth is a sleep and a forgetting"

فلاطون کے نظریے کی متضاد صورت نظر آئے گی مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اگر فلاطون تجربات اور علم کے لیے انسانی عقل و فکر کی بیداری کا قائل تھا تو ورڈسورتھ نے اس زندانِ آب و گل کو ایک دائمی مجلس سے سوا کوئی حیثیت نہ دی جہاں انسان اپنے روحانی مرکز سے دور ہوتے ہوتے یکسر تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ فلاطون کا فلسفی ۳۵ سال کی عمر پوری کرنے کے بعد سماج میں واپس آتا ہے اور اس لئے کہ سماج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے۔ ۱۵ سال تک سماج کو بہتر بنانے کی سعی و کاوش کے بعد پچاس سال کی عمر پر فلاطون کے فلسفی حکمران کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ ریاست کے فرائض سے عہدہ برا ہو کر اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن حقیقت وجود پر غور و خوض کرنے میں سکون کے ساتھ گذار دے۔

فلاطون کے مجوزہ نظامِ تعلیم کی داد ہمیشہ دیجاتی رہی ہے اور دیجاتی رہے گی اس نظامِ تعلیم کے ماتحت فرد کی انفرادیت اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور وہ اس طرح کہ جو شخص فطرت سے جس کام کی صلاحیتیں لیکر پیدا ہوا ہے اس سے سماج میں وہی خدمت لی جائے گی اور اسے تعلیم بھی وہی دی جائیگی جو اس کے حیطۂ فہم و عمل سے باہر نہ ہو اہل مغرب تو روز بروز اپنی تعلیم میں اس اصول پر کاربند ہوتے جاتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے ہماری تباہی اور بیکاری کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے تصور کر لیا ہے کہ ہر شخص ہر کام کر سکتا ہے حالانکہ نہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے اور نہ واقعات و تجربات اس کے امکانات کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ڈیوی صاحب کا فلاطون کے اصول کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے "تعلیم کے مقاصد کے معانی اس سے زیادہ گہرے معلوم کرنا مشکل ہوں گے کہ فرد کی صلاحیتوں کو دریافت کیا جائے ان صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے اور انھیں اس طرح تربیت دیجائے کہ ان کا تعلق دوسروں کے اعمال و افعال سے بخوبی ہو سکے"

فرد کی انفرادیت کو باقی رکھنے کے ساتھ ساتھ سماج کی حیات وبقا کے لئے تعلیم اور علم کو زندگی سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ ایک مفہوم میں سماج کی خدمت اور اعلیٰ اخلاق کو تحصیل علم ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ۵۰ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بار الفلسفی خود کو سماج سے بے نیاز کر کے گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ سماج کا حکمراں بن کر سماج کی رہنمائی کا ذمہ دار بنتا ہے اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "افلاطون کے یہاں یونانی زندگی ظاہری حسن سے ترقی کر کے اخلاقی یا روحانی حسن کی طرف بڑھتی ہے" گویا انسان ایک تاریک غار میں پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ غار سے باہر نکل کر سورج کی روشنی اور صاف ہوا سے لطف اندوز ہوتا ہے تو غار میں جا کر دوسرے ساتھیوں کو بھی باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک اور ایسی بات جس کی وجہ سے ہم آج افلاطون کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں یہ ہے کہ افلاطون نے تعلیمی معاملہ میں مرد اور عورت کو مساوی نظر سے دیکھا۔

"عورت بہ حیثیت عورت اور مرد بہ حیثیت مرد کسی مخصوص صلاحیت کا مالک ہے بلکہ فطرت کے عطیات دونوں کو برابر ملے ہیں مرد کے تمام مشاغل میں عورت صرف ایک کمزور مرد ثابت ہوتی ہے"

یہاں افلاطون کی حوصلگی کی داد دینے کے لئے ہم اس وقت اور مجبور ہو جاتے ہیں جب یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ افلاطون کے زمانے کی یونانی عورت کی قسمت سے تعلیم کی نعمت خارج کر چکے تھے۔ اہل اسپارٹا اس لحاظ سے کہ ان کی مائیں تندرست بچے پیدا کریں اپنی عورتوں کو جسمانی ورزش میں ضرور شریک کرتے تھے لیکن ایتھنز میں جہاں تعلیم نے اپنی تاریخ کا سب سے پہلا قابل ذکر فروغ پایا اس عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جو تعلیم کی شائق دکھائی دیتی تھی۔

[illegible] نقطہ نظر سے بھی افلاطون کا عورتوں کے لئے تعلیم ضروری ٹھہرانا مستحسن ہے لیکن شاید ہم عورت کی تعلیم کی نوعیت کو اس معیار سے جانچنا پسند نہ کریں جس سے مردوں کی تعلیم جانچی جاتی ہے اور عورت کی تعلیم نوعیت کا ایک ہونا ہی مناسب سمجھیں گے کیونکہ اب بھی بعض اعتبار سے عورت شیکسپیر کے ان الفاظ کا مصداق بنتی ہے "اے عورت تیرا نام ہی کمزوری و نزاکت ہے"

ان تمام خوبیوں کے باوجود فلاطون کے نظام تعلیم کو کبھی عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا کیونکہ نظری طور پر یہ واضح کر دینے کے باوجود کہ سماج اور فرد کا کیا تعلق ہونا چاہیے فلاطون نے علم کو چند منتخب لوگوں تک محدود کر دیا تھا یعنی فلاطون ذہنی مساوات کا کسی حد تک بھی قائل نہیں تھا ہمارے زمانے کی نفسیاتی تحقیق تو کہ اس حق میں ہے کہ جس طرح پرندوں کے غول میں سب سے آگے یا سب سے پیچھے اڑنے والے بہ نسبت کم ہوتے ہیں اور ایک ساتھ اڑنے والے زیادہ اسی طرح انسانوں میں زیادہ تعداد اوسط درجے کے دماغ رکھنے والوں کی ہے اگر اس حقیقت کو کسی شکل سے واضح کریں تو ہمارے خطوط یہ ہونگے

غیر معمولی ذہین

اوسط

کند ذہن

تعداد ۱۰ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱
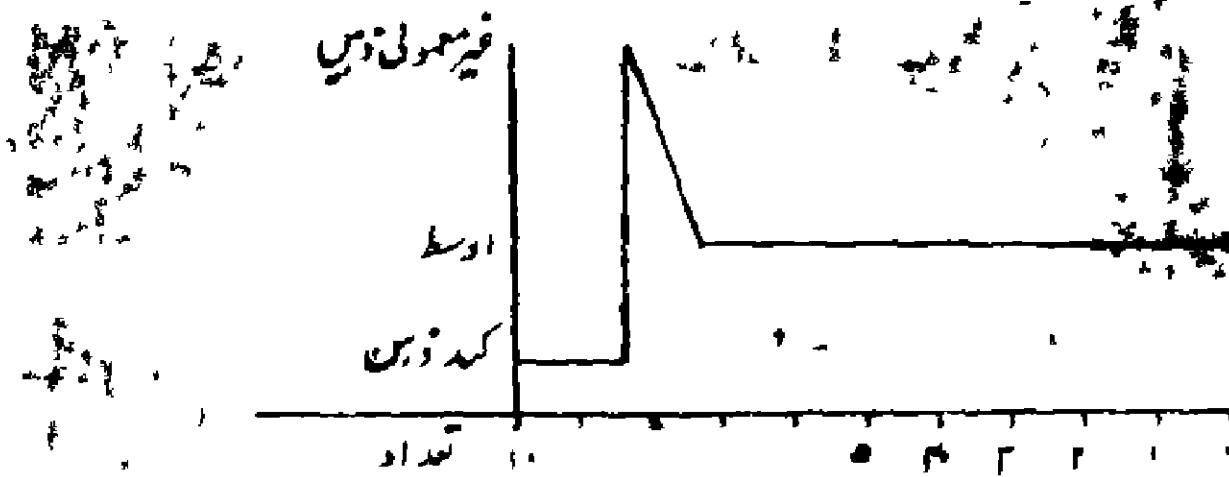
اس حقیقت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ فلاطون نے ان چند لوگوں کی تعلیم کا پورا پورا انتظام کیا ہے جو غیر معمولی ذہانت اور فراست کے مالک ہیں اور جو فلسفی کے درجے تک پہونچتے ہیں۔ لیکن اس اکثریت کا کچھ خیال نہیں کیا جو غیر معمولی طور پر ذہین نہ ہونے کے باوجود اوسط یا اوسط درجے سے کچھ زیادہ اچھا ذہن رکھتے ہیں۔

پھر طریقۂ تعلیم بھی کچھ اس طرح کا ہے کہ اس طالب علم کو جو اعلیٰ تعلیم کے لئے جاتا ہے روزمرہ کی زندگی اور سماج سے قطعاً بے تعلق ہو جانا پڑتا ہے کیونکہ حصول تعلیم کے لیے اسے جس قدر یکسوئی اور غور و فکر کی ضرورت ہے اسے سماج کی عام زندگی برداشت نہیں کر سکتی بالفاظ دیگر ہمیں یہاں طالب علم کی زندگی اور سماج کی اس زندگی کے درمیان جس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دوچار ہونا ہے وہ دیوار نظر آتی ہے جسے ہمارے عہد میں پروفیسر ڈیوی کی سماجیت (Socialization) والی تحریک نے توڑا ہے۔ فلاطون کا فارغ التحصیل طالب علم حقیقت کو پہونچا ہوا انسان تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ دوسروں کو عملی زندگی میں حقیقت سے کیونکر قریب

کر سکتا ہے؟ اس کا جواب ہمیں فلاطون سے نہیں ملتا۔

ان باتوں کے علاوہ فلاطون نے اس نظام تعلیم کے لئے، ریاست میں جو ماحول مرتب کیا ہے اس کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں فلاطون نے اپنی ریاست میں صرف تین جماعتوں کی اجازت دی ہے ـــ تاجر، سپاہی اور فلسفی لیکن ظاہر ہے کہ زندگی کے مشاغل تاجروں، سپاہیوں اور فلسفیوں کے مشاغل پر ہی ختم نہیں ہو جاتے سماجی حیثیت سے قطع نظر نفسیاتی حیثیت سے بھی یہ تقسیم ناقص معلوم ہوتی ہے کیونکہ کسی تاجر کے عقل ہو سکتی ہے اور کوئی فلسفی خواہشات کا غلام بن سکتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ فلاطون کی ریاست ایک غیر متحرک (static state) ریاست ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ فلاطون نے جماعتوں کی تقسیم اس اصول پر بھی نہیں کی ہے جو آگے چل کر ہندوستان کے سماج میں رائج ہو گیا۔ اس نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ فلسفی کی اولاد ہی سے ممکن ہے بعض بچے باپ کے رتبے کو نہ پہنچ سکیں اور تاجروں یا سپاہیوں کی جماعت میں شامل کئے جائیں یا کسی تاجر کی اولاد غیر معمولی ذہانت کی بنا پر فلسفی کے رتبے کو پہنچے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک فرد ایک جماعت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تو اس کی تعلیم اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کے مشاغل زندگی کی تعیین بھی اس سختی کے ساتھ ہوتی ہے کہ فرد کے لئے ذاتی نشوونما کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس کی بڑی وجہ فی الحقیقت یہ ہے کہ فلاطون ایک نیا نظام تعلیم وضع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ریاست کو اپنے وقت کے یونان سے الگ یا بہتر کوئی چیز نہیں بنا سکا اس میں پس پردہ انہیں قوتوں کی کارفرمائی ہے جو اس عہد کے یونان کی روح رواں تھیں چنانچہ فلاطون کی ریاست میں غلامی بھی روا رکھی گئی ہے اور بچوں کی ہلاکت بھی۔ اس کے علاوہ اگر کہیں اس ریاست کے الگ کوئی راستہ اختیار بھی کیا ہے تو وہ ارتقائی حیثیت نہیں رکھتا اور ظاہر ہے کہ جہاں دو چیزوں کے درمیان ارتقائی کڑی موجود نہ ہو وہاں کسی بہتر نتیجہ کی توقع فضول ہے چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ فلاطون کی ریاست میں تعلیم کا مقصد ریاست کو آگے بڑھانے سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ریاست کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے۔

ریاست کی ایک اور بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں خاندان یا گھر کی زندگی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی ہے حالانکہ خاندان سماج کا سنگ بنیاد ہے۔ یہی وہ گہوارہ ہے جس میں انسان سب سے پہلے آنکھ

[illegible] ہوتا ہے اور یہی وہ ادارہ ہے جہاں سب سے پہلے سماجی اقدار وضع و متعین کی جاتی ہیں لیکن فلاطون اپنی ریاست کا شیرازہ مضبوط رکھنے کے لئے خاندان کے ہر اثر اور خاندان کی ہر قوت کو نظر انداز کر دینے پر مجبور تھا فلاطون کو ریاست کی بقا کے لئے امتیازات کو حد درجہ میکانکی طریقے سے مٹانا ضرور تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی ویرانہ بنائے اور اس کا نام امن کدہ رکھ دے [illegible] ان [illegible] ایک اہم حقیقت پیش کی ہے۔

مجھے بخوبی علم ہے کہ فلاطون نے ریاست میں عورتوں کے لئے بھی وہی ورزشیں مقرر کی ہیں جو مردوں کے لئے مناسب ہیں خاندان سے پیچھا چھڑا کر فلاطون عورتوں کو اپنے نظام حکومت میں کوئی جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ اسی لئے وہ عورتوں کو مرد بنا دینے پر مجبور ہے فلاطون نے اپنے نظام میں ہر صورت حال کو تفصیل کے ساتھ مد نظر رکھا ہے اس نے ایسی مشکلات کو نظر انداز نہیں کیا جو شکل ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن اس نے ایک حقیقی دشواری کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ میں یہاں بیویوں کی حاجت کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں میرا مدعا یہ واضح کرتا ہے کہ کس طرح فلاطون نے ایک مصنوعی صورت حال پیدا کرنے کے لئے انسان کے فطری اور مالک [illegible] جذبات کو دبا دیا۔ کیا زندگی کے رسوم و روایات فطری بنیادوں کے بغیر قائم رہ سکتی ہیں؟ کیا ہم ان کی محبت کے بغیر جو ہمیں عزیز ہیں حکومت کے وفادار بن سکتے ہیں؟ کیا حب الوطنی اس دل میں کوئی حرکت پیدا کر سکتی ہے؟ جہاں زمین کے اس ٹکڑے کی کوئی محبت نہ ہو جو گھر کہلاتا ہے؟ اور کیا اچھا شہری اچھے بیٹے اچھے شوہر اور اچھے باپ کے علاوہ کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے؟ فلاطون کو بھی اپنی ان کمزوریوں کا احساس تھا۔ اسی لئے اس نے قوانین میں مصالحانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جو قدم آگے بڑھ چکا وہ بڑھ چکا پیچھے ہٹانا کیا معنی۔

اس تمام رد و کد کے باوجود ہمیں فلاطون کو اس کے محاسن کے ساتھ دیکھنا ہے نہ کہ اس کی کمزوریوں کے ساتھ اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے کسی جمہوری نظام تعلیم کی داغ بیل ڈالی ہے فلاطون کا احترام کیا ہے اور اس کے خیالات سے فائدہ اٹھایا ہے۔

(فضل الدین اثر۔ ایم اے)

جنگ اور سکّہ

۱۹۱۸ء کے اختتام پر جب جرمنی کا سپاہی تھکا ہارا میدانِ جنگ سے اپنے ملک میں پہونچا تو اس نے محسوس کیا کہ جنگ سے پہلے کسی چیز کی جو قیمت تھی اب اس کی دوگنی دینا پڑتی ہے کھانا، کپڑا، کرایہ مکان غرضکہ ہر ایک چیز کی قیمتیں دوگنی ہوگئی ہیں —— ایک سال بعد قیمتیں اور بھی بڑھ گئیں یعنی قبل جنگ ۱۹۱۳ء کی قیمتوں کے مقابلے میں ۱۵ گنا اور ۱۹۲۱ء میں ۱۹ گنی ہوگئیں اس کے بعد تو پھر کوئی انتہا ہی نہیں رہی بیچارے سپاہی کا سر اس نناونے کے پھیر میں چکرا گیا ہوگا یعنی ۱۹۲۲ء میں قیمتیں ۳۴ ہزار گنا اور ۱۹۲۳ء میں جس سال فرانسیسیوں نے رور کے علاقہ پر حملہ کیا تھا، ۱۶۶۲۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ گنا ہوگئیں جیسے جیسے قیمتیں بڑھتی تھیں، مزدوری بھی اتنی ہی بڑھتی تھی لیکن پھر قیمتیں اور بھی بڑھ جاتی تھیں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مزدوری چیزوں کی قیمتوں کے برابر پہونچ پائی ہو۔ لوگ بیچارے کیا کرتے ہر ایک اپنا روپیہ نہایت تیزی و ... خرچ کرڈالتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے وقت اُن کا سارا روپیہ کوڑی بھر قیمت کا بھی نہ رہے۔ اور جن بیچاروں کو پنشنیں ملتی تھیں وہ تو بالکل تباہ ہی ہوگئے تھوڑا بہت جو کچھ انھوں نے جمع کیا تھا اور جس سے اُمیدیں لگائی تھیں کہ بقیہ زندگی کافی آرام و اطمینان سے بسر کریں گے اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُن کا تمام روپیہ ایک وقت کا کھانا بھی نہیں خرید سکتا تھا البتہ مقروض لوگوں کی اور مرتہن لوگوں کی اچھی بن آئی۔ انھوں نے اپنے قرض کا روپیہ یا زرِ رہن بظاہر تو پائی پائی ادا کردیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اتنے روپیہ کا ایک انڈا یا ڈاک خانے کا ایک معمولی ٹکٹ بھی نہیں ... سکتا تھا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کاروبار ٹھپ ہوگیا۔ کیونکہ کوئی کسی سے آئندہ کی معاملت ہی نہیں کرتا تھا اس ڈر سے کہ مبادا جرمن سکے کی قیمت آئندہ اور بھی گر جائے تو بالکل خسارہ ہی

[illegible] ہے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ بلا مبالغہ اگر کسی کو ایک ہفتہ کا مکان کا کرایہ ادا کرنا ہو تو اس کے لئے لازمی تھا کہ ایک پوری بیل گاڑی نوٹوں سے بھر کر لے جائے تب جا کر کہیں کرایہ ادا ہو سکے۔ جب صورت حال یہ ہو گئی تب اصلاح کی اس طرح کوشش کی گئی کہ مارک سکہ واپس لے لیا گیا اور ایک نیا سکہ ریٹنش مارک نامی جو جائداد غیر منقولہ پر مبنی تھا جاری کیا گیا لیکن اس وقت تک جرمنی کا [illegible] بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

قیمتوں میں اتنا مضحکہ خیز چڑھاؤ کیوں ہوا جس کا لازمی نتیجہ تباہی و بربادی تھا؟ وجہ یہ تھی [illegible] دولت اس تیزی و کثرت سے بنا رہی تھی جتنی اس کی مشینیں کام کر سکتی تھیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اجناس و مزدوری میں کسی قسم کا تناسب قائم نہ ہو پاتا تھا۔

یہاں ہم معاشیات کے ایک موٹے سے اصول کا ذکر کریں گے۔ اس اصول کا نام "زر کا نظریہ مقدار" ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ کسی ملک میں قیمتوں کا معیار اس مناسبت سے ہوتا ہے جس مناسبت سے اس ملک میں قابلِ فروخت اجناس کی مقدار ہوتی ہے اور جتنی آسامیوں کی کھپت ہوتی ہے عام طور پر inflation کا جو لفظ کہا جاتا ہے یعنی ملک میں زر کی مقدار بڑھا دینا تاکہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو جائے اس کی تہ میں دراصل یہی زر کا نظریہ مقدار ہی کام کرتا ہے۔ جب زر اور اجناس و آسامیوں کی مقداروں کا تناسب نہیں رہتا تو کہتے ہیں کہ یہ زمانہ inflation کا ہے یعنی قیمتوں کے چڑھاؤ کا کسی ملک میں قیمتیں اس وقت تک مستحکم رہتی ہیں جب تک رائج زر کی مقدار اور اجناس و اسامیوں کی مقدار میں تناسب رہتا ہے لیکن اگر اجناس و اسامیوں کی مقدار قائم رہے اور زر رائج کی فراوانی ہو جائے تو قیمتیں لا محالہ بڑھ جائیں گی کیونکہ روپیہ کافی سے زیادہ ہو جاتا ہے اس لئے دوکاندار قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور لوگ خوشی خوشی دے دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر زر رائج کی مقدار قائم رہے اور اجناس و اسامیوں کی مقدار یا تعداد کم ہو جائے تب بھی قیمتیں بڑھ جائیں گی کیونکہ چیزیں کم ہونے کی وجہ سے دوکاندار قیمتیں زیادہ لیتے ہیں ان دونوں حالتوں میں ہم کہتے ہیں کہ یہ بڑھاؤ کی حالت ہے۔

سکہ جب گورنمنٹ خود بڑھاتی ہے یعنی مصنوعی افزائش زر تو یہ اُن افراد کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے جن کی آمدنی بندھی ٹکی ہوتی ہے مثلاً پنشن یافتہ لوگ۔ یا جو روپیہ جمع کر رکھتے ہیں۔ نقصان کے علاوہ ایسے بڑھاو کی حالت میں روپیہ جمع کرنا مفید بھی نہیں کیونکہ اس مصنوعی افزائش زر کے برعکس اس کا ردعمل بھی ہوتا ہے یعنی اُتار (Deflation) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ زر رائج کی مقدار اجناس کی مقدار کی بہ نسبت کم کر دی جائے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کاروبار بند ہو جاتے ہیں کیونکہ منافع بند ہو جاتا ہے تنخواہیں کم ہو جاتی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے کے گھنٹے کم کر دیئے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جنگ عظیم کے دوران میں اور اُس کے بعد تقریباً ہر ملک میں مصنوعی افزائش زر کا دور [illegible] مثلاً انگلستان میں اگر ۱۹۱۳ء میں زندگی کی ضروریات کے لئے ۱۰۰ پونڈ خرچ کرنا پڑتے تھے تو ۱۹۲۰ء میں ۲۵۵ پونڈ ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد اُتار کا دور شروع ہوا اور قیمتیں اپنی اصلی حالت کی طرف آنے لگیں یعنی ۱۹۲۱ء میں ۲۲۲ پونڈ ہوئے ۱۹۲۲ء میں ۱۸۱ اور ۱۹۲۳ء میں ۱۴۷ پونڈ ہو گئے۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ۱۹۱۳ء میں ۱۰۰ پونڈ تھے ۱۹۲۰ء میں ۲۰۵ پونڈ ہو گئے ۱۹۲۱ء میں ۱۹۷ اور ۱۹۳۱ء میں ۱۴۰۔

موجودہ جنگ میں ابھی تک برطانیہ میں مصنوعی افزائش زر بہت کم ہوئی ہے لیکن گذشتہ کے تجربہ سے کہا جا سکتا ہے کہ عنقریب ہو جائیگی جنگ کی تیاری کے سلسلے میں لاکھوں آدمی فیکٹریوں میں کام کر رہے ہیں یہ لوگ جو چیزیں بنائیں گے وہ فروخت کے لئے تو ہوں گے نہیں بلکہ دشمن کی توضیع کے لئے ہوں گی اب جو یہ لوگ کام کر رہے ہیں اُن کو تنخواہیں دی جاتی ہیں اس لئے جنگ کی حالت میں امن کی حالت کی بہ نسبت زر رائج کی فراوانی لامحالہ زیادہ کر دی جائے گی لیکن اجناس کی مقدار (جسے اقتصادیات کی زبان میں قابل فروخت اشیا کہتے ہیں) جنگ کی حالت میں بہت کم ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم امن کے زمانہ میں تو جاہے جتنا روپیہ چاہیں جیب میں ڈال کر چلے جائیں اور جو کچھ چاہیں دکانوں سے خرید لیں لیکن جنگ کے زمانہ میں ایسا

نہیں ہوتا کیونکہ دوکانوں میں جنس اتنی تو ہوتی نہیں جتنی امن کے زمانہ میں ہوا کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر صورت حال پر گورنمنٹ قابو نہ پائے تو اجناس کی قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں یا بڑھا دی جاتی ہیں اور اس طرح سے افراد کا روزمرہ کا خرچ بڑھ جاتا ہے جب روزمرہ کا خرچ بڑھ جاتا ہے تو لوگ اپنے اپنے منیجروں یا افسروں سے جہاں کہیں وہ نوکر ہوتے ہیں تنخواہیں مانگتے ہیں تاکہ گراں چیزوں کو خرید سکیں۔ جب تنخواہیں اور مزدوری زیادہ ملنے لگتی ہے تو دوکاندار چیزوں کی قیمتیں اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں اور پھر تنخواہوں میں اضافے کی درخواستیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ لا متناہی سلسلہ چلے ہی جاتا ہے زیادہ قیمت، زیادہ تنخواہ۔ زیادہ تنخواہ زیادہ قیمت، اس کو افزائش زر کا خبیث چکر کہتے ہیں۔

• امن کے زمانہ میں تو یہ حالت "اتار اور slump کے ذریعہ خود بخود درست ہو جایا کرتی ہے یعنی جب تمام فیکٹریاں اپنا زیادہ سے زیادہ کام کر رہی ہوں تمام مزدور کام پر لگے ہوں اور تمام الی سرمایہ لگا دیا گیا ہو تو لامحالہ جنس کی فراوانی ہو جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ منافع کم ہو جائیگا منافع کم ہونے پر اجناس کی پیداوار کم کر دی جائے گی۔ پیداوار کم کرنے پر مزدور کم لگائے جائینگے اور اس طرح بے روزگاری بڑھ جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں "اُتار" کا زمانہ آجائے گا اور اُن تمام زیادتیوں کی تلافی کر دے گا جو چڑھاؤ کے زمانہ میں ہوئی تھیں

لیکن یہ "اُتار" والا عمل جنگ کے دوران میں نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک لڑائی جاری رہے گی گورنمنٹ ملک کے تمام وسائل کو مجبوراً جنگ کے مصارف اور ضروریات میں لگاتی رہے گی۔

اس لئے ایسی حالت میں اُس روپیہ کا کیا کیا جائے جو لوگوں کے پاس ہے۔ لوگ خرچ نہیں کر سکتے کیونکہ بازار میں مال کم ہے یا جو انہیں خرچ کرنا نہیں چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جائیں گی؟

اس حالت کے بہت سے علاج ہوتے ہیں اوّل تو یہ کہ تنخواہیں کم کر دی جاتی ہیں تاکہ

فالتو روپیہ لوگوں کے پاس رہنے ہی نہ پائے اور انہیں صرف اسی قدر دیا جائے جتنے میں اُن کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ آمری ملکوں میں یہی طریقہ برتا جا رہا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس بہت ہی زیادہ بڑھا دئے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کا فالتو روپیہ اس طرح سے کم ہو سکے۔ لیکن اس صورت میں یہ ہونے لگتا ہے کہ کام کرنے والے جی لگا کر کام نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ زیادہ کام کرنے سے کیا فائدہ جب کہ اُن سے چھن جائے گا جتنا زیادہ کمائیں گے۔ ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک قومی کفایت شعاری فنڈ کھولا جاتا ہے اور لوگوں سے زبردستی اُن کا فالتو روپیہ جمع کرا لیا جاتا ہے۔ ایک چوتھا طریقہ بھی ہے۔ اس کو مسٹر جے ایم کینز کا طریقہ بھی کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ تنخواہیں یا مزدوریاں کچھ رقم روک کر دی جاتی ہیں پوری نہیں دی جاتیں باقی روپیہ آئندہ دینے کے لئے روک رکھتے ہیں اور اسوقت تک نہیں دیتے جب تک لڑائی ختم نہ ہو جائے۔

(ماخوذ از ورلڈ ڈائجسٹ)

جدید سیاسی دستورِ بین الاقوامیت

یورپ میں جب شخصی اور استبدادی حکومت کا دور دورہ تھا تو شاید روسو پہلا شخص تھا جس نے اس کے خلاف علم بغاوت اٹھایا اور آزادی انسان کا فطری حق سمجھا اس کی تلقین نے فرانس میں ذہنی انقلاب پیدا کر دیا جس کا لازمی نتیجہ انقلاب فرانس میں ظاہر ہوا۔ انقلاب فرانس کے بعد سارے یورپ کے دماغ پر جمہوریت اخوت مساوات کا تصور چھا گیا اور ہر شخص اسی ڈھرے پر سوچنے لگا مگر [illegible] انقلاب رونما ہوا جس کو صنعتی انقلاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مشینوں کی اختراع کے بعد وسیع تعداد میں تھوڑے وقت اور کم محنت سے مصنوعات کی پیداوار نے معاشی نظام کا توازن بگاڑ دیا چھوٹے پیمانے پر چلنے والی صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ سرمایہ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہونے لگا بیکاری اور بے روزگاری بڑھنے لگی۔ کیونکہ مشینوں پر کم مزدوری پر بچوں سے بھی کام لیا جا سکتا تھا اور مزدوری کا فیصلہ کارخانہ دار کی مرضی پر تھا اس طرح سے دو متضاد اور مختلف مفاد کی جماعتیں پیدا ہوئیں۔ یعنی "آمر یا سرمایہ دار" اور "مزدور"۔ گو اس زمانے میں مصلح بھی پیدا ہوئے اور قانون کی مشنری بھی ان برائیوں کو دور کرنے کے لئے اس زمانے کے مطابق حرکت میں آتی رہی لیکن انسانی فطرت کے مطابق "آمر" قانون کی خامیوں سے فائدہ اٹھا کر ہمیشہ کم سے کم دے کر زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور بقول رسکن کے "Bags and Gags have the same effect on wage" غریبوں پر اور مزدوروں پر سرمایہ کا وہی سلوک رہا جو قدیم شخصی اور استبدادی حکومت میں ہوا کرتا تھا صرف ذریعہ تبدیل ہو گیا پہلے جسمانی طاقت تھی اور اب مالی طاقت ہے

مصنوعات کی فراوانی اور اس کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی جدوجہد اب جنگ عظیم کی صورت میں نمایاں ہوئی "معاہدہ ورسائی" نے ایک اور جنگ کے بیج بو دیئے اور بنیادی نقائص اس سے دور نہ ہو سکے۔

اس سماجی کشمکش اور دولت کی نا انصافانہ تقسیم کو دیکھ کر مفکروں کے دماغ نے سوچنا شروع کیا اور کارل مارکس اور رسکن وغیرہ نے اس کے متعلق اظہار خیالات کیا کارل مارکس ان سب میں ممتاز ہے کیونکہ اس نے ایک عملی خاکہ پیش کیا کارل مارکس کے خیالات کو عملی جامہ روس میں اشتراکیت کی [illegible] نے پہنایا۔ اس نئے تجربے اور سماجی کشمکش کے جدید استعمال نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا اور دوسرے سیاسی اور سماجی حلقے مخلوط جذبات سے اس کا مطالعہ کرتے رہے لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کوئی عملی اقدام نہ کیا۔

چنانچہ دنیا میں ہر جگہ بے چینی انتشار بڑھتا چلا گیا اور جنگ عظیم کے بوئے ہوئے بیج نے برگ و بار لانے شروع کیے اور آخر ایک اور جنگ ہو کر رہی یہ ایک کھلا راز تھا کہ جنگ ہوگی۔ اس لئے دماغ پھر اس موجودہ نظام کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی فکر میں تھے کہ تلخ تاریخ پھرا ہے کو نہ دہرا سکے اور سیاست دانوں نے "بین الاقوامیت" کو ان بیماریوں کا صحیح علاج بتایا۔

بین الاقوامیت "کا چھوٹے پیمانے پر ایک تجربہ مجلس بین الاقوامی تھی، جنگ عظیم کے بعد کچھ عرصے تک کہا جا سکتا ہے کہ جنگ وجدل کو روکنے میں دنیا کی اس نے اچھی خاصی خدمت انجام دی ممکن ہے کہ لڑائی سے تھکا ہوا یورپ اس کا موجب ہوا ہو۔ مگر آخری دور میں اس نے بقول علامہ اقبال "انجمن کفن دزدان" کی حیثیت اختیار کر لی

دنیا کے امن کے قیام کے لئے پہلی چیز جو ہم کو سوچنی پڑے گی وہ سامراجی حکومتوں کا استیصال ہے۔ ہم ایک تاریخی دور کے آخری حصے میں سانس لے رہے ہیں اور ایک تغیر پذیر دور میں سے گذر رہے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا وہ دور ہے جس میں یا تو ایک جدید نظام کی بنیاد رکھی جائے گی یا تباہ کاری، موت، تکالیف انسانی نسل کو بالکل معدوم کر دے گی یہ مسئلہ معمولی مسئلہ نہیں جس کو کمرے میں بیٹھ کر سیاست کے اصولوں پر سلجھایا جا سکے۔ اس وقت لاکھوں انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے۔ ان کو اخلاقاً اور دماغاً تباہ کیا جا رہا ہے۔ کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو اس کو روک سکے ممکن ہے کہ [illegible] ہماری طرف بھی قدم بڑھا رہا ہو۔ اگر ہم اس سے بچ نکلنے کی کوشش کریں گے۔

تو وہ ہم کو بھی آلے گا۔ بہر حال ہم کو اس غور کرنا ہے سوچنا ہے سمجھنا ہے۔ موجودہ جنگ نے دراصل بنیادی مسئلہ کو چھوا تک نہیں ممکن ہے کہ یہ جنگ سب چیزوں کو تباہ کر دے اور پھر بھی کچھ طے نہ کر سکے وقت اور فاصلے پر قابو نے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم دنیا کے انسانوں کے جمیع مسائل کو ایک [illegible] میں طے کر سکیں نئی ایجادیں طاقت مشین نے زندگی کے ہر شعبے کی ترتیب کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے آج ایک ایجاد ہوتی ہے اس کو ابھی پورے طور سے قبول نہیں کیا جاتا ہے کہ دوسری ترقی یافتہ ایجاد پہلی ایجاد کو بیکار کر دیتی ہے۔

[illegible] نیا سیاسی وفاق بغیر اقتصادی اجتماعیت کے بالکل ناکامیاب چیز ثابت ہوگی۔ ہم کو روسی انقلاب سے کہیں زیادہ عمیق انقلاب کی ضرورت ہے روسی انقلاب اپنی انتہا پسندی بے صبری۔ تشدد غیر رواداری کی وجہ سے ناکامیاب رہا۔ موجودہ انقلاب نسل انسانی کو پستی کی طرف بہنے سے روکنے کے لئے زیادہ بہتر اور مکمل ہونا چاہئے۔ اس کے معنی لوگوں کو سماجی، اقتصادی اور بین الاقوامی بے راہ روی سے روکنا ہے اس کے معنیٰ ذاتی نفع کا استیصال اور پھر اس اصول کو بروئے کار لانا ہے جس سے ایک انسان دوسرے انسان کا خون نہ چوسے۔ اشتراکیت کی اوائل کوششیں اسی اجتماعیت کی تخلیق کی کوششیں تھیں لیکن "مارکیٹ" کے آغاز نے اجتماعیت کی ایک پیچیدہ صورت اختیار کر لی۔ ایک جماعت دوسری جماعت پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ امیر اور طاقتور جو عموماً زیادہ قابل اور عقلمند ہوتے ہیں ہر اس چیز کو جو ان کے ہاتھ لگی لے بھاگے۔ اور کم عقلمند اور بے فکر مزدوروں کو پسینے میں نہا لے، اور غلامی کے لیے چھوڑ دیا۔ آغاز تمدن سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ "قابضین" "محرومین" پر حاوی رہے اور "محرومین" ہمیشہ اس نظام سے نفرت کرتے رہے بعض صورتوں میں محرومین اتنے دست و پا بریدہ حالت میں رہے کہ وہ کسی قسم کی افراتفری پیدا نہ کر سکے۔ لیکن جب کبھی مزدوروں کی صورت میں یا فوج اور کاشتکاروں کی صورت میں رونما ہوئے تو ان کی انفرادی نفرت نے اجتماعی صورت اختیار کر لی بعض صورت میں یہ بغاوتیں بہت تباہ کن ثابت ہوئیں۔ لیکن پرانے بنیادی اصول وہی رہے یعنی ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی جد و جہد۔ اکثر

[illegible] کردیا۔ ان کا سلوک تحت زیادہ مبتر ہو گیا اکثر ایسا ہوا کہ محرومین کو کوئی ایسا سردار مل گیا جس نے طاقت حاصل کر کے اہل جماعت کے لوگوں کو دار پر کھینچا یا قتل کرایا ان کے سروں [illegible] لگا کر تشہیر کرائی۔ ان طوفانوں کے بعد پھر اسی پرانے نظام پر آجے۔ محرومین کے پاس [illegible] عقلمندی کا فقدان رہا اور قابضین کے پاس ضمیر کا۔

[illegible] فطری لحاظ سے قابل لوگوں کو ذرائع اور تعلیم کی کمی سے تاریکی میں ڈھکیل دیا ان کی جو ملکی برباد اور تباہ ہو گئی۔ ان کو کبھی ابھرنے کا موقع بھی نہ ملا بہت سے اشخاص اس دنیا میں مقابلہ اور [illegible] سکنے کی وجہ سے غربت اور عام زندگی میں ڈھکیل دئے گئے موجودہ زمانے کے منکرین نے اس انسانی ذرائع کی تضیع کو پہچان لیا ان کو اس کے خدمات یا اخلاق نے متحرک نہیں کیا بلکہ اس حقیقت نے کہ موجودہ نظام بہت تباہ کن اور احمقانہ ہے۔

مارکس نے اجتماعیت کا ایک بھدا خاکہ پیش کیا لیکن مارکس نے انسانی خلوص کو اپنے "طبقاتی جدوجہد" کے اصول سے جتنا صدمہ پہنچایا ہے۔ اتنا نقصان شاید کسی اور چیز سے نہیں پہنچا۔ اس نے جدجہتوں کو نبرد آزما کر دیا۔

مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں مکانوں کی کمی ہے اور جو مکان موجود ہیں ان میں سے بیشتر موجودہ معیار کے مطابق انسانی رہائش کے لئے ناموزوں ہیں اور سنیما کے ذریعہ ایسے مکانوں کا پرچار کیا جا سکتا ہے جن کا حصول ہر شخص کے امکان میں ہے بڑے پیمانے پر آبادیوں کی سیاسی اغراض کے لئے نقل و حرکت نے ہم کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ یہی چیز بہتر اعزاض اور مقاصد کے لئے نہایت سہولت سے انجام دی جا سکتی ہے۔

انسانوں کے سارے کچھ بنیادی حقوق ہونے چاہئیں۔ مثلاً۔

[illegible] ہر شخص بلا امتیاز رنگ و قوم، عقائد، مذہب و پیشہ حق رکھتا ہے کہ خوراک، لباس، طبی امداد [illegible] اس کے لئے فراہم کی جائے تاکہ وہ اپنی تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں بروئے کار لا سکے اور اس کی صحت از پیدائش تا موت قائم رہ سکے۔

۲- وہ کافی تعلیم کا حق رکھتا ہے ایک کارآمد شہری رہنے کے لئے ہر شخص کو مساویانہ ذرائع اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق حاصل ہونے چاہئیں۔

۳- [illegible] کو ہر قانون اور ہر جائز پیشہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے جس کا معاوضہ اس کام کی اہمیت اور انسانی بہبودی میں اضافے کے مطابق ہوگا۔ اس کو اپنے پیشے کے انتخاب کا حق ہوگا اور اس انتخاب کو رد کرنے یا قبول کرنے کا اختیار پبلک کو ہوگا۔

۴- [illegible] ہر ایک چیز کی خرید و فروخت کا حق یہاں تک اور اس حد تک ہوگا جہاں تک یہ اجتماعی بہبودی میں رخنہ انداز نہ ہو۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اجتماعی حکومت میں خرید و فروخت نفع کی غرض سے غیر ضروری ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوگی۔ "دار المبادلہ" بالکل معدوم ہو جائے گا صرف ایسی چیزوں پر ملکیت کا حق ہوگا جو دوسروں کے ساتھ ناانصافی کئے ہوئے رکھی جا سکتی ہوں۔

۵- ذاتی ملکیت جو قانون اور جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو مامون و مصؤن رہے گی

۶- وہ دنیا میں آزادانہ اپنے خرچ پر سیر و سیاحت کر سکتا ہے۔ اس کا ذاتی مکان اس کا قلعہ ہے جس میں اس کی بغیر اجازت کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

اجتماعیت کی مخالفت میں بہت سے لوگ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ اس نظام میں عمل کا محرک فوت ہو جائے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے قدرتی ذرائع کی ذاتی ملکیت کی وجہ سے فارغ البال محرک سے محروم ہو جاتا ہے اور غریب امید سے۔ جتنا انسان کو اچھا کھلایا جائے گا اور اچھی طرح رکھا جائے گا۔ اتنا ہی وہ عدم مصروفیت کی وجہ سے کچھ نہ کرنا چاہے گا۔

اس تصویر کے خدوخال میں ایک چیز اور نمایاں کرنی رہ گئی ہے یعنی افراد پر وفاق یا اجتماعیت کے فرائض۔ کچھ ایسے شعبے بھی ہیں جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہیں کہلائے جا سکتے۔ مثلاً تیمار داری یا گل خانہ میکانکی محنت کلرکی۔ مہمات وغیرہ وغیرہ۔ انسانی فطرت سے ہم متوقع ہو سکتے ہیں کہ ان کاموں کے لئے رضاکارانہ خدمات حاصل ہو جائیں گی لیکن کیا باقی ماندہ لوگ صرف اس سے استفادہ

ی حاصل کرنے کے لیتے ہیں پروفیسر ولیم جیمز کا حل اس کے لیے یہ ہے کہ نوجوان زندگی کا کچھ حصہ
[illegible] اس خدمت کے لئے ایک فرض کی حیثیت سے وقف کیا کریں گے وہ اس کام کو نہایت خوش اسلوبی
[illegible] سے انجام دیں گے کیونکہ ان کو یہ علم ہوگا کہ ایک محدود عرصے کے بعد ان کو اس سے چھٹکارا
مل جائے گا۔

موجودہ "مجوزہ بین الاقوامیت" کسی قسم کی ادھوری اور نامکمل بین الاقوامیت نہیں ہے بلکہ معاشی
اقتصادی سیاسی اور سماجی پہلوؤں کو لئے ہوئے ہے۔ انگلستان کے مشہور انشاپرداز اور مفکر
ایچ جی ویلز نے اپنی کتاب "نظام جدید" میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

بین الاقوامیت کو عمل میں لانا ایک شخص کا کام نہ ہوگا بلکہ بہت سے دماغوں کا یہ تدریجی
ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ہم تک پہنچے گی جس طرح بہت سی حیرت انگیز اختراعیں اور انقلاب
ایک ہی شخص کے مرہون فکر نہیں بلکہ بہت سے دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو اس کو ترقی دیتے
چلے آئے ہیں۔

اس مجوزہ بین الاقوامیت میں ظاہر ہے کہ ساری قومیں اولاً شامل نہ ہوں گی کیونکہ بہت سی
قومیں اس کو اپنے خود غرضانہ مفاد کے خلاف سمجھیں گی۔ لیکن اگر طاقتور قوموں کی اکثریت شامل
ہوگئی تو باقی ماندہ قوموں کو اس میں شامل ہونا ناگزیر ہو جائے گا کیونکہ ان کو اپنے خود غرضانہ مقاصد
کی تکمیل کے لئے موقع نہ مل سکے گا۔ اور متحدہ قوموں کا اخلاقی اثر ان کو مجبور کر دے گا۔

ان قوموں کی ایک مجلس واضع قوانین جمہوری اصولوں پر مرتب ہوگی۔ جو معاشی اقتصادی
سیاسی اور سماجی مشترکہ مسائل کے متعلق قانون وضع کرے گی اس نئے نظام کو وجود میں لانے
کے لئے احتجاج اور مخالفت سے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا لیکن عقلمند اور انصاف پرست اس کی
پرواہ نہیں کریں گے لوگوں کو اپنی ذہنیت تبدیل کرنی پڑے گی اور ان کی خوبی کا معیار یہ ہوگا کہ
انھوں نے دنیا کو کیا دیا یہ نہیں کہ انھوں نے معاوضہ و تنخواہ کی صورت میں کیا لیا۔

موجودہ اقتصادی نظام میں ہر قوم اور ہر ملک میں وہاں کے اصول اور رواج کے مطابق

ایک علیحدہ سکہ ہے۔ اور جس کا مبادلہ دوسرے ملک کے سکوں میں ہو سکتا ہے لیکن جدید نظام" یا "بین الاقوامی وفاق" میں (مسٹر مور ایڈیٹر اسٹیٹس مین نے اس نظام کو وفاق دنیا کے نام سے موسوم کیا ہے) نئے یکساں سکے بنائے جائیں گے۔ جو موجودہ قسم کے سکوں سے مختلف ہوں گے۔ "جدید نظام" میں دار المبادلہ قرض دینے والے بینک اور اسی قسم کے سب ادارے [illegible] گے۔

ان سب چیزوں کے لئے روپے کی ضرورت ہو گی اور وہ کہاں سے فراہم ہو گا؛ لیکن روپیہ تو صرف ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ اگر روپیہ ہمارے سامنے مشکلات حائل کرے گا تو اس کو بھی جدید نظام میں کوئی جگہ نہیں دی جائے گی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ جنگ کا کیا نتیجہ ہو گا بدتر یا بہتر اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جنگ کے اختتام پر یہ نظام صرف ایک دماغی لہر کی صورت میں کتابوں میں یوں ہی باقی رہ جائے گا یا کوئی عملی صورت بھی اختیار کرے گا۔

(تلخیص)

(آغا اقبال مرزا ایمن)

اشتراکیت کی فلسفیانہ بنیادیں

ایک جواب

رسالہ جامعہ کے اپریل نمبر میں مارکس کی تعلیمات پر چند اعتراضات شائع ہوئے تھے افسوس ہے صاحب مضمون سے عمیق مطالعہ کرکے مارکس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اعتراضات کر دیے۔

ذیل میں ان اعتراضات کو نمبروار لکھے دیتا ہوں جس کے بعد میں ان کا جواب دوں گا۔

۱۔ صاحب مضمون نے مارکس کی تعلیم کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ افراد کا ہر عمل معاشی مفاد اور وہ بھی ذاتی غرض سے ہوتا ہے انھوں نے اس کی تردید کی ہے۔

۲۔ کارل مارکس نے صاحب مضمون کے نزدیک تاریخ میں افراد کی اہمیت سے انکار کیا ہے انھوں نے اسے غلط ٹھہرایا ہے۔

۳۔ انسان کے عمل کے اسباب معاشی ماحول کے ناگزیر تقاضے نہیں ہوتے

۴۔ ایک ہی معاشی ماحول میں رہنے والے اشخاص کا طرز عمل ایک ہونا ضروری نہیں ہے۔

تاریخ کے مادی تصور کو اس قدر اختصار سے، جیسا کہ صاحب مضمون نے کیا ہے، بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اسے کچھ اجمال سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مارکس کے فلسفہ کو سمجھنے سے پہلے ہیگل کی تعلیمات کا جان لینا ضروری ہے کیونکہ سرمایہ داری کے خلاف مارکس نے جو حربہ استعمال کیا ہے وہ مارکس کے استاد ہیگل ہی کا مرہونِ منت ہے۔

ہیگل کا کہنا یہ ہے کہ زندگی کا ہر عنصر تبدیلی کے مسلسل دور میں ہے۔ ہر لحظہ وہ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ ہر عنصر میں دو مخالف جزو موجود ہیں۔ یہ اجزا لازمی طور پر ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں۔ جب کسی ایک کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا مصرف کچھ نہیں رہتا تو اس کا مخالف اس کی جگہ لیتا ہے اسی طرح

زمانہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کی خود اصلاح کرتا رہتا ہے۔ مارکس کا تخیل ہیگل کی تعلیم کے منافی ہے مارکس سماج کی خرابیوں کو دور کرنے کا صرف ایک نسخہ تبلاتا ہے اور وہ ہے ایک انتقالی۔ یعنی [illegible] حالانکہ ہیگل کے لئے تاریخ نام ہے ایک تدریجی تبدیلی کا نہ کہ انقلابات کا۔

تاریخ کا مادی تصور اس امر کی تکرار ہے کہ مادی حالات ہی ابتداً انسانی تخیل میں تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ تصورات یا تخیلات انسان کی اس کوشش کا نتیجہ ہوتے ہیں جو اُس نے اپنے گرد و پیش کے ماحول کی تشریح کرنے میں کی ہے انسان کا طریقۂ معاش اور معاشی حالات ان تخیلات کی تشکیل کرتے ہیں لیکن اگر مادی تصور کا خاتمہ یہیں پر ہو جائے تو اُس کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ محض اس بات کو دہراتا ہے کہ انسانی تخیلات اس کے تجربہ کا نتیجہ ہوتے ہیں مگر نہیں یہ کچھ اور بھی ہے۔

عام ماحول کے تار و پود میں طریقۂ پیداوار کا درجہ اہم ترین ہے اور اس کی خصوصیت بہت بڑی انسان کی ضروریات کو پورا کرنے والی طاقتیں یعنی پیداواری طاقتیں ہی تخیلات اور اداروں کو جنم دیتی ہیں تخیلات اور ادارے پیداواری طاقتوں د [illegible] کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ یہ تخیلات پھر ان پیداواری طاقتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ طریقۂ پیداوار ہی قانون، مذہب حکومت اور معاشرتی تقسیم کا تعین کرتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ داری ہر ادارے کو اپنے فائدہ اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تبدیل کر لیتی ہے۔ قانون کی تشکیل بھی اسی طرح کی جاتی ہے کہ سرمایہ داروں کو فائدہ پہونچے۔

مادی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ نئے بازار، پیداوار کے نئے طریقے اور خام پیداوار کا پتہ لگتا ہے پیداوار اور تقسیم کے ادارے بدلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ معاشی دستور ناکارہ ہو جاتے ہیں اور ان کی بنیادوں میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اے جی بی رسل نے طریقۂ پیداوار اور تخیلات کے مابین رشتے کو ایک بڑی اچھی مثال سے واضح کیا ہے۔ آزادئ نسواں کی تحریک کی قدامت افلاطون تک پہونچتی ہے مگر اس نے بیسویں صدی تک کوئی عملی جامہ نہیں پہنا جبکہ جو ہمیں صنعت و حرفت

[illegible] اس قدر تیزی سے داخل ہونے لگیں کہ اُن کے سیاسی حقوق کی نئے سرے سے تشکیل کرنی پڑی۔ برٹ
برون اور ولیم سوم ہدایتی آزادی کے حامی تھے مگر مذہبی آزادی شہریوں صنعت تک نہیں دی جا سکی جبکہ
[illegible] ہدایتی کو تجارتی منفعت کے خیال سے ترک کر دیا گیا۔

[illegible]پ نہیں سمجھے کہ مارکس کا مطلب کبھی وہ نہ تھا جو صاحب مضمون نے سمجھا۔ تخیل میں تبدیلی مادی حالات
[illegible] ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے یہ کہا ہے کہ جب ایک قوم مہذب و متمدن ہو جاتی ہے (یعنی بقول
اُن کے فکر معاش سے آزاد ہو جاتی ہے) تو اس کے عمل اور تخیل کے اسباب معاشی ماحول کے ناگزیر تقاضے نہیں
[illegible] ہیں کیونکہ تب تو وہ تقاضے باقی ہی نہیں رہتے۔ مگر تخیل کی پرواز اس وقت بھی مادی حالات کو زیر اثر ہوتی ہے
[illegible] صاحب مضمون کے بقول کارل مارکس نے تاریخ میں افراد کی اہمیت سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ مارکس بھی
[illegible]یات سے انکار نہیں کرتا کہ شخصیتیں تاریخ میں بہت اہم حصہ لیتی ہیں۔ اس کی کتاب Poverty of Philosophy
میں اس نے اس مسئلہ پر اچھی طرح بحث کی ہے وہ کہتا ہے کہ تاریخ لوگ ہی بناتے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے
[illegible] وہ اسے اپنے تخیل کی رنگینیوں کے مطابق نہیں بناتے اور نہ بنا سکتے ہیں۔ ہر نسل کو چند قطعی حالات سے
دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے بنانے میں ان کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ یہ اس نسل کی پیدائش سے پہلے
[illegible] ہوتے ہیں جو انہیں ماضی سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ اگر بڑے لوگوں کی کوئی اہمیت ہے تو یہ کہ انھوں نے حالات
کو اور اسے تبدیل کرنے کے طریقے کو سمجھا۔ اگر وہ حالات کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں اور اسے اپنے تخیل کی پرواز
کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حالت عجب مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔

مارکس کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ صرف مادی حالات تخیل کی تبدیلی کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے
اسباب کی موجودگی سے انکار نہیں کرتا ہے وہ حالات کو سب سے بڑی جگہ دیتا ہے۔ اس لئے بعض
مواقع پر جو بہت شاذ و نادر ہوتے ہیں کسی دوسرے سبب کا حاوی ہو جانا مارکسزم کے بطلان کا
ثبوت نہیں ہے۔

عرشی عظیمی

اسٹالین اور انقلاب اسپین

(از جناب ایم این رائے صاحب)

یہ مضمون عرصہ ہوا اخبار ٹریبون میں نکلا تھا۔ مترجم جناب آفتاب احمد خاں نے اسے اُس مضمون کے ساتھ ہی چھاپا ہے جو رسالہ جامعہ میں ٹروٹسکی پر مل چکا ہے اور جس میں ٹروٹسکی نے اسپین کی ناکامی کا سبب اسٹالین کو گردانا تھا۔

(مدیر)

اسپین کے انقلاب اور اس کے ردعمل کی اصل تاریخ اب بھی انکشاف کی محتاج ہے۔ لارگو کیبلرو اس ڈرامے کے ممتاز کرداروں میں سے تھا جو ایک ٹریجڈی کی صورت میں ختم ہوا ہے۔ کیبلرو اسپین [illegible] اشتراکی تحریک کے ایک ممتاز لیڈر کی حیثیت سے اس نے انقلاب کے ابتدائی منازل میں نمایاں حصہ لیا اگرچہ ابتدا میں وہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا ایک رکن تھا۔ مگر بعد میں اس کا رجحان بائیں بازو کی جانب اتنا زیادہ ہوگیا کہ وہ عام طور پر انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر سمجھا جانے لگا تھا۔
اس وقت جبکہ باغی فوجوں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیبلرو انقلابی جمہوریت کا وزیر اعظم تھا۔ خانہ جنگی کے ابتدائی ایام میں حکومت کی فوجوں کی باگ ڈور بھی اس کے ہاتھ میں رہی۔ شروع شروع میں باغیوں کو جس سرعت سے کامیابی ہوئی اس نے جمہوری حلقوں میں ایک ابتری سی پھیلا دی اور کئی بار پے درپے نئی نئی حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ انجام کار کیبلرو نے تمام ذمہ دار عہدوں سے استعفےٰ دیدیا اور اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہ رہی۔ اس وقت اس شخص کے ستارۂ قسمت کے زوال کے متعلق بڑی قیاس آرائیاں ہوئی تھیں جو پہلے انقلاب کا سب سے بڑا لیڈر سمجھا جاتا تھا۔

کیبلرو خود اپنی سوانح حیات لکھ رہا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں ایسی بہت سی دستاویزات ضرور قلمبند ہوں گی۔ جن کا اسپین کی انقلابی تاریخ پر گہرا اثر پڑا ان سب دستاویزوں میں سے اہم ترین وہ خط ہے جو اسٹالین مولوتوف وارشلوف نے کیبلرو کے نام ارسال کیا تھا۔ مولوتوف سوویٹ روس کا وزیر اعظم ہے اور وارشلوف سرخ فوج کا کمانڈر انچیف

خط کی پوری عبارت ذیل میں بجنسہ درج کی جاتی ہے یہی ایک نقل ہے جو آج تک ہندوستان پہنچی ہے

ہمارے سفیر دوزیر مقتدر کامریڈ روزنبرگ نے ہمیں آپ کا برادرانہ سلام بھیجا ہے نیز
[illegible] یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی کا غیر متزلزل یقین ہے
[illegible] اجازت دیں کہ ہم آپ کے برادرانہ سلام کا شکریہ ادا کریں اور آپ کو مطلع کریں کہ
[illegible] اہل اسپین کے اس یقین میں شمولیت کرتے ہیں کہ آخر میں فتح انہیں کی ہوگی
[illegible] نے ہمیشہ سے اپنا فرض جانا ہے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ ہمیں حتی الوسع حکومت اسپین
[illegible] مدد کرنی چاہئے جو فسطائی فوجوں کے خلاف اسپین کی صحیح جمہوریت اور مزدور پیشہ عوام
[illegible] جنگ لڑ رہی ہے دراصل یہ بظاہر فسطائی گروہ بین الاقوامی فسطائیت ہی کے آلۂ کار ہیں

انقلاب اسپین کی راہیں کئی ایک لحاظ سے انقلاب روس کی راہوں سے مختلف ہیں اور یہ
اختلافات خاص سماجی تاریخی اور جغرافی حالات کے اثر سے ہے اس کے ساتھ ہی اس
اختلاف کی وجہ بین الاقوامی سیاست بھی ہو سکتی ہے جس کے موجودہ حالات ان حالات
سے بالکل مختلف ہیں جن کے درمیان انقلاب روس رونما ہوا تھا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اسپین
[illegible] آئینی طریق کار انقلابی ترقی میں روس کی نسبت زیادہ موثر اور فیصلہ کن ثابت ہو۔
[illegible] کے باوجود ہمارا اب بھی یقین ہے کہ ہمارے تجربے اور خصوصاً خانہ جنگی کے تجربے
اگر وہ صرف انقلابی جدوجہد میں استعمال کئے جائیں تو اسپین کے لئے بھی مفید ہو سکیں گے
[illegible] خیال کے پیش نظر ہم نے کچھ فوجی رفقا آپ کے پاس بھیجے تھے جن کی تمام تر خدمات
آپ کے لئے وقف ہیں ہم نے یہ اقدام آپ کی پیہم درخواستوں کے پیش نظر کیا تھا جو
بہت سے مواقع پر رفیق روزنبرگ کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہیں۔

ہم نے ان رفقا کو یہ ہدایات دے رکھی ہیں کہ انہیں اسپین کی فوجوں کے کمانداروں کو
صرف فوجی معاملات ہی میں مشورہ دینا ہوگا انہیں یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ
کو اسپین کے فوجی کمانداروں کا مدد و معاون تصور کریں انہیں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے

کہ وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ اس احکام کے باوجود جو اسپین اور [illegible]
موجود ہے سوویٹ یونین کے باشندے جو اسپین میں اجنبی حیثیت رکھتے ہیں اسی صورت
میں مفید ہو سکتے ہیں جبکہ وہ صرف اور صرف صلاح مشورہ کا کام ہی انجام دیں۔ ہمیں
یقین ہے کہ آپ بھی ہمارے فوجی رفقا سے یہی کام لیں گے۔

ہم درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمیں مطلع کریں کہ ہمارے رفقا کس حد تک اپنے فرض
منصبی انجام دینے میں کامیاب رہے۔ یقیناً جب تک آپ ان کے کام کو مفید نہ سمجھیں
ان کا وہاں رہنا بے سود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم آپ سے ایک اور درخواست
کرتے ہیں کہ رفیق روزنبرگ کے متعلق بھی اپنی صاف اور صریح رائے کا اظہار فرمائیں۔
کیا حکومت اسپین رفیق مذکور کے کام سے مطمئن ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر ہم ان کی جگہ
اپنا کوئی اور نمائندہ بھیج دیں؟

(ہم مندرجہ ذیل تجاویز دوستانہ مشورہ کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں:-)

ا۔ کسانوں کی طرف خاص دھیان دینا بڑا ضروری امر ہے۔ کیوں کہ اسپین ایسے
زرعی ملک میں خاص اہمیت حاصل ہے زرعی معاملات اور ایسے ٹیکسوں کے متعلق
احکام جاری کرنا جو زراعت کی حفاظت کریں اور اسے فروغ دیں بہت کارآمد ثابت
ہوگا۔ کسانوں کو فوج میں بھرتی کرنا اور انہیں گوریلا فوج کے دستوں میں منظم کرکے فسطائی
فوجوں کے تعاقب کے لیے تیار کرنا اور بھی مفید ہوگا۔
کسانوں کے مفید مطلب احکام جاری کرنا اس سلسلے میں جو قدم آپ اٹھائیں گے
اس کے لئے آسانی پیدا کر دے گا۔

۲۔ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے بورژوا لوگوں کو حکومت کی طرف کھینچنا یا کم از کم ایسے حالات
پیدا کرنا کہ ان کا رویہ حکومت کے متعلق غیر جانبدارانہ ہو جائے بڑا ضروری امر ہے
یہ بات جائداد ضبط نہ کرنے کی ضمانتیں دینے اور جہاں تک ممکن ہو تجارت کی آزادی

... اگر یہ حکمت عملی بروئے کار نہ لائی گئی تو وہ لوگ سلطانی ... ذہنوں سے مل جائیں گے۔

... لیڈر یعنی بورژوا ورگ (...) جماعت سے نکل نہ جائیں بلکہ انہیں حکومت کے قریب تر لانا چاہئے اور ہر طرح سے ترغیب دلائی جائے ... حکومت کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹائیں۔ جنرل (ازانا) اور اس کی پارٹی کی امداد اور حمایت حاصل کرنا حکومت کے لیے خاص طور پر ضروری ہے اور ان کی اجنبیت دور ... لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ ایسا کرنا سپین کے دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لئے بہت ضروری ہے جو اسے اشتمالی جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔ اور اس بہانے سے جو کھلی ہوئی مخالفت ہو رہی ہے اس سے سپین کو بچانے کے لئے یہ امر لازمی ہے کیونکہ بیرونی مداخلت جمہوریت سپین کے لئے سب سے بڑھ کر باعث خطر ہے۔

... ایسے مواقع کی تاک میں رہا جائے جبکہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ حکومت سپین دوسرے ملکوں کے باشندوں کی جائداد اور جائز مفاد پر کسی قسم کی دست درازی نہیں کرے گی بشرطیکہ وہ ایسے ملکوں کے رہنے والے نہ ہوں جو باغیوں کی مدد کر رہے ہیں۔"

اصل خط روسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا ایک فرانسیسی ترجمہ کیبلرو کے پاس پہنچا مندرجہ بالا خط ایک جرمن ترجمہ سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے (مترجم) اس لئے نتیجتاً ممکن ہے کہ طرز بیان کی خوبصورتی میں فرق نمایاں ہو گیا ہو مگر اس کے نفس مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

یہ خط کیبلرو کے راز زوال پر بھی کچھ روشنی ڈالتا ہے یہ اس کے زوال کے تھوڑے عرصہ قبل لکھا گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ خط میں پیش کردہ تجاویز پر کیبلرو کہاں تک رضامند یا نا رضامند تھا۔ ہمیں اس کے سوانح حیات کے شائع ہونے تک انتظار کرنا چاہئے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ ان تجاویز ... زیادہ اہم تھی اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے: یہ ہم بیرونی

لوگوں کو معلوم نہیں۔ مگر اتنی بات تو عیاں نظر آتی ہے کہ رفیق روز نبرگ [illegible] میں شریک تھے۔ کیونکہ حکومت سپین کی طرف سے اس پر بڑا اعتراض یہی تھا کہ وہ اپنی لیاقت اور قابلیت [illegible] باہر ہر شعبہ میں منصبی مداخلت کرتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسے ایسا کرنے کی ہدایات نہ تھیں لیکن اس نے ہدایات کے خلاف عمل کیا بڑی اہم بات یہ ہے کہ خط لکھے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسے سپین سے بلا لیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ابھارنے پر دائیں بازو کے مدبرین نے کبیلرو کی حکمت عملی کی مخالفت کی تھی انہیں حکومت میں بارسوخ عہدے دے گئے یقیناً انہوں نے خط میں پیش کردہ کچھ تجاویز کو ماننے اور دوسری کو رد کرنے میں بڑی ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہوگا۔

ایک بات اس خط میں بڑی مبہم سی ہے۔ اور اس لئے اس میں بجا طور پر غلط فہمی ہو سکتی ہے اور بدنیتی سے اس کی غلط ترجمانی بھی کی جا سکتی ہے یہ بات انقلاب اسپین کی ترقی میں پارلیمانی طریق کار کے بڑے بڑے امکانات سے متعلق ہے لیکن ذرا اس کا تجزیہ کیا جائے تو لکھنے والے کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب اس قدر عجیب و غریب ہے کہ انقلابی ترقی میں ایک نئے نظریہ کا آغاز ہوتا ہے جس کا تصور روایتی مارکسیت میں نہیں ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ اشتراکیت کا حصول یوں بھی بغیر پرولتاریہ آمریت کے انقلابی دور کے ممکن ہے اگر ہسپانوی انقلاب محض بورژوا جمہوری انقلاب (Bourgeois Democratic Revolution) کی حیثیت رکھتا تھا تو اس کی ترقی کو آئینی طریق پر حاصل کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا یہ اعتراض صرف اس وقت معقول ہوتا جبکہ اس انقلاب سے یہ امید رکھی جاتی کہ وہ ترقی کرتے کرتے اشتراکیت کے قیام کی جدوجہد میں مل جائے گا۔ روایتاً یہ بات کٹر مارکسیت کا جزو ایمان بن گئی ہے کہ اشتراکیت کی جدوجہد پرولتاریہ آمریت کو پہلے ہی سے فرض کر لیتی ہے جو پارلیمانی طریق کار کے مخالف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایک ایجابی طریق کار پر عمل پیرا ہو کر اشتراکی انقلاب نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اسٹالین کو یہ توقع تھی کہ سپین کا انقلاب اس طریق کار سے عمل میں آسکے گا۔ اسے کبھی یہ یقین نہ آسکتا تھا کہ اس بین الاقوامی

طبقہ وارانہ جنگ کے دور میں جبکہ دنیا کا اصل تصادم اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ہے
ہسپانوی انقلاب آخر میں بورژوا جمہوری انقلاب کی حدود سے تجاوز نہیں کرے گا اور اشتراکیت
کے قیام کی [illegible] اختیار کرے گا۔ کیا یہ فرض کر لینا غلط تھا کہ یہ ترقی شاید پارلیمانی طریق
کے ذریعہ وقوع پذیر ہو سکتی تھی۔ یا یوں کہئے کہ پرولتاریہ آمریت کے قیام کی ضرورت باقی نہیں معلوم
ہوتی ہے کہ یہ تجویز اسی مفروضہ کی بنا پر پیش کی گئی تھی۔ اسٹالین نے اپنے خط میں [illegible] ہیں۔
ان میں سے ایک تجویز سے یہ بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریہ کو غلط قرار دینا گویا اپنی رائے
کو بالکل وہم سمجھنا ہوگا۔ کیونکہ بورژوا جمہوری انقلاب ([illegible] Revolution
پرولتاریہ کی زیر قیادت عمل میں آیا ہو تو پھر پرولتاریہ آمریت کی ضرورت ہی اٹھ جاتی ہے۔ یہ
خیال محض فضول ہوگا کہ وہ انقلابی جمہوری ریاست جو پرولتاریہ نے خود قائم کی ہو اور اسی کے
زیر اثر ہو۔ پرولتاریہ جماعت اسی کا تختہ الٹ کر ایک خالص اپنی ریاست قائم کرے جمہوری آزادی
کی ایسی جدوجہد جس کی باگ ڈور صرف پرولتاریہ جماعت کے ہاتھوں میں خود اس بات کا امکان
پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اس آزادی کو اشتراکیت کی تعمیر کے کام میں استعمال کرے ورنہ اگر یہ بات
نہ ہو تو خالص پرولتاریہ قیادت سے فائدہ؟

(ایم این رائے)

(مترجمہ آفتاب احمد صاحب انصاری)

محسن کاکوروی اور غزل

(از پروفیسر سراج احمد صاحب علوی ایم اے)

حضرت محسن کاکوروی کی ذات محتاج تعارف نہیں اس لئے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص نکلے جو ادب اور شاعری سے ذوق رکھتا ہو اور ان کے مشہور مدحیہ قصیدہ لامیہ کے چند شعر اس نے نہ سنے ہوں۔ جو "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کے مشہور مصرع سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ مقبول خاص و عام رہا اگرچہ لامیہ قصائد اکثر شعراء نے لکھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ محسن کے قصیدہ کی کوئی گرد کو بھی نہیں پہنچا، اس کا سبب چاہے اس کا "مقبول بارگاہ رسالت ہونا سمجھئے" یا اس میں مقامی رنگ کی تشبیہوں۔ تلمیحوں اور استعاروں کو اس کی مقبولیت کی دلیل سمجھئے، بہر نوع یہ مسلم ہے کہ محسن کی شاعری کی دنیا میں شہرت کا باعث یہی ایک قصیدہ ہے۔

حضرت محسن کے کلام کے متعلق نہیں نہیں اور کسی قسم کی اظہار رائے یا تنقید نہیں ملتی صرف دو تین ہلکے قسم کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے جو محسن ایسے بلند پایہ شاعر کے شایان شان نہیں، اور ان مضامین میں بھی بیشتر یا تو ان کے جزئی حالات زندگی ہیں یا پھر ان کے نعتیہ کلام کے متعلق معمولی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن میرے خیال میں کسی شاعر یا مصنف کے کلام یا تصانیف پر اگر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی جائے اور اس کی تصانیف کے ہر ہر نقش کو اجاگر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ مصنف یا شاعر کا صحیح مرتبہ اور اس کے کلام کا صحیح معیار اسی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت محسن کاکورویؒ کی تمام شہرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ان کے مدحیہ کلام کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہوتی جب کہ اس کا ہر شعر انتہائی خلوص اور عقیدت سے لکھا گیا ہو، مادی دنیا کے مادہ پرست حضرات خواہ اسے دیوانگی سے تعبیر

کریں خواہ توہم پرستی اور [illegible] عقیدت کہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ مداح پیغمبر نے مدح کا ایک [illegible] بھی بلا وضو نہیں لکھا جس شب کو طبیعت موزوں ہوتی ملازم کو یہ حکم دیا جاتا کہ خلوت [illegible] اگر کی بتیاں اور عود سلگا دے اور خود نہایت مودب بیٹھ کر فکر شعر کرتے اور آج [illegible] کے تے جام و سبو درکار ہے "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا" اس پر بھی [illegible] مقبولیت حاصل نہ ہو تو جائے حیرت ہے۔ جس شاعر کی یہ تمنا ہو کہ۔

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ میرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ، نہ غزل

اور بروز محشر اس شان سے نکلنا چاہتا ہو کہ

صف محشر میں تیرے ساتھ ہو تیرا مداح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

[illegible] جس کی عقیدت و محبت اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ وہ اس بات پر فخر کرتا ہو کہ

سب سے اعلیٰ تری درگاہ ہے سب سے افضل
مرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل

ظاہر ہے کہ اس کی ربودگی اور والہانہ شیدائیت کا اثر دوسرے قلوب پر کیوں نہ ہوگا۔

اس لئے میں اس بحث میں محسن کے مدحیہ کلام کے متعلق کوئی تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ اور نہ ان کے محاسن بیان کرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا مقصد اس وقت حضرت محسن کو ایک نئے لباس میں پیش کرنا ہے اور ان کی شاعری کا وہ رخ سامنے لاتا ہے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جسے مولف شعر الہند اپنی ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کے باوجود نظر انداز کر گئے اور وہ ان کا تغزل ہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حضرت محسن نے غزل کو بہت کم نوازا اور جو غزلیں انھوں نے لکھیں اس میں [illegible] نعت کے مضامین سے پر ہیں لیکن اس کے باوجود جو قلیل سرمایہ عاشقانہ غزلوں

موجود ہے، اس سے اُن کے رنگ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے مدحت کے پیچھے غزل اور دوسری اصنافِ شاعری کو ترک نہ دیا ہوتا تو آج غزل گو شعرا کے دبستان میں ان کا بھی طوطی بولتا نظر آتا۔

حضرت محسن کی غزل پر اظہار رائے کرنے سے پیشتر ان کی خصوصیات کا مختصراً بیان کر دینا اور یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ کس دبستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جن حضرات کو اُن کے قصائد نعتیہ اور مثنوی چراغ کعبہ اور صبح تجلی وغیرہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا ہوگا۔ وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ محسنؔ دبستان لکھنو کی پیداوار ہیں۔ نعت میں ان کا وہی درجہ ہے جو مرزا دبیر کا مرثیہ میں۔ غزل میں بھی اسی اسکول کا رنگ نمایاں ہے، آتش کی طرح شیریں اور موٹے موٹے الفاظ، بے تکلفی صحت اور صفائی زبان ہر شے بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن بعض اشعار میں مضامین کی اوسط درجہ کی بلندی پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ رواج زمانہ کے مطابق تناسب لفظی کا بھی کہیں کہیں التزام ہے لیکن جہاں بے تکلفی اور سادگی سے کام لیا ہے، وہاں ان کے اشعار آتش کے نشتروں سے کم نہیں ہیں۔

اب میں ان کی مختلف غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں جس سے ان کی صنف غزل میں قادر الکلامی اور علو مرتبگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خیال یار کو عاشق ہمیشہ عزیز رکھتا ہے۔ اور اس کے پیچھے اپنی عزیز ترین متاع کھو دینے میں اسے دریغ نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تصویر یار کے دل میں جاگزیں ہونے کے بعد پھر دل کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور تمام جذبات ماسوا سے وہ عاری ہو جاتا ہے۔ تصویر یار کی دولت کے آگے سب ہیچ ہے، ہر شاعر نے اس مضمون کو پائمال کیا۔ محسن کی طرز ادا دیکھئے۔

خیال یار رہے دل اگر نہ ہو نہ سہی — نہ جائے زلف کا سودا جو سر نہ ہو نہ سہی

عشق کی دنیا تسلیم و رضا کی دنیا ہے اور در اصل کشمکش ناز و نیاز ہی کا نام عشق ہے۔ احکام عشق کی یہ تصویر کسی نے یہ کہہ کر کھینچی ہے ؎

... وقت ذبح اپا اس کے بر پائے ہے

اور کسی نے اس طرح تصویر دکھائی ہے ؎

... میں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

حسن کا کھنچا ہو امرقع دیکھئے ؎

سر جھکائے ہم ہیں وہ تلوار کو کھینچے ہوئے

یہ نیاز عاجز کا اور وہ ناز ہے مغرور کا

عاشق کے لئے مژدۂ وصل بڑی چیز ہے۔ جس کی آرزو اور انتظار اس کی عین حیات ہے، اس کی تمام ... تیں، اس کی تمام تکلیفیں اور مہجوری کی المناکیاں صرف اس ایک خیال کے ماتحت قابل برداشت ہو جاتی ہیں کہ وصال محبوب آناً فاناً ان کی تالیف کر سکتا ہے۔ یہ خیال صرف خیال کی حد تک نہیں رہتا بلکہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور مہجور یار یہاں تک وصال یار کی قوت اور عالمگیر اثر پر ایمان رکھتا ہے کہ اس کے نزدیک ایک ادنیٰ اسے وصل کا وعدہ کائنات کی ہر شے کو اس کا پابند بنا سکتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وصال یار میں وہ قوت اور اہمیت ہے کہ ہر شے یار کی موافقت کے ساتھ اس کی موافقت اور معاونت کے لئے تیار ہو سکتی ہے اس حسن ظن اور سادگی یقین کا کیا ٹھکانا۔ شاعر اس خیال کو کس خوبی سے ادا کرتا ہے۔

... رات ابھی دوڑتی آئے جو کر دو وعدۂ وصل

کہئے تو چار، گھڑی دن سے اندھیرا ہو جائے

رات کا دوڑے آنا اور چار گھڑی دن سے اندھیرا ہو جانا کس خوبی سے عاشق کے یقین اور اعتماد اور ساتھ ہی ساتھ اس ہیجان کا پتہ دیتی ہے۔ جو صرف اس خیال سے پیدا ہو گیا کہ وعدۂ وصل کا امکان ہے۔ شراب انگوری ہو یا حافظ کی شراب معرفت۔ ہیں دونوں شعرا اور شراب کا طالب ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ وہ ہر وقت اس سے لطف اندوز ہوتا ... کی خواہش اور طلب دیوانگی اور جنون کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ جب کہ

من اتفاق سے ایسے سامان مہیا ہو جاتے ہیں جو خواہش کی آگ اور مے کے اثر کو اور تیز کر دیتے ہیں اور طالب مے ہوش طلب کی خود فراموشی کی حالت میں اگر مے تک دسترس نہیں پاتا تو اور بے چین ہو جاتا ہے۔ اس حالت کا نقشہ محسن نے یوں پیش کیا ہے ؎

شیشے سے نکل رندِ مئے آشام ہیں بے چین
غمزے سے بنا کے ہے دخترِ رز ایسی گھٹا میں

[illegible] پروانہ کی داستان ایسے دو اشارات ہیں جنھیں شعرا نے نہ جانے کس کس انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ اشارات محبت کی گہرائی اور جوابی محبت کے ثبوت کے لئے بہت موزوں ہیں۔ عشق کی تکمیل کا منظر خاکستر پروانہ اور شمع کی سوزش کر دیتی ہے، کبھی یہی سوزشِ عشق اس صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے کہ عشق کے دونوں حریف اس طرح ایک دوسرے میں حل ہو جاتے ہیں کہ ان کی تمیز دشوار ہو جاتی ہے، خدائے سخن حضرت میر نے عشق کے اس مقام کو کیسے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گل میں رگیں نہیں یہ ہیں نقش پائے بلبل

محسن نے بھی اس تکمیل محبت کی تصویر کھینچی ہے اور بالکل نئے انداز سے۔

شب کو یہ جذب محبت کا تماشا دیکھا
شمع پروانے کے ساتھ اڑ گئی جگنو ہو کر

دختر رز کی تو سب سے آشنائی رہی ہے اور رند و زاہد ملا و محتسب سب ہی اس کے بے حد گرویدہ رہے،

مگر یہ امر معلوم ہے کہ ؎ گوہر ہر کس ازیں لعل توانی دانست۔ کے مصداق ملا اور محتسب کہاں تک اس کے اہل ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شراب بدنام ہوتی ہے، اس لئے محسن بھی اس لعل کو بے قدروں کے ہاتھوں میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

سنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دختر رز کی
الٰہی رکھ لے تو حرمت شراب ارغوانی کی

پھر ایسی حالت میں کہ شراب کی اہمیت کا یہ عالم ہو۔ جرم ٹھہرا ٹوٹ جانا شیشۂ انگور کا

بہار کی فضائیں اور بادلوں کی سیہ مستی عجب بے ...

کیفیت پیدا کر دیتی ہے تو رند اور فطرت پرستوں کی مستیوں کا پوچھنا ہی کیا۔ شاعر ان کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

مبارک میکشو کس دھوم سے شورش پہ بادل گی | خدا حافظ ہے بادل کا صراحی بے طرح چھلکی
...کی باغ میں آمد ہے گھٹا چھائی ہے | کھو نیار رہیں ساغر و مینا و اسلے

عشق اپنی ہستی کو اور اپنے عشق کو دنیائے عشق میں سب سے اہم اور بلند تصور کرتا ہے۔ غیرت عشق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کوئی مد مقابل نہ ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ہستی کائنات عشق کو پوری طرح سمیٹ کر اپنا لینے کی اہلیت رکھتی ہے اور یہ وسعت ظرف ... عشق کا تقاضا ہے وہ اپنے آگے بڑے بڑے مدعیانِ عشق کو بے حقیقت سمجھتا ہے اس لئے کہتا ہے۔

قضا نے کس لئے زاہد و قیس کو چھیڑا | مجھی کو پہلے ملا نا تھا امتحاں کے لئے

تعطل اور جمود عشق کی دنیا میں عشاق کے لئے سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما شے ہے۔ عشق کی بہار یہی ہے کہ محبوب کی لگاوٹیں خواہ ظلم و ستم کے جامے میں ہوں خواہ پرسش نگاہ کی صورت میں جاری رہیں اور دل مبتلا کے لئے حیات نو کا باعث ہوا کریں۔ یہی اس کی غذا ہے اور عشق اسی پر جیتا ہے۔ اس لگاوٹ کا ایک پہلو عداوت بھی ہے اور عشق کے اظہار کے لئے کافی ہے اور اسی بنا پر غالب نے کہہ ڈالا۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے | کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

لیکن محبوب کی ایک سرے سے بے تعلقی جسے نہ تغافل کہہ سکیں اور نہ ظلم جذبات عشق کو متلاطم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اور جو سکرات اس وقت عشق پر طاری ہوتا ہے اس کے کرب کا اندازہ ناممکن ہے۔ اس خیال کو محسن یوں پیش کرتے ہیں۔

کیوں ... تم نے غضب کی لگاوٹیں | ... عادت خراب کی دل خانہ خراب کی

اکبر الہ آبادی کا شعر ہے ؎

جلسے میں شور ہے اکبر مسلماں ہو گیا ۔۔۔ بے وفاؤں سے کوئی کہہ دے کہ ہاں [illegible]

[illegible] ہے کہ بیوفائی کا جواب بیوفائی سے دیا گیا اور یہ آئین عشق کے خلاف ہے مجنوں نے

بھی اسی کے قریب کہا لیکن اکبر کے دانت کے بدلے دانت والی مذموم اور مذہب عشق [illegible]

[illegible] کی جس طرح عشق رقابت برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح حسن بھی شرکت

سے بیزار ہے، اور اسے اپنی توہین سمجھتا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اپنے پابند کو اپنا ہی پابند

رکھے اور کسی غیر کا گذر بھی نہ ہو۔ شاعر اس نکتے سے واقف ہے اور حسن کے اس تارک [illegible]

[illegible] بیزار ہے، وہ حسن کا ایک رقیب پیش کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ایسا حربہ ہے کہ جس کے

[illegible] کے لئے حسن کی قوتیں کام کرنے لگیں گی اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ عشق کی

پذیرائی کی صورت میں ہوگا کہتے ہیں ؎

[illegible] مجھ سے نہ بگڑو جو خدا بنتے ہو

کہیں بندہ بھی نہ اللہ کا بندہ ہو جائے

ہجر و فراق کے مصائب کے خواہ وہ عشق مجازی سے متعلق ہوں خواہ عشق صوفی سے سنگین

ہونے میں کلام نہیں، جو انقباض اور گرفتگی پیدا ہوتی ہے اس کا وہی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں

جنھیں کبھی اس سے سابقہ رہا۔ اور پھر جو انبساط اور غیر اختیاری جسمانی اور دماغی تبدیلی دفعتاً

وصال یار سے پیدا ہوتی ہے، اس کا اندازہ کرنے والے بھی معدوم نہیں ہیں، لیکن عاشق کے

لئے ہجر سے زیادہ وصال روح فرسا اور مزید کلفت کا باعث ہو جاتا ہے اور وہ اس وصل

کے خیال سے کانپتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عشق کے دعویٰ کا حسن کبھی اقرار نہیں کرتا۔ حسن کی شانِ

بے نیازی یہی ہے کہ عشق کی سپردگیوں کو جھٹلاتا رہے اور یہ چیز عشق کے لئے بدترین مصیبت

ہے۔ ظاہر ہے کہ دیدار حسن یا بہ الفاظ دیگر وصال یار عاشق کی حالت زار کا نقشہ بدل دیتا ہے

جو کرب و بےچینی اسے فراق میں نصیب ہوتی ہے اس کا مظاہرہ وہ محبوب کے آگے نہیں

کرسکتا اور بارگاہ حسن سے اسے بناوٹ اور جھوٹ کے خطابات ادا ہوتے ہیں۔ غالب مرحوم
نے اس بیچارگی اور تکلیف کی کس خوبی سے تشریح کی ہے

[illegible] ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

محسن نے بھی اسی خیال کو پیش کیا ہے۔

نہ کہو مجھ سے وہ آتے ہیں عیادت کیلئے
دل بیمار نہ اس دھوکے میں اچھا ہو جائے

غالب کے یہاں تغیر حال "یار کی دید" پر منحصر ہے اور محسن کے یہاں صرف خبر آمد کافی ہے ظاہر [illegible] کے سہارے کی مصداق پہلی حالت سے دوسری حالت زیادہ بن سکتی ہے اور اس لحاظ سے حرماں کی جو تصویر محسن نے کھینچی ہے وہ غالب سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

[illegible] کی تحلیل نفسی نے آج نہیں مدتوں پہلے یہ نکتہ حل کر دیا کہ عشق کے وجود کے لئے یا یوں کہیئے کہ محبت آفرینی کے لئے کسی خاص ترین حسن اور کسی ٹھوس معیار کی ضرورت نہیں بلکہ اس جذبہ کی آمیزش کے لئے کوئی بہانا ہونا چاہیئے، نیچر اور فطرت انسانی میں یہ جزو ودیعت رہا اور اب بھی ہے، صرف ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے منظر عام پر لے آئے اور محرکات کی دنیا لامحدود ہے، اس حقیقت کا فارسی شعرا نے بھی اعتراف کیا ہے اور اردو شعرا نے بھی
خواجہ شیرازی فرماتے ہیں:۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد — کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاریست

اور سچ تو یہ ہے کہ عشق خود حسن کو حسن بنانے اور اس میں بڑی حد تک رعنائیاں پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

کچھ وہ ہے حسیں کچھ مری نظر میں بھی حسیں ہیں

محسن نے اس حقیقت کو نہایت لطیف اور سبک انداز سے پیش کر دیا ہے فرماتے ہیں

اک آن ہو جس میں ... حسین ... ہونے کی قید کیا ہے

"آن" کہہ کر اسباب محبت کے دسیع دفتر کو سمو لینا اور حسن کی معراج کو "یوسف" کہہ کر اسے تفصیل سے بے نیاز کر دینا محسن کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اب طرز ادا سلاست اور روانی کے چند نمونے دیکھو کہ کس طرح بیان کی بے ساختگی اور طرز ادا کی سادگی نے شعر در جان ڈالدی ہے۔ جب انسان رنج اور تکلیف کا خوگر ہو جاتا ہے، یا تلاش منزل کی ... اور فکر کی لذتوں سے لطف اندوز ہو جاتا ہے تو اسے سکون اور جمود کی حالت میں ایک کلفت محسوس ہونے لگتی ہے اور دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پھر انہی کاوشوں میں گرفتار ہو جائے اور اس کی زندگی ایک سعی لاحاصل کی خواہش میں پوشیدہ نظر آتی ہے۔ اور منزل کی قربت بجائے مسرت کے دل کو پژمردہ کر دیتی ہو غالب نے "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" کہہ کر اسی لذت سعی کی طرف اشارہ کیا ہے، محسن بھی اسی خلش کو محسوس کرتے ہیں اور تقاضائے دل کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

تڑپ تڑپ کے تو پہنچا ہوں کوئے دلبر تک
یہاں سے اے تپش دل اٹھوں کہاں کے لئے

سودا کا ایک شعر ہے ؎

فکر معاش عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

شعر کیا ہے۔ اعجاز ہے زندگی کی مختصر مدت اور دنیا بھر کی ذمہ داری، خواہشات، تمنائیں اور ایک سے ایک بڑھ کر دلفریب و دلکش اور اس کا پورا نہ ہونا اور پھر اس سے جو حسرت اور ارماں نصیب ہوتا ہے ان سب کا ایسا مکمل مرقع پیش کرنا سودا ہی کا کام ہے جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا، انسانی بیچارگی اور شکست کا اس سے بہتر اور دردناک نمونہ آج تک کوئی نہ پیش کر سکا۔ شیفتہ نے اسی ہجوم افکار کو آشفتہ خاطری سے تعبیر کیا ہے

اور انسان کی بے دست و پائی اور سکون کے فقدان کا یوں اظہار کیا ہے

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ ۔۔۔ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

لیکن محسن کی دوربین نگاہ نہ صرف فقدان سکون کو محسوس کرتی ہے اور اس کی شکایت کرتی ہے بلکہ اسے ایسی خطرہ ہے کہ کہیں یہ بے اطمینانی انسان کے لئے دوامی نہ ہو اور انسان کی تکالیف کے اختتام کا کوئی راستہ ہی نہ ہو تو پھر زیست دوامی حاصل کرنے کی سعی بھی رائیگاں جائے

چنانچہ فرماتے ہیں ۔

شب فراق نہ ہو روز انتظار نہ ہو ۔۔۔ تو ہم بھی فکر کریں عمر جاوداں کیلئے

حقیقت یہ ہے کہ تشکیل فطرت انسانی کا حصہ ہے اور یہ دل کا چور نا پید نہیں ہو سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مداح پیغمبر کے دل میں بھی کانٹا چبھ رہا ہے۔ ایک جگہ مدح کے مضمون کو اس خوبی سے تغزل کے رنگ میں ادا کیا ہے کہ کہیں اس کا خیال نہیں گذرتا کہ اس شعر کا مخاطب صرف نسل انسانی کا بادشاہ ہے ۔

نہ لگے تجھ کو نظر اے قدر عنا والے
بے طرح گھورتے ہیں عالم بالا والے

محسن کی بعض غزلیں جو چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہیں سلاست اور روانی میں اور طرز ادا میں اس معیار کی ہیں کہ ان پر غالب و مومن کی غزلوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ آتش کے دبستان کے ایک نمائندے کے قلم سے یہ شعر کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

ایک آفت جاں تری ادا ہے ۔۔۔ عاشق کو قضا کا سامنا ہے
دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو ۔۔۔ رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے
لیلی کو پکارتا ہے بن میں ۔۔۔ مجنوں تجھے آج کیا ہوا ہے
محسن کو واعظو نہ چھیڑو
اچھا ہے جو کچھ برا بھلا ہے

لیکن ان نایاب اور بیش بہا موتیوں کے ساتھ وہ خزف پارے بھی ہیں جو دبستان آتش کے تمام خصوصیات کے حامل ہیں جن میں شعر کا دارومدار لفظی مناسبات اور غریب استعارو اور تشبیہوں پر ہے لیکن اپج سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً یہ شعر

[illegible] نے حل کیا پیدا لب رنگین جاناں پر — تو گویا تیل چھڑکا آتش لال بدخشاں پر

[illegible] کو آتش لعل بدخشاں سے تعبیر کرنا اور اس پر تیل چھڑک کر اسے بھڑکانا اور اس سے زینت حسن میں اضافہ کرنا صرف آتش ہی کے اسکول کے شعرار کا کام ہے، دوسرا اس فرض [illegible] خوبصورتی کے ساتھ عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر سنئے :۔

فرہاد نہ پوچھ سختی ہجر — دن آج پہاڑ سا کٹا ہے

اگرچہ شعر میں مناسبات کا خاص التزام ہے لیکن دوسرے مصرعے میں محاورے کی بے تکلف بندش نے اس کی ثقالت کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے اور ہجر کی سختی کا واقعی احساس پیدا کر دیا ہے۔

ایک شعر اس ضمن کا اور سنتے چلئے :۔

آنکھ پر ٹھہری نظر مائل ابرو ہوکر — ہم پھرے کعبے سے اے قبلہ تو ہندو ہوکر

ابرو کے حسن سے متاثر ہوا پھر آنکھوں کے اعجاز سے مسحور ہو جانا تسلیم لیکن اسے کعبہ سے ہندو ہوکر نکلنے سے تعبیر کرنا بالکل نئی ترکیب ہے اور طرز ادا ہے جو لکھنؤ مدرسہ کے لئے باعث فخر ہے۔ اس سلسلہ کے دو تین اشعار اور سنئے۔

ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری — محشر میں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی

گلے تک سیل اشک آکر ہمیں آخر میں لے ڈوبا — چڑھانا دوش پر لازم نہ تھا اس طفل بدخو کا

لیکن یہ رنگ وار ہیں ہے اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ محسن نے اس کو کس طرح جائز رکھا، اس لئے کہ لکھنؤ کے عام مذاق شاعری میں اس وقت تک تناسب لفظی کی بھرمار تھی۔

مندرجہ ذیل اشعار کہتے ہیں کہ دہلی کی شاعری کا اچھا خاصا اثر ان کی غزلوں میں پایا جاتا ہے

صاحب [illegible] سے جی خفا ہے
دور کیا مجھے آپ سے گلا ہے

بادل ہر سو گرج رہا ہے
طوطی مستوں کا بولتا ہے

اے [illegible] بیماری کی یہ حالت ہے
نہ دوا چلتی ہے اس پر نہ دعا چلتی ہے

دشمن دوست پہ شمشیر جفا چلتی ہے
آج کچھ اور ہی مقتل میں ہوا چلتی ہے

جھلملاتی نظر آتی ہے مجھے شمع حیات
صبح پیری ہے عیاں باد فنا چلتی ہے

[illegible] سے دیں خبر یا اضطراب کی
اللہ خیر ہو دل خانہ خراب کی

سادگی کی قدر کچھ عہد جوانی نے نہ کی
جو امنگ آئی طرفدار خود آرائی ہوئی

رفتہ رفتہ یہ بڑھا ہے اس کو عاشق سے حجاب
یاد بھی اب دل میں آتی ہے تو شرمائی ہوئی

شب کو یہ جذب محبت کا تماشا دیکھا
شمع پروانے کے ساتھ اڑ گئی جگنو ہو کر

رو کے دھو ڈالے سب نامۂ اعمال اپنا
چشم ہمت میں گذر کیجئے آنسو ہو کر

سنا ہے محتسب بھی تاک میں ہے دختر رز کی
الٰہی رکھ لے تو حرمت شراب ارغوانی کی

چلتے تو ہٹتے پاؤں نہ بتخانے سے مگر
دھوکا دیا زمانۂ ناپائیدار نے

رو برو جس کے تو آئے اسے سکتا ہو جائے
نقش دیوار ترا آئینہ خانہ ہو جائے

اے بت مجھ سے نہ بگڑ وہ جو خدا بخشے ہو
کہیں بندہ بھی نہ اللہ کا بندہ ہو جائے

نہ کہو مجھ سے وہ آتے ہیں عیادت کے لئے
دل بیمار نہ اس دھوکے میں اچھا ہو جائے

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو
رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے

صنم کدے سے اٹھوں زاہد و جناں کے لئے
کہاں سے مجھ کو اٹھاتے ہو تم کہاں کیلئے

سواد نجد نہ صحرائے بے ستوں چھوڑا
ہمارے شوق نے بھٹکے کہاں کہاں کے لئے

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی
دو کروٹیں تھیں عالم غفلت کے خواب کی

روئے عرق فشاں پہ ہے سرخی شراب کی
شبنم ہے لگی ہوئی تو آفتاب کی

کیا قہر ہے جھڑا کے گلستانِ میکدہ — لائے بہشت میں مری مٹی خراب کی
شیشے سے نکل رندئے آشام ہیں بے چین — غمزے نہ کرا اے دخترِ رز ایسی گھٹا میں
شرمائی ہوئی آنکھوں کی چتون ہے قیامت — شوخی کی جھلک قہر ہے انداز حیا میں
کی اُمنگ بہار نئے شباب کی — مٹی خراب کی دل خانہ خراب کی
رفتہ رفتہ یہ بڑھا ہے اس کو عاشق سے حجاب — یاد بھی اب دل میں آتی ہے تو شرمائی ہوئی
کسی کو منزلِ دیر کا راستا نہ ملا — ہزاروں کھو گئے اس راہ میں پتا نہ ملا
نہ دین کے ہوئے محسن ہم اور نہ دُنیا کے — بتوں سے ہم نہ ملے اور ہمیں خدا نہ ملا

ابھی دیکھے ہی نہیں قامتِ رعنا والے — ہمت او پنچے نہ بڑھیں سدرہ و طوبے والے
قطرہ قطرہ میں مرے اشک کی موّاجی ہے — مجھ سے کیا آنکھ ملائیں لب دریا والے

مندرجۂ بالا اشعار میں جہاں دلی کا رنگ گہرا ہے وہاں کہیں کہیں لکھنوی انداز بھی ظاہر ہو جاتا ہے لیکن اشعار کے پڑھنے کے بعد غالباً اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا کہ حضرت محسنؔ صرف نعت گو شعرا میں ہی بلند ترین مرتبہ رکھتے ہیں بلکہ لکھنؤ اسکول کے غزل گو شعرا میں بھی ان کا ایک امتیازی درجہ ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ تعصب اور غیر ضروری تنقیص کے دامن کو چھوڑ دیا جائے۔

انتظار

(از حضرت بسمل سعیدی ٹونکی)

[illegible] وعدۂ فردا کب آئے گا — [illegible] والا کب آئے گا

[illegible] وہ ذوق تمنا کب آئے گا — فردوس دل بہشت نظارہ کب آئے گا

[illegible] سراپا کب آئے گا — میری طرف نہ دیکھنے والا کب آئے گا

[illegible]ے دیکھے رہ سکوں نہ جسے دیکھ ہی سکوں — وہ آفتاب ذوق نظارہ کب آئے گا

[illegible] میرے تصور سے رنگ رنگ — یارب مجھے نظر وہ تماشا کب آئے گا

چین جبیں، تا طلسم امواج تیز تیز — پھر میری چشم شوق پہ غصہ کب آئے گا

[illegible] ہے بجھا ہوا سا تمنا اداس ہے — وہ جان دل وہ جان تمنا کب آئے گا

کب تک رہے گا سلسلۂ اشک متصل — ان آنسوؤں کا پونچھنے والا کب آئے گا

[illegible] ہیں اور سو تبسم نگاہیاں — رسوائیوں کا میری سہارا کب آئے گا

پوچھا ہے اس سے باغ میں جو موسم بہار — یارب بہار کا وہ زمانہ کب آئے گا

[illegible] جس روش پہ نسیم جمال کی — سرو روان باغ تمنا کب آئے گا

وہ جس کا نقش نقش قدم صد نگار خلد — وہ پیکر بہار سراپا کب آئے گا

اے میری جان کن کی قسم ہے تجھے صبا — اس جان انتظار سے کہنا کب آئے گا

بسمل پھر آئے گا وہ ضرور آئے گا، مگر —
اب اس کو یاد وعدۂ فردا کب آئے گا

انتخاب غزلیات

اشارے کھل کے کر سکی نگاہِ سرمگیں کہیں
فراق ہو نہ ہو مگر یہ بجلیاں گریں کہیں

جھکی نظر سے دل تو کیا بنائے دہل گئی
کہیں تھی اور پہ چمکی یہ موجِ تہ نشیں کہیں

کہاں یہ دورِ آسماں کہاں یہ نظمِ زندگی
کہ لاکھوں ایسی محفلیں وہ آنکھیں لے اُڑیں کہیں

یہ تیرگی یہ ابتری یہ کھیتیں یہ مستیاں
کہ کھل پڑی ہو جس طرح وہ زلفِ عنبریں کہیں

بس ابتدا ہی ابتدا ہے زندگی عشق میں
کہ بھول بھی سکی تری نگاہ اولیں کہیں

نہ اب وہ دورِ عاشقی نہ اب وہ فرصتیں مگر
یہ درد بھی ضرور ہے کبھی کبھی کہیں کہیں

دو رنگیاں نہ جا سکیں نگاہِ نازِ یار کی
ملال آفریں کہیں نشاط آفریں کہیں

کہیں تو لاکھوں داغِ دل ہرے بھرے کھلا کھلا
دھواں دھواں اُداس اُداس وہ رخِ حسیں کہیں

سکونِ عشق پر نہ جا ہیں یوں تو عشق بے اثر
پلٹ نہ دے فلک کہیں اُلٹ نہ دے زمیں کہیں

فراق زیرِ چرخ کچھ چمک بھی ہے دھواں بھی ہے
کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرمگیں کہیں

فراق گورکھپوری

نازک یہ مرحلہ ہے دلِ زار دیکھ کر
شکوہ سہی مگر نظرِ یار دیکھ کر

گلہائے لالہ رنگ کے چہروں کی آب تھا
تم یاد آ گئے مجھے گلزار دیکھ کر

خونِ شہیدِ عشق ہے سرمایۂ بہار
کیا دل ہو شاد رونقِ گلزار دیکھ کر

اب کیا سمائیں میری نگاہوں میں جنتیں
عالم ہے اور جلوۂ رخسار دیکھ کر

سب حادثاتِ دہر فراموش ہو گئے
اُس جانِ کائنات کو غمخوار دیکھ کر

اختر ہے آپ حسنِ کرم پر تلا ہوا
عشقِ ادب سرشت کو خوددار دیکھ کر

اختر تلہری

عشق اور آسودگیٔ شوق! میں قائل نہیں — جیتے جی آسان ہو جائے یہ وہ مشکل نہیں

آتشِ جاں سوز سے پانی ہوا جاتا ہے خون — ذوق پھر بھی التماسِ شوق پر مائل نہیں

چاہنے والے کو چاہت کے سوا کیا چاہئے — کون سی لذت ہے اس لذت میں جو شامل نہیں

غمِ دل کیونکر دکھائے کوکبِ مجروحِ دل
بات بسمل کی وہ کیا سمجھے گا جو بسمل نہیں

کوکب شاہجہانپوری

[illegible] پرست ہو حسن جنوں نواز ہو — پردۂ سازِ زندگی ایک حریمِ راز ہے

کس نے جلا دیا یہ آج دل کا بجھا ہوا چراغ — محفلِ آرزو میں پھر شورشِ سوز و ساز ہے

منزلِ مہر و ماہ میں اُس کا مقام سربلند
وادیٔ کہکشاں میں وہ محوِ خرام ناز ہے

منظر حسین شمیم

[illegible] اُن کا نیا بدل شباب اُن کا — اب کہاں نظر اُن کی اب کہاں جواب اُن کا

اس ادا سے بیٹھے وہ جیسے کچھ نہیں معلوم — دیدنی تھا محفل میں رنگِ اجتناب اُن کا

[illegible] کیا کریں اس کا اپنی اپنی قسمت ہے — غیر پر کرم اُن کا، غیر پر عتاب اُن کا

[illegible] کے کھلائے پردہ میں نہاں کافر جوانی ہے — مری گستاخ نظروں کی یہ ادنیٰ مہربانی ہے

سرور رنگینی میں ڈوبی ہوئی اُن کی جوانی ہے
شرابِ ناب کے دریا میں موجوں کی روانی ہے

عظیم حیدرآبادی

پاس رہتا ہے دور رہتا ہے — دھیان میں وہ ضرور رہتا ہے

ہائے اُس کی نوازشِ پنہاں — کس قدر دور دور رہتا ہے

شوق کی کامیابیاں تسلیم — دل مگر ناصبور رہتا ہے

دل جو رہتا تھا اپنے پاس کبھی — وہ بھی اب دور دور رہتا ہے

ہائے عہدِ شباب کا عالم — چوٹوں پر غرور رہتا ہے

[illegible] حسن ہے یہی تسلسل — یہ جو دل کو سرور رہتا ہے

[illegible]

جاپان نے اس وقت خود سری کا جو انداز اختیار کیا ہے اسے دیکھ کر آپ کو شاید یاد آ جائے کہ دنیا کی نئی سیاست کا پہلا قدم جاپان کا منچوریا پر حملہ تھا۔ نئی سیاست کو بسم اللہ کئے اب نو برس ہو گئے اور آپ اس کی کارگذاری اور پھیلاؤ کو دیکھئے تو بڑا ہی اچنبھا ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ سیاست کمزوری اور مقابلے سے بھاگتی تھی، سر جون سائمن جو اُس وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے۔ یہ سمجھے کہ اگر اسے کچھ بھیک دے دی گئی تو وہ خوش ہو کر بیٹھ رہے گی یہ بہت بڑی غلطی تھی آج کل مشرق کی بات کو مغرب تک پہونچنے میں دیر نہیں لگتی، جاپان کو کامیاب دیکھ کر جرمنی اور اٹلی کے حوصلے بھی بہت بڑھ گئے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ برطانیہ کی دولت اور ساری دنیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کا صدقہ مانگ رہے ہیں، اصل میں وہ چاہتے تھے کہ یورپ کی نئی تقسیم کے بہانے سے یورپ پر قبضہ کریں۔ جرمنی کو ایک حد تک کامیاب اور برطانیہ کو اپنی حفاظت کی تدبیروں میں مصروف دیکھ کر اب جاپان نے پیش قدمی شروع کی ہے نئی سیاست نے مشرق اور مغرب کے سرے اس طرح ملا دئے ہیں کہ دنیا کے لئے ایک چکر بن گیا ہے۔

جرمنی اور جاپان کا ہر موقع سے فائدہ اٹھانا، ایک دوسرے کو سہارا دے کر اپنے اپنے سیاسی منصوبوں کو پورا کرنا کوئی اتفاقی بات نہیں ہے نومبر سنہ ۱۹۳۶ء سے جب انھوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا جس کا نام کچھ تھا اور کام کچھ، ان کی سیاست آزاد رہی ہے مگر انھوں نے اس کا بہت خیال رکھا ہے کہ ایک دوسرے کا کھیل نہ بگاڑیں۔ جاپان نے جولائی سنہ ۱۹۳۷ء میں چین پر حملہ کیا تو جرمنی کے لئے ممکن تھا کہ وہ چین اور جاپان دونوں کے ہاتھ اپنا مال بیچے اور ان کی جنگ سے اپنی تجارت کو بہت فائدہ پہنچائے۔ مگر جاپان کے اصرار پر اس نے چین سے لین دین قریب قریب بند کر دیا اور جنگ کے ان جرمن ماہروں کو جو چین میں ملازم تھے واپس بلا لیا۔

اس کے بدلے میں جاپان نے برطانیہ سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی اور سمجھیے اس کی نبض پر ہاتھ
رکھ کر جرمنی کو بتاتا رہا کہ اس کی مزاجی کیفیت کیا ہے۔ اس نے برطانیہ کے خلاف اپنی قوم
کو بھڑکایا، چین میں برطانوی تجارت کو جہاں تک ممکن تھا نقصان پہنچایا، یانگ سی دریا میں اس
کے جہازوں کی آمد و رفت بند کر دی، برطانوی سفیر کے موٹر تک پر بمباری تک کر دی اور آخر
میں ٹی اینٹس شہر کا محاصرہ کر کے وہاں کے بہت سے انگریزوں کو ستایا اور رسوا کیا۔
[illegible]نیہ کی سنہ ۱۹۳۱ء سے یہ پالیسی تھی کہ جاپان کو جہاں تک ممکن ہو راضی رکھا جائے جب
کبھی جاپان نے ان مختلف معاہدوں کے خلاف کچھ کیا جو اس کے، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے
ملکوں کے درمیان مشترک طور پر ہوئے ہیں جیسے کہ سنہ ۱۹۲۲ء کا نو ریاستوں کا معاہدہ، تو برطانیہ
نے اسے فوراً ٹوکا، لیکن عملاً جاپان کی مخالفت نہیں کی۔ مخالفت کرنا آسان بھی نہیں تھا جب
تک کہ امریکہ کی متحدہ ریاستیں برطانیہ کا پورا پورا ساتھ نہ دیں یعنی جنگ کا اندیشہ ہو تو برطانیہ سے
مل کر جاپان سے لڑنے کا وعدہ نہ کریں۔ متحدہ ریاستوں کی عام رائے یورپ اور ایشیا میں
[illegible] دھنسنے کے خلاف ہے۔ اور برطانیہ کی حکومت کو یقین رہا ہے کہ اگر جاپان سے
لڑائی ہوئی تو متحدہ ریاستیں اس کا ساتھ نہ دیں گی۔ جاپان نے چین پر حملہ کیا تو انگلستان اور امریکہ
میں اسے بہت برا بھلا کہا گیا پریزیڈنٹ روزولٹ نے ایسی جوشیلی تقریریں کیں جن سے معلوم ہوتا
تھا کہ وہ جاپان سے لڑ بیٹھیں گے، لیکن جب چند مہینے بعد برسلز (Brussels) میں ان ریاستوں
کی کانفرنس ہوئی جنھوں نے چین کی خود مختاری قائم رکھنے کا ذمہ لیا تھا تو اس کی کوئی امید
نہ تھی کہ امریکہ والے میدان میں آ میں گے، اور ایسی حالت میں کانفرنس جھک مارنے کے
سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن نے وہ بات
صاف صاف کہہ دی جو اب تک کسی زبان پر نہیں آئی تھی۔ کہ برطانیہ اکیلا بحر الکاہل میں جاپان
سے نہیں لڑ سکتا، کیونکہ جیتنے کے لئے جتنی طاقت چاہئے وہ برطانیہ کو دنیا کے اس حصے
میں میسر نہیں ہے۔ یہی بات مسٹر چیمبرلین نے بعد کو دہرائی اور اب صورت ایسی ہے کہ مسٹر چرچل

جیسے بلند ہمت آدمی کے لئے اپنے وہرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسی وجہ سے چند مہینے ہوئے جاپان نے برطانیہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ چینی حکومت کے اس چاندی کے ذخیرے کو جو ٹی اینسن برطانوی اور فرانسیسی بنکوں میں محفوظ تھا جنگ کے ختم ہونے تک چینی حکومت کو واپس نہ کرنے کا وعدہ کر لے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ جاپان نے اس سڑک پر جو تھوڑے دن ہوئے برہما سے چین تک مال لے جانے کے لئے بنی تھی سامان جنگ بھیجنے کی ممانعت کرا دی اور برطانیہ کو شاید اس پر بھی راضی کر لیا کہ رنگون میں جاپانی نمائندے غیر سرکاری طور پر رہ کر اس کا اطمینان کرتے رہیں کہ ممانعت کے باوجود چینی حکومت کو اس رستے سے مدد نہیں پہونچائی جا رہی ہے۔

جاپان کو بے باک صرف برطانیہ کی صلح پسندی اور اس کی اس وقت کی مجبوریوں نے نہیں کر دیا ہے۔ پچھلے سال اگست میں جب روس اور جرمنی کے درمیان اچانک معاہدہ ہو گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ جاپانی سیاست کو بڑا صدمہ پہنچا ہے جاپانی جرمن سیاست کے اس طرح قلابازی کھانے پر حیران بھی ہوئے لیکن پھر انھیں اس میں ایک مصلحت نظر آنے لگی اور وہ یہ کہ اب انھیں روس کی طرف سے کوئی خاص خطرہ نہ رہے گا اور ایک طاقت جو ہر معاملہ میں ان کے مقابلہ پر آ جاتی تھی اب انھی کی سیاست کا ہمارا بن جائے گی۔ آخر میں ہوا بھی یہی روس نے جیسے جرمنی سے اتحاد کر لیا تھا ویسے ہی جاپان سے بھی صفائی کرائی، اور جیسے جرمنی کو اس کا اطمینان دلا کر کہ روس کی طرف سے اس پر حملہ نہ ہو گا مغربی یورپ میں جنگ کا اعلان کرا دیا تھا ویسے ہی مشرقی ایشیا میں جاپان کو ایک محاذ کی طرف سے مطمئن کر کے اسے موقع دیا ہے کہ دوسرے محاذ پر دل کھول کر لڑے۔ کمیونسٹ سیاست کے رازداں کہتے ہیں کہ جرمنی اور جاپان سے اتحاد کر کے ستالن نے اس کا انتظام کر دیا ہے کہ سرمایہ دار ریاستیں آپس میں لڑیں اور اس طرح کمیونسٹ انقلاب اور پرولتاریہ کی حکومت کے لئے میدان صاف ہو جائے۔ انقلاب ہو یا نہ ہو اس میں شک نہیں کہ ستالن کی حکمت عملی نے فساد بہت برپا کر دیا ہے۔

جاپان نے ایشیا کی نئی تنظیم کا جو ارادہ کیا ہے۔ کوئی بھید نہیں اب تک وہ بہت

دیکھ بھال کر قدم بڑھاتا [illegible] وہ جاپان مذر ہو گیا ہے اسلئے معلوم ہے کہ متحدہ ریاستیں اس کی
مخالفت کریں گی اور اسے ستائیں گی جیسا کہ پریذیڈنٹ روزولٹ نے تیل اور ردی لوہا جاپان
کے ہاتھ بیچنے کی ممانعت کر کے کیا بھی ہے۔ لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئے گی۔ اس لیے کہ امریکہ اکیلا
لڑ نہیں سکتا اور برطانیہ اب اسے کسی قسم کی مدد پہنچا نہ سکے گا فرانس اور ہالینڈ، جن کی نوآبادیوں
پر اس وقت جاپان کی نظر ہے خود بے بس اور جرمنی کے پنجے میں گرفتار ہیں اور جرمنی ان سے جو
چاہے منظور کرا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جاپان نے چین کو پوری طرح قابو میں کر لیا ہے، سوا اُن
[illegible] علاقوں کے جہاں مارشل چیانگ کائی شک کا راج ہے۔ یہاں وہ اپنی قومی حکومت شوق
سے قائم رکھیں۔ جاپان کا اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس نے تمام بندرگاہیں اپنے قبضے میں کر لی
ہیں چین کو مدد پہنچ سکتی ہے تو اس ڈھائی ہزار میل لمبی سڑک سے جو چین سے روس تک جاتی
ہے، اور ادھر سے بھی بس اتنی ہی مدد آئے گی جتنی کہ روسی جاپان سے اپنے تعلقات کو دیکھتے ہوئے
مناسب سمجھیں جاپان نے قزاقانہ جنگ کا ہر موقع پر ایسا سخت بدلہ لیا ہے کہ اب قومی حکومت
کے لئے اس کا جاری رکھنا بڑا مشکل ہے، اور جاپان کی محافظ فوج کا خرچ جو اتنا تھا کہ لوگ کہتے
تھے وہ جاپان کو دیوالیہ کر دے گا اب چین کی آبادی پر ڈال دیا جا رہا ہے۔ جاپان کو اس سے بجائے
نقصان کے اور فائدہ ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی جنھیں اپنا پیٹ پالنا پڑتا اب
مزے میں کماتے کھاتے ہیں، اور جاپان میں بے روزگاری کا نام نہیں چین میں حکومت جاپانیوں
کی ہے۔ نام مسٹر وانگ چنگ دے ئی کا ہے، صنعت اور تجارت مختلف جاپانی کمپنیوں کے ہاتھ
میں دے دی گئی ہے اور اس میں کسی کی آڑ لینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ بحث کرنے والے اب بھی
کہتے ہیں کہ جاپان کو اس سرمایہ کی نسبت سے جو لگایا گیا ہے بہت کم فائدہ ہو رہا ہے اور اس
کی خاص مشکل کہ اس کے پاس اپنا کوئلہ، لوہا، تیل اور روئی نہیں ہے چین پر قبضہ کرنے سے حاصل
نہیں ہوئی لیکن سب کچھ دیکھتے ہوئے کہنا ہی پڑتا ہے کہ افسوس جاپان نے چین کو فتح کر لیا۔
[illegible] وہ کوئلے، تیل اور روئی کو بہانہ بنا کر چاہتا ہے کہ فرانسیسی ہند چینی اور ڈچ مشرقی ہند کو بھی ہضم کر لے

آپ جانتے ہیں نئی سیاست بڑی منطقی ہے اور مروت کرنا جانتی ہی نہیں۔ اس منطق نے
[illegible] سے روس کو بس ارابیا دوا دیا۔ اگرچہ رومانیہ فاشسٹ ریاستوں کی برادری میں شامل ہو گیا
تھا اور جرمنی کی سرپرستی میں تھا۔ اسی منطق نے جرمنی سے اعلان کرایا کہ اسے جنوب مشرقی ایشیا
[illegible] کے جزیروں سے کوئی دلچسپی اور مطلب نہیں ہے جس وقت یہ اعلان کیا گیا جرمنی کا صرف ہالینڈ
پر قبضہ ہوا تھا اور اس اعلان کا مقصد جاپان کو اطمینان دلانا تھا کہ اس نے ہالینڈ کی ایشیائی نوآبادیوں
[پر ق]بضہ کر لیا تو جرمنی ہالینڈ کے سرپرست کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہ کرے گا اب فرانس اسی
[ط]رح جرمنی کے قابو میں ہے جیسے کہ اعلان کے وقت ہالینڈ تھا۔ اٹلی کو فرانس کی نوآبادیوں کا کوئی
حصہ ابھی تک نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن جرمنی اپنی طرف سے فرانسیسی ہند چینی پر جاپان کا حق تسلیم کرے
تو یہ بات نئی سیاست کی منطق کے لحاظ سے بالکل درست ہو گی۔ اگر فرانسیسیوں کو نئی سیاست
[سے] عقیدت ہو گئی ہے تو وہ اپنے نقصان پر افسوس اور شکایت نہ کریں گے بلکہ اسے ایسا ایثار
سمجھیں گے جس سے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بڑھتا ہے۔

جرمنی جاپان، روس اور اٹلی کی نئی سیاست مشرق سے مغرب تک چھائی جاتی ہے۔ اور
اب انگلستان اکیلا اس کا مقابلہ کر رہا ہے امریکہ والوں میں دور اندیشی ہوتی تو وہ اس کا ساتھ دیتے
لیکن وہ تو سمجھتے ہیں کہ ان کا مشرق اور مغرب بلکہ شاید زمین اور آسمان اپنا الگ ہے۔ اور انھیں
فکر صرف اس کی ہے کہ کہیں یورپ کی ہوائیں وہاں کی بیماریوں کو امریکہ میں نہ پھیلا دیں۔ اپنی
دنیا کی حدیں ہر ملک ہی نہیں، ہر شخص بھی مقرر کر سکتا ہے مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایسی دنیا بہت
تنگ ہوتی ہے اور بڑی آسانی سے ایسا قید خانہ بن سکتی ہے کہ جس میں آدمی کا دم گھٹنے لگے
ہمارا مقصد پریزیڈنٹ روز ولٹ کی نصیحتوں کے جواب میں خود ان کو نصیحت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ
ایسی کھلی ہوئی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے جسے وہ ہم سے بہت بہتر سمجھتے ہوں گے۔

تنقید و تبصرہ
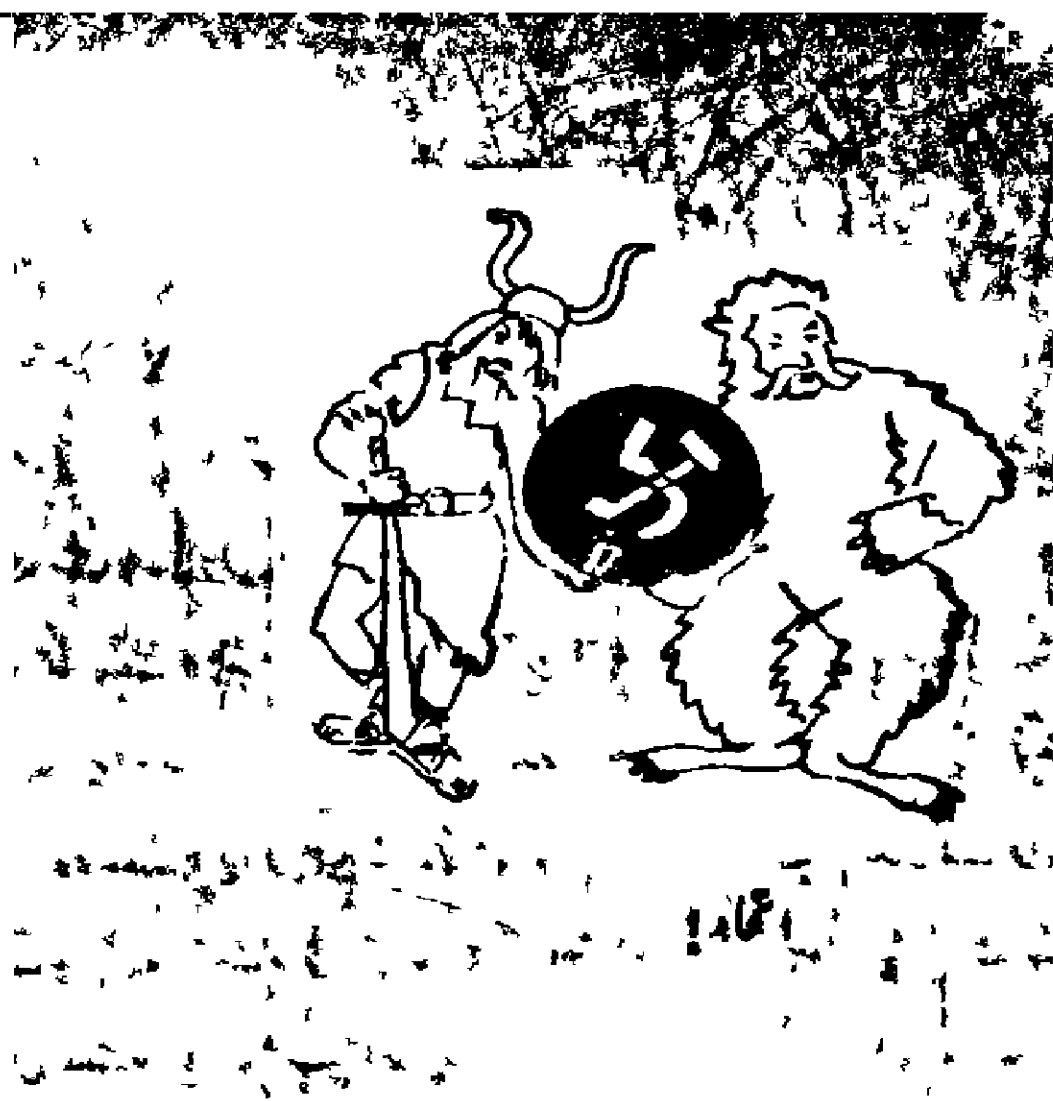
(... کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تفہیمات حصہ اوّل: تالیف سید ابوالاعلیٰ مودودی تقطیع بڑی صفحات ۳۰۵ قیمت غیر مجلد عہ مجلد ... پتہ دفتر ترجمان القرآن لاہور

یہ کتاب مودودی صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر اسلام پر اعتراضات یا شبہات کے جواب میں ہیں مثلاً کوتہ نظری ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات، آزادی کا اسلامی تصور، کیا نجات کے لیے صرف کلمہ توحید کافی ہے؟ کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟ ایمان بالرسالۃ، حدیث اور قرآن، حدیث کے متعلق چند سوالات۔ قرآن اور سنت رسول وغیرہ۔ چند مضامین میں اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کو رفع کیا گیا ہے اور بعض میں اہم اسلامی امور کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی علمی و ادبی طبقے میں غیر معروف شخصیت نہیں۔ انہوں نے مذہب و متعلقات مذہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور پھر خدا نے انہیں معقولیت سنجیدگی، متانت اور شرافت سے بھی بہرہ وافر دیا ہے زبان نہایت صاف ستھری اور طرز بیان سلجھا ہوا ہے انہوں نے تمام اسلامی مسائل کو نقل کے علاوہ عقل سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

آج کل زمانہ آزادی کا ہے غلط طریقہ تعلیم کیئے یا نئے زمانے کا ماحول اکثر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بڑی حد تک ناواقف رہے اور اگر واقف ہے تو ان مغربی کتابوں کے ذریعے جو اسلام کی مخالفت میں خوب زہر آلود ہوتی ہیں اس لئے مستشرقین یا عیسائی مصنف اسلام پر جو کچھ اعتراض کرتے ہیں وہ دل میں اترتے چلے جاتے ہیں ہمارے بعض "علمائے کرام" یا "عالم نما بزرگ" جنھیں اپنی مذہبیت "سچائی" اور صداقت کا غیر معمولی مغالطہ ہے اسلام کی خدمت اسی میں

سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا مضحکہ اڑائیں اور اگر کوئی بات غلطی سے ان نو تعلیم یافتہ لوگوں کے منھ سے نکل جائے تو اسے حصڈے پر چڑھائیں اور اپنے معاندانہ اور زہر آلود فقروں سے انھیں طلب حق کی راہ سے ہٹا کر ان میں عناد کا جذبہ بھر دیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تفہیمات میں ہمیں ایسی کوئی چیز [illegible] ملی۔ ہمارے خیال میں اس وقت اسلام کی یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔

مولانا ان مضامین کے ذریعے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈال رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ تفہیمات کا دوسرا حصہ بھی ایسے ہی مفید مضامین کا حامل ہوگا۔ (ح س)

خیال آفریں دماغ مصنفہ عرش تیموری [illegible] پبلشنگ ہاؤس، کتاب نگر دہلی قیمت [illegible] عرش صاحب نے ایک دلچسپ تمثیل لکھی ہے جس میں ایک شاعر کے خیالات بغیر کسی ترتیب کے مجسم پیش کئے ہیں۔ پلاٹ صرف اتنا ہے کہ ایک رات کو شاعر کے دماغ [illegible] خیالات لا کی ارادہ کے بلا کسی تسلسل کے چکر لگاتے ہیں صبح کو مالک مکان اس شاعر کو اپنی کرسی پر مردہ پاتا ہے۔ [illegible] کے تحلیلی و تجزیاتی افسانے جو موجودہ زمانہ کے انگریزی ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کا حربہ ہیں ہماری اُردو میں اس سے پیشتر بھی نکل چکے ہیں۔ انگارہ میں اس قسم کے کئی افسانے تھے اور بھی اکثر و بیشتر لکھے جاتے ہیں یہ جدید طریقہ کہ اتفاقات صفحۂ قرطاس پر آ جائیں آرٹ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے بے رنگی میں رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور بے ترتیبی میں ایک ترتیب نکل آتی ہے جیمس جوائس اور الڈوس ہکسلے وغیرہ اس طرز کے بڑے علمبرداروں میں سے ہیں۔ عرش صاحب اگر اس سلسلے کو جاری رکھیں یہ چیز ان کے دماغ سے ہم آہنگ بھی ہے۔ اور ان کی عمر ابھی [illegible] زوں بھی ہے۔ خیال آفریں دماغ کے بجائے اس تمثیل کا نام شاعر کا دماغ بہتر ہوتا۔ کتابت و طباعت بہت خوب ہے۔

یاد اقبال حصہ اوّل ۔ مرتبہ غلام سرور صاحب فگار دفتر اقبال اکاڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور

صفحات ۱۲۰ قیمت ہے۔

یہ مجموعہ ان نظموں کا ہے جو علامہ اقبال پر ہندوستان کے متعدد شعرا نے وقتاً فوقتاً لکھیں اور مختلف کتابوں یا رسالوں میں شائع ہوئیں۔ اقبال کی یادگار کے سلسلے میں اقبال اکیڈیمی کا یہ قدم یقینی مستحسن ہے۔ حالانکہ اس حصہ میں بہت کافی نظمیں آگئی ہیں پھر بھی ابھی تھوڑی بہت باقی رہ گئی ہیں۔ اقبال کی مقبولیت کے باعث ہندوستان کے کونے کونے میں شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہو جس نے اپنے تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو۔ علامہ اقبال کی وفات پر آل انڈیا ریڈیو نے ایک مشاعرہ اقبال کی یاد میں منعقد کیا تھا اور اس میں مرحوم پر چند مشہور شعرا نے نظمیں پڑھی تھیں بہتر ہو اگر وہ نظمیں حصہ دوم میں شامل کر لی جائیں علی گڑھ میں چند اچھی نظمیں مل جائیں گی۔ جو اس موقعہ پر وہاں پڑھی گئی تھیں۔ کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ وغیرہ بہت خوب ہے۔

ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری، ایوان اشاعت گورکھپور، صفحات ۱۳۶ قیمت [illegible]

یہ مجنوں گورکھپوری کے چند تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ریڈیو پر نشر ہو چکے اور بعض رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ مجنوں صاحب کا انگریزی اور اردو ادب کا مطالعہ بہت کافی ہے۔ اس لئے وہ اردو ادبیات میں بہت سی ایسی نئی تنقیدی چیزیں پیش کرتے رہتے ہیں جس کی [illegible] یہاں کمی ہے زیر نظر کتاب میں ادب و زندگی، ادب و ترقی، نظیر اکبرآبادی، حالی کا مرتبہ اردو ادب میں، اپنے موضوع کے اچھے مطالعے ہیں۔ چونکہ ان میں سے اکثر مضامین ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں جزئیات پر بحث نہیں ہو سکی ہے اور مجنوں صاحب محض طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلے گئے ہیں تفصیل نہیں آسکی ہے صرف اشاروں سے کام لیا گیا ہے ممکن ہے کہ انگریزی ادب سے ناواقف لوگوں کو اس میں خاطر خواہ دلچسپی نہ ہو سکے اور [illegible] سے محض عالمانہ رعب اندازی کا ایک طریقہ سمجھیں کہ اتنی کثرت سے انگریزی ادب کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر اصلیت اس کے خلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجنوں صاحب کا طرز آسان عام فہم نہیں [illegible] غالباً لوگ [illegible]

پڑھتے ہوئے گھبرائیں لیکن جسے ادبیات سے حقیقی دلچسپی ہے اسے اس مختصر مجموعے میں بڑے نکتے نظر آئیں گے۔ مختصر جملے وسیع معانی پنہاں رکھتے ہیں۔ طالب علموں کو اس مجموعہ سے خصوصاً مستفید ہونا چاہئے۔

تلاش مسرت: مصنفہ ایشور دیال سری واستو، ناشر نند کشن لال ترکمان دروازہ کیان پورہ دہلی صفحات ۱۰۵، قیمت عمر

افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ایشور دیال صاحب ابھی نوجوان آدمی ہیں زندگی کے تجربات کم ہوئے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر وہ واقعات لکھے ہیں جو ان کے دماغ ہی میں ہو سکتے ہیں۔ ایشور دیال صاحب کو اردو اور انگریزی کے بڑے افسانہ نویسوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اس فن سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو سکیں۔ حالانکہ افسانے روزانہ زندگی سے لئے ہیں اور رومانیت بھی زیادہ نہیں ہے پھر بھی کوئی نئی بات نہیں پیدا کر سکے ہیں لیکن ایشور دیال صاحب کے لکھنے کا طرز بہت ترنم اور بہت دلچسپ ہے امید ہے کہ آپ آئندہ مطالعہ اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ اردو افسانہ نویسوں میں ممتاز جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ قربانی کا پھل، پانچ خطوط، تانگہ والا، اچھے افسانے ہیں۔

رسالہ ... : ایڈیٹر خلیل احمد و شیر سندی صاحبان ۵۴ ٹمپل روڈ، لاہور سالانہ چندہ عہ

جون کے مہینہ سے یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا ہے ہندوستانی نوجوانوں کے احساسات کی ترجمانی کا دعویدار ہے۔ مضامین اور افسانے فی الحال اچھے ہیں امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ رسالہ اپنی جگہ پیدا کرے گا۔

نقشہ جنگ یورپ مغربی محاذ: مرتبہ خالد کمپنی ترابا بہرام خان دہلی سائز ۲۰×۳۰ قیمت ۴ر

یہ کمپنی اردو میں اکثر مفید نقشے تیار کرتی رہتی ہے موجودہ مغربی محاذ کا نقشہ ہر صورت سے مکمل اور عمدہ ہے، مفید حواشی بھی دئے گئے ہیں۔ حالانکہ اب وہ محاذ ختم ہو چکا ہے پھر بھی شائقین کیلئے اچھا تحفہ ہے امید ہے کہ کارکنان کمپنی موجودہ محاذ کے نقشے بھی جلد از جلد تیار کریں گے۔

اپنی اصلاح

ادبیات کی تعلیم

آرٹس کورس کی اعلیٰ تعلیم کو میں کاہل، عیش کوش اور تن آسان بنا دینے والی چیز سمجھتا ہوں ادبیات اور زبان کا علم ایسا ہے جو روح کو نرمی کی طرف لیجاتا اور آخر کار تن آساں عیش پرور اور نکما بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی گذشتہ تعلیمی سرگرمی کو ملاحظہ فرمائیے تو یہی پتہ چلے گا کہ خلفاء عباسیہ کے زمانے سے ہندوستان کے آخری تاجدار ظفر شاہ تک اور اسی طرح ایران، ترکی و مصر میں شاعری اور ادب امرائی طغرائے علمیت اور طرۂ فضیلت بن گیا تھا۔ سلاطین، علما و شعرا کو اپنے دربار میں جگہ دینا ان کی قدر و منزلت کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے [illegible] اور توصیف ہوتی تھی۔ کھانے پینے کی افراط میں سوائے بذلہ سنجیوں اور خوش گپیوں کے کیا سوجھتا ہے۔ شرابات کا جھگڑا بناتے چنانچہ زندگی کے مفید علوم سمٹ کر شاعری میں [illegible] ہو گئے اور انھوں نے کچھ ایسا نشہ پلایا کہ اب تک اس کا سرور باوجود غلام ہو جانے کے ہم نہ بھولے اور جس نے ہمارے نوجوانوں کو اتنا نکما، بزدل، کمزور اور نازک بنا دیا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ایسے مضامین لینے سے جی چراتے ہیں جن میں ذرا محنت پڑتی ہے یا جس میں دماغ زیادہ لگانا پڑتا ہو ہندوستان کے کسی کالج کسی یونیورسٹی میں چلے جائیے وہاں آپ کو مسلمان لڑکوں کی اکثریت آرٹس کورس لئے ہوئے ملے گی اور اس میں بھی موجودہ علوم مثلاً سیاسیات، معاشیات نہ لیں گے جو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ذرا خشک اور محنت طلب ہیں۔ وہ ان کی بجائے فلسفہ تاریخ منطق اور اردو فارسی ادبیات وغیرہ لیں گے کیونکہ یہ مضامین نہایت آسان اور کم دقیق ہیں۔ ڈگریاں آسانی سے دلا دیں گے۔ فلسفہ آج کل محض بیکار سی چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ سوائے کرسی نشینی اور گفتگو کو فن بنانے کے اور کوئی کام اس سے نہیں آتا منطق بھی غیر ضروری ہے اس لئے کہ ہماری روز مرہ زندگی کے لئے منطق نہ جاننا کچھ غیر مفید نہیں ہوتا تاریخ گڑے مردے اکھاڑتی ہے جس سے

کوئی سبق حاصل کر چکے ہیں نہ کرنا چاہتے ہیں محض واقعات کا رٹ لینا تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانا
ہے۔ ان تینوں علوم میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ ہم کو زندگی اور اس کی واقعی
ہوتے ہیں ہم کو ہماری چاروں طرف کی زندگی سے آنکھیں بند کر دینے پر مجبور کر دیتے ہیں
فنون اور ادبیات کے فضول ہونے کا تو تذکرہ کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ یہ چیز اظہر من الشمس ہے کہ یہ
[illegible] اور کاہلی سکھاتی ہیں عیاشی کا حق اگر ہمیں ہو پہنچتا بھی ہے تو اس وقت جب ہم
کچھ مفید کام کر چکے ہوں۔ یہ ادبیات شروع ہی سے ہمارے نوجوانوں کو تعیش پسند، آرام کوش اور
محض شاعرانہ قسم کا انسان بنا کر چھوڑ دیتی ہیں جو محض گفتار ہی میں مبتلا رہتا اور محض الفاظ ہی کے گورکھ
دھندوں سے خود کو اور دوسروں کو خوش کیا کرتا ہے۔

ہماری قوم میں بے عملی کی شکایت بہت مشہور ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی
ادبیات اور شاعری نکلے گی جس نے ہمارے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقوں کو خراب کیا ہے
اور جن کے اثر کی وجہ سے ہماری قوم میں بے عملی کی روایتی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں ادبیات
ہماری قوم و سوسائٹی کے لئے ایک افیون ہیں جو ہماری زندگی کو اتنا مست کر دیتی ہیں کہ
اس قابل بھی نہیں چھوڑتیں کہ اپنا گھر لٹ جانے پر اس کا ماتم بھی کرنے دیں مقصود چونکہ محض ڈگری لینا
ہوتا ہے اور ڈگری آسانی سے ادبیات ہی میں حاصل ہو سکتی ہے اس لئے عموماً طلبا اسی آسان راستے
کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کو اس ڈگری کی وجہ سے نوکریاں تو مل جاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ چیزیں
اور حاصل ہو جاتی ہیں وہ ہیں تعیش، نازک مزاجی، شاعری، لفاظی اور اخلاقی کمزوری جس کی بدولت خوشامد
اور اسی طرح کی ذلیل عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں تن آسانی اور تعیش لامحالہ اخلاقی طور پر انسان کی روح
کو کمزور کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم میں دوسروں سے مرعوب ہونے اور ان کی خوشامدیں کرنے کی
عادتیں پڑ جاتی ہیں ہم زندگی کی تکالیف برداشت کرنے کے خیال سے کانپنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں
کہ [illegible] اسی قسم کی دیگر ترکیبوں سے ہم زندگی آسانی سے بسر کرتے رہیں۔
یہ خامی صرف اسی وقت دور ہو سکتا ہے اور ہماری قوم میں اولوالعزم نڈر بے باک اور عملی

آدمیوں کی اسی وقت فراوانی ہو سکتی ہے جب ہم اپنے نوجوان طالب علموں کو ادبیات کی بجائے ایسے علوم کی طرف متوجہ کریں جن سے [illegible] محنت کوشی کی عادت پڑے ان کے دماغ زیادہ مفید اور عملی نتائج سوچنے پر مجبور ہوں اور اس کے ساتھ ہی زندگی اور اس کے حقائق سے ان کی وابستگی اور دلچسپی بڑھے وہ اپنے کو ایک مفید ہستی ثابت کر سکیں اپنی سوسائٹی اور قوم کے لئے ایک بے مصرف اور ناکارہ فرد نہ ثابت ہوں محض خیالی قیاس آرائیوں میں مبتلا ہو کر محض ادبی تمغہ پاکر اپنی خود غرض زندگی بسر کرتے ہوں اگر ایسے محنت کوش اور باعمل نوجوان ہماری یونیورسٹیاں اور کالج پیدا کرنے لگیں۔ تو مجھے قطعی امید ہے کہ بے عملی کاہلی اور نکمے پن کا وہ مرض جو [illegible] افراد اور قوم کو تباہ کئے ڈال رہا ہے اور ہماری قومی زندگی کی عزت اور نیک نامی کو رسوا کر رہا ہے بہت جلد دور ہو جائے گا اور ہم اس مزمن تپ کو جو ہمیں بستر پر ڈالے ہوئے ہے دور کر کے بھلے چنگے ہو سکیں [illegible]

ایسے مضامین مثلاً سائنس کامرس، طب یا ڈاکٹری، انجینئرنگ، سیاسیات معاشیات، ریاضی وغیرہ ہیں یہ ایسے علوم ہیں جو دماغ کو مجبور کرتے ہیں کہ زندگی سے اپنا رشتہ قائم رکھیں جو کچھ بھی کریں یا [illegible] وہ محض ہوائی اور بادر ہوا نہ ہو۔ ادبیات کے مضامین صرف وہی طلبا لے سکیں جن میں اس کی غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی فطری مناسبت ہو۔ ہر کس و ناکس کو محض ڈگری کی خاطر ادبیات کے مضامین [illegible] نہ دینا چاہئیں کیونکہ اس طرح سے ہماری قوم میں کاہلوں کی تعداد بڑھتی ہے کاہل والدین کاہل اور بے عمل بچے پیدا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آج ہندوستان کے [illegible] باعمل مسلمانوں کی کتنی کمی ہے۔ دوسری قومیں محنت کرتی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔ دیکھئے کب تک ہماری آنکھیں بند رہتی ہیں!

(م حسین [illegible])

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار
ترجمان سرحد
باقاعدگی سے ... اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور
سے زیر ادارت ملک امیر عالم خان (اعوان، ہزاروی رجامی) شائع ہوتا ہے
وطن کا عوامی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔
صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔
سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی
مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا ہمیشہ ارگن رہا ہے
سرحدی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد
کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور سے آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد، علاقہ
آزاد، افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں
کے لئے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے
رعایتی چندہ سالانہ
ششماہی
المشتہر
مینجر ترجمان سرحد پشاور

دیہاتی دنیا

یہ رسالہ محکمہ اصلاح دیہات و پنچایت ہائے ریاست جموں و کشمیر کی سرپرستی میں پابندی
وقت کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ زمیندار کی اخلاقی، مجلسی، زرعی، حیاتی
اقتصادی غرض کہ اس کے ہر شعبہ زندگی کی اصلاح کی تدبیر کے ساتھ ساتھ اسے علم کی فضیلت
سے روشناس کرانا اس کا خاص

نصب العین

ہے

ضخامت ۴۸ صفحات، سائز ۲۰×۳۰/۸ کتابت عمدہ، کاغذ بڑھیا اور سرورق
خوبصورت و دلفریب سہ رنگی تصویر سے مزین ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر ماہ کم از کم آٹھ
زندگی کے متعلق آٹھ فوٹو بلاکس کی تصویریں دی جاتی ہیں اور بلند پایہ مضامین
رسالہ کی جان ہوتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں یہ شرف صرف رسالہ
دیہاتی دنیا ہی کو حاصل ہے کہ والی ملک کے محل سے لے کر غریب
زمیندار کی جھونپڑی تک اسے رسائی حاصل ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا سالانہ

چندہ صرف تین روپیہ (۳) ہے

ملنے کا پتہ

رسالہ دیہاتی دنیا جموں سرینگر کشمیر

بچوں کی کتابیں

[illegible] بہت کم خیال کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں ایسی کتابیں بھی بہت کم ہیں جنھیں بچے دلچسپی اور شوق سے پڑھیں، تاہم انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے چند کتب [illegible] سے چھاپی ہیں جن کو بچوں کی دلچسپی کا سامان کہا جا سکتا ہے۔

الف بے کا کھلونا۔ یہ پیاری کتاب ننھے منے بھائی کے لیے ہے کھیل ہی کھیل میں وہ [illegible] جاتے ہیں۔ ہر حرف کے لئے ایک رنگین تصویر اور ایک [illegible] [illegible] رکھا گیا ہے چھپائی رنگین اور بہت صاف ۲۴ عکسی تصویریں۔ اگر آپ کے یہاں کئی بچے ہوں تو متعدد [illegible] خرید [illegible] نہیں تو بچے آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ قیمت صرف تین آنے

انوکھی کہانیاں۔ یہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے گیارہ نصیحت آموز کہانیاں اس میں درج ہیں زبان [illegible] صاف رنگین نہیں کہ کوئی بچہ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دے ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہے خوبصورت کتاب ہے، بچے اس کو دیکھتے ہی مچل جاتے ہیں۔ سرورق پر تین رنگ کی تصویر ہے۔ قیمت ۱۴ آنہ

[illegible] ات کی کہانی۔ یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی، کی قابل قدر تصنیف ہے [illegible] میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی تصنیف ہے اور مفید معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر [illegible] میں آئے۔ کاغذ، کتابت، طباعت اور سرورق بے انتہا نفیس ہے۔ اس [illegible] سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔ تشریح مطالب کے لئے جا بجا بیشمار تصاویر دی گئی ہیں۔ علاوہ محصول [illegible]

[illegible] کی کہانیاں۔ ایسپ ایک مشہور حکیم گزرا ہے جو مورخین کے بیان کے مطابق حضرت مسیح [illegible] قبل پیدا ہوا تھا حکیم ایسپ انسان کی پند و نصیحت کے لئے مختلف قسم کی فرضی حکایات [illegible] کیا کرتا تھا۔ انھیں کہانیوں کی وجہ سے دنیا میں اس کا نام اب تک زندہ ہے۔ اس مجموعہ میں ایسپ کی تین سو کہانیاں یکجا شائع کی گئی ہیں چھیاسٹھ تصویریں بھی شامل کتاب ہیں

جن کے باعث یہ مفید کتاب اور زیادہ دلچسپ ہو گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت [illegible]

میرے وطن کی کہانی:۔ تاریخ ہند کے کئی خاص اور روشن ابواب طلبا، کو اسکولوں میں نہیں پڑھائے جاتے، حالانکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان کا مطالعہ [illegible] اس کتاب میں بعض اس قسم کے واقعات نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے تفریحی مطالعہ کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ [illegible] ہاف ٹون کی عکسی تصویریں قیمت ۱ار

شیخ چلی کی کہانیاں:۔ شیخ چلی کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا یہ وہ جاوید ہستی ہے جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس کتاب میں آپ ہی کے کارنامے درج ہیں جو گیارہ کہانیوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ ہر کہانی اس قدر پر لطف ہے کہ انسان بھوک پیاس بھول جاتا ہے [illegible] ہنستے اور ہنستے جائیے۔ لکھائی چھپائی ایسی عمدہ ہے کہ بچوں کو بطور انعام دی جا سکتی ہے۔ [illegible] صفحات کی کتاب کی قیمت صرف دس آنے (۱۰)

داستان عجم:۔ بچے بادشاہوں کے قصے بہت شوق سے پڑھتے ہیں لیکن چھوٹے بے اصل قصے [illegible] کہ انھیں بادشاہوں کے تاریخی قصے پڑھنے کو دئے جائیں اس مقصد کے لئے داستان عجم بہت اچھی کتاب ہے۔ حالات فردوسی کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں انھیں کو اس کتاب میں بچوں کیلئے بہت سلیس اور عام فہم عبارت میں لکھا گیا ہے۔ ضرور منگائیے۔ قیمت حصہ اول دس آنے۔ قیمت حصہ دوم [illegible]

رابنسن کروسو:۔ ایک نوعمر لڑکا گھر سے فرار ہو کر بحری سفر اختیار کرتا اور طرح طرح کی [illegible] اٹھاتا ایک غیر آباد جزیرہ میں پہنچتا ہے اور پچیس برس تک مجبوراً وہیں رہتا ہے آتنی مدت اس نے کیونکر بسر کی؟ اور پھر یہاں سے کیسے نکلا؟ وغیرہ واقعات نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کو نوعمر بچے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں ہاف ٹون بلاک کی چھ تصویریں شامل کتاب ہیں جن میں ایک سہ رنگی ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحات سے زیادہ اور قیمت صرف بارہ آنے (۱۲)

ملنے کا پتہ: **منیجر کڈلو انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد**

ندوۃ المصنفین دہلی کی دو اہم کتابیں

اسلام میں غلامی کی حقیقت:- غلامی کی حقیقت اور اس کے متعلق تمام ضروری مسائل کی تفصیل پر پہلی محققانہ کتاب ہے جہاں تک اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کا تعلق ہے ابتک کسی زبان میں [illegible] کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی [illegible] یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے میں جس [illegible] سے کام لیا ہے اس میں غلامی کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے جدید [illegible] میں اسلامی تبلیغ کے لئے بڑی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے بلکہ مذہبی تعصب و غلبہ کے سبب [illegible] ترقی یافتہ طبقہ بھی اس سے اثر پذیر ہے غلامی جیسے اہم مسئلہ پر اگر آپ تحریری اور [illegible] دلچسپ و مفید اور موثر بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے طباعت [illegible] اعلیٰ کہ لیتھو پریس اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام:- اس کتاب میں اسلام کے پیش کئے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں [illegible] کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح نظام قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔

اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی دنیا کے سامنے سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام عمل ہے جسے اختیار کر کے ایک انسان [illegible] انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ اگر آپ اسلام کی اقتصادی دستور [illegible] چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے [illegible] صفحات قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible] کتابت طباعت اعلیٰ اور ولایتی کاغذ۔

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی

مسلمانوں کا روشن مستقبل
سید طفیل احمد صاحب (علیگ) سابق ممبر کونسل
ہندوستان میں مسلمانوں کے تین سو سال کے مذہبی، تعلیمی و سیاسی حالات، دس بنیادی حقوق
معیار قرار دے کر مسلمانوں کی سلطنت کے آخری زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور اسکے بعد کے زمانہ میں ان
حالات کی جانچ کی گئی ہے۔ یہ دس بنیادی حقوق کیا ہیں؟ دیگر مہذب ممالک اور کانگریس نے جو بنیادی حقوق قرار دیئے
ان سب کو مدنظر رکھ کر مصنف نے حسب ذیل دس حقوق قائم کئے ہیں اور اس پر بحث کر کے یہ دکھلایا ہے کہ جدید زمانہ
کی روشنی میں ہندوستان کو یہ حقوق کس حد تک مل چکے ہیں۔
جان و مال کی حفاظت۔ عدل و انصاف۔ مذہبی حفاظت۔
اور زبان کی حفاظت۔ تعلیم۔ ملازمت۔ شہری حقوق و مساوات۔ حقوق ملکیت۔ سیاسیات
بنیادی حقوق کا یہ محاسبہ کتاب کی جان ہے اس کتاب میں دس باب ہیں آخری باب میں مسلمانوں کے ماضی و حال
پر نظر ڈال کر دکھایا ہے کہ وہ سیاسی جدوجہد اور ملکی آزادی کی تحریک میں دیگر اقوام سے پیچھے رہے اور ان امور کی تفصیل دی گئی ہے
جن کے باعث بلاشبہ طور پر مسلمانوں کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ کتاب کا حجم ۲۶۵ صفحات
چکنا قیمت مجلد علاوہ محصول ڈاک
نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں (یوپی)
ستمبر ۱۹۴ء کا مشہور
نہیں دیکھا تو ضرور دیکھئے۔ یہ اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں سے اسقدر آراستہ ہے کہ دیکھنے والے کی نظر محو کرہ
جاتی ہے اور وہ ہمہ تن حیرت بن کر کہہ اٹھتا ہے۔ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است ظاہری خوبی میں بہت
نفیس سرورق ٹائٹل ہاف ٹون بلاک کی تین تصویریں۔ کاغذ گلیز، لکھائی چھپائی دیدہ زیب باطنی خوبی میں اچھوتے اور
دلکش مضامین ملک کے اشعار غیر ملکی ادب کے بہترین تراجم جو بڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں
کہ ہندوستان کا ایسا پاکیزہ گلدستہ اس قیمت میں آپ کو نہیں ملے گا چندہ سالانہ نمونہ کا پرچہ
نوٹ:۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۴ء تک نمونہ مفت مل سکے گا
ملنے کا پتہ
منیجر ماہنامہ مشہور ممتاز منزل فراشخانہ دہلی

سلسلہ اشاعت

بسرپرستی جمعیت مسلم نوجوانان سکندرآباد

جمعیت مسلم نوجوانان کی سرپرستی میں اسلامی تہواروں کی مناسبت کے لحاظ سے مخصوص موضوع پر رسائل شائع کئے جارہے ہیں جس میں ہندوستان کے مشہور مقتدر علماء کے بصیرت افروز مضامین عوام کے بیداری پیدا کرنے والے پیامات درج ہوتے ہیں اس سلسلہ کے رسالے حاصل کر سکتے ہیں۔

اسلام اور قربانی

جس میں فلسفہ قربانی پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ دکن کا بصیرت افروز مضمون ... صاحب کا پیام نوجوانان ہند کے نام شامل ہے۔

محرم کی تجلیاں

جس میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی شیخ الحدیث جامعہ عثمانیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عدیم المثال قربانی پر نہایت مدلل و بصیرت حاصل بحث کی ہے۔

آنحضرت صلعم اور جوانی

جس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے آنحضرت کی سیاست جوانی پر بصیرت حاصل بحث کی ہے۔

مجدد اعظم

جس میں شاعر حیات ماہر القادری نے حضور عوث پاک کی حیات طیبہ اور تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔

نوٹ:۔ فی اشاعت دو آنے کے ٹکٹ ارسال فرما کر طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر سلسلہ اشاعت نمبر (۶۶۳) کباڑی گوڑہ سکندرآباد

میل ملاپ

اپنے مسلک اور مقاصد کا واحد بار رسالہ ہے اس کا مقصد ہندو اور مسلمان بھائیوں میں محبت پیدا کرانا ہے۔ ملک کو اس سے بہت کچھ فائدہ پہنچ رہا ہے جھگڑنے والوں میں صلح وامن کی کوشش اور ملک کی فضا کو گندگی سے پاک رکھنا اس کا ذریعہ ہے۔

وطن پرست احباب اسکے خریدار بنکر ملک اور قوم کی خدمت انجام دیں اپنی قلمی اعانت سے فراموش نہ کریں ملک میں اتحاد پیدا کرانے کی بہترین تجاویز قوم کے سامنے اس رسالہ کے ذریعہ سے پیش کریں۔

یہ رسالہ نصف اردو اور نصف ہندی میں ایک ساتھ شائع ہوتا ہے۔ مزید برآں کیلئے فلسفہ روح اور حیات بعد موت وغیرہ پر نہایت صحیح اور سائنٹفک اصول سے بہترین مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں جن حضرات کو روحوں سے بات چیت کرنے کا یا روحوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا شوق ہے وہ ضرور اس رسالہ کا مطالعہ کریں۔ اس میں فضول باتوں سے یا مبالغہ سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔

چندہ سالانہ دو روپے (عہ)

نمونہ کا پرچہ مفت منگا کر ملاحظہ کریں

ملنے کا پتہ

مینیجر میل ملاپ۔ بانکی پور۔ پٹنہ

طاقت اور جوانی قائم رکھنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا
OKASA
اوکاسا کی گولیاں
معدہ میں پہنچ کر فوراً حل ہوجاتی ہے اور ان
کے اجزا خون میں مل کر جسم کے تمام حصوں میں
اپنا اثر کرتے ہیں
اوکاسا دل اور دماغ گردوں، معدہ، اور ہاضمہ میں سے ہر ایک پر پورا اثر رکھتا ہے
اوکاسا کا اصلی اثر غدود نمبر، پر ہوتا ہے۔ اس سے تمام جسمانی طاقت اور قوت مردانگی از سر نو
پیدا ہونے لگتی ہیں۔ عورتوں پر بھی اثر ہوتا ہے۔ جس سے ان کا بانجھ پن اور عام کمزوری اور حیض کا نہ آنا اور
اس قسم کی تمام شکائتیں دور ہوجاتی ہیں۔
اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے۔
اوکاسا ایسے اجزا سے بنی ہوئی ہے جو آپ کے جسم میں موجود ہیں اسلئے آپ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔
مردانہ طاقت بحال رکھنے کے لئے آج ہی سے اوکاسا شروع کیجئے
خریدتے وقت مردوں کے لئے اوکاسا (سلور) اور عورتوں کے لئے اوکاسا (گولڈ) طلب کیجئے
قیمت چھوٹا بکس ( ) بڑا بکس ( ) اوکاسا ہر دوا فروش کے یہاں ملتا ہے۔
مشن، دہلی یا براہ راست اوکاسا کمپنی برلن لمیٹڈ پوسٹ بکس

جامعہ

زیر ادارت - نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۲۳ نمبر ۱۰	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء	چندہ سالانہ صرف فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن۔ محبوب المطابع دہلی

اُردو تراجم

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں

(یہ مضمون ایک طویل مقالے "اُردو تراجم" کا دوسرا حصّہ ہے۔ مقالہ سال گزشتہ آل انڈیا اُردو کانفرنس (انجمن ترقی اُردو ہند دہلی) میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا پہلا حصہ "پہلے دور کے اُردو ترجمے" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس حصّے میں دوسرے دور کے تراجم سے بحث کی گئی ہے اور چند سطروں میں پہلے حصّے کے حاصل سے اسے مربوط کیا گیا ہے)

اگر ہم اِن کتابوں کو جو اُردو میں دوسری زبانوں سے براہ راست یا بالواسطہ ترجمہ کی گئیں دیکھیں تو ترجمے کی ارتقا کے تین خاص دور قائم کر سکتے ہیں۔ ابتدائی یعنی پہلے دور میں ترجموں کی تحریک زبان کی بے مائگی سے پیدا ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ زبان کا رنگ روپ پوری طرح ٹھہرنے نہیں پایا تھا۔ خاص خاص خیالات کو ادا کرنے کے لئے جن الفاظ، تراکیب، اصطلاحات اور اسالیب کی ضرورت تھی وہ اس وقت تک بہم نہیں پہنچے تھے۔

الفاظ کو دیکھئے تو سرمایہ محدود، زبان پر نظر کیجئے تو گنجلک، اسلوب تلاش کیجئے تو کوئی سلیقہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ بات یہ تھی کہ دربار میں اس وقت تک مسلمانوں کے زیر سایہ فارسی حکومت کر رہی تھی اور اُردو کو تو خیر بازاری ہی سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی علمی زبان تو فارسی تھی ہی، ہندوستان میں بسنے والی دوسری قومیں بھی اپنی عادت کے مطابق کہ "الناس علی دین ملوکہم" فارسی کو شاہی زبان سمجھ کر برضا و رغبت اختیار کر رہی تھیں، البتہ ہمارے مبلغ اور صوفیائے کرام تعلیم و تلقین کے لئے اور بعض شاعر محض تفنن طبع کے لئے نئی زبان پر دستِ شفقت رکھ رہے تھے، ان سب نے مل کر غیر ارادی طور پر اُردو کی ایسی خدمت کی کہ یہ بھی ایک نئی زبان بن بیٹھی بلکہ جلد ہی

فارسی کے مقابلہ میں اپنی حکومت کا دعویٰ کرنے لگی، لیکن یہ لوگ بھی فارسی کی گرم بازاری سے متاثر تھے چنانچہ جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی یہیں سے مستعار لے لی اور اس خوبی سے لے اپنایا کہ مغائرت اور اجنبیت کی بو تک باقی نہ رکھی، الفاظ، محاورات اور اُن کے ترجمے تراکیب [illegible]ن کے ترجمے، اصطلاحات اور اُن کے ترجمے، بلکہ خالص ایسے خیالات جن کا تعلق ایرانی تمدن و معاشرت اور تاریخ ایرانی سے تھا اپنی زبان کی ترکیب میں داخل کر لئے، تالیف و تصنیف میں بھی فارسی سے ہی مدد لینا پڑی، مذہب پر کوئی رسالہ یا کتاب درکار ہوئی تو فارسی کی کسی مشہور اور مستند کتاب یا رسالے کا ترجمہ کر دیا، یا اُس کا خلاصہ کر کے پیش کیا، کسی تفریحی کتاب کو چاہا تو فارسی کی مروجہ داستانوں اور مثنویوں میں سے کوئی ترجمہ کر لیا، بہت بڑھے تو یہ کیا کہ اپنی طرف سے کہیں ضروری اور دلچسپ اور کہیں غیر ضروری اور بے لطف اضافہ کر دیا، ظاہر ہے کہ ان ترجموں میں اسلوب بیان کچھ نہ کچھ اصل فارسی سے ضرور متاثر ہوا ہوگا، ایسے ترجموں کے مطالعہ سے اس خیال کو یوں اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ بعض الفاظ کا بجنسہٖ ترجمہ موجود ہے۔

یہ دور در اصل دکھنی زبان میں تراجم تک محدود رہا اگرچہ اس کے آخر میں شمالی ہند میں بھی بعض کتابیں اسی ڈھنگ پر لکھی گئیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے برخلاف دکھنی ادب کا سرمایہ بیشتر انہی تراجم پر مشتمل ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض مصنفین اور شعراء نے اپنی فطری صلاحیت اور اُپج کو بروئے کار لا کر نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل سے بڑھا دیا ہے لیکن ایسی مثالیں نادر ہیں، عام طور پر اسالیب، محاورات اور تراکیب میں فارسی کی خوشہ چینی صاف جھلکتی ہے۔

فارسی کے علاوہ بعض چیزیں عربی سے بھی ترجمہ کی گئیں، ان کی تعداد فارسی کے بعد دوسرے درجہ پر ہے اور بالعموم مذہبی مباحث، پند و نصائح، تصوف و اخلاق کے مسائل سے متعلق ہیں، ایک قلیل تعداد کتابوں کی ہندوستان کی دوسری زبانوں بالخصوص

علمی سنسکرت سے ترجمہ ہوئی۔ یہ کتابیں قصوں اور کہانیوں کی ہیں اور ان میں بھی بعض براہ راست
سنسکرت سے اور بعض فارسی کے واسطہ سے ترجمہ ہوئیں ان میں چونکہ بعض قصے بہت دلچسپ
[illegible] ترجمے موجود ہیں لیکن اس قبیل کی کتابوں کی تعداد اس قدر کم ہے
کہ زبان و اسالیب پر اس کا اثر معلوم نہیں ہوتا
ترجمہ کا یہ پہلا دور اس وقت تک قائم رہا جب تک ہندوستان میں فارسی زبان
کی حکومت رہی، مغلوں کے آخر دور میں حکومت اور اقبال کے ساتھ ساتھ ان کی شاہی
زبان کو بھی گھن لگ گیا۔ انگریزوں کے آتے ہی سیاست کی بساط الٹ گئی اور قدرتی
طور پر فارسی کی شمع بھی گل ہو گئی اور اس کی جگہ انگریزی زبان کا دور دورہ شروع ہوا، پہلے
تو ہندوستانی انگریز، انگریزی زبان اور معاشرت سے بھڑکتے رہے لیکن جن کی حکومت میں رہنا
تھا ان کے احکام سے کیسے سرتابی کی جاتی، ایک طرف تو انگریز خود کوشاں تھے کہ جلد سے جلد
دفتروں میں فارسی کی جگہ انگریزی دخل پائے دوسرے خود ہندوستانی اپنا مستقبل دیکھ رہے
تھے، جانتے تھے کہ ہماری شمع بجھ چکی اب روشنی کا کوئی دوسرا ہی سامان کرنا پڑے گا، چنانچہ
بعض نے سوچ سمجھ کر اور بعض نے محض تقلید کی خاطر انگریزی کو قبول کر لیا اور جو اثر پہلے دور
میں فارسی کا تھا وہ دوسرے دور میں انگریزی سے ظہور میں آیا
- اس دور میں پہلی مرتبہ چند ادارے خاص ترجموں کے مقصد سے قائم کیے گئے، کلکتہ میں
فورٹ ولیم کالج، لاہور میں سرکاری بک ڈپو، دہلی میں دلی سوسائٹی اور علی گڑھ میں سائنٹفک
سوسائٹی نے اس کام کو بڑی مستعدی اور محنت سے مکمل کیا، ان ہی کی بابرکت کوششوں نے
ہماری زبان کو علوم و فنون کے خزانے بخشے، انھوں نے زبان کو وسعت، خیالات کو سنجیدگی
اور اسالیب کو پختگی بخشی، آج امرت کے جو چشمے بھی اس زبان کو سیراب کر رہے ہیں ان کے
سوتے میں ملتے ہیں۔
سائنٹفک سوسائٹی کا عہد در اصل ترجموں کے عصر قدیم اور دور حاضر میں ایک اجمالی

وقفہ ہے اس کے بعد ترجموں کا تیسرا دور یعنی عہد جدید شروع ہوگیا، اس دور میں انفرادی کوششوں کے علاوہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اردو اکادمی جامعہ ملیہ دہلی اور پنجاب کی بعض نشرگاہیں ترجمہ کرنے اور کرانے کی خدمت پر مستعد ہیں، سائنٹفک، علمی، تعلیمی، فلسفی، تاریخی، ادبی، سیاسی مباحث پر متعدد کتابیں ترجمہ ہوچکیں یا ہو رہی ہیں اور اب ان کی رفتار میں روز بروز سرعت پیدا ہو رہی ہے۔
دور اوّل یعنی دکھنی دور کے اہم تراجم کی فہرست اور اس دور کی خصوصیات پر ہم اور تبصرہ کرچکے ہیں۔ اب دوسرے دور کے ترجموں کا حال سنئے۔

دور اوّل دکھنی مصنفین اور مترجمین کا دور تھا، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اس دور میں شمالی ہند میں اردو کا وجود نہیں تھا، یا اسے قبول عام حاصل نہیں ہوا تھا، یہ امر بالکل قدرتی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کا وہ لسانی مفاہمہ جو بعد میں اردو کی صورت میں ظاہر ہوا ان علاقوں سے شروع ہوا ہوگا جہاں مسلمانوں کا قیام پہلے ہوا، یوں تو دکن میں عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں لیکن یہ ایسے نہ تھے کہ مستقل زبان کی بنیاد ڈال سکیں، یہ کام سندھ، پنجاب، اور برج کے علاقے سے شروع ہوا، یہاں اردو کی ابتدائی نشو و نما سے بحث کرنے کا موقع نہیں صرف یہ ظاہر کرنا کافی ہے کہ اگرچہ شمالی ہند میں اردو وجود میں آچکی تھی اور تالیف و تصنیف کا کام شروع ہوچکا تھا لیکن دکھنی مصنفین نے اس طرف زیادہ توجہ کی، ان علاقوں میں تو عدالتی اور دفتری زبان دکھنی تھی اور سلاطین خود اس زبان کی حمایت کرتے تھے اور اسی میں شعر و شاعری اور تالیف و تصنیف کرتے تھے اور دکھنی گو شعراء و مصنفین کی قدر افزائی کرتے تھے۔

شمالی ہند میں عرصۂ دراز تک فارسی کو جو شرف حاصل رہا اس کی بناء پر جب کبھی اظہار قابلیت مقصود ہوتا، یا سلاطین و امراء تک رسائی پیدا کرنا ہوتی تو فارسی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جاتا، مغلوں کی اس فارسی نوازی نے اردو کی ترقی کی راہیں شمالی ہند میں مسدود

کر دیں اور انگریزوں کے دورِ اقتدار تک اس ملکی زبان کو یہاں نظر انداز کیا گیا۔ یہاں اُردو کی ترقی فارسی کے زوال کے ساتھ وابستہ تھی، اس دور کے بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ چونکہ بیشتر مرد اور زیادہ تر مستورات فارسی زبان پر قادر نہیں اس لئے ان کے سمجھانے کی خاطر زبانِ ہندی کو اختیار کیا، گویا اب تک اُردو لکھنے والا اس خفیف الحرکاتی کی معذرت پیش کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ہی اُردو کی نشو و نما کے لئے منظم کوششیں شروع ہوئیں۔ پہلا قدم فورٹ ولیم کالج کا قیام تھا، انگریزوں کو تجارت کرتے کرتے ہندوستان میں آزاد اور اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا انجارتی کوٹھیاں رفتہ رفتہ مضبوط اور محفوظ قلعے بن گئیں، اور ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے نمایندے ملکی سیاست میں عملی حصہ لینے لگے، اس سلسلہ میں انگریزوں کو اپنے کاروبار اور مصالح ملکی کی بنا پر اُردو زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی اور ان کے صدر مقام یعنی کلکتہ میں اس مقصد کے حصول کے لئے فورٹ ولیم کالج کے نام سے ایک ادارہ کھلا، اس کالج کے منتظمین میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت معروف ہوئے انھوں نے نہ صرف اپنی بے بہا تصانیف سے اس زبان کے تہی دامن کو بھر دیا بلکہ ہندوستانی شعرا، ادبا، مصنفین، مولفین اور مترجمین کی ایک ایسی مجلس قائم کی جہاں سے جدید ادب کا نشاۃ الثانیہ طلوع ہوا، یہاں کے کام کرنے والوں میں خود گلکرائسٹ کے علاوہ میر امّن دہلوی، میر محمد حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، مرزا کاظم علی جوان، مولوی حفیظ الدین احمد دہلوی، نہال چند لاہوری، مولوی امانت اللہ، مولوی معین الدین فیض، للولال کوی، مظہر علی ولا، مرزا فطرت، جوزف ٹیلر، مولوی اکرام علی، کپتان بینی نرائن، مرزا جان طپش، کپتان طامس روبک، محمد خلیل اللہ اشک، مولوی امانت اللہ فضل، جان شیکسپیر، مولوی محمد اسلم، اور ہنری مارٹن بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے تصنیف سے زیادہ ترجموں پر زور دیا اور اسی

وجہ سے فورٹ ولیم کالج کے سرمایہ میں دوسری زبانوں سے ترجمے زیادہ ہیں۔ ذیل کے ترجمے خصوصیت کے ساتھ بہت اہم ہیں :-

ترجمہ	مترجم	سنہ ترجمہ	اشارہ
باغ و بہار	میر امّن دہلوی	سنہ ۱۸۰۱ء	چہار درویش کا ترجمہ
طوطا کہانی	حیدر بخش حیدری	سنہ ۱۸۰۲ء	اصل قصہ سنسکرت میں ہے ضیاء الدین نخشبی بدایونی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اردو ترجمے اسی فارسی کے ہیں۔
نثر بے نظیر	بہادر علی حسینی	سنہ ۱۸۰۳ء	سحر البیان کا ترجمہ
شکنتلا ناٹک	کاظم علی جوان	سنہ ۱۸۰۳ء	
ترجمہ اخلاق جلالی	مولوی امانت اللہ	سنہ ۱۸۰۳ء	
پندنامہ	مولوی معین الدین فیض	سنہ ۱۸۰۳ء	پندنامہ عطار کا ترجمہ
ترجمہ شیر شاہی	مظہر علی ولا	سنہ ۱۸۰۵ء	
ترجمہ انجیل	مرزا فطرت	سنہ ۱۸۰۵ء	
تاریخ فرشتہ	کاظم علی جوان	سنہ ۱۸۰۸ء	
ترجمہ چہار گلشن	کپتان بینی نرائن	سنہ ۱۸۱۱ء	
ترجمہ بہار دانش	مرزا جان طپش	سنہ ۱۸۱۱ء	
واقعات اکبر	خلیل اللہ اشک	سنہ ۱۸۱۹ء	ترجمہ اکبر نامہ
ترجمہ قرآن پاک	مولوی امانت اللہ فیض	سنہ ۱۸۰۳ء	
ترجمہ بوستاں	مولوی امانت اللہ		
اردو محاورات	مرزا جان طپش		فارسی محاورات کا ترجمہ
ترجمہ ہفت پیکر	حیدر بخش حیدری		

[illegible]	اسم مترجم	سنہ ترجمہ	اشارہ
ترجمہ سادھو مل	مظہر علی ولا		
[illegible] جدید	ہنری مارٹن و مرزا فطرت	سنہ ۱۸۱۴ء	
[illegible]	سید بخش حیدری	سنہ ۱۸۱۲ء	ترجمہ دہ مجلس

[illegible]ٹ ولیم کالج تو ایک مستقل ادارہ تھا جہاں تالیف و تصنیف کا کام جاری تھا اس کے [illegible]وہ انفرادی طور پر بھی بعض لوگ اس کام میں معروف تھے اور تصنیف سے زیادہ ترجمے ہی کئے جاتے تھے چنانچہ اسی دور میں ذیل کے تراجم بھی شامل ہیں۔

طوطی نامہ	قادر بخش	سنہ ۱۷۲۹ء	نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ
صرف و نحو ہندوستانی	ڈاکٹر شوا کیٹلر	سنہ ۱۷۱۵ء	اس میں دعائے حضرت عیسی کا ترجمہ کیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اس عہد میں کس طرح ترجمہ کرتے تھے۔
روضۃ الشہدا	فضلی اورنگ آبادی	سنہ ۱۷۳۲ء	
ترجمہ قرآن پاک	مولوی رفیع الدین	سنہ ۱۷۸۸ء	
ترجمہ قرآن پاک	مولوی عبدالقادر	سنہ ۱۷۹۰ء	
تفسیر حقانی	سید شاہ حقانی	سنہ ۱۷۹۱ء	
مجمع القوانین	عمال سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی	سنہ ۱۷۹۳ء	
مجموعہ علم التشریح	پی برٹن	سنہ ۱۸۱۷ء	مترجمہ اہلکاران سررشتہ نیٹو میڈیکل انسٹیٹیوشن
اتالیق الصبیان	سید صالح محمد دہلوی	سنہ ۱۸۳۵ء	
قصہ گل باصنوبر	نیم چند کھتری	سنہ ۱۸۳۶ء	
ترجمہ فقہ اکبر	سعد اللہ رامپوری	سنہ ۱۸۴۰ء	
عجائب القصص	سید باقر حسین	سنہ ۱۸۴۰ء	
ترجمہ شیر خانی	سرور	سنہ ۱۸۴۷ء	

اب تک ہم ترجموں کے جس دور سے گزر رہے تھے اس میں "زبان اُردوئے معلیٰ" نے علمی حیثیت اختیار نہیں کی تھی، اس وقت تک درسیات کا سلسلۂ قدیم قائم تھا اور طالب علم مکتب سے شروع کر کے کسی کامل فن کی صحبت میں منشی کا درجہ حاصل کر لیتا تھا لیکن رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی اہمیت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ انگریزی کی تکمیل ہی تحصیل علم قرار پائی، ایک مقصد تو اس کا یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے نئے آقاؤں کی زبان سے آشنا ہو کر خذ ما صفا ودع ما کدر کے مصداق جو کچھ ان سے حاصل ہو سکے حاصل کریں دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ یورپ کے علوم جدیدہ کو اگر حاصل کیا جا سکتا تھا تو صرف اس زبان کے واسطے سے۔

اس سلسلہ میں سب سے گراں قدر خدمت مرحوم دلی کالج نے انجام دی جس کا قیام ۱۷۹۲ء میں عمل میں آیا اور جو ۱۸۲۵ء میں کالج کے مرتبہ کو پہنچ گیا، اس کالج نے جس قدر علمی خدمات انجام دیں ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن تراجم کے سلسلہ میں دلی سوسائٹی کا نام بہت روشن نظر آتا ہے۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ علوم جدیدہ کی اشاعت ملکی زبانوں کے ذریعہ سے کی جائے، انجمن کے مقاصد میں واضح کر دیا گیا تھا کہ انگریزی، عربی فارسی اور سنسکرت سے اعلیٰ درجے کی کتابیں اردو بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کی جائیں گی، اردو میں تو بہت سے ترجمے ہوئے لیکن بنگالی اور ہندی میں کوئی ترجمہ نہیں کیا گیا، منجملہ اور وجوہات کی ایک سبب یہ بھی تھا کہ کارکنوں کے خیال میں ہندوستانی زبان یعنی اردو کمپنی کے علاقوں کی رعایا کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور ان کے خیال میں یہ زیادہ دشوار نہ تھا کہ رفتہ رفتہ ایسی زبان کو ان علاقوں کے سرکاری مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے، اسی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی زبان میں ایک مکمل "اسکول بک لائبریری" تیار ہو جائے۔

دلی کالج میں یہ کام سوسائٹی کے مستقل قیام سے پہلے بھی ہو رہا تھا کالج کے نامور پرنسپل مسٹر بتروس اپنے طور پر اسے انجام دے رہے تھے اور سوسائٹی کے قیام کے بعد بھی سارا کام کالج والے ہی کرتے تھے، اس طرح فورٹ ولیم کالج کے بعد یہ دوسری منظم ادارہ

باقاعدہ کوشش تھی ان ترجموں کی ادبی حیثیت اگرچہ بہت زیادہ بلند نہیں لیکن بقول مولوی عبدالحق صاحب "اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی کوشش تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے ساتھ عمل میں آئی" ذیل کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے اس دعوے کی حقیقت واضح ہو جائے گی

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
تزک تیموری			فارسی سے
تاریخ ابوالفدا			عربی سے
تذکرہ شعرائے عرب			〃
تذکرہ گارسن تاسی	متین صاحب		فرانسیسی سے
ترجمہ گلستاں			یہ ترجمہ اردو اخبار پریس دہلی کے زیر اہتمام ہوا تھا
نیت پرکاش	بلدیو داس	سنہ ۱۸۴۲ء	پند نامہ سعدی کا ترجمہ
سنڈفورڈ اور مرٹن کا قصہ	راجہ شیو پرشاد	سنہ ۱۸۵۵ء	
رسالہ پیری			ایک لاطینی کتاب مصنفہ سیرو کا ترجمہ
اصول علم طبیعی	سرنرائن و شیو نرائن		آرنٹ کی کتاب کا ترجمہ
خلاصۃ الصنائع	بھولا ناتھ	سنہ ۱۸۵۴ء	انگریزی سے
رسالہ مقناطیس	سید کمال الدین	سنہ ۱۸۵۰ء	〃 〃
اصول علم طبیعی	سیوا پرشاد و اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۴۸ء	〃 〃
اصول علم اعدادیات	اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۵۰ء	〃 〃
مقاصد العلوم	سید محمد میر	سنہ ۱۸۴۱ء	

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
حدائق البلاغت			فارسی
جبر المقابلہ	مولوی کریم الدین		انگریزی سے
اقلیدس	〃		〃
جغرافیہ حصہ دوم	اجودھیا پرشاد	سنہ ۱۸۶۱ء	〃
مفتاح الارض		سنہ ۱۸۶۷ء	کرنل ہالرائڈ کے حکم سے انگریزی سے ترجمہ
حقائق الموجودات	منشی دھرجیکی لال	سنہ ۱۸۵۰ء	سنسکرت سے ترجمہ
علم جغرافیہ	میر غلام علی	سنہ ۱۸۵۱ء	انگریزی سے
جغرافیہ کا پہلا رسالہ	〃	سنہ ۱۸۵۴ء	〃
گنگا کی نہر	سدا سکھ لال	سنہ ۱۸۵۴ء	〃
مختصر دقائق النجوم	بڑے صاحب گھاسلے	سنہ ۱۸۴۰ء	〃
اصول علم ہیئت	ماسٹر رام چندر	سنہ ۱۸۴۹ء	〃
ترجمہ معاشیات مل	وزیر علی	سنہ ۱۸۴۴ء	مل کی کتاب کا ترجمہ
اصول علم انتظام مدن	دھرم نراین دہلوی	سنہ ۱۸۴۶ء	انگریزی سے
سیلف نالج			Self Knowledge 〃
حکایات گے			Tales from Gay
ترجمہ قرآن شریف			
ترجمہ الف لیلے			
ترجمہ اخلاق جلالی			
ترجمہ اخلاق محسنی			
ترجمہ شاہنامہ			

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
ترجمہ ابن خلکان			
ترجمہ قصیدہ بردہ			
ترجمہ شکنتلا ناٹک			
ترجمہ تاریخ شیر شاہ			
مثلث مخروطات			
مسلم ہندسہ	ماسٹر رام چندر		
معاشیات			
تاریخ انگلستان			انگریزی سے ترجمہ
پنچ تنتران			
پندنامہ	فیض صاحب		
قصہ سیلاس			انگریزی سے ترجمہ
قصہ قزلباش			
قصہ رابن سن کروسو			
اکونومی آف ہیومن لائف			Economy of Human Life
ویکار آف ویکفیلڈ			The Vicar of Wakefeild
روضۃ الصفا	میر اخوند		فارسی سے
سفرنامہ بنیان			Bunyan's P Progress
تاریخ طبری	جعفر شاہ		

ترجمہ	مترجم	سنہ	اشارہ
انوارسہیلی	کریم الدین		فارسی سے
تاریخ رشیدالدین			"
علم الارض			انگریزی سے
چراغ حقیقت		۱۸۵۵ء	"
تاریخ حکما		۱۸۵۵ء	"
خیالات فنیلان			
القول الاظہر	-		ابن مسکویہ کی کتاب کا ترجمہ

اس دور کے مذکورہ بالا ترجموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر دور اوّل سے ان کا مقابلہ کیجئے تو کئی امتیازی خصوصیات معلوم ہوں گی، پہلے دور میں مذہب اور تفریحی ادب کے علاوہ کسی اور مبحث پر کوئی ترجمہ نہیں ملتا، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس وقت زبان میں اس قدر وسعت اور اسلوب میں ایسی پختگی کیسے پیدا ہو سکتی تھی جو سنجیدہ اور گراں مضامین کی متحمل ہو سکے دوسرے درسیات کا پرانا سلسلہ قائم تھا اسی وجہ سے نئے درسی نصاب کی ضرورت پیش آنے پر پرانی کتابیں تقریباً سب کی سب بیکار ہو گئیں اور نئے تراجم اور تصانیف کی حاجت ہوئی۔

اسلوب کے اعتبار سے بھی اس دور میں ایک اہم تبدیلی نظر آئے گی جہاں اب تک فارسی خیالات تراکیب اور محاورات کے ترجمے رواں تھے وہاں اب انگریزی کا اثر زیادہ نمایاں ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بعض اصطلاحات کا ترجمہ ہوا، اسلوب اور انداز بیان بدلا۔ آخر دور کی مرصع مسجع اور پرتکلف ایرانی اردو کی جگہ انگریزی کی صاف گوئی اور سادگی اپنا حسن دکھانے لگی جس کی وجہ سے خالص علمی، فنی، تاریخی مباحث کے لئے ایک زول

...دو نگارش پیدا ہو گیا۔

ان حالات نے اُردو کے مستقبل کو بہت کچھ تابناک بنا دیا یہی بنیاد تھی جس پر آگے چل کر سرسید اور اُن کے رفقاء کی کوشش سے ایک قصرِ عظیم الشان اور فلک بوس تعمیر ہونے والا تھا۔ سب سے بڑا احسان دلی سوسائٹی کا یہی ہے کہ اس کا ...اتی اثر بہت دور رس ثابت ہوا اور اسی نے اردو کو وسیع امکانات کی راہ بتائی ...وس کہ بعض سیاسی ہنگاموں نے اس خالص علمی اور ادبی اجتماع کو درہم و برہم کر دیا اور اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کو اس کا حق جانشینی ادا کرنا پڑا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے ترجمے عصرِ قدیم اور دورِ جدید کے درمیان ایک طور پر معیارِ تجالی کے نمونے ہیں اس لئے اُن کی بحث انشاء اللہ آئندہ پیش کروں گا۔

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی البدایونی

سماج اور اُستاد

تعمیرِ حیات: کہتے ہیں کہ اُستاد تعمیرِ حیات کرتا ہے۔ اینٹ پتھر کے گھروندے، لکڑی لوہے کے نمونے نہیں بلکہ اس کا کام تعمیرِ حیات ہے۔ نئی نسل کی زندگیوں کی تعمیر و تربیت ہے اینٹ پتھر کی عمارت اگر بیٹھ گئی تو ایک، دو کو لے کر بیٹھ جائے گی۔ اگر کسی نکمے اور سست کاریگر نے ہوائی جہاز میں ڈھیلا پرزہ لگا دیا تو ممکن ہے ایک بہادر ہوا باز کی جان اکارت چلی جائے لیکن اگر ایک دل برداشتہ اور افسردہ اُستاد نے منزلِ حیات میں کوئی اینٹ ٹیڑھی بیڑھی لگا دی تو ڈر ہے کہ سماج کا پورا محل کھڑکھڑاتا ہوا نیچے نہ آجائے۔ ولایت میں ہوائی جہاز کے کارخانے میں ایک ہدایت جلی حروف سے لکھی ہوئی ہے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے ایک بہادر جانباز کی جان خطرے میں پڑ جائے گی" میں چاہتا ہوں کہ ایسی ہی کوئی ہدایت ہمارے مدرسوں میں بھی لگا دی جائے "خیال رکھنا تمہاری ایک غلطی سے پوری سماج کی زندگی خطرے میں ہے"

اُستاد کی کامیابی اور ناکامی کوئی انفرادی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کی گونج وقت کے ایوانوں میں سے گذرتی جائے گی۔ اُس کی صدا فضائے بسیط کی وسعتوں کو اپنے دامن میں لے لے گی، اس کی خامیوں کا اثر اپنی ذات سے بڑھ کر اُن دائروں کی طرح بڑھتا چلا جائے گا جو ایک پتھر پھینک دینے سے پانی میں پیدا ہو جاتے ہیں بڑے اور پھر اُس سے بڑے اور اُس کے بعد سب سے بڑے۔

جب تعلیم کے عمل کی اہمیت مکان و زمان کی حدود بھی پار کر گئی تو دیکھنا یہ ہے کہ اُستاد یعنی سماج کا نمائندہ جسے اس بارِ گراں کا حامل بنایا گیا اسے اُٹھانے کے قابل ہے یا نہیں کہیں وہ قرآن کریم کا ظلوماً جہولاً تو نہیں جس نے وہ بار بھی اُٹھا لیا جو پہاڑوں سے نہ

[illegible]ایا گیا۔ ہمارے ملک میں تو اُستاد کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ غریب ہے کم استعداد ہے۔ کم معاش ہے کم منصب ہے۔ سماج کی محفل میں اس کی جگہ جوتیوں سے ذرا آگے اور [illegible] کہیں پیچھے ہے۔ جہالت اور بے علمی کے کوہ پیکر عفریت کے سامنے ہم نے ایک بالشتیے کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایک قوم کے دل و دماغ کی جراحی کے لئے ہم نے روائتی جراح کو دعوت دے دی ہے وہ جراح جس کے پاس جوہر دار آلات کی بجائے محض ایک زنگ خوردہ نشتر موجود ہے ہم اپنی آنکھوں سے اس مایوسانہ جہاد کو دیکھ رہے ہیں جو اُستاد بے علمی اور کور ذوقی کے خلاف لڑ رہا ہے کیا اس جہاد کو جاری رکھنے، اس کو کامیاب کرنے کی ذمہ داری ایک فرد واحد پر، ایک ملائے مکتب پر ہی عاید ہوتی ہے نہیں ہرگز نہیں! یہ بوجھ جو ہمارے سر آن پڑا ہے سب کے اُٹھائے ہی اُٹھے گا اور یہ کام جو ہم پر آن پڑا ہے سب کے بنائے ہی بنے گا۔ اس عظیم الشان مجاہدہ میں سب لوگ ہمت باندھ کر اور سر جوڑ کر نہ لگیں گے تو اس میں یقیناً اُستاد کی ہار ہوگی اور اُستاد کی ہار کے یہ معنی ہیں کہ کل سماج کی ہار ہوگی۔

پنجاب میں ایک کہاوت ہے کہ بچوں میں سب کا ساجھا ہوتا ہے اس کا مقصد کوئی افلاطون والی جائیدادی اشتراکیت نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ بچوں کی تربیت و تہذیب کا فرض محض ماں اور باپ پر ہی نہیں بلکہ ایک گونہ پوری بالغ نسل پر عائد ہوتا ہے۔ اس لئے ہم سب کا بھلا اسی میں ہے کہ خوب اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ سب کے بچوں میں سبھی کا ساجھا ہے اس سماجی اشتراکیت میں نہ تو کوئی غریب ہے نہ امیر نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ اس میں ہمارا ہی بھلا نہیں بلکہ ہمارے بچوں کا بھی بھلا ہے ایک امیر زمیندار اپنے بچے کو ہمالیہ کی وادیوں کے اونچے یورپی مدرسوں میں تعلیم دے سکتا ہے مگر تاہم کبھی نہ کبھی اسے بھی جلتے ہوئے تپتے ہوئے میدانوں میں اترنا ہوگا۔ اس مصیبت سے تو ہماری حکومتیں اور اُن کے عمال بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ ایک اونچے درجے کا سرکاری ملازم اپنے بچے کو نجی طور پر تعلیم دلالے مگر ہر سمجھدار باپ جانتا ہے کہ علیحدہ طور پر نجی تعلیم کہاں تک

بچے کی شخصیت کی تعمیر اور تکمیل میں امداد دے سکتی۔ اور کہاں تک اس قسم کی تعلیم اس کی سماجی جبلتوں کو ایک مفید شہری کی عادات میں بدل سکتی ہے۔ بچے کی نفسیاتی زندگی میں آپس میں مل بیٹھنے اور مشترکہ کام کرنے کا بڑا گہرا جذبہ ہوتا ہے اور نجی تعلیم سے قوت عمل کی یہ سوت خشک ہو جاتی ہے اور اس کی خشک بالو میں سے جو گرد و غبار اٹھتا ہے وہ اس کی پوری نفسیاتی اٹھان پر ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر چھا جاتا ہے۔

بس ہم دیکھتے ہیں کہ امارت اور حکومت تعلیمی لحاظ سے ایک صیاد کے خطرناک جال میں۔ ہم جتنا بھی ان سے بچ کر نکلنا چاہتے ہیں اس کی گرفت ہم پر مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہمارے بڑے آدمی یہ سمجھیں کہ اپنے بچوں کو علیحدہ کر کے وہ انہیں اچھی تعلیم دلا سکیں گے تو ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان بچوں کو اگرچہ اس وقت تو آپ نے ایک تعلیمی خلا میں ایک محفوظ اور مصئون شیش محل میں رکھ لیا لیکن جب ماحول کے زناٹے دینے والے جھکڑ اس خلا میں سائیں سائیں کرتے داخل ہوں گے تو یہ مصنوعی طرز سے اگائے ہوئے پودے زندگی کی روح بخش ہواؤں کے سامنے مرجھا کے رہ جائیں گے۔

ماحول کے اثر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک کوئلے کی کان کا مالک سفید براق لباس میں مزدوروں کا کام دیکھنے اندر جاتا ہے اور واپسی پر سمجھتا ہے کہ وہ جیسا صاف تھا ویسا ہی لوٹ آیا۔ لیکن اسے یہ پتہ نہیں کہ شفاف اور چمکتے ہوئے ذروں کی ایک تہ اس کے پھیپھڑوں کے اندر ایسی بیٹھ گئی ہے کہ شاید اس کے دل پر بھی اثر کئے بغیر نہ چھوڑے گی۔ ماحول کا اثر نہ آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے نہ کانوں سے سنا جا سکتا ہے لیکن قدرت کے کارکنوں کی طرح اس کا خموش اور بادپا اثر برابر اپنا گھر بناتا چلا جاتا ہے۔

ہماری تعلیمی اور ماحولی وبائیں ایسی مصیبتیں نہیں جن سے ہم سول لائنوں میں رہ کر بچ سکیں۔ یہ ماحول ایک پرچھائیں کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ ہے ان کا علاج ان سے بھاگنے میں نہیں بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے میں چھپا ہے۔ اگر ہم ایک اچھا تعلیمی ماحول پیدا کرنا چاہتے

ہیں تو ہمیں اس کام میں اُستاد کا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ ہمارے بڑے بڑے آدمیوں کو تعلیمی مسائل میں ایک ہمدردانہ اور ذہین دلچسپی لینا ہوگی۔ ہمارے لئے نہیں اپنے لئے صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کے لئے

ان لوگوں کے دل میں کبھی کبھی تو خیال آتا ہوگا کہ ہمارے اقدار میں کس قدر تبدیلی۔ ہمارے نظریوں میں کس قدر انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک حاکم ضلع کو شاید سالوں کے ذاتی تجربے کے بعد پتہ لگ جائے کہ ہمارے بالغ شہری کی تعلیم شہریت میں کیا نقائص ہیں۔ ایک زمیندار کے دل پر شاید کبھی یہ چیز روشن ہوجائے کہ کھیتی اور آزاد کھیتی میں کس قدر تعلیمی ممکنات ہیں۔ تو کیا ہرج ہے کہ وہ اُستاد کے لئے اپنے من کے مندر کے مقفل دروں کو کھول دیں اپنے منصب اور اس کی پابندیوں سے بلند ہوکر ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسان سے گفتگو کریں۔ اس کے سینہ پر ایک محبت آمیز ٹھوکا دے کر کہیں۔ دیکھو ابھی ہم نے بہت کم کیا ہے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے ترقی کی اس کٹھن اور دشوار گزار منزل میں ہمت نہ ہارنا۔ ہماری دعائیں اور ہماری نیک خواہشیں تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔ دوسرے ممالک ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہیں۔ ایک امریکی سیاح جب زیکوسلو دکیا کے ایک مدرسہ میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ ملک کا ایک مشہور ومعروف مصنف اور ڈراما نویس بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے زیادہ جستجو سے پتہ چلا کہ مصنف موصوف جو اپنے وقت کی ہر لحظہ کھنکتے ہوئے نقرئی اور طلائی سکوں میں تبادلہ کرسکتا ہے۔ اکثر اوقات وہ اس مدرسہ میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ چیز اُس کے ماہانہ لائحہ عمل کا ضروری حصہ ہے۔ ایک سیدھے سادے خلوص والے دل کے ساتھ وہ بچوں کی محبت بھری سبھا میں شامل ہوجاتا ہے۔ ان کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا۔ اُن کے ساتھ رہتا سہتا ہے۔ اکثر جنگل کی سیروں میں وہ انہیں قدرت کے اس ابدی حسن سے متاثر کراتا ہے جس نے اس کی تصنیفات کو نہالی روشنی سے جگمگا رکھا ہے۔ کبھی وہ بچوں کے ساتھ مطالعہ قدرت کرتا اُن کے تشخیص وتفحص کے قوا کی مشق کراتا ہے۔ جو علت ومعلول کے عینی مشاہدہ سے

ذریعہ اُن کی قوتِ استدلال کو روشن کرتا ہے۔

کیا ہمارے ملک میں بھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے؟ کیوں نہیں؟ اس صحرا میں کہیں کہیں برگِ نخیل کی سبزی جھلک جاتی ہے۔ اکثر شانتی نکیتن کے آموں کے کنج میں ننھے ننھے بچے "گرُو دیو" رابندر ناتھ کے گرد حلقہ باندھ کر ناچتے ہیں۔

اکثر گوکھلے جیسا اُستاد بچوں کے ساتھ اس بنجر اور پتھریلی چٹان کے سایہ میں کھیلتا ہے جس پر ایک صبح اُس نے آفتاب کی کھلتی ہوئی کرنوں کے درمیان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ غربت اور خدمت خلق کی قسم کھائی تھی۔

جب ایک سیاسی کانفرنس کی ہما ہمی اور گہما گہمی میں ملک کا سب سے مقتدر لیڈر تعلیمی نمائش کے معائنہ کو جاتا ہے۔ تو اُس کی ملاقات ایک بچے سے کرائی جاتی ہے۔ جس کے ہم جماعت سینکڑوں میل دور کمرے میں بیٹھے اپنے عزیز دوست کا جغرافیائی نقشے پر تعاقب کر رہے ہیں۔ اُن کھیتوں کی پیداوار کا مطالعہ کر رہے ہیں جن کے درمیان سے ہو کر وہ گزرا ہے۔ ان درختوں کے متعلق دریافت کر رہے ہیں جن کے سایہ میں اس کا خیمہ تنا ہے۔ اس کی روزانہ مصروفیات پر دلچسپ مضامین لکھ رہے ہیں۔ پورے نصاب کا کام ایک جھٹکے میں پرانے فرسودہ ڈگر سے ہٹ کر ایک اور بچے تعلیمی معیار پر پہنچ گیا۔ سیاست داں کا چہرہ بچے کو دیکھ کر کھل جاتا ہے۔ مبارک ہے وہ بچہ جس نے اتنے بچوں کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دی۔ اس بچے کے اُستاد کا دل اس واقعہ سے باغ باغ ہو گیا۔ اس واقعہ سے اُس کی تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا مگر جب وہ مجھے یہ باتیں سُنا رہا تھا تو میں نے اُس کے چہرے پر ایک تازگی، ایک بشاشت پائی جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام ہے۔

ایسا ہی پیام دنیا کی زندہ قوموں کو اُن کے بڑے آدمیوں نے اکثر دیا ہے سقراط اور افلاطون یونان کے درخشاں زمانے کے تابناک ستارے اپنا درس ایتھنز کے

دادوں اس کی سیرگاہوں میں دیتے تھے سقراط ایک غریب ملازم کو روزمرہ کی باتوں ہی سے فیثا غورث کا اصول سمجھاتے ہوئے نہیں شرماتا۔ اور افلاطون جیسا مفکر نیکی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے اس بات سے نہیں گھبراتا کہ اہل ایتھنز اس کے سامنے سے ایک ایک کرکے اُٹھتے جارہے ہیں اور ارسطو کے سوا کوئی اس طوفان علم کی تاب نہیں لاسکتا۔ لیکن ہمارے بڑے آدمی مدرسوں میں جاکے کیا کرتے ہیں اکثر ان کی آمد ایک جلوسانہ انداز میں ہوتی ہے کبھی کبھی کوئی بڑا آدمی مدرسے میں انعامات کے جلسے کی صدارت کرتا ہے کبھی کوئی بڑی ہستی معائنہ کرنے آجاتی ہے۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو کسی بڑی ہستی کے استقبال یا خوش آمدید کے لئے رنگ برنگ کی جھنڈیاں دے کر خوبصورت قسم کی پگڑیاں پہنا کے یوں دورویہ کھڑا کر دیا جاتا ہے جیسے مغلوں کے زمانے کے باغ میں روشوں پر سرو کے درخت کھڑے ہوتے ہیں بڑے آدمی کی سواری آئی فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ننھے ننھے ہونٹوں نے کبھی ڈرتے ڈرتے کبھی جھجکتے جھجکتے کبھی کبھی ڈر کی وجہ سے دفعتاً اونچی آواز میں ہپ ہپ ہرّے کی صدائیں بلند کیں۔ بڑے آدمی کی سواری جس تیزی سے آئی اُسی تیزی سے آگے نکل گئی۔ بچوں نے دبی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے انگلیوں سے اشارہ کیا۔ صاحب ادھر بیٹھے ہیں۔ مگر اتنے میں اُستاد جو آوارہ بھیڑیں دوبارہ اکٹھا کرکے واپس مدرسے کو ہانکنے کو تیار ہے غصہ میں گھڑک کر بولا "تمہاری شامت تو نہیں آرہی یہ مٹکتی ہوئی انگلیاں ڈنڈے سے چٹخائی جائیں گی تم ایک بڑے آدمی پر اشارہ کرنے کی جرأت کرتے ہو؟"

معصوم بچے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ استاد ان کی نگاہ میں ایک بہت بڑی ہستی ہے اور جس ہستی سے اتنی بڑی ہستی بھی اتنی خائف ہے وہ کتنی بڑی ہوگی اُن کی ننھی سی قوت متخیلہ شاید اُس کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں بھی نہیں لے سکتی۔ اب ایک نیا سین آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ مدرسے کے کھیل کے میدان میں ایک مخملیں شامیانے کے

نیچے ایک مانگے ہوئے قالین کے اوپر ڈائس ایک بڑی چوکی اور اُس کے اوپر صدارتی کرسی
[illegible]ارتی کرسی کے اوپر ایک بڑا آدمی ایک طرف سے ایک بڈھا سا اُستاد جس کی
عینک اُس کی ناک کی پھننگی پہ ٹکی ہوئی ہے، پیچھے کی قطاروں سے سمٹتا، سمٹاتا جھکتا۔
جھکاتا بچتا بچاتا۔ فرطِ ادب سے ایک سو بیس درجہ کا زاویہ بناتا چوکی کے ایک کونے پر
ہی رک جاتا ہے اور کہتا ہے: "معزز حضرات آج اس ادارے کے لئے کس قدر فخر
و مباہات کا دن ہے کہ جناب صدر نے ہمیں اپنے قدوم میمنت لزوم سے افتخار اور استفادہ
بخشا ہے۔ میرے عزیزو تمہیں پتا ہونا چاہئے کہ ہمارے صدر محترم آج ہمارے صوبے
کی سیاست کے سب سے درخشندہ ستارے ہیں۔ عزیز طالب علمو سیاست داں بڑے
آدمی ہوتے ہیں۔ بہت بڑے آدمی اُن کے دل ایک روحانی جذبے سے منور ہوتے
ہیں اور اللہ کا اُن کے سروں پر سایہ ہوتا ہے۔ . . . . ."

اس کے بعد تھوڑی سی ہلچل۔ تالیوں کے زبردست مظاہرے کے درمیان
جناب صدر اپنی بھاری بھرکم شخصیت کو دونوں ہاتھوں سے لئے ہوئے کھڑے ہو جاتے
ہیں۔ تقریر کے وقت صدر محترم اپنے ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں کو واسکٹ کی جیبوں میں
پھنسائے رکھتے ہیں۔ اور اُن کے دونوں ہاتھ اب اُن کی توند پر یوں جمے ہوئے ہیں جیسے
کہ پہلے میز پر تھے۔ یہ توند اُن کی دنیاوی کامیابی کا جیتا جاگتا لڑھکتا پھڑکتا ثبوت ہے۔
اپنے دونوں ہاتھوں سے وہ بہانگ دہل اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ دوستو زندگی
کی کامیابی اسی میں مضمر ہے۔ اب ان کی تقریر شروع ہوتی ہے: "معزز خواتین اساتذہ
کرام اور طالب علمو میرے لئے یہ نہایت مسرت کا دن ہے کہ میں آپ لوگوں کو آج آپ
کی اسکولی زندگی کی آخری تقریب میں شامل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ میرے عزیزو
تم زندگی میں پہلا قدم رکھ رہے ہو۔ دیکھنا اگر ایک قدم آگے بڑھاؤ تو دوسرا قدم پیچھے نہ ہٹنے
پائے سیٹھ مکند لال کی طرف دیکھو جنہوں نے اپنی ہمت اور کوشش سے ایک کارخانے

شروع کرکے اب دس کارخانے کھول لیے ہیں راجہ حسن یار خاں بنتانہ کی جائداد اُن کی محنت اور قابل مبارک باد کوششوں سے ہمارے دیکھتے دیکھتے چوگنی ہوگئی ہے۔ میرے عزیزو یہ درخشندہ مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ ان پر چلو قسمت کامیابی کا سہرا تمہارے سر پر رکھے گی۔۔۔۔۔

ماسٹر علی محمد صاحب تقریر سن رہے ہیں اور اُن کا دل بے طرح اُمڈا آرہا ہے اُن کا پچھلے سال کا سب سے اچھا طالب علم کچہری میں مہینوں سے جوتیاں چٹخار رہا ہے! ایک دفتری کی جگہ کا اُمیدوار تھا مگر مل نہیں سکی۔ دوسرا لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ اُن کے کانوں میں کامیابی کے یہ سنہرے خواب کچھ بھلے معلوم نہیں ہوئے۔ مگر بچے؟ بچوں کی نگاہ میں سیٹھ منداس اور راجہ حسن یار خاں جو سامنے بیٹھے ہوئے اچھے خاصے بھلے آدمی نظر آتے تھے۔ اب دیوتا دکھائی دیتے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی بڑے آدمی نے جلدی جلدی دو چار معززین شہر سے ہاتھ ملائے۔ ایک دو استادوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گویا ملانے کو ہیں۔ لیکن جلدی کے مارے صرف اُن کی اُنگلیوں کی پوریں چھو سکے اور ہاتھ دفعتاً یوں پیچھے کھینچ لیا۔ جیسے کہیں بجلی کا جھٹکا لگ گیا ہو۔ بچوں نے اس بات کو دیکھ لیا ہے۔ بچوں کی نگاہ بڑی تیز ہوتی ہے۔ اُن کا عزت نفس کا احساس بہت بلند ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ اس سماج میں اُستاد کی کیا عزت ہے۔ بچوں کے حافظے بعض باتوں کے لئے بہت ہی قوی ہوتے ہیں۔ وہ اس واقعے کو سالہا سال نہیں بھولیں گے۔

اور جب یہ بڑا آدمی واپس پہنچتا ہے اُس کے چہرے پر ایک بیزاری کا انداز۔ اُس کی باتوں سے جھنجلاہٹ معلوم دیتی ہے۔ کسی گھر والے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا بھی "کہ آج کہاں تشریف لے گئے تھے" تو کچھ ترش رو سے ہو کر کچھ پیشانی چڑھا کے کچھ استغنا کے انداز میں بولے "ابھی تھی ایک تقریر اسکول میں، میں تو تنگ آگیا بچے، اُستاد، ہنگامہ، شور،

میرے سر میں تو ہلکا ہلکا سا درد شروع ہو گیا ہے۔" بہر حال سوال یہ ہے کہ اس قسم کی جلوسانہ تقریبوں سے کس کو کیا فائدہ پہنچا۔ کیا بڑے آدمی کی تقریر سے بچوں میں بڑے جذبات پیدا ہوئے میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی ایسا موقع بھی ہوتا ہے جہاں بڑے آدمی اپنے آپ کو نمائشی جلوس سے پیش کر سکیں۔ کیا کبھی اُن میں ایک حسین سادگی کی جھلک پیدا ہو سکتی ہے۔ سادگی، اخلاص، نیکی، وہ نیکی جو اپنے مخصوص انداز میں دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ وہ سادگی جو اپنے اثر سے دوسروں کو بھی سادہ بنا دے مدرسے کی دنیا سادگی کی دنیا ہے۔ اخلاص کی دنیا ہے۔ معصوم روحوں کی دنیا ہے۔ ایک حد تک سچی اقدار کی دنیا ہے کیا اُن سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے جلوسانہ انداز کو۔ اپنے دبدبے اور طمطراق کو۔ اپنے نمائشی اور جھوٹے لباس کو۔ اپنے آرائشی اور بھڑکیلے ملبوسات کو ایک لمحہ ایک پل کے لئے علیحدہ اُتار کر رکھ دیں اور اس بچوں کی دنیا میں ایک بچے کی سادگی کے ساتھ آئیں۔ اپنے اوج کے اخلاق عالیہ کی چمک اور ضیا سے اگر اس میں کچھ چمک ہے مدرسے کے ماحول کو جگمگا دیں۔ ایک سچے اُستاد کو تصنع اور نمائش سے دلی نفرت ہوتی ہے۔ خواہ یہ نمائش ایک لیڈر کی نمائش ہو یا ایک ایکٹر کی۔ اُس کی انگلیاں اس بھاری بھرکم اور فضول بھیس کو اُتار پھینکنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئیں۔ اور اُس کی تہ میں اُس کے سامنے ایک مخلص چہرہ اور ایک انسان کی زندہ روح عریاں ہو جانا چاہئے

جس عظیم الشان مشغلے میں وہ مصروف ہے وہ زندگیوں کی تعمیر ہے اس تعمیر میں کہیں بھی کسی کچی اینٹ جھوٹے مصالحہ یا نمائشی رنگ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُستاد بڑے آدمی چھوٹے آدمی۔ غریب اور امیر ایک بہت بڑے امر میں مصروف ہیں۔ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر سماج کی بھاری بھرکم اور وزنی گاڑی کو آگے ٹھیلنے کے لئے ہر ایک کو مردانہ وار اپنا سینہ تان کر زور لگانا چاہئے۔ ایک مخلصانہ کوشش ہے ایک سچا جہاد جس میں ہر انسان دوسرے سے اخلاص اور باہمی مفاہمت کے سطح پر آ کر اشتراک عمل کر سکے۔

زلمہ قوموں پر ایسے دور گزر چکے ہیں جب کہ وہ زندگی کی ایک نئی تعلیم۔ سماج کی ایک نئی تشکیل کے لئے جوشاں اور کوشاں تھے۔ اسی جوش اور ولولے کی رو میں بہہ کر ٹالسٹائی نے دیہاتی بچوں کے لئے اپنا مدرسہ کھولا تھا ایک بہت بڑی جاگیر کا مالک۔ ایک معزز خاندان کا درخشندہ ستارہ۔ دن کو بچوں کے ساتھ جماعت کے کمرے میں مغز مارتا ہے۔ سہ پہر کو اُن کے ہمراہ علمی سیروں میں حصہ لیتا ہے اور رات کو ستاروں کی سہانی چھاؤں میں جنگل کے گھنے درختوں کے سایہ میں کبھی تو اُن کے دلوں میں قدرت کے لئے احساس حسن بیدار کرتا ہے اور کبھی کبھی ان معصوم کمسن بچوں کی امداد سے ادب و فن کی بدیہی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

روس میں وہ زمانہ کچھ عجیب بیداری کا زمانہ تھا آزادی اور انسانی ہمدردی میں سرشار ادیب اور مفکرین چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ملک میں سچی اقدار کے معیار پھیلا دیں ٹالسٹائی ہی نہیں چیخوف۔ ترگنیف، گورکی سبھی تعلیم کی سماجی اہمیت کو سمجھ رہے تھے ایک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ ایک آئندہ روشن مستقبل کی طرف نظریں جمائے بیٹھے تھے جس پر سے ظلمت کا پردہ ایک صحیح قسم کی تعلیم ہی اُٹھا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ کسی نسل کی تعمیر کا کام خاموش محنت اور دیانت اور مشقت چاہتا ہے یہ کام اسٹیج کے تختوں پر دھما دم مچانے سے یا ایک منہ میں جھاگ بھر لانے ایکٹر کی شاعری اور تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ اگر چیخوف کو ہمارے مدرسے میں اسی رسمی تعارف سے کرسی صدارت پیش کی جاتی تو وہ کیا کہتا۔ اس کی مخلص اور نیک روح اس قسم کی ظاہرداری اور نمائشی تنظیم و شہرت سے کتنی گھبراتی تھی وہ اپنے اعزاز میں جلسوں اور دعوتوں کی تقریریں سن کر یوں گھبرا اُٹھتا جیسے کسی نے اچانک اس کی پیٹھ پر قمیص کے اندر یخ جیسا ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو

ایک دعوت کے متعلق لکھتا ہے "میں ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں شام کے کھانے کا انتظام ہے۔ بہت سے مہمان مدعو ہیں۔ بڑا لطف ہے خود بھی پی رہا ہوں، دوسروں کو بھی پلا رہا ہوں لڑکیوں سے بڑے لطف کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اتنے میں ایک صاحب کچھ بے طرح اہمیت کے

انداز میں کھڑے ہو جاتے ہیں گویا سرکاری وکیل ہیں۔ اور میری تعریف میں ایک تقریر جھاڑ دیتے ہیں۔ "الفاظ کا جادوگر..... بلند تخیل..... آج ہمارے ما بین۔ تم ہر جگہ عقلمندی پھیلا رہے ہو..... امنٹ شہرت..... ابدی مقبولیت"۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مجھ پر سے کوئی ڈھکنا اُٹھا لیا گیا ہو اور کوئی شخص میری کنپٹی پر پستول کی نالی جمائے کھڑا ہے۔ تقریر کے بعد گفتگو کی ہلکی سی سرسراہٹ اور پھر ایک بھونڈی اور تکلیف دینے والی خاموشی۔ سب لطف خاک میں مل گیا۔ میرا ہمسایہ اشارہ کرتا ہے۔ "تم بھی کچھ کہو۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے سر پر بوتل اُٹھا کر دے ماروں۔"

اس کے برعکس جب وہ اپنے دیہاتی مکان میں بیٹھا ہوتا ہے اور کوئی گاؤں کا اُستاد کچھ گھبرایا سا کچھ شرمایا سا۔ اُس سے ملنے آتا ہے۔ تو اُس کی روح کی کلی سی کھل جاتی ہے اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر وہ اسے خوش آمدید کہتا ہے اُس کے اخلاص اُس کی محبت اُس کی سادگی سے ایک چنگاری اُڑتی ہے اور استاد کے ظاہری اخلاقی خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایک مقناطیس کے زیر اثر آ کر مقناطیس ایک پارس کے قریب پہنچ کر دمکتا ہوا کندن بن جاتا ہے۔

جب کبھی وہ تندرستی کے لئے دیہی علاقوں میں نکل جاتا تھا تو وہاں ان جگہوں کے مدرسے دیکھتا تھا۔ اُستادوں سے باتیں کرتا۔ اُن کی مصیبت میں ہمدردی۔ اُن کی مشکلات میں ہمدردی کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔

گورکی نے اسے اکثر کہتے ہوئے سنا "بھئی گورکی۔ تمہیں پتہ ہے۔ ایک استاد ابھی ابھی یہاں آیا ہے۔ وہ بیمار ہے اور شادی شدہ بھی ہے۔ تم اس کے لئے کچھ کر سکتے ہو یا نہیں۔ فی الحال تو میں نے اس کے لئے انتظام کر دیا ہے۔" "دیکھنا گورکی ایک اُستاد تم سے ملنا چاہتا ہے وہ بیمار ہے۔ اس لئے بستر سے تو اُٹھ نہیں سکتا ذرا تم ہی جا کر اُس سے مل آؤ۔"

چیخوف اکثر ان اساتذہ کی بے لطف پھسپھسی، اور بے ربط گفتگو بڑی توجہ سے سنتا تھا شروع شروع میں چند ایک منٹ کے لئے یہ اُستاد اپنے احساس کمتری کی وجہ سے عجیب دلچسپ حرکات کر بیٹھتے تھے۔ ایک کرسی کے کنارے پر ٹکے ہوئے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسی احتیاط اور نزاکت سے گویا اس

کی سیٹ میں نہیں لگی ہوئی ہیں۔ اپنے بے ڈھنگے طریقہ پر خود ہی شرمسار، چہرہ شرم کے مارے سرخ ہوا جا رہا ہے۔ ماتھے پر پسینہ چھوٹا پڑتا ہے۔ بڑی کوشش سے الفاظ چن رہے ہیں جھنجھلا کر ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ اس بڑے مصنف کے سامنے نکو نہ بن جائیں اور سلیس اور عالمانہ گفتگو کر سکیں اُن کے شرمیلے پن کا مظاہرہ کئی ایک طریقوں سے ہوتا تھا۔ یا تو گفتگو کا دھاوا دفعتاً کچھ بند سا ہو جاتا تھا اور اس میں سے کہیں کہیں کچھ بوندیں رستی رہتی تھیں یا کبھی کبھی اس کے قید و بند ایک سیلاب کی آندھی میں ٹوٹ جاتے تھے اور وہ چیخوف پر بے ربط سوالوں کی ایسی بوچھار کر دیتے تھے جو اُن کے ذہن میں نہ اب تک کبھی آئے تھے اور نہ کبھی آئیں گے۔ ہمارے ملک میں بھی اکثر بڑے آدمیوں کو چھوٹے اور غریب اُستادوں سے ملنے کا اتفاق ہو جاتا ہے اُن کے منہ سے اکثر بات نہیں نکلتی۔ اور جب نکلنی شروع ہوتی ہے تو بند نہیں ہوتی یہ بڑے آدمی اپنی منصب کی بلندیوں سے اُن کے اوپر مسکراتے ہیں اور اپنی عظمت کے احساس اور دوسرے کی کم مائیگی کے تخیل سے یوں کھنچے جاتے ہیں جیسے سورج دیوتا کا چہرہ ہنسی کے گول گپے کی طرح سے پھیل جاتا ہے وہ ایک شانِ استغنا سے چھوٹے آدمی کو تھپتھپا دیتے ہیں۔ کچھ اُن کے احساس برتری کو ٹھیس لگتی ہے کچھ دوسرے کے احساسِ کمتری پر اوپری مرہم کا پھایا لگ جاتا ہے لیکن گفتگو اور ملاقات کی سطح بہت مختلف ہے ایک چوکی پر نہیں بلکہ ہمالہ کی پہاڑیوں سے بھی اونچی چوٹیوں پر ٹکا ہوا ہے اور دوسرا زمین پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ نیچے۔

چیخوف جب ان چھوٹے اُستادوں سے بات کرتا تھا تو وہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کی زندگیوں کی مایوسیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُن کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا کو جسے صرف ہمدرد دل رکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں سننے کی کوشش کرتا تھا جب کبھی وہ اُن کی بے ربط گفتگو اور اُن کے عجیب و غریب اضطراری حرکات دیکھتا تھا تو اس کی غمگین آنکھوں میں ایک مسکراہٹ چمکتی تھی۔ اُس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی شکن پڑ جاتی تھی اور پھر وہ اپنی ملائم اور حسین آواز میں سادہ صاف اور گھریلو الفاظ بولنے لگتا تھا۔ یہ سوال اُس کے مہمان کے لئے کچھ اچنبھا سا ہوتے تھے۔

اس کو دفعتاً غیر شعوری طور پر سادہ بنا دیتے تھے۔ کھیل کا ڈھنگ ہی بدل جاتا تھا اُسی اُستاد میں جو اپنے آپ کو بڑا شاطر اور عالم ظاہر کرنے کی چال چل رہا تھا ایک تبدیلی سی آجاتی تھی۔

ایسی ہی ملاقات کے متعلق گورکی لکھتا ہے "مجھے ایک اُستاد کے متعلق یاد ہے ایک اونچا پتلا دُبلا سا آدمی، پیلا رنگ اور بھوک کے مارے چہرے کے زاویے نمایاں، لمبی طوطے جیسی ناک چیخوف کے سامنے بیٹھا ہوا اپنی سیاہ آنکھیں اُس کے چہرے پر جمائے ہوئے غمگین اور مدھم سروں میں برابر بولے جا رہا تھا" تعلیمی سال کے دوران میں زندگی کے ایسے تاثرات کی وجہ سے ایک نفسیاتی ذہن السعدین ہو جاتا ہے جو ہماری گرد و پیش کی کائنات کا ایک مادی مطالعہ بالکل مفقود کر دیتا ہے کائنات کیا ہے محض اضافی چیز ہے ... فلسفۂ خودی ... تصوف"

وہ فلسفے اور تصوف پر سینگ جمائے ہوئے گویا بلا پڑ رہا تھا اور کبھی وہ مختلف علوم کی سطح پر یوں ڈگمگا رہا تھا جیسے کوئی شرابی برف پر اسکیٹ کر رہا ہے" اتنے میں چیخوف نے بہت اطمینان اور نرمی سے پوچھا " اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے علاقے میں کونسا اُستاد بچوں کو پیٹتا ہے؟"

یہ سنتے ہی اُستاد اپنی کرسی پر سے اچھل پڑا اور مارے غصے کے دونوں ہاتھوں کو ہلانے لگا" جناب کسے کہہ رہے ہیں؟ میں؟ نہیں! ہرگز نہیں" چیخوف دوبارہ مسکرایا۔ اس حرکت سے اُستاد کو اطمینان سا ہو گیا" ارے بھئی تم گھبراتے کیوں رہتے ہو۔ میں تمہیں نہیں کہہ رہا ہوں مجھے تو ویسے ہی یاد آ گیا تھا۔ خدا جانے کیسے معلوم ہوا۔ ہاں ہاں خوب یاد آیا۔ ایک دفعہ اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کے علاقہ میں کوئی اُستاد بچوں کو پیٹا کرتا ہے" اُستاد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھا اور ایک آرام کا سانس لے کر گہری اور مدھم آواز میں کہنے لگا۔ ہاں ہاں سچ ہے ایسی کچھ بات ہوئی تو تھی۔ اُس اُستاد کا نام مکاروف ہے آپ تو خوب جانتے ہیں کہ یہ چیز ایسی کچھ تعجب انگیز تو نہیں ہے زیادتی تو اُس نے ضرور کی مگر وجوہات بھی تھیں ایک تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اور اُس پر چار بچے۔ ستم یہ ہے کہ بیوی بیمار اور خود تپ دق کا شکار۔ تنخواہ محض بیس روبل اور مدرسہ کچھ نہ پوچھئے، اصطبل سمجھ لیجئے یا تہ خانہ۔ اور اُستاد کے پاس ایک ہی کمرہ چاہے اوڑھ لے چاہے بچھا لے۔ ابھی ایسے

حالات میں تو اگر فرشتہ بھی سامنے آجائے تو بغیر مار کھائے نکلنے نہ پائے گا۔۔۔۔ اور سچ پوچھئے؟ تو آپ سچ مانیے اُن میں فرشتے کی سیرت کا تو دور دور شائبہ بھی نہیں۔
دیکھئے وہی شخص جو چند لمحے پہلے چیخوف پر اپنے فلسفیانہ الفاظ کے پتھر لڑھکا رہا تھا اور اپنی ملوطے نما ناک روحانی صورت سے ہلا رہا تھا۔ اُس نے اُس کی سادگی اور اخلاص کے اثر میں آکر سیدھے سادے پرمعنی اور ہیرے کی کنی کی طرح کٹے چھنٹے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنا شروع کردیا۔ وہ الفاظ جو ایک آگ کی طرح اوسی گاؤں کی خوفناک اور بھیانک حقیقتوں کو روشن کر رہے تھے۔
جب اُستاد نے اپنے میزبان کو الوداع کہی تو اُس نے چیخوف کا چھوٹا مریل سا ہاتھ اپنی کمزور اور پتلی انگلیوں میں تھام لیا اور کہنے لگا "میں تمہارے پاس اس تیاری کے ساتھ آیا تھا گویا میں کسی حاکم کے سامنے پیش ہو رہا ہوں میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ میں ایک مرغ کی طرح پر پھڑپھڑا کر اپنے آپ میں ہی مگن ہو رہا تھا۔ میں تم پر یہ ظاہر کرنے آیا تھا کہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں۔۔۔ اور اب میں تم سے بطور ایک اچھے گہرے دوست کے رخصت ہو رہا ہوں وہ دوست جو سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ اور سب کچھ سمجھ لینا کس قدر شاندار چیز ہے تک۔ میں تمہارے پاس سے ایک دلفریب خیال لے کر جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بڑے آدمی سیدھے سادھے ہوتے ہیں۔ ہم چھوٹے آدمی بھی اُن کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ روحانی طور پر ہم لوگوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں بہ نسبت اُن کمبخت لوگوں کے جن کے درمیان اکثر ہم رہتے ہیں اچھا خدا حافظ۔ میں تمہیں زندگی بھر نہیں بھول سکتا"
جب وہ رخصت ہوگیا تو کچھ دیر تک چیخوف اُس کے پیچھے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا "کتنا بھلا آدمی ہے۔ مگر میرے خیال میں وہ زیادہ مدت تک اُستاد نہیں رہ سکتا۔" میں نے پوچھا کیوں؟ "ابجی محکمہ اسے جلد ہی ڈھونڈ لے گا اور نکال باہر کرے گا۔ روس میں تو ایک نیک آدمی اُس ہوئے کی مانند ہے جس سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔"

عبدالغفور صاحب۔ ایم۔ اے

ڈیوی کا نظریہ تعلیم

بیسویں صدی کی مایہ ناز و فخر روزگار ہستیوں میں جان ڈیوی کو خاص امتیاز اور اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک طرف فلسفی، ماہر اخلاقیات، منطقی، ماہر نفسیات اور دوسری طرف معلم اور فلسفہ تعلیمات کا امام اور درخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم"، افلاطون کی "ریاست" کے ہم پلہ خیال کی جاتی ہے۔ وہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں برلنگٹن میں پیدا ہوا۔ اپنی ابتدائی تعلیم نیو انگلینڈ اسکول میں حاصل کی۔ ۱۸۷۹ء میں جامعہ ورمانٹ سے بی اے کی ڈگری لی۔ ۱۸۸۴ء میں اس کو ہاپکنس یونیورسٹی واقع بالٹی مور نے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۶ء تک جامعہ میچیگان میں فلسفہ کا درس دیتا رہا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ جامعہ مینیسوٹا میں پروفیسر مقرر ہوا۔ اور ۱۸۸۹ء میں دوبارہ شعبہ فلسفہ کے صدر کی حیثیت سے جامعہ میچیگان گیا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۴ء تک وہ جامعہ شکاگو میں شعبہ فلسفہ کے صدر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اسی جگہ سے اس کی شہرت تعلیمی حلقوں میں بڑھنی پھیلنی شروع ہوئی۔ عرصہ تک وہ کولمبیا یونیورسٹی میں ۱۹۰۴ء سے فلسفہ کا پروفیسر رہا۔ اب ریٹائر ہو کر نیو یارک میں مقیم ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جامعہ وسکانسن اور ۱۹۱۰ء میں جامعہ ورمانٹ نے اس کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ وہ مختلف بڑی بڑی بین الاقوامی انجمنوں کا رکن و صدر رہے اور اس کے مضامین وقت کے علمی رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نظریہ عملیت (Theory of Pragmatism) جان ڈیوی، چارلس پرس اور ولیم جیمس کے نظریہ عملیت سے کافی متاثر ہو چکا ہے۔ اس نے منصبیت اور آلیت کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے کسی شے کا معیار حقیقت صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق انسانی اغراض و مفاد سے ہو۔ اور جو نظام عالم میں جاری ہو سکے وہ صحیح ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ابتدائی اسباب کے مطالعہ سے قطع نظر کر کے اس کے عملی پہلو اور نتیجہ کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ وہ حقیقت کی جستجو میں معقولات

زبانی طلوں، ازلی اصولوں، کلیات ازلی اور ابتدائی اشیا کو نظر انداز کر دیتا ہے صرف واقعات، تجربات و مشاہدات کو مشعل ہدایت بناتا ہے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ یہ فلسفیانہ طریقہ ڈارون کے خیالات و تحریرات کا رہین منت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ڈارون کی کتاب "نوع انسانی کی ابتدا" کے شائع ہونے سے قبل غیر نامیاتی ہیئت طبیعات و کیمیا میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ اور دنیائے قدیم کی غیر معتدل و پائیدار اشیا کے بجائے بے ثبات و متغیر عالم میں نئی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ڈارون نے حیاتیاتی سائنس میں انقلاب پیدا کیا لیکن اس کا اثر علوم سیاسیات، اخلاقیات، منطق و مذہب پر بھی پڑا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج شعبہ حیات کے ہر پہلو پر غور و فکر کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں طبیعیاتی و ریاضیاتی عالم کا تصور اسی وجہ سے حیاتیاتی دھرکی سمجھا جاتا ہے۔

ڈیوی کا میلان و رجحان انسانی زندگی اور جد وجہد کی طرف ہے جو تحقیق و تفتیش اور تجربہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی مثال وہ عالم اخلاقیات میں یوں دیتا ہے کہ اصول ازلی و ابدی نہیں ہونے چاہئیں بلکہ مفروضہ دعویٰ ہونے چاہئیں تاکہ وہ برابر آزمائے جا سکیں اور ان میں وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت زمانہ کے مطابق تغیر و تبدل کیا جا سکے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خیالات کے ساتھ ساتھ راہ و روش اور طور و طریقہ کو بھی تاکہ وہ زمانہ کی رفتار پر قابو پا سکے۔

ڈیوی کا خیال ہے کہ قابو حاصل کرنا افراد کی روشن خیالی اور فطانت پر منحصر ہے۔ اور یہ بات جمہوریت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جو باوجود اپنی تمام کمزوریوں (خرابیوں) کے فرد کی مکمل نشو و نما اور ارتقا کا بہترین ذریعہ ہے۔ نظریہ عملیت کے تحت وہ علم کو اخلاق سے جدا نہیں سمجھتا ہے۔ اس کے فلسفہ کا صحیح نظریہ تعلیمی نظریہ میں پنہاں ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ فلسفہ و تعلیم کے تعلق کو زندگی کی نشو و نما اور ترقی میں چولی دامن کا ساتھ سمجھتا ہے۔

تجربہ کی مسلسل تعمیر نو: ڈیوی کے تمام فلسفہ کی اساس تجربہ و مشاہدہ ہے۔ وہ تعلیم کو نشو و نما کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں تعلیمی طریق و روش تجربہ کی متواتر تعمیر نو کا نام ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تجربہ بہترین معلم ہے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کہ علم ایام زندگی کے گذرنے سے حاصل ہوتا ہے اور عہد طفولیت سے سن بلوغ تک ترقی کرنے میں عقل و فراست بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہ اسکول کا فرض عین ہے وہ اس کی (تجربہ) ترقی میں ہاتھ بٹائے بلکہ علم کو اس کے دوش بدوش کافی سرعت ساتھ چلنے دے تاکہ زندگی کے صحیح و اصلی تجربات سے روشناس ہو کر شمع راہ کا کام دے۔ کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر انسان تجربے سے مختلف سبق حاصل کرتا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جن کو زندگی ہیں اوّل سے آخر تک یکرنگی اور جمود معلوم ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے لئے زندگی ہر روز ایک نیا علم و پیغام لاتی ہے اور ان کے خزانہ دانشمندی میں اضافہ کرتی ہے۔

ایسا اختلاف کیوں ہے؟ کیا یہ فطری قوتوں کے باعث ہے یا تعلیم کے اختلاف کا نتیجہ ہے؟ ڈیوی نے اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنی تصنیف "جمہوریت و تعلیم" میں لکھتا ہے "تجربہ کی ماہیت کو یوں سمجھئے کہ وہ حرکت و جمود کے عناصر کا مجموعہ ہے۔ تجربے کا حرکی یا عملی پہلو سعی و کوشش ہے جس کی مکمل تشریح دار التجربہ یا عمل کا عمل، اور تجربہ ہے جمودی پہلو مصائب و آلام کو برداشت کرنے اور جھیلنے کا نام ہے جب ہمیں کسی شے کا شعور یا تجربہ ہوتا ہے تو وہ اس پر عمل کرنیکا محرک ہوتا ہے۔ اور ہمارا عمل کسی نہ کسی طرح اس سے متعلق ہوتا ہے۔ پھر ہم پر اس کے نتائج کا اثر ہوتا ہے۔ ہم اس چیز پر اثر ڈالتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں یہ ایک عجیب انوکھا اجتماع و ارتباط ہے۔ تجربہ کے ان دونوں پہلوؤں یا صورتوں کا اتصال در ربط اس کی قدر و مفاد کا معیار ہے۔ صرف عمل و حرکت ہی کا نام تجربہ نہیں ہے۔ وہ تجزیہ کرنے اور انتشار کو ایک مرکز پر لانے کا نام ہے۔ تجربہ بمعنی جد و جہد تغیر و تبدل کو اپنے ہمراہ لاتا ہے لیکن تغیر ایک بے معنی سی حالت ہوگی اگر اس کے ساتھ ساتھ ان نتائج کا احساس نہ ہو جو اس سے وابستہ و متعلق ہیں۔ جب کوئی عمل نتائج کے معلوم کرنے میں مسلسل جاری رہتا ہے اور جب عمل کے تبدل کا پر تو واقعہ کا س ہم میں تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ تو مسلسل حرکت بہت پر معنی ہو جاتی ہے اسی وقت ہم کچھ سیکھ سکتے اور حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب ایک بچہ اپنی انگلی آگ میں ڈالتا

ہے تو وہ تجربہ نہیں کہا سکتا بلکہ تجربہ اس حالت کو کہتے ہیں جب بچہ تکلیف کی شدت سے انگلی کو حرکت دیتا ہے اور اس کے نتیجہ کو بھگتا ہے آگ میں انگلی ڈالنے کے معنی جلنے کے ہوئے لیکن اگر اس بات کا احساس نہ ہو کہ یہ نتیجہ کسی اور وجہ سے ہوا ہے تو لکڑی کے جلنے کی طرح انگلی کے جلنے سے صرف اسکی ظاہری شکل وصورت بدل جائے گی...... تجربہ سے کچھ حاصل کرنے اور سیکھنے کیلئے دوراندیشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور پیش وپس پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ اور آخر میں ہم کو کتنا لطف وسرور حاصل ہوتا ہے یا کتنی تکلیف وپریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق تجربہ سعی وجدوجہد نتائج کے برداشت کرنے اور ان دونوں کے تعلقات کے پہچاننے پر مشتمل ہے۔ اس میں حیات کا تسلسل اور اتحاد شامل ہے پیہم اور منظم عمل ایک غیر مربوط اور کورانہ لائحہ عمل سے مختلف ہے اور جو کام آزمودہ ہو وہ عملی اقدام میں برابر معین ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عمل افزائش پذیر ہے اور ہر ذمہ دار عمل اور کام کے لئے ہم کو ہمیشہ آزمودہ نتائج کو مدنظر رکھنا لازمی ہے۔

ڈیوی لکھتا ہے کہ "علم کا فرض ہے کہ وہ ایک تجربہ سے دوسرے تجربوں میں پوری طرح فائدہ پہونچائے۔ ایک مکمل علم تعلقات کی ایسی منظم مسلسل کڑی پیش کرتا ہے کہ پرانے تجربے کی روشنی میں نئے تجربات سے پوری طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے اور مشکل وپیچیدہ عمل بآسانی دریافت کیا جاسکتا ہے۔

ڈیوی قدیم چیزوں کی قدامت کو نہیں سراہتا بلکہ وہ ان کی قدر وقیمت اس وقت سمجھتا ہے جب وہ زمانہ حال کی ضروریات کو پورا کرنے میں معین ہوں۔ وہ لکھتا ہے "ماضی کے بعد جو زمانہ آتا ہے وہ حال نہیں اور نہ وہ جو ماضی کا پیدا کردہ ہو بلکہ حال زندگی کی طرح گذشتہ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نام ہے موجودہ متحرک ورقت انگیز دنیا میں گذشتہ ماضی سے اسی حد تک مدد لی جاسکتی ہے جس حد تک ماضی سے ہماری تحریکاتِ جدیدہ کو ہدایت ورہبری ملے۔

یہ ایک مقولہ ہے کہ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرنا دانائی نہیں ہے بلکہ دانائی وحکمت یہ ہے کہ

ایک ہی غلطی بار بار نہ کی جائے اور تجربہ ہکو ہی حکمت و دانائی سکھاتا ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے
کہ تجربات کا سیلاب ہمارے اوپر سے گذر جاتا ہے اور ہم کو بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کیا اس کی وجہ
یہ نہیں کہ ہم زندگی کو صرف سطحی نظر سے دیکھتے اور اس کی بناوٹی اور ظاہری خوبیوں سے محظوظ و متاثر
ہوتے ہیں لیکن ہم اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بےحس اور اس کے مخفی اسباب و نتائج کے
تعلقات سے بے بہرہ و بےخبر رہتے ہیں۔ روزمرہ کی ایک مثال سے یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے
ہر شخص کو ایسا موقع ضرور ہاتھ آیا ہوگا اور اس نے خوشی کا احساس بھی کیا ہوگا کہ جب نئے واقعات و
اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا تو آزمودہ تجربات نے اس کی پیچیدگی کے حل کرنے میں مدد کی۔ ہم یہ
بھی جانتے ہیں کہ جب ہم کسی الجھاؤ میں پھنس جاتے ہیں اور وہ گتھی سلجھتی نہیں تو افسوس یا غصہ کے
علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور خیال کرتے ہیں کہ کاش وقت پر سوچتے تاکہ یہ دشواریاں آسان
ہو جاتیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور مشکلات کیوں سد راہ ہوئیں؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ ہم نے
گذشتہ مواقع کو ہاتھ سے جانے دیا اور تجربے سے نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہے۔ ایسی ناکامیاں
چشمۂ زندگی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اور مکمل زندگی کے منازل طے کرنے میں سد راہ ہوتی ہیں
ہم حقیقت میں مدارج ترقی کے ابتدائی زینوں پر ہیں۔ حالانکہ قدرت نے ہم میں اعلیٰ صفات و قوتیں
ودیعت کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجربہ نے ہماری مناسب و کماحقہ امداد نہیں کی اور نہ ہم نے
اس کی اعانت کی طلب و جستجو کی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور ہم تجربہ کی تشکیل اور تنظیم نو واقعی کریں تو ہماری زندگی
ترقی کی آخری منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ یہی نشوونما ہے۔ یہی ترقی کی راہ ہے یہی صراط مستقیم ہے

تجربہ کی قدر و قیمت صرف وقتی نہیں ہے کیونکہ ہم تغیر پذیر عالم میں رہتے ہیں اور مستقبل کا خیال ہمیشہ
پیش نظر رہتا ہے۔ ڈیوی کی رائے میں تجربہ کو امروز و فردا کی شمولیت کا ماحصل و مآل کا رہونا چاہیئے
ہم واقعات، رفتار و روش کو پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ کامیابی و ناکامی، حسن و قبح، امید و
بیم ہمارے لئے بہت پر معنی اور اہم ہیں۔ ہم آئندہ تجربہ پر جس حد تک قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کا
انحصار ہماری اس قوت پر ہے کہ واقعات فردا کے آثار کو واقعات حاضرہ کی روشنی میں دیکھیں اور

گذشتہ واقعات سے مستقبل کا اندازہ لگائیں۔ اور اس طرح سابق نتائج کی روشنی میں موجودہ دور میں تبدیلی پیدا کریں۔ لیکن بہر صورت حقیقتاً ہماری زندگی حال ہی میں بسر ہو سکتی ہے۔ "ممکن ہے ایک زندہ ہستی کسی حد تک مجبور اور آزاد ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ واقعات حاضرہ کا ردعمل کس طور پر واقعات فرد پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

ذاتی تجربہ کو قابو حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا تجربی سائنس کی پیدا کردہ چیز ہے۔ سائنس کی جدید ترقی سے قبل تجربہ کا مفہوم صرف رسوم، روایات اور کورانہ تقلید تک محدود تھا۔ لیکن اب ماضی کا تجربہ اس لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے جدید و بہتر تجربہ کو ترقی کے نئے جدید و اصول سے روشناس کرے۔ ہم کو صرف ماضی کا اعادہ نہ کرنا چاہئے۔ اور نہ حوادث و ... نجات کا انتظار کرنا چاہئے کہ وہ مجبوراً ہم میں تغیر پیدا کریں۔ ہم گذشتہ تجربات سے اس لئے مدد لیتے ہیں کہ مستقبل کے تجربات بہتر عمدہ اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر کئے جا سکیں۔ تجربہ خود اس طریق عمل کا نام ہے۔ جو درستی و اصلاح کے تعین میں ہماری رہنمائی کرے۔

ڈنمارک کے ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم ماضی سے واقف ہوتے ہیں لیکن مستقبل ہمارا نصب العین ہوتا ہے۔ ڈیوی لکھتا ہے کہ ہمارا مستقبل اسی حالت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب واقعات گذشتہ ہمارے پیش نظر ہوں۔ اسی لئے وہ تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے "تعلیم تجربہ کی اس تعمیر نو یا تشکیل نو کا نام ہے جو تجربہ کے معانی و مفہوم میں اضافہ کرتا ہے اور آنے والے تجربات کی رہبری کرنے میں فہم و ادراک کو مزید ترقی دیتا ہے۔"

بے شک ہر فرد میں تجربہ سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت بہت مختلف ہوتی ہے علم النفس کی جدید تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہر فرد میں نہ صرف تجربہ و استقرا کی اعلیٰ صفتوں اور قوتوں میں بین فرق ہوتا ہے بلکہ ابتدائی ارتسامات کے استفادہ اور ان کو محفوظ کرنے میں بھی بڑا اختلاف ہوتا ہے تجربات بھی اپنی اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے مختلف النوع ہوتے ہیں خاصکر اسکولی تجربات اگر ان کا بچے کی خارجی زندگی سے مقابلہ کیا جائے اسی لئے ان بچوں کی باتوں

میں تسلسل کی کمی اور بے ربطی پائی جاتی ہے جو بہت بڑی بربادی، بیکاری و تباہی کا باعث ہوتی ہے

ڈیوی اپنی تصنیف "مدرسہ اور معاشرۃ" میں لکھتا ہے بچہ کے نقطۂ نظر سے مدرسہ میں سب سے زیادہ تضیع علم کا باعث یہ ہے کہ وہ ان تجربات کا آزاد و صحیح استعمال مدرسہ کی چار دیواری کے اندر نہیں کر سکتا جو اس کو مدرسہ کے خارجی اثرات و ماحول سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان علوم کو بھی روزمرہ زندگی میں استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے جو وہ اسکول میں سیکھتا اور حاصل کرتا ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ مدرسہ اور زندگی میں کوئی ربط نہیں اور دونوں کی دنیا الگ اور جدا جدا ہے۔ جب بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان خیالات، ذوق، دلچسپی اور مشاغل کو اپنے ساتھ لاتا ہے جو اس کے گھر، ماحول نے پڑوس میں غالب و قوی تر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو روزمرہ کے تجربات سے استفادہ نہیں کرسکتا وہ دوسرے طریقہ کو استعمال کرتا ہے تاکہ بچوں میں اسکول درس کی دلچسپی پیدا ہو جائے۔

ڈیوی کے نظریہ کے مطابق مدرسہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تجربات کو مہیا اور فراہم کرے جو تعلیمی اقدار رکھتے ہیں تاکہ تمام طلباء اپنی استعداد و قوت کے مطابق علم سیکھ سکیں۔ وہ "ہمارا تعلیمی مسلک" کے دوسرے مضمون میں مدرسہ کو قومی یا جماعتی زندگی کے مشابہ خیال کرتا ہے جہاں سوسائٹی یا معاشرہ کو ترقی دے سکیں۔ مدرسے کو لازم ہے کہ وہ اپنی اندرونی زندگی کی تکمیل معاشرے کی زندگی کے نمونے پر کرے اور ایسے مواقع بہم پہونچائے جن سے فائدہ حاصل کرکے بچے اجتماعی مشاغل و مقاصد کو سمجھ لیں اور ایک حد تک اس میں حصہ لے سکیں۔ اگر مدرسہ بیرونی زندگی سے ربط و تعلق نہیں رکھے گا تو وہ معاشرتی زندگی کے لئے ہرگز مفید نہیں ہوسکتا۔ اور جو کچھ علم و ہنر لیاقت و استعداد بچے وہاں حاصل کریں گے۔ وہ اس کی چار دیواری تک محدود رہیں گی اور جب وہ اس چار دیواری سے باہر نکلیں گے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکیں گے۔

اس کی رائے میں مدرسہ ایک "مخصوص ماحول" کا نام ہے جو معاشرہ کا پیدا کردہ ہے۔

اور جہاں بچوں کے ذہنی اور اخلاقی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے اور جہاں ان کی جبلتیں انفرادی نشو ونما کے مطابق ڈھالی جاتی ہیں۔ اور جہاں ان کو اجتماعی مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ ڈیوی نے اس ماحول کی تین خصوصیات بیان کی ہیں۔ مدرسہ کا ماحول ایسا ہو کہ جدید تہذیب وتمدن کے پیچیدہ مسائل وعناصر زیادہ سہل وآسان طور پر بچوں کے سامنے پیش کئے جائیں کیونکہ بچے بغیر تمثیل کے بآسانی سمجھ نہیں سکتے۔ مدرسہ کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ بچوں کے لئے ایک سادہ ماحول مہیا کرے اور زندگی کے ان عناصر کو منتخب کرے جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو نوعمر طلبا سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان میں ایک خاص ترتیب قائم کرے۔ ابتدا میں آسان چیزیں سکھائے۔ اور ان کی مدد سے آگے چل کر زیادہ مشکل وپیچیدہ امور کی تشریح کرتا ہے۔

دوسری خصوصیت اس ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تہذیب وتمدن کے وہی عناصر منتخب کئے جائے ہوں جو بچوں کی تربیت پر عمدہ اثر ڈال سکتے ہیں۔ صلاح وترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں ایسی چیزیں منتخب کی جائیں جو صریحاً مفید ہیں اور مستقبل اہمیت رکھتی ہیں اس طرح مدرسہ طلبہ کو ایک اعلیٰ تر معیار تمدن سے روشناس کر دیگا اور وہ بڑے ہو کر معاشرے کے مضر اداروں اور طریقوں کی تنقید اور اصلاح کر سکیں گے۔

تیسری خصوصیت مدرسہ کے ماحول کی یہ ہے کہ اس میں تمدنی زندگی کے منتخب عناصر ایک خاص توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مرتب کئے جائیں تاکہ تمدنی زندگی کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کی کشاکش میں نوعمر بچے اور نوجوان جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو کسی خاص طبقے یا خیال کے ساتھ وابستہ کر کے قومی تمدن کے مجموعی نظام سے بے بہرہ نہ ہو جائیں لہٰذا اس مدرسے میں کسی فرقہ پرستی کی تنگ فضا کی جگہ وسیع قومی روایات کا وسیع تر ماحول بہم پہونچانا چاہئے اور اس کو اتنا وسیع وفراخ بنانا چاہئے کہ اس میں آفاقی انسانی تمدن کی روح پیدا ہو جائے۔ اس طرح افراد میں ہم آہنگی، وسیع النظری اور یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

معیاری نمونے کا مدرسہ محض بنالی گھر ہے۔ جو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ تمام فرائض جو ادنیٰ معیار پر گھر میں انجام دے جاتے ہیں اور جن کی ضرورت جدید صنعتی و اقتصادی نظام کے اتفاقات میں برابر پڑتی رہتی ہے۔ باضابطہ و منظم طور پر انجام دی جا سکیں (اسکول و سوسائٹی، ۴۳ ص)

جب ہم ڈیوی کے اس نظریۂ مدرسہ کا موازنہ اپنے مروجہ قومی اسکولوں کے نظری و عملی مشاغل سے کرتے ہیں تو ہم ان دونوں میں بہت کم اشتراک عمل اور اشتراک مقاصد پاتے ہیں مدرسے حالانکہ اس مقصد سے نہیں قائم کئے جاتے کہ ان میں مستقل سکونت اختیار کی جائے وہ صرف علمی درس و تدریس کے مرکز ہوتے ہیں لیکن دونوں کے فرائض علیحدہ نہیں کئے جا سکتے بلکہ دونوں میں رشتہ اخوت و اتحاد ہوتا ہے ڈیوی لکھتا ہے کہ مدرسے عموماً اس لئے ہوتے ہیں کہ طلباء استاد کی سزا کے خوف سے چپ چاپ اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اس کے سبق کو سنیں یا سوالات کا جواب دیں۔ جہاں بچوں کے ساتھ بجائے انفرادی حیثیت کے اجتماعی حیثیت سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اور جہاں بچوں میں جمود، انفعالیت، غیر اعتمادی، عدم طمانیت اور دوسروں پر مکمل اور غیر معقول انحصار کی عادت، فطرت کا جزو لاینفک بن جاتی ہے وہاں کے مدرسوں میں قومی زندگی، معاشری مواقع بالواسطہ ذہنی و اخلاقی اثر، خانگی زندگی، عمل کے نتائج سے تحصیل تجربہ وغیرہ کی امتیازی خصوصیات نہیں ہوتیں اس لئے اس معیار تک لانے کے لئے مدرسے کی نظری و عملی زندگی میں از سر نو مکمل تنظیم کی ضرورت پڑے گی۔

<u>عمرانی و اجتماعی تنظیم نو</u> ڈیوی کا خیال ہے کہ اگر معاشرہ کو ترقی پذیر ہوتا ہے تو تجربہ کی انفرادی تعمیر نو کے ساتھ ساتھ اجتماعی تنظیم ناگزیر ہے بچوں کی تعلیم معاشرہ کی مسلسل حیات کا ذریعہ ہے لیکن وہ معاشرے جو تعلیم کا واحد مصرف و استعمال اپنی حیات کی بقا، تعمیر عمرانی کا افادہ اور افزائش نسل کو تصور کرتے ہیں۔ وہ حالت جمود میں رہتے ہیں ایک حرکی معاشرہ کا کچھ اور ہی فرض ہونا چاہئے اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایسی تعلیم دے کہ جو تغیر پذیر معاشرتی نظام میں آنے والے واقعات کی رہبری کرے تاکہ معاشرۂ مستقبل موجودہ معاشرہ سے بہتر اور اعلیٰ ہو جائے۔

ڈیوی اپنی تصنیف "انسانی فطرت و روش" میں لکھتا ہے کہ حالات جدید کا غیر دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ مسلسل تدریجی، معاشی ترقی اور عمرانی اصلاح کا خاص ذریعہ بچوں کو تعلیم دینے کے مواقع کا استعمال کرنا ہے تاکہ مروجہ خیالات و خواہشات کو برتر و پاکیزہ کیا جاسکے۔ بچے اس زمانہ میں مقررہ رسوم و روایات سے پوری طرح متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے غیر ارادی اور من موجی مشاغل زندگی واضح، تغیر پذیر، آزمائشی، شوقی اور استعجابی ہوتے ہیں۔ بالغوں کی عادتیں مقابلتہً زیادہ متین، مستحکم و پختہ ہو جاتی ہیں۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات سے ان کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ البتہ وہ انتہائی کوشش و جد و جہد سے تغیر پیدا کرسکتے ہیں ممکن ہے کہ وہ لوگ واضح طور پر ضروری اور احتیاجی تبدیلی کا شعور و احساس کرنے سے قاصر ہوں یا ان کے نقصانات کے برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن وہ آئندہ نسل کے لئے بہتر مختلف زندگی کی تمنا کرتے اور خواہشمند ہوتے ہوں۔

لیکن نامعلوم مستقبل کے لئے تعلیم و تربیت دینا کیسے ممکن ہے؟ تعلیم اطفال لازماً بالغوں کے ذمہ ہوتی ہے جن کی عادات و قوت فکریہ قریب قریب مستحکم و پائیدار ہو چکے ہوتے ہیں۔ عادات دائمی و استمرائی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم بدبختی کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اخلاق و سیرت کی تخریب ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ درسی اداروں میں انقلاب پیدا کرنے اور ان مقاصد کی تکمیل کے وسائل حاصل کرنے کی کون سی راہیں ہیں؟ ڈیوی اس سوال کا جواب حسب ذیل الفاظ میں دیتا ہے

"تعلیم اطفال کو بار آور بنانے میں تاکہ معاشرہ کی ترمیم و اصلاح ہو) بالغوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوئی برتر و بہتر ریاست کا مدون و باضابطہ نصب العین پیش نظر رکھیں۔ اگر کسی تعلیمی مہم میں یہ روح جاری ہوگی تو وہ یقینی اپنی غیر متحرک اصلی حالت پہ قائم رہے گی اور اس کا انجام تشدد میں ہوگا۔ ہمارے لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان عادات و خصائل کی تشکیل و تعمیر کی جائے جو مروجہ خصائل سے زیادہ ذکی و زیرک، قوی الادراک، زود فہم، دور اندیشی میں ڈوبے ہوئے، ہست و بود سے زیادہ واقف کار، زیادہ خالص و غیر مبہم، زیادہ زود حس اور اثر پذیر ہوں۔ ایسی صورت میں وہ نئے اور دشوار امور سے دوچار ہوں گے اور ان کے حل و اصلاح کی خود ہی سوچ بچار کریں گے۔ اس کے علاوہ تغیر پذیر معیار و اقدار کے باعث علاج

کی مسلسل تعمیر کو کرنا انقلاب کی تخریب سے روکنے اور حصول استحکام کا واحد طریق عمل ہے۔ انتہائی جمود و غیر معقول سکون باغی و سرکش پیدا کرتا ہے۔ زندگی کی بقا تجدید و تعمیر پر قائم ہے۔ اگر حالات مسلسل تنظیم و تشکیل کے لئے نا مساعد ہیں تو اس کا اچانک وقوع پذیر ہونا کسی نہ کسی وقت لازمی ہے۔ انقلابات کے رونما ہونے کے ذمہ دار وہ لوگ ٹھہرائے جائیں گے جو ہم آہنگی اور تطبیق کے بجائے رسوم کی بقا کو اپنا مطمح نظر رکھتے ہیں۔

حیات امروزہ کی اہمیت | بقول ڈیوی تعلیم اور جدید تمدنی زندگی کا باہمی ربط و تعلق بے حد ضروری ہے وہ روسو کو تعلیم جدید کا پہلا اور سب سے بڑا پیمبر لنتا ہے۔ اس کے نزدیک روسو کی حقیقی عظمت اور حکمت و دانائی کا راز یہی ہے کہ اس نے تعلیم کے بنیادی اصول کو پورے طور پر سمجھ لیا کہ خواہ تعلیم کا مقصد اعلیٰ کچھ ہو اس کا نقطہ آغاز بچے کی شخصیت و ذات ہے جس کی جبلتوں اور کمزوریوں اور مخصوص رجحانات کا احترام اور ان کی ہدایت معلم و استاد کا اولین فرض ہے تعلیم کا مقصد اولیٰ صرف یہ ہے کہ بچوں کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کیا جائے لیکن اس کے یہ بھی معنی نہیں کہ ہم بچوں کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے کچھ نہ دیکھنے دیں۔ اور ان کو ان فرائض و ذمہ داریوں کے لئے تیار نہ کریں جن سے انکو مستقبل میں دو چار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینا بعید از عقل ہے جو عملی نتائج ہوئے وہ زیادہ مضر اور غیر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ معلم بجائے اس کے کہ بچوں کی موجودہ ضرورتوں۔ قوتوں اور دلچسپیوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے انھوں نے مستقبل کی توقعات اور ضروریات کو اپنا نصب العین ٹھہرالیا اور تعلیم کے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا۔ اس میں شک نہیں کہ منزل مقصود تو بلوغ کی زندگی ہے لیکن اس منزل تک پہونچنے کے لئے جس قدر درمیانی منزلیں راستے میں پڑتی ہیں وہ سب بھی اپنی اپنی جگہ اتنی ہی اہم اور قابل توجہ ہیں جتنی وہ آخری منزل اور جب تک ہم بچے کے تعلیمی سفر یعنی اس کی نشو و نما کے ہر ہر قدم کو اس کے لئے معنی خیز اور دلچسپ نہ بنائیں ہم اس کی تربیت کو مکمل نہیں کر سکتے۔ اس کے تجربات میں وسعت اور گہرائی پیدا نہیں کر سکتے۔ معلم کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری اس حقیقت کا پہچاننا ہے کہ ہر نو عمر بچہ ایک مخصوص شخصیت

کا مالک ہے۔ انواع و اقسام کے جواہر و بیش بہا قوتیں اور صفتیں اس میں پنہاں ہیں۔ وہ مخصوص شوق و رجحانات کا مالک ہے جس کا دریافت کرنا اس کا فرض ہے اور جن کی تربیت اور ترقی کے لئے مناسب ماحول اور وسائل فراہم کرنا اس کا خاص کام ہے۔

ڈیوی ان خیالات کی تائید میں روسو کی تصنیف ایمیل کا اقتباس اپنی کتاب "اسکول آف ٹومارو" میں نقل کرتا ہے "ایک انسان کو وہ تمام باتیں جاننا ضروری ہیں جو بچے کے خیال میں غیر مفید اور فضول ہیں کیا بچے کو کچھ سیکھنا لازمی ہے؟ کیا وہ تمام چیزیں سیکھ سکتا ہے جو ایک انسان اور بالغ آدمی کو جاننا چاہیئے؟ ہمارا فرض ہے کہ ہم بچوں کو ایسی چیزیں پڑھانے اور سکھانے کی کوشش کریں جو اس کے لئے بحیثیت بچے کے مفید ہیں اور اگر ایسا کیا جائے تو بچے پورے انہماک سے سارا وقت صرف کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو اس عمر کے لئے تعلیم و تربیت دیں جس عمر تک شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے؟ اور اس تعلیم و تربیت کو پس پشت ڈال دیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے پورا کرنے میں مدد و معاون ہو لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس کی تحصیل بے محل اور بے وقت ہو گی۔ جبکہ اس کو ضروریات استعمال کا وقت آن پڑے۔ روسو لکھتا ہے کہ میں اس کے جواب دینے سے قاصر ہوں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کا قبل از وقت سکھانا ناممکن ہے کیونکہ ہمارا اصلی معلم تجربہ اور شعور ہے اور ایک بالغ آدمی اپنی ضروریات و حوائج کو بھی کبھی نہیں سیکھ سکتا جب تک کہ اس کو ان حالات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ہر بچہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ آئندہ چل کر بالغ و نوجوان ہوگا اس لئے اس کو انسان کے حالات سے روشناس کرنے سے شاید ہدایت کا موقع مل جائے لیکن اس کے لئے وہ تمام باتیں لاعلمی کی حالت میں رہنی چاہئیں جو اس کی عقل و سمجھ سے باہر اور بالاتر ہوں۔ میری پوری تصنیف تعلیم کے اسی بنیادی اصول پر مبنی ہے۔"

بچہ طفلانہ زندگی بسر کرتا ہے اور زندگی کی ہر منزل کی طرح وہ اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جو بالغانہ زندگی کا پیش خیمہ ہونے سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ نشو و نما کی حالت و فطرت اپنی سی ہے۔ اس لئے ہر منزل کی کامیابی کا انحصار اس کی گذشتہ منزل پر ہوتا ہے۔

ہم ادنیٰ، مردہ و خالی الذہن عہد طفولیت پر مکمل و خوشگوار شباب کی زندگی کو استوار نہیں کرسکتے جین پال رچر کا خیال ہے کہ اگر شباب عہد زرّیں نہیں ہے تو پیری میل اور فضلہ ہے۔ عہد شباب اسی وقت خوشگوار و دلچسپ ہو سکتا ہے جب عہد طفولیت ہمارے لئے سرسبز و خوشگوار رہا ہو عہد بلوغ تمام تر تو بتوں کی تبدریج ترقی کا نتیجہ ہے اور عہد شباب کی مکمل نشو و نما کے بغیر ناممکن ہے۔

ڈیوی کے نزدیک تعلیم کا کوئی خارجی مقصد یا کوئی علیحدہ منزل مقصود نہیں وہ خود ہی راہ ہے اور خود ہی منزل بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعہ سے انسان میں علمی، اخلاقی معاشرتی نشو و نما کی قوت زیادہ ہوتی جائے۔ اور اس کی مجموعی شخصیت کی ارتقا برابر جاری رہے ایک واقعی تعلیم یافتہ و جاہل آدمی میں اصلی فرق یہی ہے کہ پہلے میں سیکھتے رہنے کی غیر محدود صلاحیت ہے اور دوسرے میں یہ صلاحیت نہیں پہلے کی تعلیم ہمیشہ جاری رہتی ہے کبھی ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے کی اگر کبھی شروع بھی ہوئی تھی تو اب بند ہے .... حیات بخش صرف وہی علم ہو سکتا ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے ہمیشہ متحرک رہے۔ جب علم میں یا تعلیم میں جمود پیدا ہو جائے تو اصل میں انسان کی زندگی کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اگر تعلیم کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ بچوں کی تمام موجودہ فطرتی قوتیں، رجحانات جبلتیں، شوق اور دلچسپیوں کو بیدار کیا جائے۔ اور ان کی باقاعدہ تنظیم و تشکیل کی جائے۔ تو یقیناً طلبا کی زندگی بدرجہا افضل و بہتر ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مستقبل کے لئے مکمل طور پر تیار و مسلح ہو جائیں گے لیکن دماغی و اخلاقی ارتقائی برتری اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب طلبا خود بالارادہ اور اختیاری طور پر عملی قدم اٹھائیں پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے یا نہیں اگر تعلیم کے معنی نشو و نما کے ہیں تو لازم ہے کہ وہ موجودہ امکانات کو بتدریج قوت سے فعل میں لائے۔ اور اس طرح افراد میں آئندہ کے فرائض پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرے نشو و نما کوئی ایسی چیز نہیں جو یوں ہی کبھی کبھی واقع ہو جایا کرے۔ وہ تو برابر رفتہ رفتہ موجود

کیفیت سے مستقبل کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ اگر مدرسہ کا ماحول اور خارجی حالات ایسے ہیں جن میں بچوں کی موجودہ صلاحیتوں کو مناسب طریقہ پر کام میں لایا جا سکتا ہے تو مستقبل جو حال ہی میں سے پیدا ہوتا ہے خود بخود بہتر اور خاطر خواہ صورت اختیار کرے گا غلطی یہ نہیں کہ بچوں کو مستقبل کیلئے تیار کرنے پر زور دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کو موجودہ کوشش اور جدوجہد کا مرکز و مدار قرار دیا جائے چونکہ واقعتاً یہ بات بہت اہم ہے کہ نوعمر طلبہ کو اس زمانے کی زندگی کے لئے جو دم بدم ترقی کرتی رہتی ہے تیار کیا جائے۔ اس لئے لازم ہے کہ ان کے موجودہ تجربات کو معنی خیز و گوناگوں بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس طرح غیر محسوس طریقہ پر حال مستقبل کی فکر خود بخود کر لیگا

اس نظریہ کی رو سے تعلیم کے مطمح نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے ہم لوگ ابھی تک اسی خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ بالغوں کے معاشرہ کے معیار کے مطابق بچوں کی نشو و نما تربیت ہونی چاہیئے علم ذوق و شوق، عادات و اخلاق میں بچے بالغوں کے معیار پر پرکھے و جانچے جاتے ہیں اور ہر شخص کی نظر میں اچھے بچوں کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور بڑوں کو بہت کم پریشان و دق کرتے رہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بچے اپنی طفلانہ زندگی میں بزرگوں سے بالکل مختلف ذوق و شوق مشاغل اور اخلاقی معیار رکھتے ہیں اور یہی بچوں کے ذوق و شوق اور مشاغل ہر حصول علم کے لئے اور ان نتائج و مسائل کے لے جو اس سے وابستہ ہیں بہت ضروری اور اہم ہیں بالفاظ دیگر یوں سمجھے کہ نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ بچے اس کے حاصل کرنے میں اپنے گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں اور موجودہ زندگی کے تجربات میں اضافہ کر سکیں تاکہ وہ مستقبل کے حوادث سے دوچار ہونے میں خضر راہ کا کام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کو از سر نو مدون کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

<u>تدوین نصاب</u> اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ بچوں کو ایسے تجربات بہم پہونچائے جائیں جو سبق آموز ہوں جو بچوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکیں یعنی بچوں کی حاجت تجسس رفع کرنے میں معین ہوں تاکہ بچے کھیل کود کی طرح اس کو اختیاری طور پر سیکھ لیں تحصیل درس ہی ہمارا نصب العین نہ ہونا چاہئے حصول علم

کے معنی حفظ کرنے کے نہیں بلکہ اس کا مقصد اعلیٰ زندگی کو اور زیادہ دلچسپ و کامیاب بنانا ہے۔ اس عملی پہلو کے بغیر ہمارے تجربات کی تعبیر نو میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ روسو نے اسی چیز پر زور دیا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ قدیم طرز تعلیم جس میں پرانے آیات و نشانات علوم کو طوطے کی طرح رٹا دیا جاتا تھا مسترد کر دی جائے اور اس کی جگہ تحصیل تجربات کو خاص اہمیت دی جائے بقول ڈیوی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا و مہیا کرے جو طلبا اور متعلم کے احساسات و رجحانات کو بیدار کرنے کے علاوہ اس کی حیات میں معین ہو۔ دوسری بہت اہم بات عمرانی ماحول کا پیدا کرنا ہے جو بچوں کے عادات و خصائل کی اصلاح ان کے اجتماعی احساس اور ان کی ذہنی و عقلی قوتوں کی نشو و نما کر سکے مدرسے میں ایسے مشاغل ہونے چاہئے جو عقلی تربیت اور سائنس کے معلومات حاصل کرنے میں آسانیاں بہم پہونچائیں علمی تحقیقات، اختراع و ایجاد کے لئے بیشتر حصہ تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کیا جاتا ہے لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں مروجہ و مقررہ نصاب تعلیم میں ایسے مواقع بہت مشکل سے پائے جاتے ہیں ڈیوی نے نہایت خوش اسلوبی سے اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے

انسان کے جتنے مشترک اور اہم ترین مشاغل ہیں ان کا تعلق خوراک مکان، لباس اور مکان کے ضروری سامان سے اشیاء کے بنانے، ان کا مبادلہ کرنے اور ان کو صرف کرنے کے ذرائع و وسائل سے ہے چونکہ یہ تمام چیزیں انسانی زندگی کی ضرورت اور آسائش سے متعلق ہیں اسی لئے وہ انسانی جبلتوں کی گہرائی تک پہونچتی ہیں اور ان میں جو معلومات اور اصول پنہاں ہیں وہ تمدنی لحاظ سے بہت اہمیت اور قدر رکھتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ باغبانی، پارچہ بافی، لکڑی اور دھات کا کام، کھانا پکانا اور اسی قسم کے مختلف مشاغل جو انسانی کاروبار میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور مدارس جدید میں داخل کئے گئے ہیں محض روزی کمانے کا ذریعہ ہیں تو ہم ان کی واقعی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہیں گے، مانا کہ عام طور پر لوگوں کو صنعت و حرفت کے تمام کاروبار ایک ناگزیر مصیبت معلوم ہوتے ہیں جس کو محض حصول معاش کی خاطر گوارا کرتے ہیں لیکن یہ قصور ان کاموں کا نہیں بلکہ ان حالات کا ہے جس میں یہ کام کئے جاتے ہیں دور حاضرہ کی زندگی میں اقتصادی معاملات کی اہمیت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے اس لئے

تعلیم کا فرض ہے کہ وہ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ تمدنی بہبود کا انحصار ان معاملات پر ہے اور ان کا سائنس پر مدرسوں میں یہ مشاغل کسی مالی منافع کی خاطر جاری نہیں کئے جاتے بلکہ اپنی داخلی قدر و قیمت کی بنا پر جب یہ تمام خارجی اثرات اور روپیہ کمانے کی خواہش سے آزاد ہو جاتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے ایسے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بجائے خود مفید ہیں۔ اس وقت وہ واقعتاً دماغ کی آزاد تربیت کا باعث ہوتے ہیں۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈیوی نے بحیثیت ناظم شکاگو ابتدائی اسکول اور مدرسین کی مدد و مشورہ سے ان مشاغل کا انتخاب کیا جو بچوں کے لئے بے حد مفید ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نصاب تعلیم کو حسب ذیل سوالات کے پیش نظر مرتب کیا۔

اول۔ کیا یہ ممکن ہے اور کیونکر کہ مدرسے کو بجائے تعلیمی و تدریسی مرکز بنانے کے جہاں صرف چند مضامین کی ترتیب ہو اس میں گھر اور گرد و پیش کی زندگی سے تعلق اور عملی ارتباط پیدا کیا جائے اور کون سی تدابیر اختیار کی جائیں کہ مدرسے اور روزمرہ کی زندگی میں جو وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے یک قلم مفقود ہو جائے؟

دوم۔ کون سی صورت اختیار کی جائے کہ تاریخ، سائنس، آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ اصلی زندگی میں قطعی اور حقیقی فائدہ پہونچائیں اور چھوٹے سے بچے کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کا حاصل کرنا محمود اور قابل قدر ہے؟

سوم۔ ظاہری شعبوں کی تعلیم (مثلاً لکھنا۔ پڑھنا۔ ہندسوں کا استعمال) میں اور حال کی زندگی میں کس طور پر باہم ارتباط پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ بچے ان مضامین میں غیر معمولی شوق و دلچسپی حاصل کریں اور ان کو واقعتاً اس بات کا خیال ہو کہ وہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں؟

چہارم۔ بچوں کی طرف انفرادی توجہ کس طرح مبذول کی جا سکتی ہے؟

ڈیوی نے ان تمام مسائل پر ہر پہلو سے خوب غور و خوض کرنے کے بعد تدوین نصاب میں حسب ذیل مشاغل کو شامل کیا جو بچوں کی مکمل تعلیم کے لئے بہت مفید ہیں۔

مدرسوں میں طلبا، کاغذ، گتا، لکڑی، چمڑے، کپڑے، سوت، مٹی، ریت اور دھاتوں کا کام کرتے ہیں۔ کبھی اوزاروں کی مدد سے اور کبھی ان کے بغیر اس قسم کے کاموں کو کرتے وقت انھیں بہت چیزیں سیکھنی اور کرنی پڑتی ہیں۔ مثلاً کاغذ کاٹنا، تہ کرنا، سوراخ کرنا، ناپنا، ڈھالنا، ماڈل بنانا، نمونے کاٹنا، گرم کرنا، ہتوڑے، آری و ریتی سے کام کرنا یہ سب کام مشق کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مختلف دلچسپ مشاغل کے سلسلہ میں کرنے پڑتے ہیں مثلاً علاوہ طرح طرح کے کھیلوں کے تفریحی سفر کے لئے جانا۔ باغبانی، کھانا پکانا، سینا، چھپائی، جلد سازی، کپڑا بننا، رنگ بھرنا، تصویر کشی، ڈراما کرنا، کہانیاں کہنا اور لکھنا پڑھنا نہ صرف اس مقصد سے کہ ایک خاص فن سیکھنا ہے جو مستقبل میں فائدہ پہونچائے گا بلکہ اس خیال سے کہ یہ عملی مشاغل موجودہ اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معین ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب طلبا میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے وہ اپنے مشاغل کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں تو وہ ان کو اور زیادہ سرگرمی، شوق و انہماک سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدرسے کے مشاغل میں خاص طور پر جس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ مضامین نصاب کا ربط ہے یعنی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ہر مضمون اپنی جگہ پر مکمل اور مستقل ہو بلکہ تاریخ و جغرافیہ، ریاضی و ادب سائنس و فلسفہ، علم نباتات، علم حیوانات، علم زراعت وغیرہ کے درمیان باہمی تعلق و ربط ہو اور اس کے ساتھ ہی طلبا کی زندگی و تجربات سے بھی تاکہ بچے اپنے گرد و پیش کے مشاغل، تعلقات اور کاروبار کو اچھی طرح سمجھیں اور جب زندگی کے پیچیدہ اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے حل کرنے میں زیادہ دشواری و پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

ڈیوی کا مدرسہ تھوڑے ہی عرصہ تک قائم رہا لیکن اس نے تعلیمی دنیا میں ایسا بیش بہا اضافہ کیا کہ اس کا اثر چار دانگ عالم میں بہت گہرا اور مستقل ہوا۔ اس عملی مدرسہ نے وہ کامیابی حاصل کی کہ ڈیوی نے تمام دنیا سے مسلم الثبوت استاد اور معلم ہونے کا لوہا منوا لیا۔ اس معلم و مفکر نے اپنی تصنیف "مستقبل کے مدرسے" میں ان تمام مدرسوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو تعلیم

اصولوں پر قائم کئے گئے ہیں ان کی تعداد ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور ہر مدرسہ اپنی انفرادی کاوش و تجربہ سے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ان مدرسوں میں جو انہیں اصول پر کامیابی کے ساتھ کام کر رہے ہیں مسٹر جانسن کا اسکول واقع فیرہوپ پروفیسر جے ایل میریم کا میسوری ابتدائی اسکول گیری (انڈیانا) کا پبلک اسکول وغیرہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر ایلسورتھ کولنگس چودہ پندرہ سال سے میسوری کے دیہاتی مدرسہ میں ان اصولوں پر عملی تجربہ کر رہے ہیں اور تجربات و مشاہدات، عملی مشاغل اور سائنٹیفک نتائج کو ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی ضروریات و مقاصد زندگی کو پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا تھا۔ روزمرہ کے کام کی کامیابی و ناکامی کو دیکھ کر نصاب مرتب کیا اور بچوں ہی کی رائے کے مطابق تعلیم دیتے رہے۔ انھوں نے مقررہ مضامین کو بالکل اہمیت نہیں دی لیکن اگر ضروری سمجھا تو ان کو داخل بھی کر لیا۔ انھوں نے زندگی اور اسکول کے درمیان رشتۂ اتحاد و موانست کو قائم کیا روزمرہ کا دستورالعمل (۱) قصہ گوئی۔ (۲) تعمیری کام (۳) کھیل کود۔ (۴) تفریحی سفر پر مشتمل تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بچے اپنے مشاغل کا حسن انتخاب کر سکیں اور ان کو نہایت خوبی و کامیابی کے ساتھ انجام دیں اور اس طور پر ان میں خلقی اُنس، روحانی محبت، اخوت، مساوات، دیانتداری، حسن اخلاق وفاداری، نیک دلی، رحم، قومی روح، سماجی روح اور عملی زندگی پیدا کر دیں۔ پروفیسر کلپیٹرک مشہور و معروف پروفیسر ٹریننگ کالج نے اس مدرسہ کی کامیابی پر بہت عمدہ رائے کا اظہار کیا ہے

ہندوستان میں مسٹر ہیگی نے موگا اسکول کی بنا اسی منصوبی طریقے پر ڈالی ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ روزافزوں ترقی کر رہا ہے وہاں بچوں کی مکمل اور عملی تربیت کے لئے ایسا ماحول پیدا اور فراہم کیا گیا ہے جس سے بچے نصاب تعلیم اور زندگی کے مشاہدات و تجارب میں ربط قائم کر سکیں موجودہ واردھا اسکیم بھی اسی اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے اور منصوبی طریقے کو رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسی نظریہ سے کسی حد تک تجاوز کر کے اور ہندوستانی ماحول کو پیش نظر رکھ کر شاعر اعظم

رابندرناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتان اور سری نکیتان کو قائم کیا۔ انھوں نے عملی ارتباط اور ذہنی تعاون کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ جہاں بچوں کی شخصیت کا احترام کیا جاتا ہے کیونکہ ان ہی کی فطرت خوابیدہ میں وہ جوہر نہاں ہیں جن کو بیدار کرنے سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔ بقول ٹیگور "ہر طفل نوزائیدہ دنیا میں پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا۔"

دوسرا مدرسہ جامعہ ملیہ ہے جہاں بچوں کو اسکولی زندگی اور عملی زندگی کے تعلق سے روشناس کیا جاتا ہے اور پروفیسر پادرتھ کے اس قول پر عمل ہوتا ہے کہ مدرسہ کو بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہونا چاہیے جس میں وہ تمام عمدہ اثرات اور مشاغل مہیا کئے جائیں جو تمدنی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔

(ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی)

ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کیا ہے؟

اس وقت جبکہ "مہذب ومتمدن" اقوام عالم، نہایت بیدردی وسفاکی کے ساتھ ایک دوسرے کا خون بہانے اور اپنے ہاتھوں اپنی تہذیب وتمدن کے آثار مٹانے پر تلی ہوئی ہیں، مسلمانان ہند کے سامنے علمی حیثیت سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ ان کے تمدن وتہذیب کا کوئی مستقل وجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے صحیح ومتعین حدود کیا ہیں اور اس کی حفاظت واشاعت کے طریقے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

مسئلہ زیر بحث پر رائے زنی کرنے والے حضرات تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) ایک وہ گروہ جس کے نزدیک "اسلامی تہذیب" ایک مکمل وجامع تہذیب ہے، اور بغیر اس کو اختیار کئے مسلمان نہ تو روحانی ترقی کر سکتے ہیں اور نہ مادی (۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو سرے سے اسلامی تہذیب کے وجود ہی کا قائل نہیں، اور اس کے نزدیک مذہب اور فرقہ کی بنا پر تہذیب کی تقسیم ہی غلط ہے (۳) تیسرا گروہ بین بین ہے یہ گروہ اسلامی تہذیب اور اس کی شاندار ماضی کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی موجودہ زمانے کی پرآشوب فضا کے پیش نظر اپنی قوم کو "مصلحت اندیشی" کا مشورہ نیک نیتی کے ساتھ دینا چاہتا ہے۔

اس گروہ میں اچھی خاصی تعداد ان حضرات کی ہے جو عام ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے کو علمی اور تعلیمی خدمات کے لئے وقف کر چکے ہیں اور ہر مسئلہ پر جذبات کی رو میں نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں غور کرنا چاہتے ہیں۔

مضمون ذیل میں پہلے گروہ یعنی اسلامی تہذیب کو مکمل اور جامع ماننے والوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کی جائے گی اور خصوصیت کیساتھ اس تیسرے گروہ سے جو مصلحت اندیشی کا قائل اور اپنے نزدیک روش اعتدال پر گامزن ہے گفتگو کی جائے گی جون ۱۹۴۰ء کے جامعہ میں اس گروہ کے جذبات کی ترجمانی ایک فاضل پروفیسر کے قلم سے سنجیدگی ومتانت کے ساتھ ہو چکی ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اسلامی تہذیب کے مستقل وجود کو ثابت کرنا ہے۔ یہ دعویٰ کہ مسلمانوں کو

کبھی نرالے یا انوکھے بننے کا شوق نہ ہوا۔ اور ہماری تاریخ میں کوئی ایسا دور نہ ملے گا جب مسلمانوں کی زندگی میں ایسی عجیب یا غیر معمولی خصوصیتیں تھیں کہ جن پر فوراً نظر پڑتی اور آسانی سے بیان کر دی جائیں۔"
تاریخ اسلام کی بدیہیات کے منافی ہے۔ عرب جاہلیت میں جو رسوم و رواج پھیلے تھے۔ اسلام نے ان سب کو کالعدم کیا۔ شراب و قمار، سود و بدکاری کے رائج الوقت طریقے جو اس زمانہ کی تہذیب کے عناصر تھے، ایک ایک کر کے حرام و ممنوع قرار دے گئے۔ اسلام قبول کرنے والوں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ کسی حال میں وہ ایک وقت میں چار عورتوں سے زیادہ اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتے۔ جھوٹ، مکر و فریب، مروجہ شاعری (جو ہر قسم کے لغو و سفلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی) کو سخت ترین الفاظ میں مذموم اور قابل ترک ٹھہرایا گیا پھر نوبت یہاں تک پہونچی کہ عرب کی سرزمین کو مقدس اور محض مسلمانوں کے لئے مخصوص قرار دیا گیا اور جملہ دیگر تہذیبوں کا وہاں سے خاتمہ کر دیا گیا۔ اس اصول پر ان اماکن مقدسہ میں غیر مسلم کا قدم رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ خلافت راشدہ میں اسلامی فتوحات جہاں جہاں ہوئیں مسلمانوں کی انفرادی حیثیت ہر جا نمایاں رہی اور ہر جگہ وہ "نرالے اور انوکھے" سمجھے گئے۔ خلفاء خصوصاً حضرت عمرؓ عساکر اسلامیہ کے جنرلوں اور سپاہیوں سب کو اس امر کی مؤکد ہدایتیں دیتے رہے کہ اپنی وضع قطع و طرز معاشرت میں اپنے مفتوحوں سے جدا رہنا عجمیوں یا رومیوں کی تن پروری اور عیش میں نہ پڑنا۔ اس زمانہ میں روم و ایران کے تمدن عروج پر تھے۔ لیکن اس زمانے کے مجاہد مسلمانوں نے ان کو حقارت کے ساتھ ٹھکرایا اور ان کی جگہ اسلامی تمدن و تہذیب کی اشاعت کی کہ بغیر اس کے تبلیغ اسلام ناقص اور ادھوری رہتی۔ خلفاء عباسیہ کے دور میں جبکہ دربار میں بہت کچھ عجمیت داخل ہو چکی تھی، عباسی شہزادے بچپن میں عموماً عرب بھیج دئے جاتے تھے تاکہ سرچشمۂ اسلام عرب کے تمدن سے وہ بیگانہ نہ ہونے پائیں۔ ترکوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے ملک کے رسم و رواج کو تقریباً فراموش کر کے تمام تر اسلامی تہذیب و تمدن اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ خلافت کا بار بھی اپنے کاندھوں پر لیا جس کا سلسلہ ۱۹۲۴ء تک جاری رہا۔ یہ خلافت کیا تھی؟ بڑی حد تک اسلامی تہذیب و تمدن کی یادگار اور اس کے لئے بمنزلہ سرچشمہ کے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی مسلمانوں کی تہذیب کے آثار ان کے ہر دور حکومت میں بکثرت پائے جاتے ہیں اکبر کے "وسیع المشربی" کے دعویدار کے دربار میں بھی تمدن اسلامی کی جھلک نظر آتی رہی علما و فضلا اپنے مخصوص لباس میں جو کسی طرح بھی اس زمانہ کے ہندی تمدن سے متاثر نہ تھا اس کے دربار میں بیٹھتے تھے۔ بلکہ بہت سے ہندو درباریوں نے بھی اسلامی تمدن بہت کچھ اختیار کر لیا تھا چھوت چھات کی بندشیں جو اس زمانہ کی ہندو تہذیب کا ستون تھیں، مسلمانوں کی تہذیب میں ایک لمحہ کے لئے بھی جگہ نہ پا سکیں ستی اور اس قسم کی دوسری وحشیانہ رسوم پر پابندیاں مسلمانوں ہی نے عائد کیں۔ ہندوستان کا لباس مسلمانوں کی آمد سے قبل تقریباً نیم برہنگی کا تھا مسلمانوں کی آمد نے لباس کو پوری طرح لباس ساتر بنایا، اور یہاں کی مختلف بولیوں کو اکٹھا کر کے ایک نئی زبان کی تشکیل کی جس پر غلبہ اسلامی تہذیب ہی کا تھا۔ ہندوؤں کے متعدد گروہ خصوصاً کایستھ اس سے اب تک بہت کچھ متاثر ہوئے۔ ان کی بول چال لباس بعض جگہ کھانا بھی مسلمانوں کا سا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تہذیب کا کوئی مستقل وجود نہ ہوتا یا اس میں دوسروں کو جذب کرنے کی خاصیتیں نہ ہوتیں تو ہرگز ہندوستان میں مسلمان ایک طاقتور اقلیت بلکہ بعض بعض صوبوں میں اکثریت کی حیثیت حاصل نہ کر سکتے۔

مسلمانوں کی یہ تہذیب عالمگیر اور بین الاقوامی حیثیت کی مالک رہی ہے یہ ضرور ہے کہ ہر ملک کی آب و ہوا، اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے مختلف ممالک میں تھوڑی تبدیلیاں آپ کو ملیں گی لیکن ایسے ضروری اجزا جن سے ایک مسلمان فوراً ممتاز ہو جاتا ہے، مسلمانوں میں ہر جگہ آپ کو ملیں گے۔ سلام کا مروجہ طریقہ ہر اسلامی ملک میں ایک ہے۔ مسلمان خواہ کہیں بستا ہو۔ لازمی طور پر مختون ہوگا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کے اعمال و اقوال اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے بہت کچھ جدا ہوں گے۔ دائیں ہاتھ سے کھانا کھانا۔ طہارت کی پابندی۔ بات بات پر خدا کا شکر ادا کرنا مصیبت پر تلقین صبر کرنا، شراب اور قمار وغیرہ سے بہ نسبت دوسری اقوام کے زیادہ محترز رہنا۔ کہ معظمہ کو اپنا مرکز سمجھنا۔ شرک سے بچنا۔ بچہ کی پیدائش کے وقت اس کے کان میں بانگ اذاں پہونچانا۔ مرنے کے

بعد تجہیز و تدفین کے مخصوص اعمال، وغیرہ اسی قسم کے صدہا امور ہیں جو دنیا کے ہر گوشہ کے مسلمانوں میں کم و بیش ملیں گے، اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم میں نہیں ملتیں۔

مسلمانوں کی اس تہذیب کی عالمگیریت اور بین الاقوامیت قائم رکھنے کے لئے اس تہذیب کا منفرد و ممتاز ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تبلیغ و اشاعت بھی جاری رکھی جائے۔ دنیا میں نئی نئی تہذیبیں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ ابھی کل تک ہندوستان میں انگریزوں کی تقلید منتہائے فیشن سمجھی جاتی تھی ہر جا کوٹ پتلون والے کی عزت کی جاتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ پلٹ چلا، اب گاندھی ٹوپی اور کھدر کے لباس کو بہت کچھ اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ آئین جہاں یونہی بدلتا رہتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں لچک بھی ہے اور سختی بھی۔ تعصب بھی ہے اور رواداری بھی۔ وہ ہر تہذیب کی اچھائیوں کو اپنے اندر اس طرح لے لیتی ہے کہ اس کی جداگانہ ہستی ہونے پر کوئی ضرر نہ آئے ہزار سال گذر جانے پر اس کی جداگانہ ہستی مضبوط چٹان کی طرح قائم ہے۔ اس کو کسی تہذیب کی چیز لینے سے اس بنا پر اعتراض نہیں کہ وہ فلاں فرقہ یا قوم کی ملک یا ایجاد ہے۔ ہاں اسے اس پر ضرور اعتراض ہے کہ اس اچھائی یا چند اور اچھائیوں کی بنا پر کسی دوسری تہذیب کو اسلامی تہذیب سے فائق سمجھ لیا جائے۔ ہر تہذیب کو خواہ وہ دیسی ہو یا بدیسی اسلامی تہذیب کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ آپ اسلامی تہذیب کو ایک گونہ جارحانہ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی ہم پر قابو پا چکی ہے اپنے یہاں کا زر خالص دوسروں کے پیتل کے مقابلہ میں بلحاظ آب و رنگ کمتر معلوم ہو رہا ہے لیکن نظر کی یہ غلطی اور ذہن کی یہ غلامی سدا قائم رہنے والی نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ان کی تہذیب بڑے بڑے خطرات سے دوچار ہو چکی ہے لیکن ہمیشہ پھر ابھری ہے اور اس کا ہر ابھار گمراہوں اور دشمنوں کو راہ راست پر لا چکا ہے اور ان سے اس تہذیب کی خوبیوں کا اعتراف کرا چکا ہے۔

۱ آج کل اپنی رواداری اور بے تعصبی کے اظہار کے لئے ہمارے بعض علمی حلقوں میں یہ کہا

جاتا ہے کہ اب ہر جگہ علم کا شیوع ہو چکا ہے۔ اب مومن و مشرک، مسلم و کافر کی تفریق پر زور نہ دینا چاہئے بلکہ اسلامی تہذیب کو اب دوسری تہذیبوں کے ساتھ ملا دینے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ اس امتزاج پر مسلمانوں بلکہ انسانیت کی ترقی کا انحصار ہے۔ اس دعویٰ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مومن و مشرک کی تفریق اور اس پر اصرار اس وقت تک ضروری تھا جبکہ مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جاتا تو "اسلام" یہاں کے فرقوں میں سے ایک فرقہ بن جاتا۔ علم، معقولیت اور فطرت کا مذہب نہ رہتا۔ لیکن اب جبکہ عقل کی قدر اتنی بڑھ گئی ہے کہ مذہب بھی کہیں کا نہ رہا تو ہمارا اس پر اصرار کرنا کہ ہم سب سے الگ ہیں خود ہمارے آئین کے خلاف پڑ سکتا ہے۔"

مذکورہ بالا دعویٰ ہندو بیرون ہند کے روزانہ کے واقعات کے جتنا خلاف ہے، کیا اس کے بیان کرنے کی حاجت ہے؟ ہندوستان میں آج "عقل کی قدر" بڑھ جانے اور "مذہب کے کہیں کے نہ رہنے" کے باوجود بھی کیا ہندو مسلم فساد موقوف ہو گئے ہیں؟ کیا خالص علمی درسگاہوں اور قومی انجمنوں میں مسلم غیر مسلم کی تفریق پڑھے لکھوں کے ہاتھوں مٹ چکی ہے؟ کیا سرکاری محکموں اور دفتروں میں جہاں جہلا نہیں تعلیم یافتہ ہی ہوتے ہیں محض کسی خاص فرقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر ناانصافی کے واقعات سننے میں نہیں آتے؟ اردو ہندی کا جھگڑا، مشترکہ اور جداگانہ انتخاب کا قضیہ، پاکستان اور دستور ساز اسمبلی کے مطالبے کیا سب پڑھے لکھوں، در تعلیم یافتہ لوگوں کے پھیلائے ہوئے نہیں؟ ہندوستان کے باہر نگاہ ڈالئے، ان ممالک پر نگاہ ڈالیے جو علم کے معدن، تہذیب کے مخزن سمجھے جاتے ہیں وہاں کے امن کی جو حالت ہے اس کے متعلق کیا ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت باقی ہے؟ جرمنی کے نزدیک ہٹلر ازم، روس کے نزدیک بالشویزم، اور اٹلی کے نزدیک فیسزم کی جبریہ اشاعت یورپی ممالک سے یہودیوں کا ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے کی بنا پر اخراج یہ سب کس چیز کو ظاہر کر رہے ہیں؟ علم و تعلیم نے تہذیب و تمدن نے تفریق و امتیاز کو گھٹایا یا بڑھایا؟ غریب مذاہب جن چیزوں کے لئے بدنام تھا کیا ان سے بدرجہا زائد آج دنیا میں نہیں ہو رہا ہے؟

اس وقت ہمارا خاموش رہنا اور اسلامی تہذیب و تمدن کی اشاعت کو مصلحت اندیشی کی نذر کر دینا نہ صرف ہمارے وجود کو فنا کر دے گا بلکہ ساری انسانیت کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہوگا۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی تہذیب کی خوبیوں کو اپنے قول و عمل سے دنیا پر واضح کریں اور بتائیں کہ امن و سلامتی کا راستہ صرف یہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر مسلموں کا گلا کاٹنے لگیں یا ان کے مال و دولت پر حملہ شروع کر دیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اپنی ہستی بحیثیت مسلمان کے قائم رکھیں۔ اپنی ان تمام خوبیوں کو جو ہماری تہذیب میں ورثتاً چلی آ رہی ہیں (مثلاً جذبۂ انسانیت، مساوات، عقل کا صحیح استعمال، سچے علم کی طلب اور محض طلب علم پر اکتفا نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل بھی)، نہ صرف قائم رکھیں بلکہ دوسروں کو بھی انھیں کی تلقین کریں۔ لیکن اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے عقیدہ و عمل میں ہم آہنگی ہو۔ ذہنی غلامی اور غیروں کے رعب سے ہمارا عقیدہ شمہ برابر بھی متاثر نہ ہو۔ اور ہمارا عمل خلوص سے لبریز اور ریا سے معرا ہو۔

ہماری تہذیب کے علاوہ اس ملک میں دو بڑی و نمایاں تہذیبیں اور ہیں جن سے ہمیں مقابلہ کرنا ہے پہلی تو فرنگی تہذیب ہے۔ سات سمندر پار سے آئی ہوئی اور علاوہ حکمراں طبقہ کے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں بھی بہت کچھ رائج۔ دوسری ہندوؤں کی تہذیب جو عرصہ تک مردہ حالت میں رہی تھی، لیکن بعض قومی تحریکات کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ اور بعض ہندو زعما کی جان توڑ کوششوں کی بدولت از سر نو زندہ کی جا چکی ہے۔ اور متحدہ قومیت کے پردہ میں اس کو مسلمانوں کے سر منڈھنے کی باضابطہ سعی کی جا رہی ہے۔ ان دونوں تہذیبوں میں باہم اختلافات بھی ہیں اور مشترک چیزیں بھی۔ اسماء و اصطلاحات کے اختلافات باہم ملیں گے لیکن جہاں تک "اسلامی تہذیب" سے دشمنی کا تعلق ہے اور دشمنی بھی کیسی جانی دشمنی، ان دونوں تہذیبوں میں "تیر قضا" اور "بر تیر قضا" کا فرق ہے۔ سنکھیا کو خواہ آرسینک کے انگریزی نام سے پکاریئے یا اس کو سنکھیا کے ہندی نام سے موسوم کیجئے ہلاکت اس سے بہرحال یقینی ہے۔ نام اور اصطلاح کا فرق اس کی خاصیت کو تبدیل نہیں کر سکتا!

یہ دونوں تہذیبیں جیسا کہ ان کا طرز عمل بتاتا ہے سراسر جارحانہ ہیں۔ فرنگی تہذیب کو اگر حکومت کی سرپرستی اور ساتھ ہی فرنگی علوم نظری و عملی کی تائید حاصل ہے تو ہندی تہذیب کو ہندوستان کی

اکثریت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ہندوستان کے مہاتماؤں، اور سرگرم عمل قومی انجمنوں کی طرف سے اس کا پرچار جاری ہے۔ موجودہ زمانہ پروپگنڈہ کا ہے۔ ان دونوں تہذیبوں کے حامل مسلمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور کہیں زیادہ پروپگنڈے کی اہمیت سے نہ صرف آشنا بلکہ مالک ہیں تعلیم گاہوں میں عمومی طور پر وہی چھائے ہوئے ہیں، پریس ان کا، سینما کے اسٹیج پر انھیں کے پیش کردہ مناظر، اور ریڈیو کی مشین سے انہیں کی بولی سنائی دیتی ہے۔ ان سب ذرائع ووسائل سے ہمارے تہذیبی خصائص ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے ہیں۔ رواداری اس وقت تک روا رکھی جاسکتی ہے جبکہ خود ہماری ہستی قائم رہے۔ ایسی رواداری جس کی بدولت ہم فنا ہو جائیں، کس آئین دانش کے مطابق ہے

یہ دونوں تہذیبیں صاف صاف کہہ رہی ہیں کہ آؤ ہم میں ضم ہو جاؤ! ہم اس انضمام واشتراک کے لئے شاید تیار ہو جاتے بشرطیکہ ہمیں یقین ہوتا کہ ہمیں اس سے کوئی فائدہ پہونچے گا۔ اور ہماری تہذیب انفرادی کے بجائے مشترکہ بن کر ہماری ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی لیکن افسوس تجربہ اور عقل دونوں ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ خیال سراسر خام ہے۔ ان تہذیبوں میں سے کسی ایک سے بھی اتحاد وانضمام ناممکن العمل ہی نہیں ناممکن التصور ہے۔

فرنگی تہذیب مسلمانوں نے اختیار کی اس میں انتہائی توغل وانہماک رکھنے اور نقل کو زیادہ سے زیادہ مطابق اصل بنانے کے باوجود بھی کیا ان کو یورپینوں کے مساوی حقوق حاصل ہو گئے؟ مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے نہیں خالص مادی وسیاسی اعتبار سے سہی؟ "نیٹو"، اور اس قسم کے تحقیری کلمے وحشی اور جاہل ہندوستانیوں کے علاوہ تعلیم یافتہ وتہذیب یافتہ ہندوستانیوں کے متعلق کیا نہیں سنے گئے؟ رنگ ونسل کا سوال آج سے چند سال قبل تو اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں اور ریل کے اونچے درجوں میں کتنا زیادہ اٹھتا تھا؛ اور اب بھی کبھی نہ کبھی ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ بڑے سرکاری عہدوں میں محض ہندوستانی یا مسلمان ہونے کی بنا پر کیا ناانصافیاں موقوف ہو گئی ہیں؟ یہ ان لوگوں کا انجام ہوا جنھوں نے اپنی تہذیب کو ترک کر کے فرنگی تہذیب اختیار کر لی تھی اور بالکل اس میں ضم ہو گئے تھے

اِس سے مسلمانوں کو من حیث القوم، خالص مادّی اعتبار ہی سے دیکھئے آخر کیا فلاح پہونچی؟ نصف صدی یا اس سے زائد کے تجربات کیا عبرت کے لیے کافی نہیں؟

اب رہی ہندو تہذیب جو ہندی قومیت کی آڑ میں لائی جارہی ہے۔ فرض کیجئے کہ مسلمان اس کو جبراً یا برضا خود قبول بھی کرلیں، اور اپنی وضع قطع بالکل ہندؤں کی سی بنالیں، پاجامہ کی جگہ دھوتی، لوٹے کے بجائے لٹیا، اردو کی جگہ ہندی وغیرہ کا استعمال شروع کردیں، تب بھی کیا ہندو ان کو اپنا سا سمجھنے لگیں گے؟ کیا اسوقت وہ ان کو اپنی طرح اس ملک کی قسمت کا حصہ دار تسلیم کرلیں گے؟ کیا ایسی صورت میں وہ مسلمانوں سے چھوت چھات چھوڑ دیں گے؟ کیا اسلامی نام رکھنے والوں کے ساتھ ملازمتوں وغیرہ میں جو تعصب برتا جاتا ہے اس میں اس تبدیلی سے کچھ بھی کمی واقع ہوجائے گی؟ سوال کے جواب کے لئے نئے تجربہ کی ضرورت نہیں، ہندؤں کی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈال جائیے۔ اچھوت اقوام کی کروڑہا کی تعداد، کتنے زمانہ سے انسانیت اور شہریت کے ابتدائی حقوق سے محروم چلی آتی ہے؟ اور آج بھی باوجود مغربی تعلیم پھیل جانے کے یہ اچھوت زندگی کی کس منزل میں ہیں؟ کیا مسلمان ہندؤں کے ہاتھوں، ان کی تہذیب و تمدن کے ہاتھوں، اپنے حق میں اچھوتوں سے بہتر سلوک کی توقع کرسکتے ہیں۔ خاصکر جبکہ مذہبی اختلاف بھی دونوں کے درمیان حائل ہے اور سیاسی کشمکش بھی عرصہ سے چلی آتی ہے۔ اس تہذیب میں ضم ہوکر مسلمان بجز اس کے کہ اچھوتوں کی تعداد میں کئی کروڑ کا اضافہ کردیں اور کیا کرسکتے ہیں اور کیا پا سکتے ہیں؟

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ دوسری اقوام کے ساتھ رواداری برتی ہے اور جن اقوام کو کہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی اپنے دامنِ عافیت میں پناہ دی ہے لیکن اس پناہ دینے میں یہ نکتہ ہمیشہ مد نظر رہا ہے کہ پناہ گزیں دامن کے نیچے رہے، یہ نہ ہو کہ انکا دامن چاک کرڈالے اور ان کو اپنی تن پوشی کے لئے اس کا محتاج ہونا پڑے۔ دوسری اقوام اور اُن کی تہذیبوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو رواداری برتی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان اقوام کو زندہ رہنے اور اُن کی تہذیبوں کو خود ان اقوام کے اندر پھلنے پھولنے دیا جائے لیکن انہیں اپنے کو ضم کردینا، اپنے حق میں سب سے بڑی ناروا داری اور سب سے بڑا ظلم ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں۔

(حکیم عبدالقوی دریابادی)

کانسٹی ٹیوئینٹ اسمبلی

موجودہ حالت میں وہ اقتدار اعلیٰ جس کے ہاتھ میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہے تاج برطانیہ کو حاصل ہے لوگوں کے نمائندوں کے ذریعہ ہند کے دستور کی تشکیل کے لئے "دستور ساز مجلس" کے انعقاد کے یہ معنی نہیں کہ اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ سے لیکر ہندوستان کے عوام کو دے دیا جائے ہندوستانی ایک نئی حکومت کی بنا صرف اسی وقت ڈال سکتے ہیں جب ان کو سیاسی غلبہ و اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ برطانوی پارلیمنٹ کی محکومیت سے آزاد ہو جائیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں دستور ساز مجلس کے نئے معتقدین ایک بالکل ہی مختلف خیال رکھتے ہیں۔ لبرل لوگوں کی طرح ان کے نظریے کی بنا اس خیال پر ہے کہ ترغیب و سمجھوتے سے قوت منتقل کرائی جا سکتی ہے۔ عوام کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے ترغیب کی بجائے مطالبہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مطالبہ میں وہ زور اور دباؤ کہاں سے جو آقاؤں کی پشت توڑ دے اور انکو ماننے پر مجبور کرے۔ کانگریس کا مطالبہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ کل کی کل ہندوستانی آبادی برطانوی سامراجی حکومت کی جگہ لے لیگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسٹر برلا اور دیگر مہاراجے دستور ساز مجلس کے ذریعہ ہندوستان کا دستور مرتب کرنے پر راضی ہو جائیں گے اور برطانوی سامراج کو ہٹا دینگے۔ کانگریس کے مطالبہ کو سیدھے سیدھے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تم ہمیں زبردستی غلام نہ بناؤ بلکہ ہم کو اپنی خواہش سے غلام بننے دو۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا بنایا ہوا دستور برطانوی پارلیمان نے مسترد کر دیا تو پھر؟ اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ ایسی حالت میں برطانیہ دنیا کی نظر میں اخلاقی مجرم ٹھہریگا۔ اور بدنام ہو جاویگا۔ مگر کیا یہ بدنامی ہندوستان سے غلامی کی لعنت دور کر دیگی؟ آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔

دستور ساز مجلس کا تخیل انقلاب فرانس کی پیداوار ہے۔ اور ہندوستان میں اول اول

یہ فقرہ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے موقع پر استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ اُس وقت سے برابر اس خیال کو تقویت ہوتی گئی یہاں تک کہ کانگریس کے آئینی پروگرام میں داخل کر لیا گیا۔ آج کل یہ کانگریس کی پالیسی کا خاص محور بنا ہوا ہے۔ بہر حال یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ مطالبہ کی انقلابی اہمیتوں کو نہیں سمجھا گیا ہے اور یہ مطالبہ کے بنیادی سیاسی فلسفہ کے متعلق اُلجھے ہوئے خیالات سے ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ عوام کو اس مطالبہ کے لئے تیار کرنے سے پہلے اس پراگندگیٔ تخیل کو صاف کر لیا جائے۔ دستور ساز اسمبلی، کے مطالبہ کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستانی عوام اپنے حق خود اختیاری کے ظاہر کرنے کے لئے ایک آلۂ قوت کی تخلیق پر تُل گئے ہیں۔ دراصل حق خود اختیاری کے کوئی معنی ہی نہیں جب تک اُس کا عملی اظہار نہ ہو۔ اور اُس کے اظہار کے لئے ہندوستانی عوام کو ایک آلۂ کار کی ضرورت ہے۔ مکمل آزادی یا پرن سوراج کے مقصد کا حصول اسی بات پر مبنی ہے کہ ہندوستان کے عوام کے ہاتھوں میں طاقت حکومت آجاوے۔ جب تک کانگریس کے سیاسی پروگرام کے اس مفہوم کو نہ سمجھا جائے دستور ساز مجلس کا صحیح تخیل قائم نہیں کیا جا سکتا۔ دستور ساز مجلس کے منوانے کا موثر طریقہ معلوم کرنے سے قبل فلسفۂ سیاست کے دو بنیادی نظریوں کو اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ دونوں نظریے اصولِ ریاست و اصول دستور ہیں۔ جس دستور سے ہمیں مطلب ہے وہ ایک ریاست کا دستور ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ریاست کیا ہے؟ عام طور سے ریاست اور حکومت ایک چیز سمجھی جاتی ہے حالانکہ اس سے زیادہ غلط اور کوئی چیز نہیں۔ امور سلطنت کا انتظام حکومت کرتی ہے اور حکومت کی تشکیل میں یا اُن حضرات میں جو برسرِ حکومت ہوں وقتاً فوقتاً تبدیلی ممکن ہے اور ہو سکتی ہے لیکن ریاست یا سلطنت ایک مستقل ادارہ ہے جو افراد پر مشتمل نہیں۔ حکومت ایک ملک کی سیاسی تنظیمی حالت کا نام ہے۔ ایک خاص قسم کی سیاسی تنظیم جو اپنی جگہ پر اُن مخصوص عمرانی رشتوں پر مبنی ہے جو معاشی حالات کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔ اُس آئینی مشینری کے پیچھے جس کو گورنمنٹ کہتے ہیں کچھ معین رشتے کام کرتے ہیں ہندوستان کے معاملہ میں یہ رشتہ برطانوی تاج کی محکومیت کا تعلق ہے اور تاج برطانیہ ایک خاص معاشی

نظام کا علمبردار ہے جس کو برطانوی سامراج شاہی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو سلطنت قائم ہے وہ یہ ہی حکومت ہے۔

اس حکومت کے رشتہ کی روح رواں برطانوی سرمایہ کے ذریعہ ہندوستانی جنتا کی معاشی لوٹ کھسوٹ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس سامراجی سلطنت کا انصرام ایک ایسی حکومت کے ہاتھ میں ہو جو ہندوستانیوں پر مشتمل ہو۔ وائسرائے بھی ہندوستانی ممکن ہے لیکن وہ جب تک تاج برطانیہ کا نمائندہ ہے ہندوستان اس سامراج شاہی سلطنت کا ایک جزو خاص بنا رہے گا۔ اس لئے یہ صاف طور سے سمجھ لینا چاہئے کہ ایک آزاد قومی سلطنت بننے سے پہلے ہندوستان کو سلطنت برطانیہ سے تمام رشتوں کو توڑ دینا ہوگا جن تعلقات پر ایک سلطنت کی بنا ہوتی ہے وہ سیاسی یا آئینی نہیں ہوتے بلکہ اصل میں معاشی ہوتے ہیں۔ اور اس بنیادی معاشی رشتے کو ایک سیاسی شکل دے دی جاتی ہے جو گورنمنٹ اور اس کا قائم کردہ نظام بن جاتا ہے۔ یہ سیاسی شکل بلا اندرونی حالات پر اثر انداز ہوئے بدل سکتی ہے جب تک ان معاشی تعلقات کی نہرست قائم رہتی ہے گورنمنٹ کی ہیئت میں تبدیلی سے ریاست کی تبدیلی لازم نہیں آتی۔ سلطنت جو طاقت کا آلہ کار ہے بزور بنائی جاتی ہے اور بزور قائم رکھی جاتی ہے۔ اور اس لئے کسی قائم شدہ سلطنت کو صرف بزور ہی مٹایا جا سکتا ہے۔ یہ صرف بذریعہ انقلاب ممکن ہے۔ کسی قائم سلطنت کے قوانین کے حدود کے اندر رہ کر ایک نئی سلطنت کا دستور نہیں مرتب کیا جا سکتا۔ یہ اصول کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کے مطالبہ کے وقت پوری طور سے ذہن میں رہنا چاہئے اس طرح یہ مطالبہ خود بخود سیاسی طاقت پر قبضہ جمانے کے فرض کو لوگوں پر عائد کر دیتا ہے۔ اور قبضہ پانے کے معنی منطقی طور پر یہ نکلتے ہیں کہ قائم شدہ سامراج شاہی سلطنت کو الٹ دیا جائے۔

دستور حکومت کسی ملک کی سرکاری مشینری کے بیان کا نام نہیں مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو کوئی دستور نہیں کہا جا سکتا اور نہ بدقسمت نہرو رپورٹ میں کسی آنے والی آزاد

ہندوستانی سلطنت کا مسودہ ہے۔ کسی ریاست کا دستور چند بنیادی اصولوں کا نام ہے جن کے مطابق اس کے امور انتظام پانے چاہئیں۔ وہ ایک سلطنت کا بنیادی قانون ہے۔ تمام وہ قوانین جو بعد کو حکومتیں امور ریاست کے انصرام کے لئے بنائیں گی دستور کے اندر لکھے ہوئے اصولوں کے مطابق ہونا چاہئیں۔ موجودہ سلطنت جو ہندوستان میں قائم ہے اس کے دستور کا اولین اصول یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ تاج برطانیہ کو حاصل ہو۔ اب کوئی دوسرا دستور آ ہی نہیں سکتا جب تک اس بنیادی اصول کو کسی دوسرے بنیادی اصول سے کلیتاً نہ بدل دیا جائے یعنی اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل ہو جائے۔ مگر ہم تو تاج برطانیہ کے اختیارات کو بھی کم نہیں کر سکتے یہ حق کلیتاً برطانوی پارلیمان کو تفویض کیا گیا ہے ایک آزاد قومی سلطنت کے دستور کا ہندوستانی عوام کے ہاتھوں مرتب ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے قبل تاجِ برطانیہ کا اقتدار ختم ہو گیا اور یہ حالت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہندوستان کے قوت و اقتدار کو منوا لیا جائے۔ ایک آزاد سلطنت کے دستور بنانے کا ہندوستانیوں کو کوئی حق و اختیار نہیں ہو سکتا جب تک اس اختیار پر ایک بیرونی طاقت کا دعوائے تسلیم شدہ ہے۔

ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے وہ یہ کہ جس ریاست کے قیام کے ہم اس قدر خواہاں ہیں اس کے اصول قبل سے طے کر لینا چاہیئے۔ اور وہ اصول مظلوم اور تباہ شدہ لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر قرار دینے چاہئیں جن کی بدنصیبی کے ذمہ دار وہ سماجی تعلقات ہیں جن پر موجودہ سلطنت کی بنا رکھی گئی ہے۔ عوام کو تیار کرنے کے لئے ان اصولوں کو عملی طور پر وضع کیا جائے اور ان میں ان کی اشاعت کی جاوے۔ ایک دستور ساز مجلس ان عوام کے نمائندوں کی جماعت ہے جو غلبہ حاصل کرنے کی انقلابی جد و جہد میں مصروف ہیں اور اس نمائندہ جماعت یا اسمبلی کا بنایا ہوا دستور ان اصولوں کے آئینی جواز کا ضامن ہے جن کی اشاعت تحریک آزادی کو بڑھانے کے لئے کی جا رہی ہے۔ دستور کا وضع کرنا ایک قانونی دستاویز کی طرح

نہیں جس کا مسودہ ایک قانون داں تیار کرے۔ دراصل وہ تو عملی نتیجہ ہے اُس بغاوت کا جو عوام قائم شدہ سیاسی رشتوں کے خلاف کرتے ہیں اور اس طرح ایک نئی ریاست کی بنا ڈالتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ سلطنت کی بنا بدیشی سرمایہ کے ذریعہ یہاں کے عوام کی معاشیاتی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اس کے بجائے ایک ایسی ریاست بھی قائم کی جاسکتی ہے جس میں ایک بہت چھوٹی سی تعداد ایک بہت بڑی کثرت آبادی پر حاکم و مسلط ہو بیٹھے اور اس کثیر انبوہ کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھے۔ اس حالت میں ہندوستان کو ظاہرا آزادی مل جائے گی مگر وہ جمہور کی آزادی نہ ہو گی اور نہ ہی وہ جمہوری سلطنت ہو گی۔ وہ دستور جو حقیقی آزادی کا علمبردار ہو ایسے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے جن سے ظالمانہ سماجی تعلقات کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو جائے تمام بالغوں کے لئے حق رائے دہی کا حاصل ہو جانا ہی کافی نہیں۔ قوت و اقتدار اُس وقت تک آئینی طور پر تسلیم شدہ نہیں جب تک معاشی استعمار اور سماجی ظلم سے بچاؤ کے لئے مؤثر سیاسی غلبہ نہ حاصل ہو جائے۔ ایک آزاد جمہوری ریاست کے دستور میں انہیں اصولوں کو دُہرایا جاتا ہے۔

حال کی تاریخ سے یہ سبق ملتا ہے کہ دستور ساز مجلس جمہور کی بغاوت سے پیدا ہوتی ہے۔ قائم شدہ سلطنت کو اُلٹ دینے کے بعد ہی ایک نئے دستور کا نفاذ ہو سکتا ہے جب کبھی ان دونوں میں سمجھوتہ کر لیا گیا ہے یا قائم شدہ سلطنت کی رضا و رغبت سے آئینی طور پر اُس کی طاقت کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ ایک کامیاب ردِ عمل ترقی کی راہ میں ہو گیا ہے پرانی سلطنت نے اپنی طاقت کو پھر مجتمع کیا ہے اور نئی ریاست کو اُلٹ دیا ہے۔ ایک نیا دستور وہی قوم بنا سکتی ہے جو سیاسی طاقت پر قبضہ پانے کی جد و جہد میں مصروف ہو۔ اور ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی اسی مقصد کے لئے ایک آلۂ کار کا کام کرتی ہے۔ مظلوم اور تباہ حال جمہور کو خود اپنی جماعتیں بنانی چاہئیں جو قائم شدہ حکومت کے لئے چیلنج ہوں۔ یہ جماعتیں آزاد قومی سلطنت کی بنا ڈالیں گی۔ ہندوستان کی ایک بہت

بڑی کثرت آبادی ایسی ہے جن کے مفاد سامراج شاہی سے کبھی سمجھوتہ کے ذریعہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ اس دستور ساز اسمبلی کے مطالبہ کو منوا سکتے ہیں۔ اُن کے لئے ضروری ہے کہ غلبہ کے حصول کی جد وجہد جاری رکھنے کے لئے اپنی اپنی جگہ نمائندہ قومی جماعتیں قائم کریں۔ آخر میں یہ ہی پنچائتیں ایک قومی اسمبلی میں اپنے مندوبین بھیجیں گی۔ یہ نمائندہ قومی پنچائت یا مجلس اقتدار اعلیٰ اختیار کرے گی اور اپنے اجزائے ترکیبی کے مفاد کے مطابق چند بنیادی قوانین کو وضع کرکے ایک آزاد جمہوری ریاست کا قیام عمل میں لائے گی۔ دستور ساز پنچائت کے انتخاب کا نعرہ اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے ایک اجتماعی جد وجہد کا اشارہ ہوگا۔ صرف ایسی ہی جد وجہد کے بعد ایک حقیقی آزاد قومی ریاست کے دستور کو وضع کرنے کے لئے ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نمودار ہو سکتی ہے اور بس۔

مترجمہ سید محمد اصفہانی، بی، اے

غزل

کیوں نہ سب پہ ہو جاتا حال دل عیاں اپنا
ہر سکوتِ بیجا کی تہ میں تھا بیاں اپنا

دل سے کچھ اُمیدیں تھیں وہ بھی اب نہیں کا ہے
کاش عشق میں ہوتا دل ہی رازداں اپنا

تیرے در سے اُٹھ کر ہم جائیں تو کدھر جائیں
اب زمیں اپنی ہے اور نہ آسماں اپنا

فصل گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا
فصلِ گل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

تھا حریم ناز اُن کا دل کی آخری منزل
ہم نے اُن کو ڈھونڈا تھا مل گیا نشاں اپنا

بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

زندگی کب اپنی ہے موت کس کے بس کی ہے
ہجر میں بنا لیتے کس کو ہمزباں اپنا

اُس نے دل کی حالت کا کیا اثر لیا ہوگا
دل نے کیا کہا ہوگا۔ دل ہے بے زباں اپنا

نقشِ سجدہ گھبرا کر کیوں مٹائے دیتے ہو
اُس میں کیا نظر آیا سنگ آستاں اپنا

پھر بھی نارسا ٹھیرا۔ اور کیا رسا ہوتا
عرش سے پرے پہونچا شورِ الاماں اپنا

گھر ہے اب قفس فانیؔ گھر کبھی چمن بھی تھا
ہاں کبھی وطن بھی تھا اب وطن کہاں اپنا

فانیؔ بدایونی

غزل

فسردہ پا کے محبت کو مسکرائے جا
اب آگیا ہے تو اک آگ سی لگائے جا

بغیر علم بھی جیسے ہوائیں چلتی ہیں
یوں ہی کچھ اہلِ محبت کو یاد آئے جا

نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور
مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے
طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات
ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

بھری نگاہ بتا دے گی رازِ عشق ابھی
کسی کی چشمِ کرم کا فریب کھائے جا

تجھے کچھ اپنا پتہ یوں ہی چل رہے گا کبھی
ترے نثار ابھی مجھ کو آزمائے جا

پھر اپنا کام بھی کرتی رہے گی اس کی نگاہ
ابھی تو عشق کے گنو پر اُسے لگائے جا

ابھی تو ایک دھواں سا اٹھا ہے سینے میں
دل و جگر پہ ابھی بجلیاں گرائے جا

ابھی تو اے غمِ پنہاں جہان بدلا ہے
کوئی دن اور زمانہ کے کام آئے جا

پھر اپنے ناز بھی اٹھتے نہیں محبت سے
ابھی تو ایک زمانہ کے ناز اٹھائے جا

کبھی تو حسن جگے گا یہ عشق سے کہہ دو
کہ بن کے خواب ہی اس آنکھ میں سمائے جا

ابھی نہ کھول ذرا نسیم باز آنکھوں کو
ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

وہ کیمیا ہی سہی پہلے خاک ہونا ہے
ابھی تو سوزِ محبت کی آنچ کھائے جا

تو مجھ کو چھوڑ رہا ہے خراب کر کے جسے
وہ عمر کیسے کٹے گی ذرا بتائے جا

شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار
ابھر رہا ہوں اسی رنگ سے مٹائے جا

فراقؔ چھیڑ تو نے کیا فسانۂ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مگر سنائے جا

(فراق گورکھپوری)

آدم بیڈ

جارج ایلیٹ انیسویں صدی کی ایک مشہور انگریزی ناول نگار تھی۔ اسلوب میں ایک خاص قسم کا مزاح تھا پھر بھی جو چیز جھلکتی تھی وہ غم تھا۔ آدم بیڈ اس کی مشہور ترین ناول ہے۔ یہ ناول ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ پلاٹ سادہ تھا لیکن پختہ ہے۔ ناول نگار میں جتنی مذہبیت تھی اس کی بھی حال ہے خود مصنفہ کہا کرتی تھی کہ میرا سب سے چہیتا کردار دینا مارس ہے۔

جون ۱۷۹۹ء کا زمانہ ہے سلوپ کے گاؤں میں ایک بڑھئی مسٹر جاتھن برج کی بڑھی ہی دوکان میں پانچ آدمی کواڑے اور کھڑکیاں بنانے میں مصروف ہیں۔

ان پانچ میں ایک آدمی بہت لمبا ہے۔ تقریباً چھ فٹ اونچا، بہت مضبوط گٹھا ہوا بدن۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے اور مضبوط ہاتھ جس کے ایک گھونسا مارے وہ وہیں ختم ہو جائے لیکن ہتھیلیاں بڑی بڑی اور انگلیاں تپلی تپلی۔ کاریگری اور استادی کے کام کرنے والوں کی ایسی ہی ہتھیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ بڑا سا کھڑا چہرہ لیکن چہرے سے سیدھا پن نیکی اور کافی ذہانت آشکارا۔ یہ آدم بیڈ ہے۔

قریب ہی اس کا بھائی کام کر رہا ہے تقریباً اتنا ہی لانبا۔ اسی کی طرح کا چہرہ مہرہ۔ لیکن اسکے چوڑے کاندھے ذرا جھکے ہوئے ہیں اور اس کی نظریں تیز نہیں بلکہ متبسر اور رحیم معلوم دیتی ہیں اس کا نام سیتھ بیڈ ہے گاؤں کے لونڈے ہمیشہ اس سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیتے تھے۔ آدم سے البتہ ان کی بات کرنے کی بھی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

شام کے چھ بج گئے ہیں۔ کاریگروں نے کام بند کر دیا اور چلے گئے صرف سیتھ ذرا رکا رہا اور آدم کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ امید کر رہا ہے کہ اس سے کچھ کہا جائیگا۔

آدم وعظ سننے سے پہلے گھر جاؤ گے نا؟

سیتھ۔ نہیں گھر دس بجے سے پہلے نہ پہونچ سکوں گا دینا مارس کو گھر چھوڑ کر آنا ہے اگر اس نے

منظور کر لیا تو۔ اس کے ساتھ تو کوئی پوکسر کے گھر سے آتا ہی نہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

آدم گھر روانہ ہو گیا۔ اور سیٹھ پونے سات تک گاؤں کے اس میدان میں پہونچ گیا جہاں میتھوڈلیسٹ وعظ دے رہے تھے۔ جب دینا مارس گاڑی پر چڑھی (گاڑی ایک ممبر کا کام دے رہی تھی) تو لوگ ذرا اس کے گرد سمٹ آئے۔ دینا میں نہ کسی قسم کی گھبراہٹ تھی نہ جھجک وہ گاڑی پر اسی اطمینان سے چڑھ گئی جیسے بازار جا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی چمک یا تیزی نہ تھی، وہ دیکھ نہیں رہی تھی بلکہ اپنی آنکھوں سے شفقت برسا رہی تھی۔ اس کی آواز میں طراری نہ تھی۔ جو کچھ کہتی تھی آہستہ لیکن صاف لہجوں میں۔ اس کی تقریر پہلے سے سوچی ہوئی نہ تھی۔ لیکن خلوص نے اس کی تقریر کو اتنا فصیح کر دیا کہ جب تک وہ بولتی رہی لوگ محو اور گرویدہ ہو کر سنتے رہے۔

جب اس کا وعظ ختم ہو گیا تو سیٹھ بیڈ اس کے ساتھ پگڈنڈیوں پر ہو لیا جو میدانوں اور کھیتوں میں ہوتی ہوئیں اس کے گھر ہال فارم کو جاتی تھیں۔

غیر شعوری طور پر دینا کے چہرہ پر خاموشی متانت اور سنجیدگی تھی۔ یہ چیز ایک عاشق کے لئے ذرا مایوس کن ہوا کرتی ہے اس لئے سیٹھ بیڈ سوچتا ہی رہا کہ کیا کہے اور کس طرح کہے اور جب تک یہ دونوں ہال فارم کے دروازوں کے قریب نہ پہونچ گئے سیٹھ کچھ نہ کہہ سکا۔

- دینا اب کچھ کہنا ممکن ہے ذرا بیجا اور گستاخانہ ہو جب کہ تم اپنے خیالات مجھ پر ظاہر کر چکی ہو پھر بھی مقدس کتابوں میں شادی کی موافقت میں مخالفت سے زیادہ آئتیں نکل سکتی ہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے۔ "دو ایک سے بہتر ہیں" یہ قول جہاں اور باتوں کے لئے درست ہے وہاں شادی کے لئے بھی درست ہے۔ کیونکہ دینا ہم تم دونوں یک جان دو قالب ہو جائینگے میں تمہارا ایسا شوہر ہرگز نہ ہوں گا کہ تمہارے ان کاموں میں حائج ہو سکوں جو خدا نے تمہارے سپرد کئے ہیں۔ میں تو بلکہ تمہیں خوب آزادی دوں گا اس سے بھی زیادہ جتنی تمہیں آج کل میسر ہے کیونکہ ابھی تمہیں اپنی روزی کمانی پڑتی ہے۔ شادی کے بعد مجھے اپنے بازوؤں پر اعتماد ہے کہ

اتنا کما سکوں گا کہ ہم دونوں کے لئے کافی ہوگا۔"

وہ دونوں اب ہال فارم پہونچ گئے۔ دینا رُکی اور اپنی آہستہ اور نازک آواز سے کہنے لگی۔

"سیٹھ بیٹا۔ میں تمہاری محبت کی بیحد شکرگزار ہوں اور اگر میں کسی آدمی کو اپنے عیسائی بھائی سے زیادہ سمجھ سکتی تو میرے خیال میں وہ یقیناً تم ہی ہوتے۔ لیکن مجھ کو شادی کرنے کی یا دنیا میں گھربار قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ خدا نے مجھے اپنا کلام سنانے کے لئے مقرر کیا ہے اور وہ میرے کام سے خوش ہے۔"

ہال کے دروازہ ہی پر اُن دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا کیونکہ سیٹھ اندر جانا نہ چاہتا تھا اور اُنہیں پگڈنڈیوں پر سے اور اُنہیں میدانوں اور کھیتوں میں ہوتا ہوا واپس ہوا جن پر سے وہ ابھی گذر چکا تھا۔ گھر پہونچتے پہونچتے دس بج گئے اور جوں ہی اُس نے دروازہ میں قدم رکھا اوزاروں کے کھنکنے کی آواز سنی۔

"کیوں ماں۔ کیا پاپا اتنی رات گئے ابھی تک کام کر رہے ہیں؟"

"تیرا پاپا نہیں۔ یہ تیرا بھائی ہے۔ وہی تو سب کام کرتا ہی ہے اور کون کرے گا؟"

اُس کی ماں بڑبڑاتی ہی رہی۔ اس کو بڑبڑانے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ بڑے لڑکے کی سنجیدگی اور اس سے بیحد محبت کی وجہ سے زیادہ بول ہی نہ سکتی تھی۔ سیٹھ ہی پر اپنی بوچھار کیا کرتی کیونکہ یہ کبھی اپنی ماں کو کچھ کہتا نہ تھا۔

سیٹھ سنی اَن سنی کرکے ذرا پریشان ہوکر کارخانہ میں چلا گیا۔

"ایڈم۔ کیا بات ہے؟ کیا پاپا تابوت بنانا بھول گئے؟"

"آدم نہیں بھائی بھولے نہیں وہی پرانا قصہ۔ لیکن آج میں اسے ختم ہی کر ڈالوں" کا" سیٹھ کے چہرے کی طرف دیکھ کر "کیوں تجھے کیا ہوگیا ہے کچھ تکلیف ہے؟"

سیٹھ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور نظروں سے گہری مایوسی ٹپک رہی تھی۔

"ہاں ایڈی۔ لیکن میری تکلیف کا کوئی علاج نہیں۔ یہ برداشت کرنا ہی پڑے گی۔۔۔۔
اچھا اب میری باری ہے۔ تم جا کر سو رہو۔"
"نہیں بھیا۔ اب میں جم کے بیٹھ گیا ہوں بہتر ہے میں ہی کام کرتا رہوں۔ کل صبح سات بجے تابوت تیار کر کے براکسٹن پہونچا دینا ہے۔ میں تمہیں تڑکے پکاروں گا اور پھر ہم تم دونوں چل کے پہونچا آئیں گے۔"

آدم رات بھر کام کرتا رہا۔ اپنے بچپن اور اس زمانہ کی خوشیاں یاد کرتا رہا اور اس کے بعد کی تکلیفوں کے دن جب سے اس کا باپ شراب خواری کی لت میں پڑ گیا ہے اور اس کی ماں روتی رہتی ہے۔ اس کو خصوصاً وہ رات بہت یاد آتی رہی جس رات کو خود اس نے اپنے باپ کو نشہ میں سرشار وحشیوں کے مانند آوارہ دیکھا تھا۔

صبح ہوگئی۔ تڑکے ہی دونوں بھائی لمبے تابوت کو اپنے کاندھوں پر رکھ کر چھ بجے براکسٹن پہونچا آئے اور واپس ہو رہے تھے جب اس سرسبز میدان میں پہونچے جس میں سے ہو کر چشمہ بہتا تھا کہ سیتھ ایکدم تیز چلنے لگا۔ کہا "ذرا دیکھنا پانی کے کنارے کیا چیز پڑی ہوئی ہے؟"
وہ دونوں دوڑ کر پہونچے ایک لمبے بھاری جسم کو باہر کھینچ کر نکالا۔ اس لاش کی بے نور کھلی آنکھوں کی طرف سکتے کے عالم میں دیکھتے رہے۔۔۔۔ یہ ان کے باپ کی لاش تھی

ہال فارم۔ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا ایک بہت اچھا پرانا مکان ہے کسی زمانہ میں یہاں ایک لارڈ رہا کرتا تھا۔

یہاں بڑی چہل پہل ہے حالانکہ سال کا یہ کاہل ترین زمانہ ہے یعنی خزاں اور پھر یہ وقت بھی دن کا وہ حصہ ہے جس میں سویا ہی جاتا ہے یعنی اسوقت مسز پوئسر کی خوبصورت ہفت روزہ گھڑی میں ساڑھے تین بجے ہیں۔

مسز پوئسر ایک قبول صورت کی عورت ہے اڑتیس سے زیادہ عمر نہ ہوگی صاف رنگ

ہے، بھورے بال، متناسب اعضا، ہلکی پھلکی ابھی اپنا کروشیا کا کام اُٹھایا ہے۔ قریب ہی اُس کی بھتیجی دینا مارسن بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک دوسری بیسر بھتیجی ہیٹی سارل سترہ اٹھارہ برس کی ایک نہایت خوبصورت لڑکی قریب ہی بنیر رفا سے میں کام کر رہی ہے۔

مسز پوئسر:۔ دینا تم جب سے بیٹھی ہو تو بالکل اپنی خالہ جوڈتھ کی تصویر معلوم ہوتی ہو میں اُس سے بھی ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ وہ دوسروں کی خاطر برابر ایثار کرتی رہے گی۔ وہ بھی میتھو ڈلیسٹ ہوگئی تھی لیکن وہ تم سے ذرا مختلف تھی۔ ٹوپی بھی تم سے ذرا مختلف قسم کی دیتی تھی تم سے بھی یہی کہتی ہوں کہ اگر تم یہیں رہو گی تو بہت ممکن ہے کسی اچھے آدمی سے تمہاری شادی جلد ہو جائے۔ بس تم یہ وعظ وغیرہ کا قصہ چھوڑ دو، دیکھنا کتنے آدمی تیرے لئے تیار ہو جاتے ہیں اگر تیرا ارادہ سیتھ بیڈ ہی سے شادی کرنے کا ہے تو حالانکہ وہ غریب ہے اور کبھی کچھ بچا کے نہیں رکھتا پھر بھی تیرا چچا تجھ کو ایک سور تحفہ میں دیگا اور شاید ایک گائے بھی کیونکہ میرے عزیز داروں سے وہ بڑی مہربانی سے پیش آتا رہا ہے اور اپنے گھر پر ہر ایک کو خوش آمدید کہتا ہے۔ تیرے واسطے بھی وہ اتنا ہی کرے گا جتنا ہیٹی کے لئے حالانکہ وہ اُس کی اپنی سگی بھتیجی ہے۔۔۔

ہے سلوپ کے پادری مسٹر آروِن اور کپتان ڈونی تھارن (جو لارڈ ڈونی تھارن کا پوتا اور وارث ہے) کی ملحنت آمد نے مسز پوئسر کی روانی طبع کو روک دیا۔

"دینا میں قسم کھا کے کہتی ہوں کہ یہ لوگ تیرے وعظ کے متعلق کہنے آئے ہیں جو کل تو نے دیا تھا۔ اب تو ہی اُن کو جواب دینا۔ میں کچھ نہ بولوں گی تو نے جو یہ مصیبت ہم لوگوں پر ڈالی ہے میں اس کے متعلق کافی کہہ چکی ہوں اگر تو خود مسز پوئسر کی اپنی بھتیجی ہوتی تو پھر مجھے کوئی غم نہ ہوتا۔ وہ جانتے اور اُن کا کام۔ میں بری الذمہ رہتی۔"

لیکن مسٹر آروِن کو میتھوڈلیسٹ کے وعظ پر ناراض ہونے کا خیال تک نہ تھا اور نوجوان آرتھر ڈونی تھارن محض ہیٹی سارل سے کچھ باتیں کرنے کے خیال میں آیا تھا۔

باتوں باتوں میں پادری نے بیان کیا کہ تھامس بیڈ چشمہ میں ڈوبا مرا ہوا پایا گیا۔ یہ سنتے ہی دینا مارس نے طے کیا کہ اُسے مرحوم کی بیوہ کی تسکین کے لیے فوراً روانہ ہو جانا چاہیئے۔

ہیٹی سارل اپنی جگہ کپتان ڈونی تھارن کی اُن نظروں کے متعلق سوچ رہی تھی جو اُس نے ابھی اُس پر ڈالی تھیں۔ آدم اور اُس کی تکلیفوں کا خیال کیوں آنے لگا۔ ایک خوبصورت نوجوان کی پسندیدہ تیز نظروں نے بیچاری ہیٹی کے دل کو لرزہ براندام کر دیا۔ حالانکہ اس قسم کی نظروں کی وہ بالکل عادی ہو چکی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ سٹر کریگ، لارڈ ڈونی تھارن کا باغبان سرتا پا اُس کے عشق میں چور ہے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ آدم بیڈ، استباز، ہوشیار اور بہادر آدم بیڈ۔ جس کا لوگوں پر اتنا اثر ہے اور جس کے متعلق اس کا چچا ہمیشہ خوش ہو کر کہا کرتا ہے کہ آدم اُن لوگوں سے بدرجہا واقف کار ہے جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ یہ آدم بھی جو اکثر لوگوں سے روکھے پن سے پیش آتا ہے جو گاؤں کی دوسری چھوکریوں کے پیچھے گھوما نہیں کرتا یہ آدم بھی اُس کی ایک نظر ایک لفظ سے سُرخ و پیلا کیا جا سکتا ہے۔

ہیٹی کو بالکل یقین تھا کہ اُس کا چچا آدم کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہے اور وہ خوش ہو گا اگر وہ اس سے شادی کر لے گی گذشتہ تین سالوں سے جب سے کہ اُس کی نگرانی میں نئے باڑے کا کام ہوا ہے آدم کی ہال فارم پر ہمیشہ خوش آمدید ہوتی رہی ہے اور دو سال سے تو ہیٹی برابر۔ اپنے چچا کو کہتے ہوئے سنتی رہی ہے کہ آدم ممکن ہے ابھی تھوڑا ہی بہت کماتا ہو لیکن کسی دن وہ ضرور امیر کبیر ہو جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ جو عورت اُس سے شادی کرے گی بہت نفع میں رہے گی۔ اور وہ کہا کرتی "یہ سب تو ٹھیک ہے کہ ایک نیا بنا بنایا امیر مل جائے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بنا بنایا بیوقوف بھی نکلے۔ اور پھر تو یہ کوئی اچھی بات نہ ہو گی کہ جیبیں تو روپے سے بھری ہوں لیکن جیب میں ایک سوراخ بھی ہو۔ ایک اچھی گاڑی میں بیٹھنا کچھ فائدہ نہیں رکھتا اگر اس کا چلانے والا بیوقوف ہو۔ تھوڑی دیر میں وہ خندق میں گرا دیگا۔"

چنانچہ ہیٹی نے آدم کی کسی قسم کی ہمت افزائی نہ کی تھی۔ وہ صرف یہ محسوس کرنے ہی میں لطف لیتی تھی کہ ایک مضبوط آدمی اُس کے قبضہ میں ہے۔ رہا شادی کا سوال تو یہ قصہ ہی دوسرا تھا۔ ہیٹی ہمیشہ عیش و عشرت کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر آدم اتنا امیر ہو گیا کہ اُس کی دلی چیزوں کو مہیا کر سکا مثلاً بڑے خوبصورت بالے۔ ناٹنگھم کی لیس۔ ڈرائنگ روم میں بڑے بڑے غالیچے تب وہ اُس کے ساتھ ضرور شادی کرے گی

لیکن حال کے چند ہفتوں میں ہیٹی پر ایک نیا اثر پڑ رہا تھا۔ اس کو احساس ہونے لگا تھا کہ مسٹر آرتھر ڈونی تھارن صرف اُس کی ایک جھلک کی خاطر کتنی تکلیفیں برداشت کر لیتا ہے اور پھر دینا بھی بھی اپنے وعظ وغیرہ دینے اور کچھ کام کرنے باہر دوسرے گاؤں میں چلی جاتی ہے

آدم بیڈ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ محبت کی وہ علامتیں جو دراصل دوسروں کے واسطے ہوتیں اپنے لئے سمجھتا رہا۔ ہال فارم کے باغیچہ میں ایک دن صبح آدم ہیٹی کو جب انگور توڑنے میں مدد دے رہا تھا اُس نے خیال کیا کہ آدمی ایک چیز عمر بھر نہیں بھول سکتا اور وہ بات یہ ہے کہ پہلی عورت جس سے وہ محبت شروع کرتا ہے آخر کار وہ دیکھتا ہے کہ وہ عورت خود اُس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اُس نے بھی محسوس کیا کہ ہیٹی میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ابتدائے محبت کی گھبراہٹ اور پریشانی اب ظاہری نمایش سے بہت آگے بڑھ گئی ہے چنانچہ آدم اکثر اس کو عالم محویت میں پاتا اور سمجھتا کہ یہ سب کچھ میرے لئے ہے حالانکہ وہ سب آرتھر ڈونی تھارن کے لئے ہوتا۔

آرتھر کچھ دنوں کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر حاضری اُس کے لئے کوفت کا باعث تھی وہ چاہتی تھی کہ اُس کے کانوں میں محبت کے نغمے سنائے جائیں۔ آدم سے اُس کو کچھ ڈر نہ تھا کہ وہ اس کو محبت اور تعریفی خوشامدوں سے پریشان کرے گا وہ ہمیشہ اس سے سنجیدگی سے پیش آتا تھا۔ وہ اسی بات کے احساس میں خوش تھی کہ ایسا مضبوط

آدمی اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے اتنا قریب ہے آدم ہی سے اُس نے ایک دن سُنا کہ کپتان ڈوڈنی تھارن دو ایک دن میں واپس ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی وہ آدم پر اور بھی زیادہ مہربان ہو گئی۔ آدم ہرگز ہرگز ہیٹی سے اپنے عشق کا اظہار ابھی تک نہ کرتا اگر اس بڑھتی ہوئی مہربانیوں سے بالکل عیاں نہ ہو جاتا کہ دوسری طرف بھی لگی ہوئی ہے۔ آدم نے باغیچہ سے اُس کے لئے گلاب کا پھول توڑا اور اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے فارم کی طرف واپس آیا۔ اور جب رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تو مسٹر پوئسر نے کہا "ہیٹی اگر آدم تیرا شوہر ہو جائے تو بہت جلد تو اپنی ذاتی گھوڑا گاڑی میں اُڑتی پھرے گی مجھے بالکل یقین ہے"۔

اس کے چچا نے مگر یہ نہیں دیکھا کہ ہیٹی نے کس طرح منہ بنایا ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر گھومنا اُس کے لئے بڑی ادنیٰ بات تھی۔

اٹھارہ اگست کی تاریخ تھی، آدم فارم پر کام کر کے اپنے گھر واپس جا رہا تھا، سامنے کوئی بیس گز آگے دو رویہ درختوں کے ختم پر اس کو دو شکلیں دکھائی دیں، وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے کھڑے تھے، جوں ہی آدم بیڈ کا کتا بھونکا وہ دونوں ایک دم الگ ہو گئے ایک شکل تو اس کنج کے دوسری طرف روانہ ہو گئی۔ دوسری یعنی آرتھر ڈونی تھارن نہایت گھبرایا، سراسیمہ، منہ سرخ آدم کی طرف آ گیا۔ نوجوان کپتان دو ایک ہفتے ہوئے اپنی اکیسویں سالگرہ منانے آیا ہوا تھا اور دوسرے ہی دن اپنی رجمنٹ کو واپس جانے والا تھا۔

ابھی تک ان دونوں جوانوں میں دوستی اور خلوص اور ایک دوسرے سے رفاقت رہی تھی۔ لیکن آدم اس وقت یہ حالات دیکھ کر نہایت متحیر ہو گیا اور جلد ہی اس کا تحیر غیظ و غضب میں تبدیل ہو گیا۔

آرتھر نے کوشش کی کہ معاملہ کو ٹال ٹول دیا جائے گا یہ کہہ کر کہ محض اتفاقیہ ہیٹی سے ملاقات ہو گئی ہے۔ لیکن آدم نے محسوس کیا کہ اس آدمی نے جس پر وہ اعتبار کیا کرتا تھا

اس کے ساتھ نہایت مکاری اور دغا بازی کا برتاؤ کیا ہے اس لئے یہ معاملہ یوں رفع دفع نہیں کیا جا سکتا چنانچہ دونوں میں وہیں جنگ ہوئی تھوڑی ہی دیر میں آدم کے ایک زور دار گھونسے نے آرتھر کو زمین پر گرادیا جب آرتھر رخصت ہوا تو اس نے آدم کو یقین دلایا کہ وہ لام پر جا کر ہیٹی کو خط لکھ دے گا کہ اب وہ اس سے کوئی معاملہ رکھنا نہیں چاہتا نہ کوئی غرض اور آئندہ کے لئے اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گا۔ چنانچہ آرتھر نے جیسا کہا کر دکھایا۔ آدم نے یہ سوچ کر اپنے کو اطمینان دے لیا کہ محض معمولی پسندیدگی شروع ہوئی ہوگی جیسی نوجوانی میں عموماً ہوا کرتی ہے اور اب تو وہ ختم ہی کر دی گئی دن گذر گئے لیکن آدم نے محسوس کیا کہ وہ سکون وصبر جس سے وہ ہیٹی کی محبت کا انتظار کرتا رہتا تھا اس رات کے واقعہ کے بعد سے غائب ہو گیا ہے اس کی بجائے اب رقابت کی آگ سلگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کا سکون دماغی جاتا رہا۔

ہیٹی کو آرتھر کا خط ملا کچھ دنوں اس پر عجیب مایوسی کا عالم طاری رہا اب اس کی طبیعت میں کچھ کچھ تبدیلی ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں کیوں نہ آدم سے شادی کر لوں جو کچھ ہوا سو ہوا۔

چنانچہ نومبر میں جب مسٹر برج نے آدم کو اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت دی تو آدم نے نہ صرف یہ کیا کہ اسے خوشی سے قبول کر لیا بلکہ یہ بھی طے کر لیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہیٹی سے شادی کی درخواست کرے چنانچہ اس نے درخواست کی ہیٹی کچھ نہ بولی۔ آدم کا چہرہ لیکن اس کے چہرہ کے بہت قریب رہا بلکہ خود ہیٹی نے اپنے گول گول گال آدم کے گالوں سے ٹکرا دے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کو پیار کیا جائے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی گویا آرتھر پھر اس سے قریب ہے۔

آدم۔ تو پھر میں تمہارے چچا اور چچی کو اطلاع کر دوں۔ کیوں نا ہیٹی؟

رات کو جب ڈرائنگ روم میں آگ خوشی خوشی جل رہی تھی اور ہر ایک کے چہرے اس کی روشنی میں سرخ سرخ چمک رہے تھے آدم نے مسٹر اور مسز پوئسر سے کہدیا کہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک بیوی کا کفیل ہو سکتا ہوں اور ہیٹی میری بیوی بننے کے لئے تیار بھی ہو گئی ہے۔

اس اطلاع کے بعد بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی کہ آدم کا گھر کہاں بنایا جائے آخر کار جب

بہت دیر ہو گئی تو مسٹر ویئسر نے کہا، خیر خیر اس کی کیا ضرورت ہے کہ سب باتیں اسی وقت طے ہو جائیں اور تم ایسٹر سے پہلے تو شادی بھی نہیں کر سکتے ہو۔ حالانکہ میں زیادہ التوا میں رکھنے کا حامی نہیں ہوں پھر بھی تھوڑا بہت انتظام تو کرنا ہی ہے۔ اس کے بعد آدم رخصت ہو گیا۔

یہ نومبر کا زمانہ تھا۔

فروری میں ہیٹی سارل کی زندگی نے المیہ صورت اختیار کر لی۔ اس نے مکان چھوڑ دیا اور ایک دوسرے گاؤں میں جا کر اس کے بچہ پیدا ہوا آرتھر ڈونی تھارن کا بچہ ہیٹی نے اس بچہ کو ایک جنگل میں چھوڑ دیا اور جب اسے لینے واپس ہوئی تو وہ مر چکا تھا۔ پولیس، تحقیقات اور مقدمہ لیکن سزائے موت سے بچ گئی۔ عمر بھر کی جلا وطنی نصیب ہوئی چند سالوں کے بعد اسے معافی مل گئی مگر گھر واپس ہو رہی تھی کہ راستہ میں فوت ہو گئی۔

سنہ ۱۸۰۱ء کی خزاں کا زمانہ ہے دینا مارس ہال فارم پر واپس آئی ہوئی ہے لیکن پھر وہ عنقریب اپنے کام پر اپنے گاؤں جانے والی ہے لیکن مسز ویئسر نے دینا میں ایک نئی بات یہ محسوس کرنا شروع کی ہے کہ وہی دینا جس پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا اب اگر کبھی آدم کہتا ہے کہ دینا اب ہم ہی لوگوں میں ہمیشہ کے لیے بس گئی ہے اب میرے خیال میں اپنے گاؤں جا کر کرے گی بھی کیا تو دینا کے گالوں پر سرخی آجاتی ہے۔

مسز ویئسر کہتی "تمہارا خیال کیا سب کا یہی خیال ہے جو ذرا بھی سمجھ رکھتا ہے۔ لیکن آدم ایک بات اور بھی ہے کسی میتھوڈیسٹ کی باتیں سمجھنے کے لیے پہلے میتھوڈیسٹ ہونا ضروری ہے اس کے بغیر تم اس کے دل کی بات نہیں جان سکتے

مسٹر ویئسر کہتے۔ کیوں دینا! آخر ہم لوگوں سے کیا خطا ہوئی کہ تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر جا رہی ہو یہ تو خلاف وعدہ بات ہے۔ تمہاری خالہ کے تو کبھی دماغ میں بھی نہ آیا تھا کہ تم اس جگہ کو اپنا گھر نہ بناؤ گی۔

دینا اطمینان ظاہر کرتے ہوئے نہیں چچا میں جب پہلے آئی تھی اسی وقت میں نے کہہ دیا تھا کہ میں

تھوڑے ہی دنوں کے لئے آئی ہوں اور اس وقت تک رہوں گی جبتک میں خالہ کی کوئی خدمت کرسکوں۔

مسز ہولسر۔ تو بھلا تم سے کس نے کہا کہ تم اب میری خدمت نہیں کرسکتیں۔ اگر تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتی تھیں تو پھر تم آتیں ہی نہ۔ جو چیز ہوتی نہیں تو پھر اس کے جانے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

دینا آدم کے ساتھ روانہ ہوگئی کیونکہ آدم کی ماں کی طبیعت ناساز تھی اور اس نے اسے بلایا بھی تھا۔ راستہ میں آدم نے پھر ذکر چھیڑا۔ "دینا اگر خدا کہیں ایسا کرتا کہ تم کو ہماری بہن بناتا اور تم ہمارے ہی درمیان رہتیں تو میں کتنا خوش ہوتا!" دینا نے کچھ جواب نہ دیا اور دونوں چلتے رہے جب دونوں گھر کے قریب پہونچے تو آدم نے اوپر آنکھ اٹھائی دیکھا اس کا چہرہ تمامتر سرخ ہو رہا ہے گویا وہ کسی جذبہ کی کشمکش میں مبتلا ہو رہی ہے۔ بڑا متعجب ہوا اور بولا۔ "مجھے خیال نہیں کہ میں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے تمہیں تکلیف ہوئی شاید میں نے بہت زیادہ آزادی برتی۔ میں تمہاری کسی بات کے خلاف نہیں جانا چاہتا تم اپنے لئے جو بہتر سمجھتی ہو وہی بہتر ہے۔ اگر میری بات سے رنج پہونچا ہو تو میں تم سے تیس چالیس میل دور رہا کرونگا

بیچارہ آدم! سیدھے آدمی اسی قسم کی غلطیاں کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

اتوار کی صبح کو آدم کی ماں نے آنکھ کھولی۔ آدم قریب بیٹھا ہوا اپنی تصویروں دار انجیل پڑھ رہا تھا۔ اس کی ماں نے دینا کی باتیں کرنا شروع کیں کہ کس طرح وہ اپنے گاؤں واپس جا رہی ہے حالانکہ وہ ہم لوگوں کے درمیان بھی رہ سکتی تھی۔ آدم نے اکتا کر کہا کہ بس اماں اس کا خیال دل سے نکالدو۔ وہ رک نہیں سکتی تو جانے دو اور اسے بھول بھی جاؤ ابھی تمہاری طبیعت اچھی بھی نہیں ہے۔

ماں۔ "نہیں میں اسے بھلا نہیں سکتی۔ میں تو سمجھتی ہوں وہ تیرے ہی لئے بنائی گئی ہے۔ مجھے اس یقین سے کوئی بات ہٹا نہیں سکتی کہ خدا نے اسے صرف تیرے لئے بنایا ہے اور ہمارے گاؤں میں سے صرف تیرے ہی لئے بھیجا ہے۔ اگر وہ میتھوڈیسٹ ہے تو کیا حرج ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گی۔

آدم کرسی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں کا اصلی مقصد کیا تھا۔ چنانچہ اس نے پھر کوشش کی کہ اپنی ماں کے دماغ سے دینا کا خیال نکالدے لیکن اس کی ماں بھلا کیسے نکال سکتی

تھی بلکہ اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ دینا کو خود تجھ سے محبت ہے اس بات نے آدم پر بہت اثر کیا اور
اس نے طے کر لیا کہ اسے دینا کے پاس جانا چاہیئے۔ اس نئے خیال نے اور تمام خیالوں کو برطرف
کر دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ واقعی اس میں صداقت ہے یا نہیں۔ اس نے سیتھ سے اس کا تذکرہ کیا
اس نے کہا میں نے تو مدت ہوئی اس سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ بلکہ میں تو خوش ہوں گا اگر
وہ تیری بیوی ہو جائے گی لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ شادی کے لئے تیار بھی ہو۔ پھر بھی پوچھ لو جب
میں نے پوچھا تھا تو اس نے کچھ بھی بُرا نہ مانا تھا۔ اور تیرا تو مجھ سے زیادہ حق ہے"

چنانچہ آدم نے آخر کار دینا سے جا کر پوچھ ہی لیا۔ دینا نے کہا کہ میرا دل تو تمہاری طرف بہت
راغب ہے لیکن جب تک خدا کی طرف سے بھی اس امر کی ہدایت مجھے نہ ہو اس وقت تک میں
کوئی جواب نہیں دے سکتی ابھی انتظار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ہال فارم چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی۔

آدم انتظار کرتا رہا کئی ہفتے گذر گئے آخر کار وہ اس کا جواب لینے دینا کے گاؤں گیا۔

تھوڑی دیر وہ دونوں ٹہلتے رہے دینا جواب میں کہنے لگی "آدم خدا کی مرضی یہی ہے۔ میری
روح تیری روح میں اس قدر ضم ہو گئی ہے کہ تیرے بغیر میں صرف آدھی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ اس
وقت تم میرے قریب ہو تو میں ایسا محسوس کر رہی ہوں گویا خدا کی مرضی اور اس کے احکامات کی
بجا آوری کے لئے مجھ میں دوگنی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بات مجھ میں پہلے کبھی نہ آتی تھی"

"اچھا دینا، تو پھر ہم دونوں اب کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک موت
ہم کو جدا نہ کر دے"

گہری خوشی کے ساتھ ان دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کر لیا۔

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نظم اُردو۔ از حکیم ابو العلا صاحب ناطق۔ صدیق بکڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ، قیمت ۸؍

ناطق صاحب نے اردو نظم و نثر کی تاریخ کو ۹۶ بندوں میں نظم کیا ہے ناطق صاحب پُرانے شاعر ہیں لکھنؤ میں مقیم ہو جانے کے باعث زبان پر قدرت حاصل کر لی ہے۔ اس نظم میں دو چار ایسے مواقع آئے ہیں جہاں انھیں اپنے فنی کمال دکھانے کا موقع ملا ہے۔ پھر بھی نظم اپنے مخصوص موضوع کے باعث میٹھی نہیں ہو سکی ہے لیکن ناطق صاحب نے جو حاشیے لکھے ہیں وہ البتہ بڑی کاوش اور بڑی محنت سے ترتیب دئے ہیں۔ تمام پرانے نثار اور شاعروں کی نثر اور نظم کے نمونے حاشیہ پر معہ تاریخ درج کر دئے ہیں۔ ان کے مختصر حالات بھی ہیں یہ چیز ایسی ہے جو اردو داں طبقہ کے لئے عموماً اور طلبا کے لئے خصوصاً بہت مفید ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ ناطق صاحب کی اس محنت کی ضرور قدر کی جائے گی۔

سفر نامہ حکیم ناصر خسرو۔ مترجمہ ثروت اللہ صاحب کرمانی۔ ملنے کا پتہ: اشراف محلہ سندیلہ ضلع ہردوئی و مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ قیمت ۸؍

یہ سفر نامہ دراصل حکیم ناصر خسرو کی کتاب زاد المسافرین کا ترجمہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۴۳۷ھ تا ۴۴۴ھ میں اختیار کئے تھے۔ شروع میں جناب چودھری محب اللہ صاحب کا تبصرہ ہے جس میں انھوں نے حکیم ناصر خسرو کی دیگر تصانیف پر بھی نظر ڈالی ہے اور زاد المسافرین کا ہلکا سا جائزہ لیا ہے۔ دو حکیم ناصر خسرو کی تفصیلات پر دیگر سفرناموں سے کچھ اضافہ کیا ہے۔ دیباچہ میں مترجم نے انھیں مقامات کے سفر کا زمانہ حال کی آسانیوں سے مقابلہ کیا ہے جن مقامات کا حکیم ناصر نے سفر کیا تھا

ترجمہ بھی صحیح اور با محاورہ ہے۔

خاتم النبیین و آموزش اسلام: ۔ جلد اول۔ از عباس شوستری صاحب۔ پروفیسر فارسی میسور یونیورسٹی صفحات ۷۷۴، قیمت درج نہیں

مصنف نے یہ کتاب موجودہ فارسی زبان میں پیغمبر اسلام کی زندگی اور ان کے پیغام پر لکھی ہے۔ عباس صاحب لائٹ آف ایشیا کا بھی ترجمہ کر چکے ہیں اور اسی پر انھیں خیال ہوا کہ ایسی ہی کتاب پیغمبر اسلام کے متعلق بھی ہونی چاہیے۔ پیغمبر صلعم کی زندگی کے تمام واقعات قرآن کی روشنی میں پیش کئے ہیں۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ یہ کتاب صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث ہو سکے۔ عباس صاحب لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اس مبارک کام کو سرانجام دیا اور بوجہ احسن انجام دیا۔

جنگ آلودہ دنیا: ۔ وینکٹیش نارائن صاحب تیواری انڈین پریس الٰہ آباد صفحات ۹۰، قیمت درج نہیں

موجودہ جنگ نے یورپ کے نقشہ میں جو تبدیلیاں کر دی ہیں اور جن ممالک پر موجودہ اثر ہو رہا ہے ان ممالک کے تمام نقشے مع مختصر حالات کے جمع کر دئے گئے ہیں آخر میں بہت مفید ضمیمے شامل کر دئے گئے ہیں۔ تقریباً اہم نقشے مع چارٹوں کے ہیں۔ جنگ کے حالات سمجھنے میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

تذکرۂ بے نظیر: ۔ مولفہ سید عبدالوہاب افتخار۔ مرتبہ سید منظور علی ایم۔ اے۔ کتابستان الٰہ آباد قیمت عہ

سید منظور علی صاحب ریسرچ اسکالر نے ۱۹۳۵-۳۶ء میں عبدالوہاب افتخار کے تذکرۂ بے نظیر کو ترتیب دیا تھا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی و عربی نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ میر عبدالوہاب بارہویں صدی ہجری میں دکن میں فارسی کے ایک معروف شاعر تھے۔

سنہ [illegible] میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کے وسیلے سے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تذکرہ سنہ [illegible] میں ترتیب دیا گیا۔ یہ تذکرہ دراصل ان ایرانی اور ہندی فارسی شاعروں کا ہے جو بارہویں صدی کے شروع کے ۲۷ سالوں میں مشہور و معروف تھے۔ تذکرہ قدیم طرز کی فارسی زبان میں ہے۔ ہندی شعرا میں بعض وہ بھی ہیں جو اردو کے بھی معروف شاعر رہ چکے ہیں۔ مثلاً قزلباش خاں امید، سراج الدین علی خاں آرزو، مظہر جان جاناں وغیرہ

شروع میں منظور علی صاحب کا لکھا ہوا ایک دیباچہ انگریزی میں ہے۔ مؤلف کے حالات اور اس کے اسلوب پر اس سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

نقشہ جات

لڑائی کا نقشہ (یورپ دونیا) اور سنہ [illegible] کے میدان جنگ کا نقشہ۔

یہ دونوں نقشے یو۔ پی کے محکمہ توسیع تعلیم کی طرف سے اردو میں شائع کئے گئے ہیں۔ جنگ کے موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے یہ نقشے بہت مفید ہوں گے۔ نقشے صاف اور اچھے بنے ہیں۔ پہلے نقشہ میں البتہ دریا ضرورت سے زیادہ دیدے گئے ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ بھارگوا اسکول بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ سے مل سکتے ہیں۔

رسالہ تاریخ:۔ مرتبہ حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری، دفتر تاریخ حیدرآباد دکن صفحات ۱۴۴، چندہ سالانہ درج نہیں

نواب لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے حکیم شمس اللہ صاحب قادری کی زیر نگرانی یہ سہ ماہی رسالہ نکل رہا ہے۔ زیر نظر نمبر میں پونا آلی کا قطب شاہی کتبہ، بڑے گنج دروازے کا منظوم کتبہ شہنشاہ بابر کے سکے شیخ شہاب الدین سہروردی، سلاطین کلوہ، مہم ارکاٹ وغیرہ مضامین ہیں۔ جن میں آخری تین بڑے پر مغز اور تحقیقی مقالے ہیں۔ حکیم صاحب خود تاریخ و آثار قدیمہ پر بہت کام کر چکے اور کر رہے ہیں۔ تاریخ سے ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔

شذرات

مولانا احسن مارہروی کی وفات حسرت آیات نے اُردو کے شاعروں میں ایک اور کمی کر دی
مولانا احسن پرانے طرز کی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔
داغ کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ مدتوں ان کے ساتھ رہے اور بعد کو [illegible]
[illegible] مولانا کو تصنیف و تالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔ کلیات ولی، تاریخ نثر اردو [illegible]
[illegible] کے مشہور کارنامے ہیں۔ خود ان کا کلام احسن الکلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے
علاوہ بھی کئی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ کتب بینی کا بہت زیادہ شوق تھا۔ مارہرہ میں خود اپنی
ایک لائبریری قائم کی تھی۔ باوجود ساٹھ کے اوپر ہو جانے کے، شوق کے باعث بہت زیادہ
محنت کیا کرتے تھے۔ کوئی رسالہ ایسا نہیں جس میں ان کا کلام شائع نہ ہو چکا ہو۔ تندرستی بہت
اچھی تھی۔ چند دنوں سے پیٹھ پر پھوڑا نکل آیا تھا جو آخر کار مہلک ثابت ہوا۔ ایسے اولوالعزم اور انتھک
کام کرنے والے ادیب اردو کو مشکل سے نصیب ہوتے ہیں۔

اس ماہ میں یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ پروفیسر رضی الدین صاحب صدیقی کو نوبل پرائز
ملا۔ پروفیسر صاحب آئن سٹائن کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں اور نظریہ کوانٹم پر موصوف
نے کافی کام کیا ہے۔ یہ انعام انہی خدمات کا اعتراف ہے۔ جن لوگوں کو یہ انعام مل چکا ہے
ان میں غالباً موصوف ہی سب سے کم عمر ہیں۔

اس شمارے سے ہم مشہور انگریزی ناولوں کا اختصار افسانے کی شکل میں پیش کر رہے ہیں
اگر ہمارے ناظرین نے پسند کیا تو اس سلسلہ کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان میں اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب رضا اینڈ سنس چار مینار حیدرآباد (دکن) سے دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صرف ۴ روپے

انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی کی چند نئی مطبوعات

معمارِ اعظم جدید یورپ کے نامور تمثیل نگار السن کے مشہور ڈرامے (The Master Builder) کا ترجمہ جو عزیز احمد صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) نے نہایت سلیس زبان میں تحریر کیا ہے [illegible] کے لائق ہے فاضل مترجم نے ابتدائی چالیس صفحوں میں مصنف کے سوانح حیات اور اس کی تصانیف پر ایک پر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔ حجم ۱۷۵ صفحے قیمت بلا جلد ۱۲ مجلد ۱۴

اضافیت آئن شٹائن کی نظریہ اضافیت کی عام فہم تشریح از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ عام طور پر نظریہ اضافیت کو ایک دقیق مسئلہ سمجھا جاتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف بارہ ریاضی داں ایسے ہیں جو اس انقلاب انگیز نظریہ کو سمجھنے کے قابل ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بالکل بہمل نظریہ ہے۔ لائق مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ ہر وہ ریاضی داں جو ریاضی کی اس شاخ کا باضابطہ مطالعہ کرے اس نظریہ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ طرز بیان سادہ اور عام فہم رکھا گیا ہے اور اصطلاحات سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے حجم تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحے۔ قیمت ۱۲ مجلد ۱۴

اقبال انجمن کے رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۸ء نمبر اقبال نمبر کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ چند ہی روز میں اس کی یہ اشاعت ختم ہو گئی لیکن فرمائشیں برابر آتی رہیں اس لئے ارباب شوق کے اصرار پر اس نمبر کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ یہ کتاب ۲۲×۱۸ کے ۲۷۶ صفحوں پر چھپی ہے قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (۸/۲) غیر مجلد دو روپے (۲) رسالہ شاہکار لاہور کے مدیر کی رائے اقبال نمبر کے متعلق ملاحظہ ہو۔

> آج کل کافی تعداد میں "اقبال نمبر" نکل چکے ہیں اور اقبال کی شاعری کے متعلق مضامین تو عام طور پر رسائل میں نکلتے رہتے ہیں لیکن رسالہ اردو کے اقبال نمبر نے تمام پر فوقیت حاصل کر لی۔ آج تک اس قسم کے سیر حاصل مضمون شائع نہیں ہوئے۔

ملنے کا پتہ

منیجر انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی

بچوں کی کتابیں

بچوں کی دلچسپی کا لوگ بہت کم خیال کرتے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں ایسی کتابیں بھی بہت کم ہیں جنھیں بچے دلچسپی اور شوق سے پڑھیں، تاہم انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے چند کتب خاص طور پر بچوں کے لیے چھاپی ہیں جن کو بچوں کی دلچسپی کا سامان کہا جا سکتا ہے۔

[illegible]ے کا کھلونا۔ یہ پیاری کتاب ننھے منے بھائی کے لیے ہے کھیل ہی کھیل میں وہ حروف تہجی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہر حرف کے لیے ایک رنگین تصویر اور ایک شعر ہے زبر، زیر اور پیش وغیرہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ چھپائی رنگین اور بہت صاف ۲۲ عکسی تصویریں اگر آپ کے یہاں کئی بچے ہوں [illegible] طلب فرمایئے ورنہ بچے آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ قیمت صرف ۱۲/

[illegible]کھی کہانیاں۔ یہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے۔ گیارہ نصیحت آمیز کہانیاں اس میں درج ہیں۔ زبان [illegible]ت آسان ممکن نہیں کہ کوئی بچہ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دے۔ ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہے جو صورت کتاب ہے۔ بچے اس کو دیکھتے ہی مچل جاتے ہیں سرورق پر تین رنگ کی تصویر ہے۔ قیمت ۴ آنہ

[illegible]یجادات کی کہانی۔ یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر (میرٹھی) کی قابل قدر تصنیف ہے یہ کتاب اردو میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی تصنیف ہے اور مفید معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے کاغذ، کتابت طباعت اور سرورق بے انتہا نفیس ہے اس قدر اچھے اہتمام سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔ تشریح مطالب کے لئے جا بجا بیشمار تصویریں دی گئی ہیں۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۱۲/

[illegible]یسپ کی کہانیاں۔ ایسپ ایک مشہور حکیم گزرا ہے جو مورخین کے بیان کے مطابق حضرت مسیح سے ۶۰۰ برس قبل پیدا ہوا تھا حکیم ایسپ انسان کی پند و نصیحت کیلئے مختلف قسم کی فرضی حکایات اور کہانیاں بیان کیا کرتا تھا۔ انھیں کہانیوں کی وجہ سے دنیا میں اس کا نام اب تک زندہ ہے اس مجموعہ میں ایسپ کی تین سو کہانیاں یکجا شائع کی گئی ہیں چھپائی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں جن کے

باعث یہ مفید کتاب اور زیادہ دلچسپ ہو گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔
مجلد ہے۔ قیمت دو روپے (۲؍)

[illegible]ے وطن کی کہانی ۔ تاریخ ہند کی کئی جلدیں [illegible] پڑھلئے جاتے، حالانکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس کتاب میں اس قسم کے واقعات نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے تفریحی مطالعہ کے لئے بیان کئے گئے [illegible] میں ہاف ٹون عکسی تصویریں۔ قیمت ۱۰؍

شیخ چلی کی کہانیاں ۔ شیخ چلی کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ یہ وہ جادو بھری ہستی ہے جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اس کتاب میں آپ ہی کے کارنامے درج ہیں جو گیارہ کہانیوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ ہر کہانی اس قدر پر لطف ہے کہ انسان بھوک پیاس بھول جاتا ہے۔ پڑھئے جائیے اور ہنستے جائیے۔ لکھائی چھپائی ایسی عمدہ ہے کہ بچوں کو بطور انعام دی جا سکتی ہے۔ دو سو صفحات کی کتاب کی قیمت صرف دس آنے (۱۰؍)

داستان عجم ۔ بچے بادشاہوں کے قصے بہت شوق سے پڑھتے ہیں لیکن جھوٹے بے اصل قصوں سے یہ بہتر ہے کہ انھیں بادشاہوں کے تاریخی قصے پڑھنے کو دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے داستان عجم بہت اچھی کتاب ہے۔ خلاق سخن فردوسی کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں انھیں کو اس کتاب میں بچوں کیلئے بہت سلیس اور عام فہم عبارت میں لکھا گیا ہے۔ ضرور منگائیے۔ قیمت حصہ اول دس آنے (۱۰؍) حصہ دوم دس آنے (۱۰؍)

رابنسن کروسو ۔ ایک نوعمر لڑکا گھر سے فرار ہو کر بحری سفر اختیار کرتا ہے اور طرح طرح کے مصائب اٹھاتا ایک غیر آباد جزیرہ میں پہنچتا ہے اور وہیں پچیس برس تک تھوڑا دہیں رہتا ہے۔ اتنی مدت اس نے کیونکر بسر کی اور پھر یہاں سے کیسے نکلا، وغیرہ واقعات نہایت دلچسپ ہیں۔ اس کتاب کو نوعمر بچے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ہاف ٹون بلاک کی چھ تصویریں شامل کتاب ہیں جن میں ایک سہ رنگی ہے۔ حجم ڈھائی سو صفحات سے زیادہ اور قیمت صرف بارہ آنے (۱۲؍)

ملنے کا پتہ:- **مینیجر بکڈپو انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد**

تعلیم نسواں پر بہترین کتابیں

[illegible] کو علم و تہذیب سکھانے میں یہ کتابیں لاجواب ہیں

آداب [illegible] بیٹیوں اور لڑکیوں کے لئے نہایت کار آمد اور مفید نصیحتیں۔ قیمت

گھر اور گھر والی بی بیوں کے لئے خانگی زندگی میں بجائے اتالیق کے کام دیگی۔ قیمت ۸ر

بیوی کے فرائض:۔ شریف مستورات کے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے بتایا گیا ہے
اس پر عمل کرنے سے گھر نمونہ جنت بن جائے گا۔ قیمت ۸ر

بہشتی جھومر:۔ لڑکیوں کے لئے اسلامی دستور العمل جملہ مسائل نسواں ایک دلچسپ قصہ کی شکل میں قیمت ۱۲ر

راہ جنت:۔ بیبیوں کو دینداری کی زندگی بسر کرنیکی ترغیب دلانے والے دلچسپ قصے درج ہیں۔ قیمت ۸ر

حوران جنت:۔ عرب کی تمام عالمہ فاضلہ مشاہیرہ۔ محدثہ اور فقیہہ مسلمان بیبیوں کے حالات قیمت ۸ر

شریف بیبیاں:۔ ہندوستانی اور انگریزی خواتین جو دنیا میں اپنے علم و فضل کے باعث نام پیدا
کر گئی ہیں۔ قیمت ۵ر

صبر کی دیوی:۔ ایک صابر و شاکر بی بی نے اپنے جابر و ظالم خاوند کو کیسے اپنے لئے مہربان
کیا۔ قیمت ۳ر

جمیلہ خاتون:۔ ایک ضدی اور ہٹیلی عورت کا زیور کی بدولت نادم ہو کر توبہ کرنا ایک سبق
آموز داستان ہے قیمت ۳ر

رفیق مرزا:۔ تعلیمیافتہ اور جاہل ماؤں کا مقابلہ انکی اولاد کا الگ الگ انجام قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

منیجر رہنما ایجنسی محلہ مفتی ٹولہ شہر مراد آباد یوپی

جوئبار زمانۂ حال کی ایک معیاری تصنیف
یہ کتاب جناب ظفر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو بائیس ... سائز پر
نہایت اچھے کاغذ، کتابت اور طباعت سے انجام پایا ہے۔
جوئبار کی پہلی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری نے ایسی گلشن اور
کروٹ لی ہے کہ شعرا تو اسکی ہمدوشی نہیں کر سکے گی
جوئبار میں اس جوان سال شاعر نے اپنی رومانی و فطری نظموں میں کہیں بھی رومان
کو منظر او منظر کو رومان سے علیحدہ نہیں ہونے دیا
جوئبار کی ہر نظم شاعر کی کیفیت و رحجوم رنگ و بو کیساتھ ساتھ یہ بھی عیاں ہے کہ شاعر
کو دعا کی جستجو ہے اور مایوس ہو کر بار بار فطرت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے
غرض
جوئبار سے دور کی شاعری کا ایک قابل دید نمونہ ہے
قیمت صرف ایک روپیہ
پتہ:-
قصر اردو ملتان چھاؤنی
بیادگار آغا حشر کاشمیری مرحوم
ماہوار
حشر
"ملتان چھاؤنی"
ہندوستان
کا پہلا ماہنامہ جس کے متعلق ملک کے ۵۰ مشہور و معروف
اخبارات و رسائل نے تعریفی نوٹ لکھے
فی پرچہ دو آنے (۲)
مینیجر رسالہ حشر ملتان چھاؤنی
ہر ماہ
۱- حشر کے غیر مطبوعہ ڈرامے
۲- دلچسپ افسانے دلکش نظمیں۔
۳- دیدہ زیب تصاویر اور بے لاگ تنقیدیں
۴- اصلاح سخن کے نادر نمونے۔
سالانہ چندہ صرف ڈیڑھ روپیہ
آپ حشر کو ایک نظر دیکھئے اگر ہمیشہ کے لئے سرپرستی
اختیار نہ کریں تو ہمارا ذمہ۔ نمونے کے لئے دو آنے
کے ٹکٹ بھیجئے۔

جامعہ

زیرادارت :- نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۳ نمبر ۱۱ | بابتہ ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محمد المطابع دہلی

اسلام ہیگل کی نظر میں

جرمنی کے مشہور و معروف مفکر ہیگل ۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء نے فلسفہ تاریخ پر خطبات کا ایک سلسلہ تیار
کیا تھا جو اس کے نظام فکر کے لئے ایک عام فہم دیباچے کا کام دیتا ہے ہیگل کا سمجھنا دشوار اور
اس کا صحیح سمجھنا دشوار تر ہے مگر ان خطبات میں اس کے مابعد الطبیعات کے اصول ایک تاریخی
اور سماجی ماحول میں اور مادی صورت میں روشن ہو جاتے ہیں ہیگل مسلسل وحدت الوجود
کا قائل ہے اور اس کی نظر میں نسل انسانی اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اس ارتقائی شاہراہ
پر گامزن ہے جس کا مقصود عقل کل کو پا لینا ہے اس شاہراہ پر کئی ایک منزلیں
کئی ایک قیام گاہیں رہی ہیں جن میں سے مختلف اقوام عالم مختلف زمانوں اور ملکوں میں
گذر چکی ہیں۔ اس کے خیال میں تاریخ کے تہذیب ساز عمل کا اصل مقصود ذہنی آزادی حاصل کرنا ہے
اس لحاظ سے اس نے تاریخ عالم کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے سب سے پہلے دنیائے مشرق
آتی ہے جس میں چین، ایران اور ہندوستان شامل ہیں ان مذہبی تمدنوں میں حقیقت
کو سمجھنے اور پالینے کے لئے انسان کو صورتوں کی ضرورت پڑی اس کے بعد عالم یونان اور
عالم روما آتا ہے سب سے آخری لیکن سب سے اہم عالم المانوی ہے۔ اس دنیا کی سپرٹ
نئی دنیا کی سپرٹ ہے اس دنیا میں انسان اصل حقیقت کی جستجو کے ہزاروں سالہ مجاہدے کو کامیاب
طور پر ختم کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پہلے دوروں میں انسانیت خود ایک غلام ہے اس کے
ہاتھ اور پاؤں پر روایتی عقائد و سماجی بندھنوں کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں سماجی زندگی کا منتہائے
اعلیٰ انہی بندھنوں سے رہائی پانا ہے اور ذہنی آزادی کے معراج کو حاصل کر لیا ہے انسانیت کا
اصل مقصد اپنی حقیقت کو پا لینا ہے اس دور میں روح کی مکمل نشو و نما ممکنات میں سے نظر
آتی ہے روح انسانی جس کی فطرت ہی آزاد واقع ہوئی ہے خارجی اور داخلی ... سے اپنے

قید و بند کی کڑیوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالتی ہے خارجی آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان ایسے خارجی قوانین اور اصولوں کا پابند ہو جن کو وہ دل سے خود بھی تسلیم کرتا ہو اور داخلی آزادی سے مراد نفسانی خواہشات اور بہیمانہ جذبات سے مبرا ہو جانا ہے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیگل نے باوجود اپنی عیسائی تربیت اور مذہبی اثر کے اسلام کی ان شاندار خدمات کا اعتراف کیا ہے جو نظام اسلامی نے نسل انسانی کو ان ارتقائی مدارج کے طے کرنے کے سلسلے میں کی ہیں عالم الاوہی پر لکھتے ہوئے وہ اپنی بحث کا آغاز ان میوٹن نسل کے گروہوں اور جرمنی کے وحشی قبائل سے کرتا ہے جنہوں نے پہلے پہل عیسائیت کو قبول کیا یہ روح انسانی کے لئے ایک لازمی قسم کا تطہیری دور تھا اس دور میں روح میں جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے (مادی) صورت میں تکمیل پا رہی تھی انسان ابھی اس قابل نہ ہوا تھا کہ اصل حقیقت کو اس کی تجریدی حالت میں بغیر کسی تشبیہ اور استعارے کے بغیر کسی بت اور اصنام کے معلوم کرے لیکن اسی زمانے کے قریب دنیائے مشرق میں اخلاقی اور سماجی لحاظ سے ایک نیا انقلاب آجاتا ہے یہ انقلاب ہے طلوع اسلام اس انقلاب کی رو میں بہہ کر انسانی دنیا قرنوں اور صدیوں کی ارتقائی منزلیں سالوں اور مہینوں میں طے کر لیتی ہے عقل کے باد پا قاصد منطق کی بھول بھلیوں میں رہ جاتے ہیں۔ اور عشق کی مشعل سے اس کے خرمن عقل پر ایک چنگاری پڑتی ہے جس سے کہ اصل حقیقت جگمگا اٹھتی ہے حقیقت پا لینے کا یہ عمل ایک بجلی کی طرح انسانی ذہن پر چمک جاتا ہے اور اس حقیر انسانی ہستی کو جو ہزاروں سال تک عین حقیقت پا لینے کے لئے کبھی پتھروں کی محتاج رہی کبھی فطرت کے منظروں کی اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ عین ذات پر تجریدی صورت میں نگاہ بھر کے دیکھ لے ہیگل کے خیال میں انسانی روح کا کمال یہی ہے۔ اس مذہبی اور سماجی عمل کی کیفیت جس کی امداد سے یہ معجزہ رونما ہوا ہیگل کے الفاظ میں سنئے]

ایک طرف یورپ اپنی تعمیر نو کر رہا تھا قومیں اپنی بیخ و بن استوار کر رہی تھیں تاکہ آزاد حقائق کی ایک ایسی دنیا پیدا کریں جس کی وسعتیں اور جس کی ترقی ہر طرف ظہور پذیر ہو۔ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے کام کی ابتدا اس طرح کی کہ تمام سماجی تعلقات کو تخصیص کا رنگ دیدیا اور تخصیص بھی اس طور پر کہ اپنے کند اور تنگ ذہنوں سے ان باتوں کو جو بظاہر عام اور حسب معمول ہیں اس طرح خرد برد کر ڈالا کہ وہ قدرتی کلیے محض اتفاقی اور ناگہانی امور کا مجموعہ ہو کر رہ گئے جن کو ایک سادہ سے اصول اور سادہ قانون کی شکل میں ہونا چاہیے تھا رسوم کا ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا جال بنا کر رکھ دیا مختصراً یہ کہ جب مغرب ایسے کو اتفاق پیچیدگی اور تخصیص کی سیاسی عمارتوں میں بناہ گزیں کر رہا تھا روحانی تجلی کا تناسب قائم رہنے کے باعث دنیا میں دوسری جگہ اس کے بالکل متضاد اصولوں کا ظہور ہونے لگا یعنی مشرق میں انقلابی شان سے ظاہر ہوئی جس نے تمام تخصیص اور انحصار کے خرخشوں کو تباہ و برباد کر دیا اور طبیعت اور روح کا تصفیہ کر کے انھیں تمام تر پاک و صاف کر دیا یعنی مجرد ذات وحدہٗ کو اپنی توجہ و عبادت کا مرکز بنا لیا اور اسی قدر خالص داخلی عرفان —— یعنی مجرد ذات وحدہٗ کے عرفان —— کو حقیقت کا واحد مقصد گردانا یعنی اس ذات غیر مشروط کو مشروط حیات قرار دیا۔

ہم شرقی اصولوں کی ماہیت سے آگاہ ہو چکے ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ وہاں کی ذات اعلیٰ محض منفی حیثیت رکھتی ہے یعنی اس کے نزدیک مثبتی حیثیت رکھنا محض مایا میں اپنے کو مبتلا کر دینا ہے اور روح کو مادی حقیقتوں کا غلام بنا دینا ہے صرف یہودیوں میں ہم نے دیکھا تھا کہ مجرد وحدانیت کا اصول ان کے یہاں تفکر کی بلندیوں پر لے جایا گیا تھا کیونکہ صرف وہی لوگ ذات وحدہٗ کا اعتقاد رکھتے تھے اور ان کا ذات وحدہٗ کا نظریہ تخیل کی صورت میں تھا یہ وحدانیت کا تصور اس وقت بھی قائم رہا حالانکہ روحانی پاکیزگی کے لئے مجرد روح کے تصور کا مسئلہ طے سمجھ لیا گیا لیکن اس کو ابھی اس تخصیص سے آزاد ہونا تھا جو یہودا کی پرستش میں سدِ راہ ہوتی تھی۔ یہودا صرف

لہ Particularity لہ یہاں ہمدردوں سے مطلب ہے

اسی قوم کا خدا تھا[1] ابراہیم کا، اسحٰق کا، یعقوب کا، صرف یہودیوں سے گویا اس خدا نے سمجھوتہ کر لیا تھا
اس تعلقات کی تخصیص کو اسلام نے فنا کر دیا۔ روح کی اس عالمگیری میں تصور کی اس محدود و
غیر معین سادگی اور پاکیزگی میں فرد انسانی کے لئے کسی اور مقصد کی ضرورت نہیں سوائے اس کے
وہ اس عالمگیری سادگی کو حاصل کرے اللہ یہودیوں کے خدا کی طرح ایجابی اور محدود مقصد نہیں رکھتا
اسلام کا مقصد اور واحد مقصد محض ایک ذات وحدہٗ کی پرستش ہے۔ آدمی کی داخلیت (روح)
کے لئے صرف یہی ایک کام ہے کہ وہ اسی ذات وحدہٗ کی پرستش میں منہمک ہو جائے، اور تمام
خارجی موجودات کو اسی ذات وحدہٗ کا مطیع بنائے یہ ذات وحدہ دراصل روح کی خصوصیت
رکھتی ہے لیکن چونکہ انسان کی داخلیت (روح، خارجی اشیا میں ملوث ہو جاتی ہے یہ ذات
وحدہٗ اس لوث سے منزہ رہتی ہے اس طرح سے داخلیت ایک طرف تو بالکل روحانی
طور پر آزاد نہیں ہو پاتی دوسری طرف اس کی عبادت کا مرکز مادی بھی نہیں ہونے پاتا لیکن
اسلام ہندوانہ نہیں ہے نہ راہبانہ طور پر واجب الوجود میں گم ہو جانا یہاں داخلیت زندہ اور
غیر محدود ہے یعنی یہاں داخلیت وہ قوت ہوتی ہے جو دنیاوی زندگی میں محض منفی مقاصد کے
ساتھ داخل ہوتی ہے اور دنیاوی معاملات میں اپنے کو محض اس طرح سے مشغول کرتی ہے
اور ان میں اس طرح مداخلت کرتی ہے جس سے ذات وحدہٗ کی خالص تحریم و تکریم میں ترقی
ہو۔ اسلامی عبادت کا مرکز تمام تر عقلی ہوتا ہے کوئی بت یا خدا کی کسی قسم کی صورت و شکل نہیں پیش
کی جاتی محمد پیغمبر مانے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انسان یعنی انسانی کمزوریوں سے بالا نہیں اسلام
کے خصائص میں یہ بات جاری و ساری ہے کہ عالم موجودات میں کوئی چیز مقرر اور مستحکم نہیں ہو سکتی
ہر چیز کی قسمت میں ہے کہ اپنے کو حرکت دے۔ زندہ بنے اور دنیا کی بے انتہا وسعتوں میں اتنی
پھیل جائے کہ وہ تمام کل سوائے اس ذات وحدہٗ کے علاقہ کے کسی اور صورت کا کبھی نہ جا سکے
یہ متحرک قوت اپنی وسعت میں قوم اور ذات پات کے تمام امتیازات کو نس نس کر دیتی ہے نسلی

---

[1] یہودیوں کا اللہ۔

جنسی، موروثی یا ملکی کسی قسم کے حقوق تسلیم نہیں کئے جاتے صرف انسان رہ جاتا ہے اور وہ بھی
مومن انسان۔ ذات وحدہٗ کی عبادت و تعظیم کرنا، اسی میں ایمان رکھنا، روزے رکھنا تاکہ خصوصیت کا
جذبہ اور دنیاوی علائق کی وجہ سے ذات نامحدود سے علیحدگی کا جو احساس ہو جاتا ہے وہ دور ہو جائے
زکوٰۃ دینا (یعنی مخصوص ذاتی ملکیت کے احساس سے نجات پانا) یہ اسلام کے احکامات کا نچوڑ ہیں اور
ان سب میں ارفع حکم مذہب کی خاطر شہید ہو جانا ہے اسلام میں وہ شخص جو میدان جنگ میں ایمان کی خاطر
شہید ہو جنت اس کے لئے یقینی ہے۔

مذہب اسلام عربوں میں شروع ہوا۔ ان کے وہاں روح اپنی سادہ ترین صورت میں جلوہ گر
ہوتی ہے اور ذات سے صورت کا احساس وہاں اپنی خاص منزل رکھتا ہے کیونکہ ان کے ریگستانوں
تھا کوئی چیز مستحکم اور مضبوط صورت و شکل میں نہیں لائی جا سکتی مسلمانوں کا سنہ محمدؐ کی ہجرت سے
سنہ ۶۲۲ء سے شروع ہوتا ہے خود آپ کی زندگی میں آپ کے زیر قیادت لیکن آپ کے بعد
خاص کر آپ کے خلفاء کی سیادت میں عربوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں پہلے انھوں
نے شام پر حملہ کیا اور اس کے دار السلطنت دمشق کو سنہ ۶۳۵ء میں فتح کرلیا اس کے بعد فرات و
دجلہ کو عبور کر کے اہل فارس سے نبرد آزما ہوئے۔ اور بہت جلد تمام فارس کو زیر کر لیا مغرب میں
انھوں نے مصر، شمالی افریقہ اور اسپین فتح کیا اور جنوبی فرانس میں بھی تورز تک بڑھتے چلے گئے جہاں
تورس کے مقام میں چارلس مارٹل انھیں روک سکا مغرب میں تو یہاں تک پھیلے مشرق میں انھوں
نے یکے بعد دیگرے فارس، سمرقند اور ایشیائے کوچک کے جنوب مغربی حصے کو فتح کرلیا۔ اور یہ تمام
فتوحات اور ساتھ ہی ان کے مذہب کی تبلیغ غیر معمولی تیزی کے ساتھ ہوئی جو کوئی اسلام لے آتا
تھا وہ تمام مسلمانوں کے بالکل برابر ہو جاتا۔ جو اس سے انکار کرتے وہ شروع میں تو قتل کر دئے جاتے
تھے لیکن رفتہ رفتہ اہل عرب مفتوحین سے رحمدلی کا برتاؤ کرنے لگے اب اگر مفتوحین اسلام قبول
کرنے میں معذرت کرتے تو ان سے صرف سالانہ جزیہ (ایک قسم کا ٹیکس) لیا جاتا اور وہ شہر جو جلد
اطاعت قبول کر لیتے ان سے ان کی ملکیت کا صرف ½ لیا جاتا اور جو نبرد آزمائی کے بعد مفتوح

ہوتے ان سے لئے۔

مسلمانوں کے دماغ میں تجرید جاری وساری ہوگئی تھی ان کا مقصد یہی تھا کہ ایک مجرد عبادت جاری کر دیں اور وہ اس مقصد کو پورا کرنے میں بہت جوش وخروش سے مصروف ہوگئے، اس جوش وخروش کو ہم تعصب یعنی کسی مجرد چیز کے لیے شدت کہہ سکتے ہیں۔ ایسے مجرد خیال کیلئے جو موجودات کے نظام کے حق میں باطل شکن حیثیت رکھتا ہے۔ تعصب کی روح یہی ہے کہ مادی اشیا کے حق میں تباہ کن وبرباد کن حیثیت رکھے لیکن اسلام کا تعصب اس کے ساتھ ساتھ نہایت ارفع واعلیٰ منزلوں پر بھی پہونچا دینے والا تھا ایسی رفعت وبلندی تک جو معمولی اغراض سے بلند ہوتی اور فیاضی اور بہادری کے ضمن میں جتنی خوبیاں آتی ہیں ان سب کی حامل ہوتی

لیکن اصل زندگی تاہم مادی ہوتی ہے اور حاس مقاصد کا پابند بنا دیتی ہے فتوحات حکومت و دولت کر تی ہیں موروثی خاندانوں کو شاہی سپرد کراتی ہیں اور افراد کو متحد کرا دیتی ہیں۔ لیکن یہ تمام طاقت کی عمارتیں ریت پر اپنی بیخ و بن رکھتی ہیں۔ یہ آج ہیں کل نہیں ایک مسلمان چاہے جتنا شوق ودلچسپی اس تاجی تار و پود میں کیوں نہ ظاہر کرے دراصل اس کا دل ان چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے وہ محض اپنی قسمت کے چکر میں دوڑتا رہتا ہے اسلام نے اپنی وسعت کے زمانہ میں بہت سی سلطنتوں اور حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں اس بیکراں سمندر پر ہمیشہ موجیں آگے بڑھتی رہتی ہیں مستقل قیام کسی کو نہیں۔ جو کچھ بکھر کھا کر ایک صورت شکل اختیار کر لیتا ہے اپنی چمک دکھلاتا ہے دوسرے ہی لمحہ وہ غائب ہو جاتا ہے ان حکومتوں میں بنیادی مضبوطی نہ تھی۔ حکومتیں اسی لیے ختم ہوگئیں اور وہ افراد جن سے وہ بنی تھیں گذر گئے جہاں کہیں ایک پاک روح اپنا امتیاز ظاہر کرتی ہے بحر مواج میں ایک بڑی اونچی لہر کی طرح ــ وہ آزادی کی شان وشوکت کے ساتھ اپنی تجلی دکھاتی ہے اس طرح کہ اس سے بڑھ کر اچھی، اس سے بڑھکر وسیع القلب اس سے بڑھ کر جری، اس سے بڑھکر مستعد کبھی دکھی نہیں جاتی جس کسی خاص مقصد کا ارادہ وہ فرد کر لیتا ہے اس کو تمام تر اور کلیتہً اپنی روح کی تمام قوتوں سے وابستہ کر لیتا ہے۔ رنگی نو تعلقات اور اشکال کے بیچ تما

چند صنوں میں پھنسے رہتے ہیں گویا کہ ہر فرد ان تعلقات واشکال کا ایک بار ہوتا ہے لیکن اسلام میں فرد صرف ایک جذبہ اور اسی جذبہ کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ظلم کرے گا تو بے انتہا ظلم، بہادر ہوگا تو بے انتہا بہادر، چالاک ہوگا تو ... یا مجسمہ اور فیاض ہوگا تو فیاضی کا سرچشمہ۔ جہاں کہیں محبت ہوگی وہاں بے خودی اور سرفروشانہ جذبہ کے ساتھ، جو محبت کی شدید ترین صورت ہوتی ہے، اگر کوئی بادشاہ اپنے غلام سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے محبوب کے قدموں پر اپنی تمام شان، اپنی تمام شوکت اور طاقت تاج و تخت سے بالکل بے پروا ہو کر نچھاور کر دے گا لیکن اگر اس سے نفرت ہوگئی تو اس کو تباہ بھی اسی شدت سے کرے گا۔ یہ بے پناہ شدت عربوں اور شرقیین کی گرم دہکتی ہوئی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے ان کی شاعری میں یہ گرمی اور روشنی وساحل تخیل کی بیباکانہ آزادی کی باعث ہوئی ہے یہ تخیل اپنے مطلوب کی زندگی میں مدغم ہو جاتی ہے اور پھر اس سے اصلی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خودی اور خودداری کو کلیتہً فنا کر دیا گیا ہے۔

جس تیزی سے عربوں کی فتوحات ہوئیں اسی تیزی سے علوم وفنون بھی اپنے معراج کمال پر پہنچ گئے۔ پہلے تو ہم ان فاتحین کو علوم وفنون کی قسم کی ہر چیز تباہ و برباد کرتے ہوئے پاتے ہیں عمرؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اسکندریہ کی بڑی لائبریری برباد کرا دی[1] یہ کہکر کہ ان کتابوں میں یا تو وہی تمام باتیں ہیں جو قرآن میں ہیں یا اس کے علاوہ باتیں ہوں گی۔ دونوں صورتوں یہ بربادی کی مستحق ہیں۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد عربوں نے ہر جگہ علوم وفنون کو شد ومد سے ترقی دینی شروع کی اور جہاں کہیں گئے انھیں لے گئے ان کی حکومتیں خلیفہ منصور اور خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اپنی معراج پر پہنچیں سلطنت میں جگہ جگہ پر بڑے بڑے شہر پیدا ہو رہے تھے جہاں تجارت، صنعت وحرفت ترقی کر رہی تھی۔ شاندار محلات اور مدرسے بنوائے گئے تمام اقلیم کے ارباب علم خلیفہ کے دربار میں مجتمع تھے ایسا دربار جو صرف ظاہری شان وشوکت، انمول جواہرات، اعلیٰ فرنیچر اور عالیشان محلوں سے مزین نہ تھا۔ بلکہ شاعری اور علم کے چراغوں سے بھی روشن تھا شروع کے خلفاء نے تو ریگستان کے عربوں کی شہرۂ آفاق سادگی تمام و کمال قائم رکھی (خلیفہ ابوبکرؓ اس معاملہ میں خاص مشہور ہیں) جن کے آگے منصب جاہ وثروت کسی قسم کا

---

[1] عیسائی مورخوں کا یہ بیان اب غلط ثابت کر دیا گیا ہے مترجم

امتیاز بیکار تھا معمولی سے معمولی مسلمان غریب سے غریب لے وقت بڑھیا بھی خلیفہ سے برابر سے بات چیت کر سکتی تھی بے تکلف سادگی کو کسی تہذیب کی ضرورت نہیں ہوتی ہر مسلمان اپنی روح کو آزاد سمجھنے کے باعث اپنے حکمراں سے بھی برابری کے تعلقات رکھتا ہے۔

مانا کہ سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ جس کی بنا عالمگیر ہو اس میں کوئی چیز استقامت پذیر نہیں ہوتی عرب کی عظیم الشان سلطنت تقریباً اسی زمانہ میں ختم ہوگئی جس زمانے میں جرمنک والو کی سلطنت فرانس میں ختم ہوئی تھی غلاموں نے اور سلجوق و منگول کے حملوں سے سب تارا جگر دیا نئی حکومتیں پنپیں اور نئی سلطنتوں کی بنیادیں ڈالی گئیں عثمانی نسل نے آخر کار ایک معبو اسلطنت کی بنیاد ڈالی اور جاں نثاروں سے ایک مخصوص طاہر کر بنالیا تعصب و شدت اب سرد ہو چکی تھی افراد کی روحوں میں اخلاقی اصول باقی نہ رہا تھا مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کی وجہ سے زنگیوں کی بہادری و شجاعت اونچی منزلوں پر پہونچ گئی علوم و فنون خصوصاً فلسفہ موسیقی میں عربوں ہی سے آیا بلند مرتبہ شاعری اور آزاد تخیل جرمنوں نے مشرق ہی سے لیا یہ ایسے واقعات ہیں جس نے گوئٹے کی توجہ مشرق کی طرف پھیری اور اس نے اپنے دیوان کو عشقیہ شاعری کے موتیوں کا ہار بنادیا۔ اس میں جو گرمی او تصور کی آرائش ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا لیکن مشرق میں جب رفتہ رفتہ جوش سرد ہوگیا تو وہ خراب سے خراب برائیوں میں پڑ گیا نہایت کریہہ جذبات ان پر مستولی ہو گئے اور اسلام نے جو اکو عشرت کے ابتدائی مدارج تک کی جو اجازت دی تھی اور جسے مومن کے لئے جنت کے انعام کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اب اس میں شدت بڑھ گئی۔ آج کل عیسائی طاقتوں کے حسد کی وجہ سے اسلام محض ایشیا اور افریقہ کے گوشوں میں پسپا کر دیا گیا ہے اور یورپ میں اسے محض ایک گوشہ میں رہنے کی اجازت ہے۔ اسلام اس طرح تاریخ کے صفحات سے عرصہ سے محو ہوئے ہے اور اب مشرق کی آسودگی و عیش میں خوابیدہ ہے

فرانس اور اسلام

۱۸۳۰ء میں الجیریا فتح ہوا اور اس فتح نے فرانس کی توسیعی پالیسی میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں کیونکہ شمالی افریقہ فرانس کی پرانی نوآبادیات سے جو بحیرۂ کریبیا اور بحیرۂ ہند میں تھیں بالکل مختلف تھا۔ فرانس کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ شمالی افریقہ یا (عربوں کی زبان میں مغرب) سے اُن اشیاء کا ملنا محال ہے جو عموماً گرم ممالک سے حاصل کی جاتی ہیں نیز یہ کہ وہاں کے باشندوں کو مٹاکر نہ تو یورپی نوآبادیوں کے لئے مسکن بنایا جا سکتا ہے اور نہ وہ غلام بن کر ان کی خدمت ہی کر سکتے ہیں ان پر یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام نے اِن لوگوں کے سامنے ایسا مذہبی اور تمدنی نمونہ رکھدیا ہے جس کی وہ شدت سے محافظت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ فرانس کو کسی اسلامی اور مشرقی قوم پر حکمرانی کرنے کا تجربہ نہیں تھا اس لئے فتح الجیریا کے بعد سے اس کو اپنے طریقہ کار کے لئے بے ربط کوششیں کرنا پڑیں رفتہ رفتہ الجیریا سے ان کو وہ تجربے حاصل ہوئے جو اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں ٹیونس اور ۱۹۱۲ء میں مراکش میں کام آئے لیکن آج بھی فرانس میں نہ تو کوئی خاص نوآبادیاتی نظام ہے اور نہ مقررہ اصول ایسے مناسب ہیں جن سے وہاں کی مسلم آبادی خوش اسلوبی کے ساتھ چل سکے۔

عام خیال ہے کہ شمالی افریقہ میں عرب آباد ہیں لیکن یہ صحیح نہیں وہاں بربروں کی آبادی ہے جو کافی عرصہ سے عربی رنگ میں رنگ گئے ہیں درحقیقت بربروں کو مسلمان کرنے میں اور ان میں سے جو قبیلے زیادہ غیر متمدن تھے ان پر عربی تمدن کی جلا کرنے میں عرب فاتحوں کو پانچ صدی سے کم عرصہ نہیں لگا بربروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ کبھی فاتح اقوام کے تمدن کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوئے ان کو رومیوں، ترکوں، فرانسیسیوں عربوں، بزنطینیوں، ونڈالوں اور فنیشیا والوں کی زبردست فوجی طاقت سے زیر ہونا پڑا۔ لیکن ان تمام نشیب فراز میں انہوں نے اپنا تمدن محفوظ رکھا

ان کی غیر معمولی تخصیص بندی اد [illegible] لیکن ان کی بیرونی اقتدار
سے نفرت جو کبھی سماجی بغاوت کی صورت [illegible] ہوا کرتی تھی اب قومی احتجاج بن کر پھوٹ نکلی ہے
صدیوں تک بیرونی اثرات سے کشمکش کرنیوالے مخالفین چاہے مسلم، عیسائی، ترک یا فرانسیسی
کوئی ہوں، مذہبی جمعیتیں اور مقامی علما ہوتے رہے فرانسیسی نظام حکومت نے ان کو ہموار کرنے
یا اپنے کام لانے کے لئے ان کے وظائف اور اوقاف مقرر کر دیئے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ جمعیتیں
اور مرابوطوں کی حیثیت بہت جلد گر گئی۔ کیونکہ بربر اپنے مذہبی رہنماؤں اور غیر ملکیوں کی سازش کو
شکوک نظروں سے دیکھنے لگے اب وہ پہلے کی طرح مذہبی فرقہ بندی میں اپنی بہتری نہیں
سمجھتے بلکہ قوم پرستی اور پان عرب ازم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

فرانسیسی محکومیت سے پہلے شمالی افریقہ میں سوائے شاید مراکش کے کہیں قوم پرستی کا نام
تک نہ تھا بربروں کی مستقل سیاسی اور سماجی جماعت اگر تھی تو وہ محض ان کا قبیلہ تھا وقتاً فوقتاً
مختلف قبیلے مل کر بڑے بڑے قبیلے بھی بن جاتے تھے لیکن ان کو اقوام کسی صورت سے نہیں کہا
جا سکتا تھا وہ ایک عارضی اتحاد ہوتا تھا اور محض کسی خاص فائدہ کی غرض سے ایسی شکل اختیار کر لیتا
تھا۔ فرانسیسی فتح کے بعد بھی شمالی افریقہ سیاست اور رسم و رواج کے اختلاف کی حیثیت سے تین
حصوں میں منقسم رہا۔ الجیریا وزارت داخلہ کے زیر قلم اور مراکش اور ٹیونس (چونکہ زیر حمایت حکومتیں
ہیں اور جہاں بادشاہ برائے نام حکومت کرتے ہیں) وزارت خارجہ کو ایڈی آرسے کے ماتحت
ہیں۔ یہ دونوں [illegible] ایک دوسرے کے اختیارات کو حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے
انہوں نے حکومت کرنے کے مختلف طریقے اختیار کئے اور اس کی وجہ سے ہر حصہ کی خصوصیات
اور زیادہ متاثر ہو گئیں چنانچہ عرصے سے مراکش، الجیریا، ٹیونس ہر ایک کی جداگانہ انفرادی حیثیت
ہو گئی ہیں گویا فرانسیسیوں نے ان حصوں کو جو پہلے خود مختار تھے اب ایک دوسرے سے ممتاز اور
متحد ممالک کی شکل دیدی اس سے ہر ایک ملک میں وطنیت کا جذبہ پیدا ہو گیا لیکن قبیلوں میں
وفاداری کا جذبہ مثائے بغیر وطنیت کا جذبۂ اصل کمزور متضاد ما میں تھیں مشرق کے اسلامی ممالک سے بھی

[illegible]وں نے اس قومی جذبہ کو اور بھی بھڑکایا اسلامی نشاۃ الثانیہ کا جذبہ مغرب سے
تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کر گیا اور اس کا ماحصل اس اصول کی شکل میں ظاہر ہوا کہ تمام عربی بولنے
والے ممالک ایک قوم میں متحد ہو جائیں۔

عرب اتحاد کی تحریک جو انیسویں صدی میں جاری ہوئی محض دو ہستیوں کی شروع کی ہوئی تھی
یہ جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہٗ تھے الافغانی نے دو مطالبات پیش کئے۔ اولاً یہ کہ عرب
ممالک کو آزاد ہونا چاہیئے تاکہ آزاد خیال اداروں کے ماتحت اپنی ترقی جاری رکھ سکیں۔ اور دوسرے
یہ کہ ان کی ایک وسیع سلطنت بن جائے جس پر ایک ہی خلیفہ حکمراں ہو تاکہ وہ فرنگی شہنشاہیت
کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ اُن کے مصری شاگرد شیخ عبدہ نے مذہب اسلام کو سائنس کے ساتھ
ملانا چاہا تاکہ اہل اسلام مغربی طور طریقے اور خاص طور سے مغربی ہتھیار اختیار کر لیں لیکن مذہبی
روایات پر اس کا اثر نہ پڑے اور وہ بدستور قائم رہیں ان دونوں کی تمنائیں کے اثر سے اٹھارویں صدی
کے آخر میں پیرس میں عرب ممالک کی لیگ قائم ہوئی اور عرب کانگرس کے اجلاسوں سے جو
۱۹۱۳ء اور اس کے بعد ہوتے رہے اس کو اور وسعت دی۔ اُن کی بنیادی یکجہتی، زبان نسل
اور تاریخ کی یکسانیت کے باعث تھی۔

قدیم عربی زبان میں سی روح پھونکی جا چکی ہے اور مختلف مستند درسگاہوں (خاص کر جامعہ ازہر
قاہرہ) نے نوجوان علما کی مدد سے اس کو موجودہ ضروریات کے قابل بنا دیا ہے نئی زبان بہت خوبی
سے موجودہ سیاسی سماجی، علمیانہ مسائل کی ترجمانی کر سکتی ہے اور یہ مصری اخبارات کے زیر اثر اسلامی
دنیا کے لئے مقامی بولیوں کو مٹا کر ایک مشترک زبان بننے والی ہے۔ اس طرح سے اس کی
سیاسی حیثیت بھی اہم رہے کیونکہ یہ ایک سلطنت کی زبان ہو جائے گی اور اس کے بن جانے سے
عرب اتحاد کی منزل نزدیک تر آ جائے گی۔

یہ خیال سائنس کے اعتبار سے صحیح نہیں کہ اسلامی دنیا ایک ہی نسل سے وابستہ ہے
اُن قبیلوں اور لوگوں میں جو ایمان لا چکے ہیں نسلی تنوعات اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن میں یکسانیت

ان کی غیر معمولی تخصیص پسندی اور غیر ملکیوں سے نفرت بدستور قائم ہے لیکن ان کی بیرونی اقتدار سے نفرت جو کبھی سماجی بغاوت کی صورت میں رونما ہوا کرتی تھی اب قومی احتجاج بکر پھوٹ نکلتی ہے صدیوں تک بیرونی اثرات سے کشمکش کرنیوالے مخالفین چاہے مسلم، عیسائی، ترک یا فرانسیسی کوئی ہوں مذہبی جمعیتیں اور مقامی علما ہوتے رہے فرانسیسی نظام حکومت نے ان کو ہموار کرنے یا ان کو کام لانے کے لئے ان کے وظائف اور اوقاف مقرر کر دیے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ جمعیتوں اور مرابوطوں کی حیثیت بہت جلد گر گئی کیونکہ بربر اپنے مذہبی رہنماؤں اور غیر ملکیوں کی سازش کو بہت مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے اب وہ پہلے کی طرح مذہبی فرقہ بندی میں اپنی بہتری نہیں سمجھتے بلکہ قوم پرستی اور پان عرب ازم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

فرانسیسی حکومت سے پہلے شمالی افریقہ میں سوائے شاید مراکش کے کہیں قوم پرستی کا نشان تک نہ تھا بربروں کی مستقل سیاسی اور سماجی جماعت اگر تھی تو وہ محض ان کا قبیلہ تھا وقتاً فوقتاً مختلف قبیلے مل کر بڑے بڑے قبیلے بھی بن جاتے تھے۔ لیکن ان کو اقوام کسی صورت سے نہیں کہا جاسکتا تھا وہ ایک عارضی اتحاد ہوتا تھا اور محض کسی خاص فائدہ کی غرض سے ایسی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ فرانسیسی فتح کے بعد بھی شمالی افریقہ سیاست اور رسم و رواج کے اختلاف کی حیثیت سے تین حصوں میں منقسم رہا۔ الجیریا وزارت داخلہ کے زیر قلم ا۔ مراکش اور ٹیونس (چونکہ زیر حمایت حکومتیں ہیں اور جہاں بادشاہ برائے نام حکومت کرتے ہیں) وزارت خارجہ کو ایڈی آر سے کے ماتحت ہیں۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کے اختیارات کو حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حکومت کرنے کے مختلف طریقے اختیار کئے اور اس کی وجہ سے ہر حصہ کی خصوصیات اور زیادہ متاثر ہوگئیں چنانچہ عرصہ سے مراکش، الجیریا، ٹیونس ہر ایک کی جداگانہ انفرادی حیثیت ہو گئی ہیں گویا فرانسیسیوں نے ان خطوں کو جو پہلے خود مختار تھے اب ایک دوسرے سے ممتاز اور متحد ممالک کی شکل دیدی جس سے ہر ایک ملک میں وطنیت کا جذبہ پیدا ہو گیا لیکن قبیلوں میں وفاداری کا جذبہ مٹائے بغیر وطنیت کا جذبہ اصل کسا دو متضاد باتیں تھیں شرق کے اسلامی ممالک سے ہی

اثرات آئے جنھوں نے اس قومی جذبہ کو اور بھی بھڑکایا اسلامی نشاۃ الثانیہ کا جذبہ مغرب سے تعلیم یافتہ طبقہ میں سرایت کر گیا اور اس کا ماحصل اس اصول کی شکل میں ظاہر ہوا کہ تمام عربی بولنے والے ممالک ایک قوم میں متحد ہو جائیں۔

عرب اتحاد کی تحریک جو انیسویں صدی میں جاری ہوئی محض دو ہستیوں کی شروع کی ہوئی تھی یہ جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہٗ تھے الافغانی نے دو مطالبات پیش کئے۔ اولاً یہ کہ عرب ممالک کو آزاد ہونا چاہئیے تاکہ آزاد خیال اداروں کے ماتحت اپنی ترقی جاری رکھ سکیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان کی ایک وسیع سلطنت بن جائے جس پر ایک ہی خلیفہ حکمراں ہو تاکہ وہ فرنگی شہنشاہیت کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ ان کے مصری شاگرد شیخ عبدہ نے مذہب اسلام کو سائنس کے ساتھ ملانا چاہا تاکہ اہل اسلام مغربی طور طریقے اور خاص طور سے مغربی ہتیار اختیار کرلیں لیکن مذہبی روایات پر اس کا اثر نہ پڑے اور وہ بدستور قائم رہیں۔ ان دونوں کی تلقین کے اثر سے اٹھارویں صدی کے آخر میں پیرس میں "عرب ممالک کی لیگ" قائم ہوئی اور عرب کانگریس کے اجلاسوں سے جو ۱۹۱۳ء اور اس کے بعد ہوتے رہے اس کو اور وسعت دی۔ ان کی بنیادی تحریک زبان، نسل اور تاریخ کی یکسانیت کے باعث تھی۔

قدیم عربی زبان میں نئی روح پھونکی جا چکی ہے اور مختلف مستند درسگاہوں اور خاص کر جامعہ ازہر قاہرہ نے نوجوان علما کی مدد سے اس کو موجودہ ضروریات کے قابل بنا دیا ہے نئی زبان بہت خوبی سے موجودہ سیاسی سماجی، فلسفیانہ مسائل کی ترجمانی کر سکتی ہے اور یہ عربی اخبارات کے زیر اثر اسلامی دنیا کے نئے مقامی بولیوں کو مٹا کر ایک مشترک زبان بننے والی ہے۔ اس طرح سے اس کی سیاسی حیثیت بھی اہم ہے کیونکہ یہ ایک سلطنت کی زبان ہو جائے گی اور اس کے بن جانے سے عرب اتحاد کی منزل نزدیک تر آ جائے گی۔

یہ خیال سائنس کے اعتبار سے صحیح نہیں کہ اسلامی دنیا ایک ہی نسل سے وابستہ ہے ان قبیلوں اور لوگوں میں جو ایمان لا چکے ہیں نسلی تنوعات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان میں یکسانیت

تو قطعی کبھی ہو ہی نہیں سکتی لیکن آن نسلی یکسانیت کا خیال خصوصاً ان لوگوں میں بہت ہے جو عرب نہیں ہیں مثال کے طور پر نومسلم بربروں نے پیچیدہ شجرے بنا کر عرب فاتحوں سے رشتہ جوڑا تا کہ اُن کی عزت بڑھ جائے اس نسلی توہم نے افریقی مسلمانوں کو ایشیا والوں سے جا ملایا اور اس طرح وہ یورپی مداخلت کے مخالف بن گئے ہیں ہر ایک مسلمان اسلام کی اخوتِ عالمگیری سے وابستہ ہے اس کو بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ عرب ممالک کا زوال آزادی چھن جانے سے شروع ہوا۔ اور آزادی مل جانے پر خلفائے بنی امیہ اور بنی عباسیہ کا زرّیں عہد ایک بار پھر واپس آ سکتا ہے تاریخ کی یہ دو عملی تعلیم یعنی پان عرب ازم اور وطنیت مسلمانوں کو اپنے ماضی پر مفتخر اور مستقبل کا معتمد بنا دیتی ہے۔

جنگ عظیم نے عرب اتحاد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شاہ فیصل کی حکومت قائم نہ رہ سکی۔ یہودی فلسطین میں بسا دیئے گئے اور برطانیہ اور فرانس کے ماتحت عراق، شام، لبنان، ٹرانس جارڈن اور فلسطین میں مندوبین قائم ہو گئیں۔ ابن سعود نے عرب خاص میں دہانی طاقت میں اور اضافہ کر لیا۔ لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود عرب عوام پان عرب ازم کے حامی ہیں۔ گزشتہ بیس سال سے خلیج فارس سے لے کر بحر اوقیانوس تک تمام عربوں میں اپنے مذہبی اور تمدنی اتحاد کا احساس ترقی پذیر ہے اور وہ یورپ کے مقابلہ میں اس اتحاد کو متعین کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عربی ممالک نے بڑھتے ہوئے جوش و خروش سے اپنے وطن کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے پان عرب ازم اور وطنیت حالانکہ ظاہراً متضاد ہیں لیکن مغرب کے مقابلہ میں مشرق کے یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہیں۔

عرب نشاۃ الثانیہ کی روح شمالی افریقہ میں کتابوں اخبارات، جامعوں اور طلبا کے ذریعہ آئی جو مصری اور شامی جامعات سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تھے۔ اسلامی عربی دنیا مغرب کو اپنا جزو سمجھتی تھی اور اسلامی کانگریس جو بروشلم میں ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی۔ اس میں شمالی افریقہ کے نمائندے برابر جاتے تھے۔ ان لوگوں میں جنھوں نے پان عرب تحریک کو شمالی افریقہ میں پھیلایا سب سے زیادہ سرگرم کارکن امیر شکیب ارسلان لبنانی رئیس تھا۔ اس اہم شخصیت

کا سیاسی کردار بہت طویل اور متنوع ہے وہ قسطنطنیہ میں ترکی پارلیمنٹ کے نائب کی حیثیت
سے بیروت کی نمائندگی کرتا تھا اور ان وفدوں میں بھی شامل رہا جو ترکی نے جنگ عظیم کے
زمانہ میں جرمنی بھیجے کئی سال تک وہ سرگرمی کے ساتھ بلقان اور ٹریپولتانیہ میں اسلامی اقتدار
قائم کرنے کی کشمکش میں لگا رہا لیکن اس کی سرگرمیاں داعی کی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں
اس کو عربی پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ وہ "سلطان الفصاحت" کہلاتا ہے اور اسی وجہ
سے ۱۹۳۹ء میں عرب اکاڈمی دمشق کا صدر منتخب ہوا۔ اس کی اعلیٰ تربیت، ان تھک سیاسی
کوششوں اور باوقار شخصیت نے اس کو فطری طور سے لیڈر بنا یا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد شامی فلسطینی کمیٹی قاہرہ میں قائم کی گئی اور امیر شکیب ارسلان جنیوا میں
اس کی مستقل طور سے نمائندگی کرنے لگا وہاں اس کا کام جمعیت اقوام کے سامنے عربوں کی
ترجمانی کرنا تھا۔ یہ کام شکیب ارسلان جیسے کارآزمودہ اور اولوالعزم آدمی کی تحریکات کے لئے بہت
مناسب تھا اس لئے اس نے اپنے دفتر کو ساری اسلامی دنیا سے متعلق تمام اطلاعات اور پروپیگنڈے
کے مسکن میں تبدیل کر دیا۔ اس کے اس نظام کی تحریکات اس قدر دور رس ہوئیں کہ جنیوا میں اس کا
مکان اسلام کا خاص مرکز بن گیا۔ اس نے محض مسلمان لیڈروں ہی سے نہیں بلکہ یورپی مدبرین
سے بھی تعلقات پیدا کر لئے۔ ان میں مسولینی خاص طور سے قابل ذکر ہے جس کا وہ خاص مداح
تھا وہ مقامی عرب جماعتوں کو ہدایات اور پروگرام بھیجا کرتا اور مختلف مسلم گروہوں اور لیڈروں کے
قضیوں کو طے کرتا تھا۔ "القوم العرب" بھی ان کتابوں اور رسالوں میں سے ہے جن کو وہ شائع کرتا
تھا۔ یہ کتاب جاوا سے مراکش تک وسیع پیمانہ پر تقسیم ہوئی ۱۹۳۹ء میں وہ برلن چلا گیا اور اپنے
اثرات کو جرمنی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

شمالی افریقہ کے قوم پرست پان عرب ازم کے اس دائمی چشمہ سے پوری طرح سیراب ہوئے
شکیب ارسلان عرصہ سے شمالی افریقہ کی سیاسی اہمیت سے واقف تھا جنیوا میں وہ مراکش اور
ٹیونس کے نمائندوں کے ساتھ خوب گھل مل کر رہا۔ وہ نوجوان طبقہ اور مغرب کی مذہبی بیداری کی

کارپردازوں کا روحانی رہبر بن گیا۔ اس نے ہر جگہ کی مقامی قوم پرستی میں جلا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس خیال کو مقبول بنانے میں ہر شخص سے زیادہ کوشش کی کہ ٹیونس، الجیریا اور مراکش ایک ہی بڑی اسلامی ملت کے حصے ہو جائیں۔

یروشلم کانفرنس نے "عرب پیکیٹ" مرتب کیا اور اس میں عرب ممالک کا "مکمل اور ناقابل تقسیم اتحاد" اور ہر شخص کی "ایک ہی منزل مقصود" کو تسلیم کیا گیا اس میں اس بات کی بھی ضرورت دکھلائی گئی کہ سامراجیت کو ہر ممکن طاقت سے دور کیا جائے عمل کے لئے جو یہ آواز بلند کی گئی اس نے شمالی افریقہ کی قومی جماعتوں کے لیڈروں کو جوش دلایا لیکن وہاں اگر یہ پروگرام عمل میں لایا جاتا تو قومی لیڈروں اور فرانسیسی حکومت میں تصادم ہو جاتا اس لئے شاید شکیب ارسلان ہی کی تحریک سے سمجھوتہ کی درمیانی شکل اختیار کی گئی بعد ازاں امیر سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد شمالی افریقہ کے لیڈروں نے ٹیونس اور مراکش سے ایک ہی وقت میں ایک ہی مفہوم کے اعلانات شائع کئے وہ اس پر مشتمل تھے کہ شمالی افریقہ کو فرانس کی مدد سے آزادی کی طرف چلنا چاہیے نیز یہ کہ فرانس یہ مدد دے کر شمالی افریقہ کے آزاد لوگوں کی حمایت ہمیشہ کے لئے حاصل کر لے گا اور ان کے درمیان مشترکہ اغراض و احساسات کے تعلقات باہم دگر قائم رہیں گے یہ بہت مدبرانہ اعلان تھا کیونکہ وہ قوم پرستوں کی توقعات کو فرانس کی برائے نام وفاداری کے ساتھ وابستہ کر رہا تھا انھوں نے فرانسیسی حکومت سے خود مختاری کے فیاضانہ عطیہ کی درخواست کی تھی گو وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کا حصول ممکن نہیں۔

اسی درمیان میں خطہ داری پابندیوں سے ایک اور وسیع تر قوم پرستی پیدا ہوئی جس نے تمام شمالی افریقہ پر گھیرا ڈال دیا ۱۹۳۶ء میں طلبا کی کانگریس نے اسکولوں میں ایسی تعلیم کا مطالبہ کیا جو "شمالی افریقہ میں ہمارے اتحاد کا احساس پیدا کرے اس اتحاد کی بنیاد متحدہ عقلی نظریوں، واحد مذہب اور مشترکہ جذبات پر رکھی گئی ہو۔ اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہم وضعی اتحاد پیدا کر رہے ہیں نہیں ہزار دفعہ نہیں ہم صرف دیرینہ اتحاد کی تجدید کر رہے ہیں جس کا تاریخ مشاہدہ کرے اور اس کی ضامن ہو

قومی جماعتوں نے مل کر مشترکہ دستور العمل بنانے اور کام کرنے کے لئے متحد ہوگئیں ٹیونس کے ایک مجاہد نے ۱۹۳۷ء میں لکھا کہ "ٹیونس، الجیریا اور مراکش جو ایک ہی نوآبادیاتی نظام کے ماتحت ہیں ایک ٹھوس اور مستحکم محاذ قائم کرنے کی طرف مائل ہیں" اسی زمانہ میں الجیریہ کی قومی تحریک کے قائد نے اعلان کیا کہ "شہنشاہیت سے مقابلہ کرنے کے لئے ہم ٹیونس مراکش اور الجیریا والے اپنا مشترکہ محاذ قائم کر رہے ہیں"

یہ نظریہ جسے ہم "پان مغرب ازم" کہہ سکتے ہیں یہ پان عرب ازم کی راہ میں در اصل قوم پرستی کی ایک منزل ہے ابھی تک یہ ناکامیاب رہی ہے اس وجہ سے نہیں کہ حکومت نے اس کو دبایا ہے بلکہ اس لیے کہ خطہ وار امتیاز ابھی کچھ باقی ہے۔ اتحاد کی تمنا جس قدر بھی بھڑک رہی ہو ٹیونس مراکش اور الجیریا کے قومی گروہ ابھی مجبور ہیں کہ وہ مختلف خطوں کو منظم اور ہر ایک کے مطالبات الگ الگ مرتب کریں کیونکہ وہ مختلف نظاموں کے ماتحت ہیں۔

الجیریا اپنے دونوں پڑوسیوں سے کئی صورتوں میں مختلف ہے فرانسیسی حکومت ٹیونس اور مراکش میں ریزیڈنٹ اور مقامی رئیسوں کے ذریعہ سے بالواسطہ حکومت کرتی ہے مگر الجیریا میں ایسا کرنے کی بجائے اس نے ملک کو مختلف قسموں یا فرانسیسی وضع کی تحصیلوں اور پرگنوں میں تقسیم کر دیا ہے وہ فرانس کی طرح پیرس کی پارلیمنٹ میں اپنے نائب اور اراکین بھیجتے ہیں۔ وہاں یورپی نوآبادیوں کا بھی نسبتاً زیادہ تناسب ہے ۱۹۳۶ء میں ۷،۲۳۴،۶۸۴ کی مردم شماری میں ۹۸۷،۲۵۲ یورپی تھے تعلیمیافتہ باشندوں نے عرصہ سے اس حق تلفی کے خلاف علم بلند کر رکھا ہے اور وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت فرانسیسیوں کی سی کر دی جائے الجیری علماء نے مراکش اور ٹیونس کی طرح جداگانہ حقوق طلب نہیں کئے بلکہ اس بات کی استدعا کی کہ ان کو فرانسیسی شہری بننے کا حق دیدیا جائے ساتھ ہی وہ مسلمان کی حیثیت سے رہیں اور تمام حقوق کو مثلاً وراثت نکاح وغیرہ برقرار رکھیں جو انہیں اسلام سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے شمالی افریقہ میں ایک نئی تحریک پیدا ہوئی جس نے فرانسیسیوں کے ساتھ اتصال کا رجحان طبع دکھایا۔ اگر حکومت مسلمانوں کے شہری

حقوق حاصل کرنیکے مطالبہ کو روکتی اس تحریک کے روکنے کی ہر ممکن کوشش نہ کرتی تو یہ اور زیادہ وسیع ہو جاتی۔ ان لوگوں میں جنھوں نے اتصال کی پالیسی کو سراہا بہت سے مقامی باشندے بھی تھے جو انتخاب سے حاصل ہونے والے عہدوں پر فائز تھے عرصتک یہ مہم ایوانوں اور عوام میں جاری رہی اور بالاخر اس کا تصادم علما اور نجم شمالی افریقہ سے ہوا۔ اس جماعت کے بارے میں ابھی کچھ اور بتایا جائے گا

علما اسلامی شریعت پرست ہیں۔ انھوں نے مذہب کو ایک طرف تو مرابطوں اور فریبی ملاؤں سے اور دوسری طرف یورپ کا اثر قبول کرنے سے بچانا اپنا مسلک بنالیا ہے۔ ان کی جمعیت نے جس کی تشکیل سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوئی شیخ بن بادیس کی قیادت میں سارے الجیریا میں بہت زبردست اثر پیدا کرلیا۔ شیخ موصوف افریقی مسلم علما میں بہت ہی فاضل اور شمالی افریقہ کی زبردست شخصیت ہیں انھوں نے ایک طرف تو مرابطوں کی جماعت کو درہم برہم کردیا اور دوسری طرف اُن فرانسیسی جماعتوں میں کسی کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کیا جو ان کے ساتھ کام کرنے پر کمربستہ تھیں۔ اس کی بجائے انھوں نے اپنی سرگرمیوں کو ان باتوں تک محدود رکھا جو علمائے کے اصلاحی پروگرام میں آسکتی ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی دیسی باشندہ فرانسیسی شہری بن جائے تو وہ اپنے مذہب سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

نجم شمالی افریقہ نے بھی اتصال کی مخالفت کی یہ ایک انقلاب پسند اور قومی جماعت ہے جس کی بنیاد سنہ ۱۹۲۹ء میں پڑی اس کا رہبر نہایت فصیح اور لسان حامی جمہور مصالی الحاج تھا جو پہلے شکیب ارسلان کے ساتھ کام کرچکا تھا۔ دیگر مطالبوں کے علاوہ مصالی الحاج نے یہ مطالبہ بھی پیش کیا کہ الجیریا آزاد کردیا جائے۔ ابتدائی دور میں نجم شمالی افریقہ کی سرگرمیاں ان الجیری مزدوروں تک محدود رہیں جو پیرس کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ بظاہر وہ سنہ ۱۹۲۹ء ہی میں ٹوٹ گئی لیکن اس کا کام خفیہ طور سے ہوا کیا سنہ ۱۹۳۳ء میں وہ پھر رونما ہوئی لیکن اگلے سال پھر حکومت کا عتاب اس پر نازل ہوا سنہ ۱۹۳۶ء میں موسیو بلوم نے حکومت قائم کی اور مصالی الحاج جو اس درمیان میں جنیوا میں پناہ

گزین تھا پیرس لوٹ آیا۔ کچھ عرصہ پیرس میں قیام کرنے کے بعد وہ الجیریا چلا گیا۔ وہاں اس نے مقامی انجمنیں بنائیں جن کو شعبہ جاتی وفاقوں میں منظم کیا۔

وہ کامیابی حاصل کرتا رہا لیکن اس کو ستمبر ۱۹۳۷ء میں، شہنشاہ سلطنت کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں دو سال کی سزا ہو گئی اس کے تمام شہری اور سیاسی حقوق چھن گئے اور اس طرح اس کی سیاسی تحریکات کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن عوام میں اس کی عزت قائم رہی وہ اب بھی اسکو خود مختار اور جابرانہ حکومت کا مظلوم سمجھتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ فرانس عہدوں داروں اور علما کے مطالبۂ تصال کو بخوشی منظور کئے بغیر سیاسی اور مذہبی قوم پرستی کے سیلاب کو روک نہیں سکتا موسیو بلوم اس بات کو خوب سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے موسیو وائولٹ وزیر حکومت کی معیت میں ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ایوان کے سامنے ایک بل پیش کیا۔ اس کے منظور ہو جانے پر چند خاص طبقوں میں سے بائیس ہزار باشندوں کو فرانسیسی شہریوں کے انتخاب کے حقوق دے دیے جاتے اسلامی شریعت کے ماتحت ان رائے دینے والوں کی ذاتی حیثیت بھی برقرار رہتی ایسے حقوق ان کے ہم مذہبوں کو یوگوسلاویہ، فرانسیسی ہند اور سینیگل میں بھی مل چکے ہیں۔

الجیریا کے مسلمانوں نے بلوم، وائولٹ تجویز کا نہایت جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ انھوں نے سلطنت فرانس سے ملحق ہونے کی خواہش ظاہر کی موسیو بلوم تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر الجیریا کے فرانسیسی نوآبادوں نے اس کی اس قدر سخت مخالفت کی کہ موسیو بلوم کے جانشینوں نے ایوان میں اس پر بحث ہی نہ ہونے دی جو نا امیدی لوگوں میں پیدا ہوئی اس سے مینا کی قومی جماعت کو بہت فائدہ پہونچا وہ ہمیشہ سے فرانس کے وعدوں پر اعتبار کرنا مہمل سمجھتی تھی۔ حکومت نے اپنی سیاسی کمزوری پر زیادہ تر اقتصادی مراعات سے نقاب ڈالنے کی کوشش کی مگر الجیریا والے دوسروں کی طرح وفاقی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی سیاسی تمنائیں زندگی کی اس بلند معیار ہی سے مردہ نہیں ہوئیں

جو اب شہری اور دیہاتی زندگی میں رونما ہے۔

مراکش اور ٹیونس میں سلطان اور بے فرانس کے زیرِ حمایت برائے نام حکومت کرتے ہیں۔ وہاں مسائل کی دوسری نوعیت ہے۔ اس نظام کے موجدوں نے خیال کیا کہ اس سے حکومت کو الحاق کے تمام فوائد حاصل ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کا بار بھی نہیں پڑے گا لیکن اب ٹیونس میں فرانسیسی اعلیٰ افسر ٹیونس کے وزیروں کی جگہ اپنے اختیارات کام میں لانے لگے ہیں شہری افسروں نے قائدوں کی طاقت اور فرانسیسی فوجی پولیس نے سپاہیوں کی قوت سلب کر لی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے ٹیونس والوں نے جو فرانسیسی قانونی روایات کا مطالعہ کر چکے تھے ماتحت حکومت کی بدنظمیوں پر بہت زوروں سے نکتہ چینی کی ان کا دعویٰ تھا کہ باردو اور لا مرسا کے صلح ناموں نے فرانس پر اسکے زیرِ حمایت ملکوں کے بارے میں بہت سے فرائض عائد کر دیئے ہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ حکومت خود اختیاری کو بڑھا کر اور تعلیمی نظام میں توسیع کر کے ٹیونس کی سیاسی حیثیت بلند کر دیں۔ وہ وعدہ کی بجائے جس میں فرضی الحاق کار فرما ہے وہ فیاضانہ سرپرستی کو ترجیح دیتے ہیں اس سے رفتہ رفتہ ٹیونس آزاد ہو کر محض معمولی وفاقی رشتہ سے فرانس کے ساتھ وابستہ رہے گا قانونی حیثیت سے معاملہ مضبوط ہے مگر فرانس کی حکمرانی کی تمنا کے ساتھ اس کا تصادم ہو جاتا ہے آزادی کا خیال ٹیونس کے عوام میں متحرک ہے مگر فرانسیسی مدبر اس کو تباہ کن تصور سمجھ کر رد کر دیتے ہیں ریزیڈنٹ کبھی پورے اختیارات سے کام لیتے ہیں اور کبھی فیاضی دکھاتے ہیں، کبھی ٹیونس والوں کی عرضداشتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور جب وہ لوگ بہت زیادہ بلند ہو جاتے ہیں تو سختی سے بھی کام لیتے ہیں باوجود اس سختی و نرمی کے وہ قومی تحریک کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد ہی ٹیونس میں دستور کا مطالبہ شروع ہوا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں اس تحریک کے رہنماؤں نے پریسیڈنٹ ولسن کے نام ایک عرضداشت بھیجی اور "شہید ٹیونس" کے نام سے ایک گمنام پمفلٹ شائع کیا۔ اس پمفلٹ کا مصنف درحقیقت ایک عالم شیخ ثعلبی تھا اس نے

اسلامی اصلاح کے اصول مشرق سے حاصل کئے تھے اور چاہتا تھا کہ ٹیونس ۱۸۸۱ء سے قبل کے حریت پسندانہ دور میں واپس آجائے جب کہ فرانسیسی تشدد کا نام تک نہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں دستور پارٹی قائم ہوئی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ ٹیونس والے غلامی کی زنجیروں سے آزاد کر دئے جائیں، "ایسا دستور ملے جس کی رو سے حکومت کی باگ ڈور بے اور اس کے خاندان کے ہاتھ میں دیدی جائے اس کے بعد فرانس کے خلاف اخباری پروپیگنڈہ اور سڑکوں پر مظاہرے شروع ہوئے وفود پیرس بھیجے گئے اور اقتصادی بائیکاٹ کی کوشش کی گئی حکومت نے اس کا تشدد سے جواب دیا لیکن ۱۹۲۲ء میں نمائندہ مجالس قانون ساز بنا دیں۔ اس سے اعتدال پسند طبقہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔

۱۹۳۴ء میں دستوری جماعت کے دو حصے ہو گئے نئے دستور والے جن کی باگ نوجوان طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور ان کے نئے رجحانات تھے اور پرانے دستور والے جو روایات پر سختی سے کاربند تھے نئے دستور والے چاہتے تھے کہ ٹیونس کے لوگ حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ان کی سیاسی تار و پود کچھ تو فرانس سے لی گئی تھی اور کچھ فاسستی اٹلی سے ۔ وردی قواعد عرب اسکاؤٹوں کی تنظیم، مقامی انجمنوں کو مرکزی اداروں سے احکامات صادر کرنا اور مظاہروں کا پہلے ہی انتظام کر رکھنا وغیرہ اس کے خاص کام تھے ۔ پر جوش قانون داں حبیب بورقیبہ کی قیادت میں نئے دستور والوں کو ٹیونس کے عوام کی تقریباً کلی حمایت حاصل ہو گئی نئے دستور والوں کی کمزوری جو ان کے پروگرام اور تدبیروں میں داخل تھی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ محافظ حکومت سے مراعات وصول کر کے نئی اصلاحات مل سکتی ہیں دوسرے لفظوں میں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ان صلح ناموں کو تسلیم کرتے تھے جنھوں نے ٹیونس کو فرانس کے ساتھ وابستہ کیا تھا بہت سے لوگ قومی تحریک کے اعتبار سے ان کو غلط راہ پر سمجھتے تھے پرانے دستور والوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی کمزوری نہ تھی اصولی طور پر ان کا انحصار رؤسا اور اعلیٰ طبقہ کا تھا انھوں نے ماتحت حکومت کے اصول کو ماننے سے انکار کر دیا ریزیڈنٹ سے بھی کسی طرح تعاون کرنے پر تیار نہ تھے بیسویں

یعنی دستور والے الجیریا کی انجمن علما کی طرح پان عرب ازم اور اسلام کے سادہ اصولوں کی طرف رجعت کے موافق ہوتے ہوئے بھی اپنے مطالبات قطعی اور واضح طور پر پیش نہیں کرتے تھے۔ اور فرانسیسیوں کی سیاست کے مدوجزر کے ساتھ یہ اپنی پالیسی بدل نہیں دیتے تھے۔ اسلئے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان سے دستور والوں کے ساتھ گورنمنٹ نے سخت انسدادی کارروائیاں کیں پرانے دستور والوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

۱۹۳۶ء میں فرانس میں مقبول عام فرنٹ گورنمنٹ ہوئی اس نے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ریگستان صحارا میں جو لوگ جلاوطن کر دیے گئے تھے ان کو واپس بلا لیا اور ان کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کی پوری پوری آزادی دیدی۔ دفتر خارجہ کا ایک ذہین نوجوان انڈر سکرٹری موسیو پیر تنوجوکس۔ ماضی میں مراکش میں لاؤ کا شریک کار رہ چکا تھا ٹیونس اور مراکش کا متفق بنایا گیا اور ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جن سے پریس اور عوام الناس کو دوبارہ اظہار خیال کی آزادی مل گئی فرانس کا سماجی قانون بھی مقامی امور کا لحاظ کرتے ہوئے ٹیونس میں رائج کر دیا تھا لیکن یہ سب کافی نہ تھا کیونکہ گورنمنٹ کی ترکیب میں چند اور بنیادی اصلاحات کی ضرورت تھی اس لئے موسیو ویتو شروع ۱۹۳۷ء میں بطور خود اسکی تحقیق کے لئے ٹیونس گیا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ ملک کو کامل سیاسی۔ انتظامی اور اقتصادی تنظیم نو کی ضرورت ہے پھر بھی دستور کو اس سے کچھ ہاتھ نہیں لگا ویتو نے کہا کہ حکومت از یر حمایت دراصل غیر مشروط ہے اور اسلئے اسنے طے کر لیا ہے کہ وہ تمام قانونی ذرائع سے اس کی حرمت کو برقرار رکھیگا اور تمام فتنہ و فساد اور جھوٹے پروپیگنڈے کو دبا دیگا۔ فرانس میں موسیو بلوم کی وزارت کی شکست کے بعد یہاں پھر تحریکیں تیزی سے ہونے لگیں۔ تمام شمالی افریقہ میں فسادات اور جھگڑے پیدا ہو گئے جیسے کسی ایک ہی آدمی کے اشارے سے ہوئے ہوں شاید شکیب ارسلان کے اشارے سے، نئے دستور والوں میں جو زیادہ پیش پیش تھے انہوں نے مقبول عام فرنٹ گورنمنٹ کے وعدوں کی نا استواری کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا اور اصلاحات کے لئے زیادہ باعمل طریقوں کا مطالبہ کیا دستور والوں کا زور اب اور بھی بڑھ گیا تھا کیونکہ تیخ تعلبی کی پندرہ سالہ

جلاوطنی کے بعد واپسی پر پرانے اور نئے دستور والوں میں جھگڑا ہونا شروع ہوا اس سے کافی گرما گرمی پیدا ہوگی اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں شیخ مشرق قریب میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کی تحریکات سے کافی وابستہ رہا تھا۔ اس لئے اس نے اب یہ تجویز کیا کہ پرانے اور نئے دستور والوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔ لیکن چونکہ ثعلبی کی ہمدردیاں نئے دستور والوں کے جمہوری اور کامل وطنیت کے اصول کے خلاف تھیں اس لئے ثعلبی کے ماتحت اس اتحاد کا مقصد یہ ہوتا کہ پرانے دستور والوں کی حیثیت رہتی چنانچہ نئے دستور والوں نے ثعلبی کی مخالفت کی یہاں تک جب وہ پبلک میں بولنے کھڑا ہوتا تو یہ لوگ خونخوار بلوہ کرا دیتے۔ پھر بھی ثعلبی نے یروشلم کے مفتی اعظم کی ہمت افزائی پر ذاتی طور پر مسلم اتحاد کی لیے اپنی تبلیغ جاری رکھی کچھ عرصہ بعد نئے دستور والوں نے محسوس کیا کہ ان کا سطحی پروگرام ثعلبی کے مذہبی رنگ کے پروگرام کے مقابلہ میں نامقبول ہو جائے گا حبیب برغبی نے چنانچہ نومبر ۱۹۳۷ء میں اپنی پارٹی سے گورنمنٹ کی موافقت کی پالیسی کو چھڑوا دیا۔ اور الجیریا اور مراکش میں جو جبری کارروائیاں گورنمنٹ نے کی تھیں اس کے خلاف ایک عام ہڑتال بھی کرا دی۔ گویا اس طرح نئے دستور میں مسلم یکجہتی اور مسلم اتحاد اس کے پروگرام کا خاص اصول ہو گیا۔ اسی زمانہ میں بہت جلد فرانسیسی بائیں جماعت اور تجارتی یونین والوں کی ہمدردیاں اس سے جاتی رہیں۔ پرانے دستور والوں سے سبقت لے جانے کے خیال سے برغبی نے تجویز کیا کہ ماتحتی حکومت کا ہر ممکن صورت سے اختلاف کرنا چاہئے۔ بغاوت بھی اس میں جائز ہے چنانچہ اپنے ساتھیوں میں جذبہ شہادت و بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کی ٹیکس ادا کرنے اور فوجی خدمت کرنے سے منع کر دیا۔ اور عام اژدہامی مظاہرے کرنے کی تلقین کی۔

۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو نئے دستور کے لیڈروں کے ماتحت (جب جرمنوں نے آسٹریا پر حملہ کر دیا تو فرانسیسی کمزوری کا یقین کر کے) ایک منظم انبوہ نے پولیس پر حملہ کر دیا ایک فرانسیسی کا گلا کاٹ ڈالا۔ پولیس والوں نے فیر کئے بہت سے لوگ مر گئے لیکن جلد ہی امن قائم ہو گیا اور بہت سے لوگوں کو سزائیں دی گئیں چند گھنٹوں کے اندر حبیب برغبی اور نئے دستور کے دیگر زعما قید کر لئے

گئے اور تین دن کے اندر اس پارٹی کو ختم کر دیا گیا۔ حالانکہ گورنمنٹ نے بعد کو بہت سے لوگوں کو رہا کر دیا لیکن بلوم کی گورنمنٹ نے جو سماجی اصلاحات کی تھیں ان سب کو منسوخ کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قید کی سزا سے بڑھ کر ٹیونس میں امن قایم کیا نازی دہشت اور فاشسٹی مطالبوں نے ستمبر ۱۹۳۸ء میں میونخ کا قضیہ ہوا لیکن ٹیونس بالکل خاموش رہا بلکہ پبلک فرانس کے تعلقات پہ پہلے سے زیادہ مستعد نظر آنے لگی یہ نظریہ اور بھی ترقی پذیر ہو گیا جب اٹلی نے دسمبر ۱۹۳۸ء میں لاول اور مسولینی کے جنوری ۱۹۳۵ء والے سمجھوتے کو مسترد کر دیا اور فاشسٹی پریس نے ٹیونس کے الحاق پر زور دینا شروع کیا ٹیونس والوں نے کبھی فاشسزم کے متعلق اچھی رائیں نہیں رکھیں لیبیا کی قربت نے ان کو مواقع دئے تھے کہ مسولینی کی مسلم پالیسی کا اصل مطلب سمجھ سکیں لیبیا کو اطالوی وطنی علاقے میں داخل کر لینا اور اس کو چار صوبوں میں تقسیم کر دینا بیس ہزار اطالویوں کو ۱۹۳۵ء میں وہاں عربوں کے درمیان بسنے بھیج دینا اور پھر یہ اعلان کرنا کہ ابھی اور بھیجے جائیں گے یہ سب باتیں ایسی تھیں جنھوں نے عام مسلمان ملکوں میں اس کے خلاف حقارت کی لہر پھیلا دی یہاں تک کہ شکیب ارسلاں بھی باوجود مسولینی کے متعلق بلند رائے رکھنے کے ان امور سے بہت متاثر ہوا۔

ٹیونس کی قوم کو اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ ان کے اپنے مفاد و اغراض کس سے وابستہ ہو سکتے ہیں فرانسیسی اور اطالوی نوآبادیات میں کس کو منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اس امر میں ایک نیا دستوری بھی اب مذبذب نہ کریگا۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۸ء میں فاشسٹ چیمبر میں مختلف نائبوں نے "ٹیونس، جبوتی، کارسیکا" کے مطالبے کا نعرہ بلند کیا تھا اس کا اثر ٹیونس میں فوراً اور بہت گہرا ہوا۔ اور اس کے ایک ماہ بعد موسیو دلاضیے کے ٹیونس جانے پر عوام الناس نے اپنے جوش و خروش میں بہت خلوص کا مظاہرہ کیا پھر بھی اطالوی مطالبوں کو رد کرنے کی فضا سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انھیں فرانسیسی پالیسی منظور رہے۔ نئے دستور والوں نے ابھی تک اپنے وہی مطالبات قائم رکھے ہیں اور وہ لوگ جو دور اندیش و محتاط ہیں اور فرانسیسیوں کے ساتھ شریک کار ہیں انھوں نے بھی اس بات کو صاف ظاہر کر دیا ہے کہ ان کا اشتراک عمل ہمیشہ کیلئے قطعی نہ سمجھ لیا جائے جنگ کے بعد وہ ماتحتی حکومت

کی مکمل تنظیم نو کی امید رکھتے ہیں۔

مراکش میں قومی تحریک اسی قدر ترقی پذیر ہوئی جتنی کہ ٹیونس میں مراکش رؤسا کے بہت سے لڑکے پیرس پڑھنے بھیجے گئے۔ جہاں انھوں نے فرانسیسی بائیں جماعتوں کے جمہوری اور سرمایہ داری کے مخالف نظریوں کو قبول کیا واپسی پر انھوں نے مراکش کی آزادی کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور ان تصورات اور نظریوں کو پیش نظر رکھا جو انھوں نے فرانس سے حاصل کئے تھے۔ گو کہ یہ گروہ تعداد میں بہت تھوڑا تھا پھر بھی یہ لوگ بہت سرگرم تھے اور آخر میں تو انھوں نے ان لوگوں سے بھی اس کی قیادت منظور کرائی جو پرانے خیالات کے حامی تھے مراکش کی بڑھتی ہوئی قومی تحریک کا سب سے زیادہ اثر انداز واقعہ ۱۹۲۵ء میں عبدالکریم کی بغاوت تھی اس کے فیز کے دروازوں تک بڑھ جانے نے قوم پرستوں کو بتا دیا کہ مراکش کی آزادی حاصل کرنے کی راہ میں محض موجودہ ہتھیاروں کا نہ ہونا مانع ہے۔

ریف کی جنگ ختم ہو جانے کے بعد مراکش میں کھلم کھلا شورش ختم ہو گئی حالانکہ تعلیم یافتہ طبقہ میں سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی خواہش اسی طرح موجزن تھی۔ یہ دبی ہوئی آگ ۱۶ رمئی ۱۹۳۰ء میں بربر ظہیر کے شائع ہونے پر پھر بھڑک اٹھی۔ اس بے موقع اور غلط فرمان کے ماتحت وہ قانونی قضیے جو اب تک بربر قبیلوں کی بعض قرآنی عدالتوں میں پیش ہوا کرتے تھے، ان عدالتوں میں منتقل کر دئے گئے جن میں قبیلوں کے رسم و رواج کے مطابق عدل کیا جاتا تھا۔ اس قانون کے خلاف مراکش کے تعلیم یافتہ طبقہ نے "مراکشی عمل" نام کی جماعت میں منظم ہو کر شکیب ارسلان کی زیر ہدایت ایک سخت احتجاج کرنا شروع کیا انھوں نے اس کی بہت سختی سے مخالفت کی (اس وقت بھی جبکہ اس قانون کی بعض دفعات ہلکی کر دی گئیں تھیں) وہ کہتے تھے کہ اس سے ہم خدائی عدل سے محروم ہو جائیں گے اس طور پر ان لوگوں نے اپنے کو پرانی نسل والوں کے سامنے (جنھیں ان کی مغربی تعلیم نے اسلام سے بیگانہ بنا دیا تھا) اسلام کے نگراں کی شکل میں پیش کیا ان کے اس عمل کی تعریف یروشلم کی کانفرنس میں بھی ہوئی۔

یہ بات بہت اہم تھی کیونکہ ان نوجوانوں کو اپنے وطنی پروگرام بنانے میں اسلامی روایات اپنے بزرگوں کے قدیمی رجحانات اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیرس کے مربیوں کے جمہوری اور انقلابی اصولوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ ایک مغربی طرزِ خیال کے آدمی کو یہ دونوں مقاصد صاف طور پر متضاد معلوم ہوں گے لیکن مراکشی عمل کے ان نوجوانوں کو ان میں کوئی بات متضاد نہیں معلوم ہوئی جیسا کہ ان کے مراکشی اصلاحات کے پروگرام کی اشاعت سے ظاہر ہو گیا۔ یہ پروگرام انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ایک فرانسیسی گروپ کے زیرِ ہدایت چھاپا۔ اس گروپ کے لوگ سیاست، صحافت، قانون اور علمی زندگی میں کافی مشہور تھے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ پروگرام قاہرہ میں بھی چھپوایا گیا۔ یہ اعلان جو دراصل بجائے اصلاحات کے کسی خاص پروگرام ہونے کے مطالبات اور شکایات کی ایک طویل فہرست ہے پھر بھی اس تحریک کا یہی دفتری پروگرام ہو گیا۔ اس انجمن کے فرانس کی بائیں جماعت میں بہت سے دوست تھے اور جب یہ پارٹی ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں منتخب ہو گئی تو قدرتی طور پر یہ سمجھا گیا کہ اس انجمن کے مطالبات فوراً منظور ہو جائیں گے لیکن چند ماہ بعد یہ محسوس ہونا شروع ہوا کہ بلوم والی وزارت ان مطالبات کو منظور نہیں کرے گی۔ اس وقت اس انجمن نے بہت زبردست شورش مچانا شروع کر دی لیکن ۱۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو سلطان نے اس انجمن کو بے ضابطہ ٹھہرا کر شکست کر دیا۔ وطن پرستوں نے اس وقت طے کیا کہ صرف طاقت ہی سے کوئی بات منوائی جا سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ملک کو اس بات کیلئے تیار کرنا شروع کیا۔ ان دیہاتی ضلعوں میں بھی دورہ کیا گیا جو دور دور واقع تھے تاکہ وہ بھی سخت قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔ اگست ۱۹۳۷ء میں باقاعدہ پہلے سے تیار کئے ہوئے بلوے ہونا شروع ہوئے اور کافی خون بہایا گیا۔ اکتوبر میں حکام نے کثیر تعداد میں لوگوں کو قید کرنا شروع کیا۔ ریذیڈنٹ جنرل نوگی نے ایک بڑی عقلمندی کی پالیسی یہ اختیار کی کہ نوجوان مراکشیوں کے شکوک کو ان کے کچھ مطالبات منظور کر کے رفع کر دیا اور جن لوگوں کو قید کیا گیا تھا ان کو آزاد کر دیا۔ اس عرصہ میں وطن پرستوں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ تحت حکومت کو طاقت سے نہیں آزاد کرایا جا سکتا چنانچہ میونخ کا واقعہ بھی مراکش میں بغیر کسی اثرات کے گزر گیا

اب اگر ہم شمالی افریقہ کو تمام تر نظر میں رکھیں تو فرانسیسی پالیسی کے متعلق چند واضح کلیے قائم

کر سکتے ہیں۔ شروع میں حکام نے ان مخالف اثرات کو صحیح صحیح سمجھنے میں غلطی کی جو مشرق قریب سے داخل ہو رہے تھے۔ وہ دستور علما، ثابتہ شمالی افریقہ اور مراکشی عمل، ان سب کی جد وجہد کا مذاق اڑانے کی طرف مائل رہے۔ انھوں نے یہی خیال کیا کہ یہ چیزیں عوام الناس کی مانندگی نہیں کر رہی ہیں۔ اس کے بعد دفعتاً واقعات سے معلوم ہوا کہ وطنیت کی اسپرٹ دیہاتی علاقوں کے قبائل تک میں پہنچ گئی ہے۔ اب یہ معلوم ہونے پر بے انتہا پریشانی پیدا ہو گئی۔ اور وہ تمام مطالبات جو وطنی پیش کرتے تھے ان میں جو خالص تمدنی قسم کے ہوتے وہ بھی اب فرانسیسیوں کو اپنے خلاف معلوم ہوتے۔ الجیریا میں یہ حالت خاص کر پیدا ہوئی اسی لئے وہاں اکثر بلا امتیاز جبر کیا گیا۔ ٹیونس میں تو اپریل ۱۹۳۸ء کے بلوؤں کے بعد محاصرے والی حالت قائم کر دی گئی۔ اور حکام کے ہاتھ میں جب اتنے جبری اختیارات دیدئے گئے تو وہ اکثر جرم کے لحاظ سے سزا بہت زیادہ دیتے تھے صرف مراکش میں بڑی مصالحت سے انسدادی تدبیریں کی گئیں، ایسی کہ لوگ خوش ہو گئے اگرچہ تمام تر مطمئن نہیں ہوئے۔

فرانسیسی حکومت جس طرح شمالی افریقہ میں بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہو سکی اسی طرح ان مندوبی ملکوں یعنی شام اور لبنان میں بھی وہاں کی دشواریوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ شام میں اس کو ان تعلیم یافتہ روسا سے مقابلہ کرنا پڑا جو ترکی دور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور لبنان میں ان لوگوں سے جو کہ زیادہ تر عیسائی تھے اور جہاں تعلیم کی فراوانی کی وجہ سے صرف ۱۶ فیصدی جہالت رہ گئی تھی فرانسیسی نو آبادیاتی حکام جن کی تربیت زیادہ تر افریقہ کی نو آبادیات تک محدود تھی ان کو یہاں حکومت کرنے کے طریقوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ یہاں کے عام لوگ سیاسی اور سماجی ترقی کے باعث تہذیب کے اعلیٰ مدارج تک پہونچ چکے تھے۔

اس کے علاوہ فرانسیسی گورنمنٹ کو پیرس میں نہ اس کے حکام کو جو اس مقام پر تھے کچھ معلوم تھا کہ ایک مندوب ملک پر کس طرح حکومت کرنا چاہئے بعض کہتے تھے کہ فرانس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ریاستوں کو مکمل آزادی کے لئے جلد سے جلد تیار کر دے۔ دوسرے لوگ سیاسی فوجی اور مالی وجوہ کی بنا پر یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ اس وقتی حکومت کو غیر مقررہ وقت تک طول دیا جائے فرانس کی اس غیر متعین اور متضاد

پالیسی کے خطرات شام میں جولائی ۱۹۲۵ء میں آخر ظاہر ہو گئے جبل دروز میں بغاوت شروع ہوئی اور اسکا اثر دمشق، جبل حرمان، اور جنوبی لبنان تک جلد پہونچ گیا ایسی شورش کے دفع کرنے میں گورنمنٹ نے کوئی اصولی پالیسی نہیں برتی شام کے وطن پرستوں سے سمجھوتے ہوئے اور پھر توڑ دیے گئے اصلاحات جاری کئے گئے اور پھر ملاحظہ منسوخ کرے گئے ۱۹۳۰ء تک فرانسیسی گورنمنٹ اپنی کمزوریوں کا اسی طرح مظاہرہ کرتی رہی۔ اس سے شام اور لبنان کی قدیمی چشمک شام میں عیسائیوں کی اقلیت اور لبنان میں مسلمانوں کی اقلیت وغیرہ کے مسائل کبھی نہ طے ہو سکے۔

جون ۱۹۳۱ء میں مندوب کمیشن کے فرانسیسی رکن نے اس بات کا اعلان کیا کہ موجودہ طریقہ کار محض شام ولبنان کو مندوب سے ہٹا کر آزاد کرنے کیلئے ہے اور اس میں بہت دیر نہیں لگے گی۔ اس وعدہ سے مطمئن اور ۱۹۳۲ء میں عراق کو آزادی ملنے پر شام کے وطن پرستوں نے بھی کسی درمیانی سمجھوتہ سے انکار کر دیا۔ اجنوری ۱۹۳۶ء کو انھوں نے الفاظ سے گذر کر عمل سے کام لینا چاہا ۱۸ جنوری سے ۲۴ فروری تک تمام بازار بند رہے، تمام باہر کے مال کا بائیکاٹ کر دیا گیا دمشق، حمص، حلب، دیر الزور وغیرہ مقامات پر فسادات ہوئے جن میں [illegible] مقتول اور سیکڑوں زخمی ہوئے آخر کار پہلی مارچ کو گورنمنٹ نے وعدہ کر لیا کہ شام کو وہی حقوق مل جائیں گے جو برطانیہ نے عراق کو دے ہیں۔

جون ۱۹۳۶ء میں موسیو بلوم کی وزارت فرانس میں قائم ہوئی۔ موسیو فلینڈن نے جو وعدے کئے تھے ان کی پابندی ان کو ورثتاً ملی اور اس سلسلہ میں ابتدائی کارروائیاں جو پیرس میں ہو رہی تھیں وہ بھی جاری رہیں موسیو ویو جس نے یہ طے کر لیا تھا کہ بہت جلد اور کامیابی کے ساتھ یہ امور ختم کر دیگا۔ اس نے ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء ایک عہدنامہ پر شام کے وفد کے لیڈر ہاشم بے الاطاسی کے ساتھ دستخط کر دئے۔ اس کے بعد ۱۳ نومبر کو لبنان اور ۲۲ دسمبر کو شام سے ایک صلحنامہ پر دستخط ہو گئے لبنان کو شام سے علیحدہ کر دیا گیا اور ہر ایک کو اس کی اپنی حکومت دیدی گئی یہ تسلیم کر لیا گیا کہ شام تین سال میں آزاد ہو جائے گا اس کے بدلے میں اس نے فرانس سے ایک پچیس سالہ اتحاد کا وعدہ کر لیا اور کچھ فوجی، اقتصادی اور تمدنی مراعات دینا بھی مان لئے۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے امن قائم ہو گیا۔ دمشق میں ہائی کمشنر اور وطن پرستوں کے درمیان کامل [illegible] ہونے لگا یہاں تک کہ جب اول الذکر نے صلحنامہ میں چند تبدیلیاں منظور کر لیں تو موخر الذکر نے بادل نخواستہ

سنجک کے علاقہ کو ترکی کو دینا منظور کر لیا تھا۔ اس اتحاد کے باوجود بھی گورنمنٹ نے اس صلحنامہ کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے میں دیر کی اس کے علاوہ اقلیتوں کے مطالبات کی ہمت افزائی کی گئی خصوصاً چند فرانسیسی حکام نے ان عیسائیوں کی بہت زیادہ طرفداری کی ان باتوں سے شام میں عام خیال یہ پیدا ہو گیا کہ فرانس اس صلحنامہ کو بالکل ختم کر دینا یا کم از کم اس کی صورت بالکل مسخ کر دینا چاہتا ہے۔ انتہا پسندوں کے سردار ڈاکٹر شاہ بندار نے یہ خیال پھیلایا کہ صرف جہاد ہی سے فرانس کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ اپنے وعدے پورے کرے۔

حالات اتنے نازک ہو گئے تو شام کے وزیر اعظم جمیل مردم بے دمشق سے اگست ۱۹۳۸ء میں فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بونے سے ملنے پیرس گئے، وہاں یہ دونوں حضرات متفقہ نتیجہ پر پہنچ گئے۔ ۱۴ نومبر کو ان دونوں نے ایک متفقہ اعلان شائع کیا کہ "ہمیں امید ہے کہ شام کی پارلیمنٹ دسمبر ۱۹۳۶ء والے صلحنامہ کو ۲۰ جنوری ۱۹۳۹ء تک منظور کر لے گی اور یہ کہ فرانسیسی پارلیمان بھی جس کے سامنے مخصوص کمیٹیوں کی رپورٹ ۱۵ دسمبر سے پہلے پیش کی جائے گی، اس صلح کو ۳۱ جنوری ۱۹۳۹ء سے پہلے مان لے گی۔ ان شرائط کے ماتحت مندوبی حکومت کے امور شامی نظام میں فروری تک منتقل ہو جائیں گے، اس کے علاوہ شام جمعیت الاقوام میں ۳۱ دسمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۹ء تک شامل ہو جائے گی۔"

آپس کے یہ باہمی سمجھوتے بالکل واضح اور صاف تھے لیکن ابھی جمیل مردم بے دمشق واپس بھی نہیں پہنچے تھے کہ موسیو بونے نے دفتر خارجہ کی چند سازشوں کے زیر اثر اس بات کا اعلان کیا (۱۴ دسمبر) کہ ابھی وہ ایوان کے سامنے اس صلحنامہ کو منظوری کے لئے نہیں لائیں گے۔ ایک پختہ وعدہ کے ایک مہینہ سے کم عرصہ میں اس طرح شکست ہو جانے سے شام میں خطرناک نتائج پیدا ہو گئے جمیل مردم بے ۱۸ فروری کو عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے بعد دو کابینہ بنے، ایک وطن پرستوں کا دوسرا غیر جانبداروں کا لیکن یہ چند ہفتہ ہی قائم رہے۔ حالت اس قدر نازک ہو گئی کہ ہائی کمشنر نے پولیس کے اختیارات خود لے لئے اور مارچ میں دمشق میں فوجیں بلا لیں۔ یہ حالت نازک تر ہو گئی جب ۲ جولائی کو گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ اقلیتوں کو خود مختاری میں کچھ حصہ دیدیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ ہاشم بے العطشی نے اپنے عہدۂ صدر جمہوریہ سے استعفا دیدیا۔ اس صورت حال کا خاتمہ کرنے کے لئے ہائی کمشنر مجبور ہوا کہ دستور کو ملتوی کر دے۔ ایوان کو برخاست

کرنے اور حکومت کو ایک نظارت کے سپرد کردے جس کا نگراں وہ خود بنے اس نے اس کا بھی اعلان کیا کہ کسی
اس قسم کی کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ فرانس اپنا اقتدار شام میں باقی رکھنا نہیں چاہتا، اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نا
خود مسدودی طرز حکومت کو طویل مدت تک قائم رکھنے کا قائل ہے اور ان وعدوں کے خلاف ہے جو فرانسیسی
گورنمنٹ یکم مارچ ۱۹۳۶ء سے اب تک کرتی رہی ہے۔ اس کے نزدیک یہاں فرانسیسی ہی حکومت ہونا چاہئے
کل نظام اس طرح درہم برہم کردے جانے سے اور ان سزاؤں سے جو وطن پرستوں کو اس اعلان کے بعد
دی گئیں فرانس کی شام کی پالیسی کا ایک نیا اور بہت عملی رخ ظاہر ہوا۔

اس وقت شام میں شمالی افریقہ کی طرح دو سال کے اندر موسیو بلوم کے وسیع اصلاحات کے خلاف رد عمل
ہوا اور حاکمانہ طریقہ حکومت کی طرف رجعت ظاہر ہوئی موجودہ جنگ نے وطن پرست جماعتوں کو ایک بہت اچھا
موقع بغاوت کیلئے دیا اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان لوگوں نے اتحادیوں سے بے ساختہ اتحاد
عمل شروع کردیا۔ دمشق، ٹیونس، الجیریا اور ہر جگہ کے باشندوں کی رائے متحدہ طور پر ہٹلر کی نسلی طرز حکومت کے خلاف
ہوگئی باوجود اس کے کہ برلن سے شکیب ارسلان بہت مستعدی سے جرمنوں کا پروپیگنڈا کرتا رہا۔

لیکن اگر وطن پرست لیڈروں نے خصوصاً شام میں، اپنے مطالبات کو فی الحال ملتوی کردیا ہے تو
انھوں نے یہ بات بھی بالکل واضح کردی ہے کہ جنگ کے بعد وہ بڑی شدت و قوت سے اپنے مطالبات پیش کریں گے
جمیل مردم بے نے جہاں یہ کہا کہ شام ہمیشہ فرانس کا مددگار رہے گا اور اس کا ایک وفادار حلیف، وہاں ساتھ
ہی یہ امید بھی ظاہر کی کہ فرانس کی گورنمنٹ اپنی قدیم روایتی پالیسی اختیار کرلے گی اور عربی ممالک کو ان کے
وطنی عزائم کو پورا کرنے میں مدد دے گی ڈاکٹر شاہ بندر نے اس سے زیادہ صاف الفاظ استعمال کئے انھوں
نے کہا گذشتہ جنگ میں عرب مسلح ہوئے اور اتحادی ممالک کی طرف سے لڑے اب بیس برس بعد اپنے
پرانے ساتھیوں کے ساتھ دوش بدوش پھر کھڑے ہیں کیونکہ ان کی قسمت لازمی طور جمہوریتوں سے وابستہ
ہے اتحادیوں کی اس فتح سے ان کو اپنی آزادی اور خود مختاری کی امید ہے۔"

فرانس خود اپنی ذہنیت ظاہر کردے گا اگر اس نے جنگ کے بعد اپنی مسلم پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ
کی شام اور لبنان میں اس کو اپنے کئے ہوئے وعدوں کا لحاظ کرکے شام و لبنان کے جمہوریوں کو

ضرور آزاد کر دینا چاہیئے شمالی افریقہ کی ماتحت حکومتوں ٹیونس اور مراکش میں اسکو مکمل دستوری تبدیلیاں کرنا چاہئیں۔ ماتحتی حکومت کے نظریہ کو دوبارہ جانچنا چاہیئے اور اس کے قانونی اساس کی صحیح اور قطعی وضاحت کر دینی چاہیئے۔ الجیریا میں فرانسیسی آبادی کے حقوق تمام مسلمانوں کو بھی ملنا چاہیئے۔ سیدھا سادہ انصاف تو یہی ہے۔ اس سے فرانس کو بھی فائدہ ہوگا کیونکہ اس طرح وہ ایک قابل عبور پشتہ اس پان عرب ازم کی لہر کے لئے قائم کر دے گا جو مشرق سے شمالی افریقہ میں بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے ان تمام ملکوں میں فلاحین (کاشتکار) کو زمین ضرور دینا چاہیئے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سرکاری ملازمتیں دے کر ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔ وطن پرستوں کے تمدنی مطالبات کو خواہ مشرق قریب ہی سے مستعار کیوں نہ ہوں اس روشنی میں نہ دیکھنا چاہیئے جس طرح مخصوص پارٹیوں کے سیاسی دستور العمل دیکھے جاتے ہیں اور آخری بات یہ کہ گورنمنٹ کو اطلاعات حاصل کرنے اور مسلم پالیسی کو متحد کرنے کے ذرائع کو ترقی دینا چاہیئے۔ حالانکہ بحر روم میں ہائی کمیٹی (جو وزیر اعظم کے دفتر سے ملحق ہے) اور شمالی افریقہ میں مختلف نظاموں کو متحد کرنے کی وزارت یہ دونوں اسی طرح کے اقدام ہیں لیکن ان جیسے اور بھی ہونے چاہئیں۔

سنہ ۴۲ء کے بجٹ پر دسمبر سنہ ۳۹ء میں بحث کرتے ہوئے موسیو سرّا وزیر داخلہ، موسیو ہیریو صدر ایوان اور موسیو مینڈل وزیر نوآبادیات نے وعدہ کیا تھا کہ فرانس ان خدمات کو نہیں بھولے گا جو اس کی نوآبادیات موجودہ جنگ کے زمانہ میں انجام دے رہی ہیں اپنے سمندر پار مقبوضات کو فرانس نے کافی مہذب بنا دیا ہے۔ اب جبکہ وہ خطرے میں ہے وہ اپنی تمام شفقت و وفاداری سے اس احسان کا بدلہ دے رہی ہیں۔ اگر کل صلح ہو جائے اور جیسا کہ تمام فرانسیسی امید کرتے ہیں کہ یہ صلح انصاف کی صلح ہوگی تو یہ انصاف محض یورپین قوموں کے لئے نہیں بلکہ نوآبادیاتی باشندوں کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔

عرب کا مسئلہ بحر روم کے معاملات میں یقیناً بہت اہم حیثیت رکھے گا صرف فرانس و برطانیہ ہی نہیں بلکہ اٹلی و اسپین بھی دنیائے عرب کے واقعات سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اسپین کی مثال لیجئے جب جنرل بیگ بیدر مراکش کے اسپینی علاقہ کے ہائی کمشنر تھے تو انہوں نے وہاں کے بہت سے باشندوں کو فرانکو کی طرف سے لڑنے کے لیے نوکر رکھا اور انہوں نے مراکش کے فرانسیسی علاقہ

میں وطن پرستوں کی حریت کی آگ کو خوب مشتعل کیا۔ اب جبکہ وہ فرانکو کا وزیر خارجہ ہے ممکن ہے وہ یہی حکمت عملی دوسری آمری طاقتوں کی مدد سے دوسری جگہ بھی پھیلائے۔

جہاں تک اطالیہ کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ مسولینی کی مسلم پالیسی محض اس کی عام خارجی حکمت عملی کی ایک شکل ہے۔ اطالیہ کی مسلم رعایا کی آبادی چالیس لاکھ جاہل حبشیوں اور سات لاکھ بے رہنما باشندگان لیبیا پر مشتمل ہے۔ ان کی بہبودی کے متعلق فاشستی حکومت کو کچھ زیادہ خیال نہیں ہے مسولینی کا مقصد فرانکو کی طرح منفی ہے یعنی فرانس اور برطانیہ کے مقبوضات میں (باری) کے ریڈیو اسٹیشن سے عربی زبان میں نشر کے ذریعہ اشتعال پھیلاتے رہنا اور اشتعال انگیز رسائل کا شائع کرنا اور شکیب ارسلان کے سے شورش کرنے والوں کی ہمت افزائی کرنا۔ ۱۹۳۷ء میں مسولینی نے تو یہاں تک کیا کہ ترپولی میں ایک شاندار جلوس کے سامنے خود کو "محافظ اسلام" کا لقب دلوایا۔ فسطائی پروپیگنڈہ زیادہ کامیاب ہوتا اگر روم نے اطالوی نوآبادیوں کی نسلی برتری اور غیر مخلوط رہنے کے خیال سے چند شدید قوانین لیبیا اور حبش میں نہ بنا دئے ہوتے۔ لیبیا میں ایک مخصوص اطالوی شہریت قائم کر دی گئی ہے جس کی رو سے وہاں کے باشندوں کو افریقہ کے حدود میں محض چند حقوق دئے گئے ہیں اور انھیں صرف چند معمولی و شہری عہدوں کو حاصل کرنے کا مجاز ہے۔ بالفاظ دیگر ان مسلمانوں کے لئے جو اطالیوں سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور فرمانبردار ہیں ایک قسم کی دوسرے درجے کی شہریت قائم کی گئی ہے۔

باشندوں کے حقوق سے اسی قسم کی نفرت فسطائی نوآبادیات کے تصور میں بھی پائی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ بحر روم پر قبضہ حاصل ہو جائے اور اطالوی استبداد مستحکم ہو جائے۔ اپنے فوجیوں کو لیبیا کے ساحل پر آباد کرنے کے خیال سے فسطائی گورنمنٹ نے وہاں کے باشندوں کی عمدہ زمینیں انھیں دیدی ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے اٹلی تلم پر بُری طرح بمباری بھی کر چکا ہے۔ یہ تمام واقعات دنیائے اسلام کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب اٹلی کو معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی مسلم پالیسی کی بدولت تمام مسلمان اس کے سخت دشمن ہو گئے ہیں۔

(ماخوذ از عارین (پیرس))
(مترجمہ ف ا کرمانی)
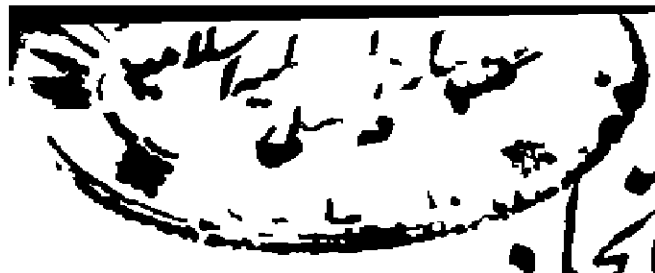
روس اور جرمنی کا اتحاد

یہ مضمون بو.بی کری ڈسکی کی مشہور کتاب "میں اسٹالین کا ایجنٹ تھا" سے ماخوذ ہے۔ کری ڈسکی نے تقریباً بیس سال سوویٹ حکومت میں گزارے اور ہیگ میں سوویٹ کے فوجی رسائی کے محکمہ کا افسر اعلیٰ رہا۔ جب اسٹالین نے فوجی افسروں اور پرانے انقلابیوں کا قتل عام کیا تو کری ڈسکی اور حکومت میں اختلاف پیدا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کری ڈسکی کو اپنی عہدات سے سبکدوش ہونا پڑا۔ حکومت کا افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اس کو حکومتی طبقے کے خفیہ ارادے معلوم تھے جن کا اس نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

ہٹلر کے قوت میں آنے سے دس سال پہلے معاہدہ رپالو نے برلن اور ماسکو میں دوستانہ تعلقات قائم کر دیئے تھے۔ اس زمانہ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا جرمن فوج اور سرخ فوج کا میل جول بڑھ گیا تھا۔ اور روس نے جرمنی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ سرزمین روس پر اپنی فوجی تنظیم کرے تاکہ ورسائی کے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کے الزام سے بھی بچ جائے اور فوجی قوت بھی پیدا کر لے۔ اس رعایت کے بدلے میں جرمنی نے سرخ فوج کو نئے طریقۂ جنگ سکھانے کا وعدہ کیا تھا اس طرح دونوں ممالک کی دوستی گہری ہو گئی تھی اور دونوں ملکوں میں خوب تجارت ہونے لگی تھی

جرمنی میں اس زمانہ میں تین پارٹیاں قوت حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پارٹی کا لیڈر ہٹلر تھا۔ پروگرام کے اختلاف کی بنا پر دوسری دو پارٹیوں نے ہٹلر کے خلاف سمجھوتا کر لیا تھا اور یورپی سلطنتوں کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب ہٹلر کی طاقت ختم ہو جائے گی لیکن اسٹالین کا یہ خیال تھا کہ چونکہ فوج ہٹلر کے ساتھ

ہے اس لئے آخری فتح روس کی ہی ہوگی چنانچہ استالین نے پولیٹبیرو میں تقریر کرتے ہوئے کہا
"جو کچھ جرمنی میں ہو رہا ہے نازیت کے زوال پر دلالت نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف
وہ ظاہر کرتا ہے کہ نازی ازم کو طاقت اور اقتدار حاصل ہو جائے گا۔"
استالن کا خیال درست ثابت ہوا اور کچھ ہی مدت میں ہٹلر برسر اقتدار آگیا۔ لیکن
نازی ہٹلر کمیونسٹ استالن کا دشمن نکلا ہٹلر نے قوت پکڑتے ہی روس سے تجارتی اور فوجی
دوستی ختم کردی اس پر استالن بہت پریشان ہوا اور اس نے مخاصمت کو دوستی بنانے
کی کوشش شروع کردی اور استالن کی رائے کے مطابق پولیٹبیرو یعنی پولیٹیکل پارٹی
کی سیاسی کمیٹی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہر ممکن طریقہ سے ہٹلر کو روس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے
مجبور کیا جائے۔ استالن بذات خود ہمیشہ ایک طاقتور دشمن سے سمجھوتہ کرنے کو بہتر خیال کرتا ہے وہ لینن کی
موت کے بعد ہی سے جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا نازیت کے عروج نے اس کی خواہش کو مضبوط سے
مضبوط تر بنا دیا لیکن استالن ہٹلر کی طرف جتنا بڑھتا تھا ہٹلر اتنا ہی پیچھے ہٹتا تھا۔
۲۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جب ہٹلر کو چانسلر سے ہوئے گیارہ مہینے گزر چکے تھے مولوٹوف نے
سوویٹ کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا "ہمارے بین الاقوامی تعلقات میں جرمنی ایک
نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ سوویٹ یونین کو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بنا پر وہ
اپنی پالیسی میں کوئی ایسی تبدیلی کرے جس روسی جرمنی تعلقات پر کوئی اثر پڑے" اسی
دن خارجی کمیسار لٹوینوف نے اپنی تقریر میں کہا "سیاسی اور اقتصادی وجوہات کی بنا
پر دس سال سے ہمارے جرمنی کے ساتھ تعلقات ہیں ہم ہی صرف وہ ایک ایسی قوم ہیں
جس کو معاہدہ ورسائی اور اس کے نتائج سے کچھ واسطہ نہیں ہم نے وہ حقوق بھی چھوڑ
دئیے جو اس معاہدہ نے ہم کو دئے تھے ہماری خارجی تجارت میں جرمنی کو اول درجہ
حاصل ہے اور روس و جرمنی نے ان اقتصادی اور سیاسی تعلقات کی بنا پر بڑے فوائد
حاصل کئے ہیں۔ ہم جرمنی سے تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ سوویٹ اور جرمنی ان

تعلقات کی بنا پر سوائے فوائد کے اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کو مشرق مغرب یا کسی اور سمت میں بڑھنے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے اور ہم خوش ہوں گے اگر جرمنی بھی ہم سے یہی بات کہے۔"

۲۶ جنوری ۱۹۳۴ء کو استالین نے بذاتِ خود سویٹ کانگریس کے سترویں جلسہ میں ہٹلر سے سمجھوتہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا "جرمنی میں فاشسزم کا قائم ہو جانا ہم کو کسی طرح مجبور نہیں کرتا کہ ہم اپنی پالیسی میں کسی قسم کی تبدیلی کریں کیونکہ ہم کو فاشسزم سے کوئی تعلق نہیں۔ اٹلی میں بھی فاشسزم ہے لیکن وہ روس اور اٹلی کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنے میں سدِّ راہ نہیں ہوئی۔"

لیکن ہٹلر نے ان دوستانہ اشاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی چنانچہ مجبور ہو کر استالین کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔

اب اس نے ہٹلر کو روس سے صلح کرنے پر مجبور کرنا چاہا۔ اُس نے سوچا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سویٹ روس کو اب معاہدہ وار سائی کی حمایت کرنی چاہئے مجلسِ اقوام میں شامل ہونا چاہئے۔ اور جرمنی کے خلاف دوسرے ملکوں سے معاہدے کرنے چاہئیں تاکہ جرمنی ڈر کر سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ استالین نے اس تجویز پر ۱۹۳۴ء عمل کرنا شروع کیا سرکاری اخباروں سے پراودا (Pravada) اور زیوستیا (Izvestia) میں جرمنی کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے۔ استالین کے طرزِ عمل میں جو تبدیلی ہوئی تھی اُس کا پروپیگنڈا ان اخبارات کے ذریعہ کیا جانے لگا لیکن مضامین اس ترکیب سے لکھے جاتے تھے کہ دوسرے ممالک کے کمیونسٹ تو یہ سمجھیں کہ روس کا اقدام بالکل جائز اور مناسب ہے اور جرمنی و روس کے درمیان سمجھوتہ کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ ان مضامین کی تیاری میں استالین نے خود حصہ لیا تھا۔

ادھر تو یہ مضامین لکھے جا رہے تھے اُدھر کمیسار لٹوینوف ہٹلر سے سمجھوتہ کرنے کی

کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں لٹوینوف نے ہٹلر سے یہ بات بھی کہی کہ دونوں ممالک مل کر بلقانی ریاستوں کی آزادی کا ذمہ لیں لیکن ہٹلر نے اس کو نامنظور کر دیا مضامین برابر چھپ رہے تھے اور دوسرے ممالک روس کی اس سیاست پر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔ فرانس والے خوش تھے کیونکہ ان مضامین سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ روس فرانس کی طرف متوجہ ہوا چاہتا ہے اور بلقانی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا آرزومند ہے تاکہ جرمنی کا گھیرا ڈال لے۔

اسی زمانے میں ریڈک نے اسٹالن کے اشارہ پر ایک مضمون لکھا ہے "جرمن فاشزم اور جاپانی شہنشاہیت ایسی جدوجہد میں مشغول ہے جس سے دنیا کا نقشہ بدل جائے یہ جدوجہد دراصل سویٹ روس فرانس پولینڈ۔ چیکوسلوواکیا۔ رومانیہ۔ بالٹک کی حکومتوں چین اور ممالک متحدہ امریکہ کے خلاف ہے لیکن برطانوی شہنشاہیت یہ چاہتی ہے کہ یہ جدوجہد محض سوویٹ یونین ہی کے خلاف ہو۔ اور باقی کسی ملک کے خلاف نہ ہو"

ریڈک نے یہ مضمون تو چھپوا دیا لیکن جب کریوٹسکی نے ریڈک سے اس نئی پالیسی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگا "صرف بیوقوف ہی یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ہم جرمنی سے بگاڑ سکتے ہیں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایک چیز ہے اور حقیقت دوسری جو کچھ جرمنی نے ہمارے ساتھ کیا ہے دوسرا ملک نہیں کر سکتا۔ جرمنی سے الگ ہو جانا ہمارے لئے ناممکن ہے"

غرضکہ جو مضامین اخباروں میں شائع ہوتے تھے اُن کو حقایق سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو محض اعلیٰ سیاسیات سے تعلق رکھتے تھے۔ اسٹالین اس طرح جرمنی کو روس کے قریب لانا چاہتا تھا۔

رشتۂ اتحاد قائم کرنے کے لئے لیٹوینوف نے یورپی ممالک کا ایک دورہ کیا لیکن یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اس کا دورہ جرمنی کو خوف زدہ کر کے اُس سے سمجھوتہ

پر آمادہ کرنے کے لئے ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ معاہدۂ لوکارنو کی بابت بات چیت کر لی ہے۔

۱۳ جون ۱۹۳۴ء کو لٹوینوف نے برلن پہونچ کر جرمنی کے وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور مشرقی یورپی پیکٹ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جب جرمنی نے اس دعوت کو بھی ٹھکرا دیا تو پھر یہ دھمکی دی کہ اگر جرمنی معاہدہ میں شامل نہ ہوا تو روس دوسرے ممالک سے فوجی معاہدے کرلے گا۔ لیکن جرمنی وزیر خارجہ نے یہ کہہ کر کہ جرمنی فوجی گھیرے سے خوف زدہ نہیں ہے لٹوینوف کو خاموش کر دیا۔

اس واقعہ کے اگلے دن یعنی ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کو ہٹلر مسولینی سے وینس میں ملا۔

استالن اس جواب سے بھی ناامید نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے پولینڈ کو پھسلانا شروع کیا کہ وہ اپنی پالیسی کی ایسی وضاحت کرے جو جرمنی مفاد کے خلاف ہو۔ لیکن پولینڈ روس کے اس اقدام سے گھبرا گیا اور اس نے جرمنی سے مدد چاہی۔ پولینڈ اور جرمنی کے تعلقات زیادہ مضبوط ہو گئے۔ جس سے استالن کو اور زیادہ تشویش ہو گئی۔ لیکن وہ اب بھی ناامید نہیں ہوا۔

دو ہفتہ بعد ریڈک نے اپنے مضمون میں لکھا "کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ فاشسٹ جرمنی اور سویٹ روس کیوں نہ ساتھ ساتھ چلیں جبکہ فاشسٹ اٹلی اور سویٹ روس میں گہرے تعلقات ہیں۔"

لیکن ہٹلر نے ہر بات سننے سے انکار کر دیا۔ فوجی گھیرے کی بھبکی بھی کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔ آخر کار استالن نے اس بھبکی کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی۔

لیٹوینوف دوبارہ جنیوا گیا۔ اور نومبر میں فرانس آکر پیری لاول سے فرانس اور روس کے سمجھوتہ کے بارے میں گفت و شنید شروع کر دی۔ اور ۵ نومبر کو ان دونوں ممالک میں ایک معاہدہ ہو گیا اس کے چار دن بعد لیٹوینوف نے یہ بیان جاری کیا سویٹ نے ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے اور خصوصاً

جرمنی سے مجھے اُمید ہے کہ فرانس کا بھی یہی رویہ ہے۔ اور مشرقی یورپی پیکٹ ان تینوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے گا۔"

اب ہٹلر کو حرکت ہوئی۔ اُس نے سویٹ کو ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سونے کے مارکس کا قرضہ ۳۵ء میں دیا جس کی وجہ سے استالن نے اپنی تقریر میں کہا "ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ ہٹلر ہم سے جنگ کرے گا جبکہ وہ ہم کو اتنا بڑا قرضہ دیتا ہے۔ یہ بات ممکن ہے کیونکہ جرمنی میں تجارتی گروہ بہت طاقتور ہے۔"

اسی دوران میں جرمنی اور جاپان کے درمیان سمجھوتہ کی خفیہ بات چیت ہو رہی تھی اور ہرفان ربن ٹراپ اور جاپانی فوجی اتاشی ہیروشی اوشی ما کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ترتیب دیا جا رہا تھا۔ اس معاملہ کی دوسرے ملکوں کو خبر نہیں تھی۔ لیکن باوجود پردہ داری اور رازداری کے روسی حکومت کو اس خفیہ معاہدہ کا پورا پورا علم ہو گیا۔ استالن نے اس راز کو طشت ازبام کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ چپ لگائے رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں بعض اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جرمنی اور جاپان میں کسی قسم کا خفیہ سمجھوتہ ہو گیا۔ ۱۰ر جنوری کو مولوٹف نے اپنی تقریر میں خفیہ معاہدہ کا اخباروں کے حوالے سے ذکر کیا لیکن یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ اُن کو اس معاہدہ کا پورا پورا علم ہے۔ ۱۲ر جنوری کو ٹوکیو اور برلن نے اگرچہ اس خبر کی تردید کر دی۔ لیکن دوسرے ممالک کو یقین نہ آیا اور تمام ممالک کی نظریں برلن پہ لگ گئیں۔ اب جاپان اور جرمنی نے اس خفیہ معاہدہ کو چھپانے کے لئے دوسرا معاہدہ انٹی کمینٹرن (Anti - Commintern) پیکٹ ترتیب دیا جو ۳۵ء کو برلن میں دستخط ہو گئے لیکن اس پیکٹ کے پیچھے اصلی جاپانی جرمن معاہدہ چھپا ہوا تھا جس کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ برلن اور ٹوکیو سے جو بھی سیاسی کارروائی ہو وہ دونوں ممالک کے صلح نامے سے عمل میں آئے چاہے اُس کارروائی کا تعلق مغربی یورپ سے ہو یا بحرالکاہل سے۔

ان تمام معاملات کو جن کا تعلق روس اور چین سے ہو دونوں ممالک ترتیب دیں اور پھر ایک دوسرے کی رائے کے نہ تو کوئی یورپ میں قدم اٹھائے نہ بحر الکاہل میں۔

۳۔ برلن نے اپنے جنگی اسباب اور ہتھیاروں میں جو کچھ تبدیلی اور نئی ایجاد کی ہے ٹوکیو کو بتلائے اس معاہدہ میں کمیونزم کا لفظ تک نہیں آیا تھا اور نہ کسی ایسے اقدام کا پتہ چلتا تھا جو کمیونزم کے خلاف ہو۔ اب استالن نے برلن کو بتانا چاہا کہ سویٹ گورنمنٹ خفیہ معاہدہ کی بابت سب کچھ جانتی ہے چنانچہ کیسا لٹوینوف نے ۲۸ نومبر کو سویٹ کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک جرمن۔ جاپان کے انٹی کیمنٹرن پیکٹ کا تعلق ہے میں آپ سے کہوں گا کہ اس سے کوئی مطلب نہ نکالیں کیونکہ اس معاہدہ میں درحقیقت کوئی معنی پوشیدہ نہیں ہیں وہ تو ایک دوسرے اصلی معاہدہ کو چھپانے کے لئے کیا گیا ہے اور وہ دوسرا معاہدہ نہ تو شائع ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس اصلی معاہدہ کے لئے پندرہ مہینے درکار ہوئے ہیں جس میں کمیونزم کا لفظ تک بھی نہیں آیا اور وہ خفیہ معاہدہ اس جنگ کو جو ایک براعظم پر لڑی جائیگی دوسرے براعظم تک پھیلانے کے لئے ہے . . . " (۱)

اس بیان سے جرمنی میں ہیجان پیدا ہوگیا لیکن ہٹلر پھر بھی خاموش ہی رہا۔ آخرکار استالن نے دوسری چال چلی۔ اس نے فرانس سے ایک اور معاہدہ کیا اور چیکوسلوکیا سے بات چیت شروع کی اور ایک دوسرے کی مدد کا عہد کیا۔ انٹی فاشسٹ ممالک میں پروپگنڈا کیا۔ اور ان کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ پھر جرمنی اور اٹلی کے خلاف اسپین کی خانہ جنگی میں کود پڑا تاکہ برطانیہ اور فرانس پر یہ ظاہر کرسکے کہ وہ جرمنی سے کسی طرح صلح نہیں کرسکتا دوسری طرف اس نے اپنے خاص سفید ڈیوٹ کینڈلیکی سے کہا کہ وہ ہٹلر سے صلح کی بات چیت کرے ان سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ہٹلر ڈر گیا اور اس سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہوگیا استالن کی چال چل گئی اس نے پولٹ بیورو ( ) کے اجلاس میں

اعلان کر دیا "مستقبل قریب ہی میں ہم جرمنی سے ایک سمجھوتہ کرلیں گے" سنہ ۱۹۳۶ء میں شروع تین مہینوں تک تو بات چیت ہوتی رہی۔ آخر کار معاہدہ کا ڈھانچہ تیار ہوگیا۔

۱۲ مارچ کو ہٹلر نے آسٹریا ہضم کرلیا لیکن روس نے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی ستمبر میں سوڈیٹن لینڈ پر بھی قبضہ کرلیا اور روس نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ غرضکہ سنہ ۳۸ جیسا معرکہ آرا سال گذر گیا اور استالن نے اپنی زبان تک نہیں ہلائی۔ آخر کار ۱۲ جنوری ۳۹ کو ہٹلر اور روسی سفیر کے درمیان دوستانہ بات چیت شروع ہوئی ایک ہفتہ بعد نیوز کرانیکل میں یہ خبر شایع ہوئی کہ جرمنی اور سوویٹ روس میں کوئی سمجھوتہ ہوا چاہتا ہے۔ ۲۵ جنوری کو ڈیلی ہیرلڈ کے نامہ نگار نے لکھا "نازی حکومت کو اب یہ یقین ہوگیا ہے کہ اب یورپ میں کوئی جنگ چھڑی تو روس غیر جانبدری کی پالیسی اختیار کرے گا۔ جرمنی کے تجارتی وفد کا مقصد جو ماسکو جا رہا ہے تجارتی نہیں بلکہ سیاسی ہے!"

فروری کے شروع میں معلوم ہوا کہ ماسکو نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اپنا تیل جرمنی اور اٹلی اور دوسری قوتوں کو جن کا تعلق روم برلن سے ہے فروخت کریگا یہ پالیسی برطانیہ اور فرانس کے بالکل خلاف تھی آخر کار ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء کو اسٹالن بول اٹھا اس نے ہٹلر کی کھلم کھلا طرفداری کی۔ اور یہاں تک کہدیا کہ جمہوریتیں فضا کو خراب اور زہریلا بنا نا چاہتی ہیں تاکہ جرمنی اور روس میں ناچاقی پیدا ہوجائے لیکن روس اور جرمنی کے ظاہر التعلقات میں ناچاقی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اسٹالن کی تقریر کے پانچ دن بعد ہٹلر نے چیکوسلویکیا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور سٹالن خاموش دیکھتا رہا۔

اسٹالن کی پالیسی کا اظہار کہ وہ ہر صورت سے جرمنی سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے ایک اخبار ( ) میں اگست ۲۱ سے پہلے ہی شائع ہوچکا تھا اور ۲۲ اگست ۳۹ کو دنیا دنگ رہ گئی جب برلن سے ہرفان ربن ٹراپ اور ماسکو سے مولوٹف نے روسی جرمن پیکٹ کا اعلان کیا اور اس طرح یورپ کی آئندہ تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کرنے کا سامان مہیا کر دیا

(مترجمہ ایم ایم جوہر میرٹھی)

روسی ظرافت

قوموں میں یہ قوم وہ ہے جو لطیفے بڑے شوق سے سنتی ہے، مگر آخر میں یہ ضرور پوچھتی ہے
کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آپ منہ بنا کر ہنسنے کی وجہ بتائیے تو اس قوم کے لوگ آپ کی
خاطر سے اچھا یہ بات تھی، کہہ کر کھیسیں نکال دیتے ہیں۔ اور آپ اپنے لطیفے پر ترس کھا کر اور ہنسنے والے
کی موٹی سمجھ پر افسوس کرکے رہ جاتے ہیں۔ اگر اس قوم کے لوگوں کو کسی بات پر ہنسی نہ آتی تو ہم
سمجھ لیتے کہ گونگوں اور بہروں، لولوں اور لنگڑوں کی طرح ایک قسم ایسے آدمیوں کی بھی ہے جو
ہنس نہیں پاتے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہی لوگ خوب ہنستے رہتے ہیں۔ اور مذاق کے سوا
ہر طرح کی باتوں پر ہنس لیتے ہیں۔

لطیفے اور حکایت کے لئے ملک اور زبان اور قوم کی کوئی قید نہیں، اور بہت سے لطیفے
ایسے ہیں کہ جو ذرا ذرا سا بھیس بدلے ہوئے آپ کو ساری دنیا میں ملیں گے۔ ظرافت کی قسمیں
اور وہ باتیں جن پر ہنسی آنا چاہئے ہر جگہ قریب قریب ایک سی ہیں۔ بعض موقعے ایسے آتے ہیں
جن پر لوگوں کو ہنسی ضرور آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی کی ٹوپی ہوا میں اڑ جائے اور وہ اس کے پیچھے
دوڑے یا کسی موٹے آدمی کا پیر پھسل جائے اور وہ گرتے گرتے بچے۔ حماقتیں بیان کرنے اور ان
پر ہنسنے کا بھی ہر جگہ رواج ہے لیکن تہذیب نے اور پابندیاں لگانے کے ساتھ ٹھٹھا مار کر ہنسنا
بھی نامناسب ٹھہرایا ہے۔ اس سے ہر جگہ ہنسی کی قدرتی خواہش کو تہذیب کا لباس پہنا کر ظرافت
کی شکل پیدا کی گئی ہے۔ اور اسے گدگدانے اور ابھارنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ روسی
ناول نویس گوگول کا قصہ ہے کہ ایک زمیندار تھے جنہوں نے اپنے بھتیجے کو پڑھانے
کے لئے ایک انگریز استانی رکھی وہ دراصل کسی اور فراق میں تھی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا تو یہ
بیچارے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کے اچانک گھر اور شہر چھوڑ کر بھاگ جانے سے پولیس کو شبہ

ہوا اور اس سے ان کا پیچھا کیا۔ یہ سمجھے کہ انگریز استانی ان کو پولیس کے ذریعے پکڑوانا چاہتی ہے
تو یہ اور بھاگے۔ روس سے بھاگ کر جرمنی اور وہاں سے دوسرے ملکوں میں پہونچے۔ روسی پولیس
نے اپنی طرف سے ضابطے کی کارروائی جاری رکھی۔ ہر ملک کی پولیس کو ہدایت کر دی کہ ان پر نظر
رکھے اور یہ بے چارے مفت میں بین الاقوامی مجرم بن گئے۔ لیکوک کا یہ قصہ ظرافت کی وہ قسم
ہے جس میں ہنسی کی بات کا کوئی موقع یا واقعہ ہوتا ہے۔ ظرافت کی یہی قسم زیادہ مہذب، زیادہ نفیس
بھی ہو سکتی ہے۔ لیکوک ہی نے اپنے ناول "گرجا والوں" میں پادری اخلا کی کرامات بیان کی
ہیں جو نہایت ہی تندرست، کھلنڈرا اور جاہل تھا۔ یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ لے دینی اور اس چیز کو
جسے ہمارے یہاں ایک زمانے میں نیچریت کہتے تھے دور کرے۔ چنانچہ اس کا ہر وقت میونسپل
ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر سے مقابلہ رہتا تھا۔ سائنس ماسٹر میونسپلٹی سے لاشیں مانگتا تھا کہ وہ
علم تشریح پڑھا سکے۔ میونسپلٹی چاہتی تھی کہ نئے علم کی سرپرستی کر کے نام پیدا کرے۔ اس لئے وہ لاوارث
کی لاشیں اور متفرق ہڈیوں کو خرید کر سائنس ماسٹر کو دیا کرتی تھی۔ انھیں لاشوں کو پادری اخلا چرا لیجاتا
اور بڑی دھوم دھام سے دفن کرتا۔ یہ دین کی خدمت تھی اس لئے میونسپلٹی پادری اخلا کو لاوارث
مردوں کو دفن کرنے کا انعام بھی دیتی تھی۔ سائنس ماسٹر کے لئے لاشوں اور ہڈیوں کا چوری جانا کچھ
ایک مصیبت نہ تھی۔ وہ آزاد خیال تھا، سائنس کی زبان میں گفتگو کرتا تھا لیکن اس کی ماں بیچاری
جاہل تھی۔ اور جب لڑکے کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو اسے شبہ ہوتا کہ لڑکے نے دین و ایمان
کے خلاف کچھ کہا ہوگا اور وہ نحوست دور کرنے کے لیے اس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی۔

انقلاب سے پہلے تک روس میں لیکوک کی ظرافت بہت پسند کی جاتی تھی۔ انگریزوں
کی ظرافت جس کا دنیا بھر میں چرچا ہے زیادہ تر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جب بھی ہنستے ہیں تو ایسی ہی باتوں
پر۔ فرانسیسی البتہ زیادہ نفاست پسند ہیں۔ وہ ہنسنا تہذیب کی شان کے خلاف مانتے ہیں۔ ان کے
یہاں صرف مسکرانا مناسب ہے اور ظرافت بس ذہانت اور قابلیت کو ظاہر کرنے کا طریقہ ہے۔ اچھی
سے اچھی شکل میں فرانسیسی ظرافت نکتے میں بسی ہوئی علم اور تجربہ کا نچوڑ ہوتی ہے جو ظرافت اس

پائے گی نہیں ہوتی انھیں دنیا کی، آدمی کی اور خاص طور سے عورت اور مذہب کی تحقیر پر لطف
انداز سے کی جاتی ہے۔ ایسی ظرافت صرف اس شخص میں ہو سکتی ہے جو اپنے آپ کو زندگی اور دنیا
والوں سے اس قدر برتر سمجھے کہ آدمیوں اور ان کے کاروبار سے بے تعلق ہو جائے۔ زندگی اس
کے لئے ایک تماشا ہو جس پر وہ الگ کھڑا ہو کر اپنی رائے چٹکلوں میں بیان کرے۔ یہ ادا روسیوں
کی طبیعت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ بھی دل میں دنیا کو ایک دھوکا اور انسان کی آرزوؤں اور
کوششوں کو ہیچ سمجھتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ دنیا سے کوئی دامن جھاڑ کر الگ نہیں ہو سکتا۔ ان
کے نزدیک جو اس مغالطے میں ہو کہ وہ دوسروں کی طرح خواہش اور امید، کوشش اور جستجو، کامیابی
اور مایوسی کے جال میں پھنسا ہوا نہیں ہے اور پھنس نہیں سکتا وہ سب سے زیادہ بے وقوف ہے
اور سب سے پہلے اسی پر ہنسنا چاہئے۔ فرانسیسیوں کی ظرافت شوخ اور چنچل ہے، روسیوں کی گہری
اور سنگین۔ ایک بجلی کی طرح زندگی کے دریا پر چمکتی ہے اس کی سطح کو روشن کر دیتی ہے مگر اندر تک
نہیں پہونچتی۔ دوسری اسی دریا میں غوطے لگاتی ہے اور جو کچھ لاتی ہے دریا کی تہہ سے لاتی ہے
کہنے والوں نے کہا ہے روسی ایک آنکھ سے ہنستا اور دوسری سے روتا ہے یعنی دنیا کا تماشا
دیکھ کر اسے ہنسی آتی ہے لیکن اسے ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے آپ کو یک تماشا بنا دیا
ہے ہمدردی اور محبت اتنی ہے کہ ان کے حال پر اسے رونا بھی آتا ہے۔ اس کی نظر اتنی تیز
ہے کہ ہر ا[illegible] پردے اور اوٹ کو جو دنیا والے اپنے بھیدوں کو چھپانے کے لئے لگاتے ہیں
پار کر جاتی ہے جس چیز پر پڑتی ہے اس کے ہر پہلو کو دیکھ لیتی ہے۔ اس لئے روسی کو ہنسی آئے
تو کچھ تعجب نہیں۔ اس کی نظر اوپر ہی پڑتی تو وہ ہنس کر رہ جاتا لیکن ایسا نہیں ہے روسی کی نظر زندگی
میں سما جاتی ہے۔ اور جیسے ہی اس کو ہنسی آتی ہے ویسے ہی اس کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے
یہی وجہ ہے کہ روس کے پہلے بڑے ناول نویس نکولائی دیسلیوچ گوگول نے آخر عمر میں لکھنے پڑھنے
... ہنسنے ہنسانے سے توبہ کی جتنے مسودے چھپنے سے رہ گئے تھے انھیں جمع کر کے جلا دیا۔ اور
اپنے دوستوں کو بھی نصیحت کرنے لگا کہ گنہگاروں کی زندگی چھوڑ دو اور مذہب کی گود میں

گوگول نے شروع میں جو افسانے لکھے اور ان سے بھی بڑھ کر اس کے ڈرامے ظرافت سے لبالب بھرے پیالے ہیں جنھیں پی کر آدمی ہنسی سے بالکل بے قابو ہو جاتا ہے لیکن یہ خالص روسی ظرافت نہیں ہیں اصل روسی ظرافت کے نمونے ہیں اس کے ناول "مردہ روحوں" میں ملتے ہیں۔ گوگول کے زمانے میں کسان زمینداروں کے غلام تھے اور جیسے ہم آج کل حساب لگاتے ہیں کہ فلاں جائداد میں اتنے گاؤں ہیں ویسے ہی روس میں کہا جاتا تھا کہ فلاں زمیندار اتنی روحوں یعنی کسانوں کا مالک ہے اور انھیں کے حساب سے اس سے مالگذاری لی جاتی تھی۔ مردم شماری دس دس برس کے بعد ہوتی تھی اور اس درمیان میں جو کسان مر جاتے ان پر بھی مالگذاری ادا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بہت چلتے ہوئے آدمی چچیکوف کو خیال آیا کہ ایسی مردہ روحوں کو زمینداروں سے خرید لے عدالت میں ایک بیان داخل کر دے کہ میں نے اتنی روحیں خریدی ہیں اور جب وہ ان کا مالک تسلیم کر لیا جائے تو اپنی اس روحوں کی جائداد کو کسی بنک میں گرو رکھ کر اس پر روپیہ قرض لے اور چلتا بنے چچیکوف نے گاڑی کرایہ پر لی اور یہ انوکھا بیوپار شروع کیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیسے کیسے آدمیوں سے ملا ہو گا۔ اوروں کو چھوڑیئے بس دو کا حال ذرا سا سن لیجیے۔ ایک صاحب نوجوان زمیندار ہیں بڑے شاعرانہ مزاج کے، دن بھر اونگھتے اور طرح طرح کی تجویزیں سوچتے رہتے ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ گھر کے پیچھے جو بڑا سا تالاب ہے اس پر پل بنوائیں اور اس پر دونوں طرف اچھی اچھی دوکانیں لگوائیں۔ لیکن ان کے ڈرائنگ روم میں برسوں سے کئی مونڈھے رکھے ہیں جن پر کپڑا چڑھانا رہ گیا ہے جو ملنے آتا ہے اس سے یہ کہتے ہیں کہ ان پر نہ بیٹھو، یہ ابھی تیار نہیں ہیں مگر مونڈھوں پر کپڑا چڑھانے کی نوبت نہیں آتی ان سے ملاقات ہوتی تو آپ فوراً پرکھ لیتے کہ یہ اپنے زمانے کے تعلیم یافتہ روسیوں کا نمونہ ہیں جنھیں قدرت نے چاہا تھا کہ بہت ہی اچھے آدمی بنائے مگر انھیں بنا نہیں چکی تھی کہ اور کسی کام میں لگ گئی اور یہ نامکمل رہ گئے۔ دوسرے صاحب ایک شہر کے سرکاری وکیل تھے۔ ان کی بائیں آنکھ جھپکتی رہتی اسے جھپکتے دیکھ کر آپ سمجھتے کہ وہ آپ کو اشارہ کر رہے ہیں

کہ پاس کے کمرے میں چلو تو تمہیں بڑے مزے کی بات سناؤں۔ مگر وکیل صاحب ایسے تھے ہی نہیں جیسا کہ ان کی آنکھ کے جھپکنے سے معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑے سیدھے، خاموش، دبو آدمی تھے۔ انہیں کوئی خاطر میں نہ لاتا اور بیان کرنے والے نے بیان کیا ہے کہ جب جان یہاں کے لوگوں نے انہیں مرتے دیکھا تبھی انہیں یقین ہوا کہ وکیل صاحب کے روح بھی تھی۔

روس میں ان وکیل صاحب سے زیادہ بے حقیقت لوگ تھے جو دنیا میں آتے اور پرچھائیں کی طرح گذر جاتے۔ ان کا نمونہ گوگول نے اپنے ایک رسالے میں پیش کیا ہے جس کا نام "لبادہ" ہے۔ "لبادے" کا ہیرو اکاکئی اکاکئے وچ ایسا آدمی ہے کہ جس کے نام کو سن کر اور صورت کو دیکھ کر لوگ مسکرا دیتے۔ طبیعت کا یہ نہایت مسکین سیدھے چاروں میں یہ سب سے زیادہ بے چارہ ہے۔ لوگوں کے سامنے آتے سڑک پر چلتے سہم جاتا ہے۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا نہیں اور دیکھتا ہے تو اس انداز سے کہ گویا وہ دنیا میں پیدا ہونے پر بہت نادم ہے اور اپنے تصور کی معافی چاہتا ہے۔ وہ ایک دفتر میں ملازم ہے اور اس کا کام کاغذات نقل کرنا ہے۔ اُسے خوش نویسی کا بڑا شوق ہے اور وہ کام جسے ہم آپ بہت خشک سمجھتے ہیں اُسے اتنا پسند ہے کہ اس میں وہ اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ دنیا میں وہ اور کچھ نہیں چاہتا سوا اس کے کہ اپنی خوشخطی کی دُھن پوری کرتا رہے۔ مگر بے چارہ کیا کرتا اُسے سردی بہت لگتی تھی اور آخر مجبور ہو کر ایک موٹا لبادہ بنوانے کی آرزو کرنے لگا۔ اس نے برسوں پیسے جوڑ جوڑ کر اتنا جمع کر لیا کہ ایک لبادہ بن سکے۔ لبادہ اس نے بنوا لیا لیکن پہلے ہی دن جب وہ اسے پہن کر نکلا تو وہ چوری گیا۔ اکاکئی اکاکئے وچ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا، وہ مر گیا اور اس کا بھوت مدتوں تک شہر بھر میں لبادے کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔

اکاکئی اکاکئے وچ کے سراپے اور اس کی سرگذشت پر روسیوں کو ہنسی آئی لیکن وہ خیال ہی خیال میں اس سے گلے مل کر روئے بھی اور کہا کہ ہم بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔ یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ اکاکئی اکاکئے وچ کی دلگیر سکینی روسی ادب پر کوئی پچاس برس تک چھائی رہی۔ گوگول کی کسی نے نقل نہیں کی لیکن اسے کولی کیا کرتا کہ دس بیس ... سے دوچار اکاکئی اکاکئے وچ

کے ہم شکل اور ہم مزاج ضرور ملتے۔ کوئی گھرانہ، کوئی محل ان سے خالی نہ تھی گوگول نے کسی ایک آدمی کو پکڑ کر اس کا مذاق نہیں اڑایا تھا۔ اس کی نظر نے اس سانچے کو دیکھ لیا تھا جس میں لاکھوں آدمی ڈھلتے ہیں۔ اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ سانچا اب ٹوٹ گیا ہے یا قدرت اسے کام میں نہیں لاتی۔

گوگول کی طرح ایک آنکھ سے ہنسنے اور ایک آنکھ سے رونے کی عادت قریب قریب ہر روسی ادیب کو تھی لیکن حقیقت کو لطیفہ بنا دینے کی جو قدرت گوگول کی تھی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ گوگول سے پہلے فون ویزن اور گریبوئے دوف، اس کے بعد دستوفسکی اور گونچروف کی تصانیف میں طنز اور ظرافت کے بڑے اچھے اچھے نمونے ملتے ہیں اور گونچروف اپنے ناول "اوبلوموف" میں تو گوگول سے بھی بازی لے گیا تو رگنیف، توسی اور دستوفسکی روحانی کشمکش میں ایسے مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے نام کے ساتھ ظرافت کا نام نہیں لیا جا سکتا مگر تورگنیف کی ظرافت سنہری کرن کی طرح مایوسی کی کالی گھٹاؤں کو چیر کر نکل آتی ہے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ مصیبت اور بے چینی کی اس فضا سے اثر نہ لے جو دستوفسکی کی دنیا پر چھائی رہتی ہے اسے دستوفسکی کے ناولوں میں بھی بہت سے دلچسپ موقعے اور واقعے مل جائیں گے کہ جن پر آدمی ہنس سکتا ہے لیکن دستوفسکی اس ہنسی میں شریک نہیں ہوتا۔ اسے رونا بہت آتا ہے ہنسی کسی بات پر نہیں آتی اور لطیفہ بیان کرنا وہ جانتا ہی نہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ٹالسٹائی کا بھی ہے۔ اس میں ظرافت کی کمی نہ تھی، مگر معلوم ہوتا ہے اسے ہنسنے ہنسانے کی مہلت نہیں ملی۔ آپ اس کی ظرافت کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس چھوٹی سی حکایت کو سن لیجئے۔ اور دیکھئے کہ ٹالسٹائی ایک ذرا سے اشارے میں ہم سب کی زندگی کے کتنے موقعے اور واقعات یاد دلا دیتا ہے کہ ریبنن نامی ایک صاحب جو بہت بڑے عہدے پر ملازم ہیں۔ اپنی بیوی آننا کی بے حیائیوں سے عاجز آ کر ایک وکیل سے طلاق کے بارے میں مشورہ کرنے جاتے ہیں۔ وکیل صاحب کی عادت تھی کہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہاتھ سے مچھر پکڑا کرتے تھے اور اس میں انہیں ایسی مشق ہو گئی تھی کہ جو مچھر ان کے پاس آیا وہ پھر بچ کر نہیں جا سکتا

جس وقت کارتین صاحب اپنی مصیبتیں بیان کر رہے تھے وکیل صاحب کی نظریں مچھر کو تلاش کرتی رہیں۔ جیسے ہی کارتین صاحب نے اپنی رام کہانی ختم کی ایک بہت بڑا مچھر وکیل صاحب کے سامنے سے گذرا انھوں نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ اٹھایا، مگر پھر انھیں کارتین صاحب کی پریشانیوں کا خیال آیا اور انھوں نے مچھر کو نہیں پکڑا۔

روس کے باہر روسی ظریفوں کا سرتاج چیخوف مانا جاتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ روس کیا دنیا کے ظریفوں کا بادشاہ ہے چیخوف کا دل دنیا کے دکھ درد سے تڑپتا رہتا تھا اس کے بہت سے افسانے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر آدمی ہفتوں غمگین رہتا ہے بعض کو پڑھئے تو ایسا دم گھٹنے لگتا ہے کہ خدا کی پناہ لیکن جب وہ ہنساتا ہے تو آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے چیخوف بہت نیک آدمی تھا۔ اس کی ظرافت بھی بہت ہی نیک ہے۔ اس کے پیروں میں کوئی کانٹا نہیں ہوتا چیخوف ہنساتا ہے تو کسی بات پر کسی آدمی پر نہیں ہنساتا۔ اس کی ہنسی میں یہ تاثیر بھی ہوتی ہے کہ وہ دل کو صاف کرتی ہے۔ ہم کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عقلمند ہیں اور کوئی دوسرا بیوقوف چیخوف کی ظرافت عقلمند اور بیوقوف کے فرق کو مٹا کر ہمیں یقین دلا دیتی ہے کہ جن باتوں پر ہم ہنستے ہیں وہ ہمارے ساتھ بھی پیش آسکتی ہیں اور تب ہم بھی کریں گے تو کیا کریں گے ہنس کر رہ جائیں گے چیخوف کی اس میٹھی دوا کی کوئی خوراک ہمیں اس وقت نہیں پلا سکتا لیکن آپ تلاش کریں تو کتب فروشوں کے یہاں یہ دوا آپ کو آسانی سے مل جائے گی اور اکثر دواؤں سے سستی ہوگی اس میں وقت اور خوراک کی کوئی قید بھی نہیں بس جب ملے اور جتنی ملے۔

(پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے آکسن) (بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

تخلیقی مدنیت کیا ہے؟

تخلیقی مدنیت کے لئے آزادی اور انفرادیت کا وجود اور ان کا احترام لازمی ہے انہیں سے افراد کی نشوونما اور تکمیل، اور ذہانت میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ وہی اشتراک عمل کا باعث ہیں اگر اخلاقی لحاظ سے دیکھیں تو ان کے ماتحت دوسروں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے۔ نفسیاتی اعتبار سے اختلاف اور کشمکش کی وجہ سے ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ تعلیمی مدد سے فرماں برداری، ہمدردی، اجتماعی خدمت اور ذمہ داری کی افزائش ہوتی ہے جدید سائنس نے زمان ومکان کے قیود کو فنا کر دیا ہے اور ذرائع آمد ورفت میں وسعت وہمہ گیری پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے شہری کے لئے عالمگیر شہری ہونا ناگزیر ہے۔ جس میں وسیع النظری اور آفاقی ہمدردی کے جذبات اس طرح موجزن ہوں کہ وہ تمام نوع انسانی کو ایک خاندان خیال کرے جیسی کہ اسلام کی تعلیم ہے "الخلق عیال اللہ" ۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند	کہ در آفرینش ز یک جوہر اند	(سعدیؒ)
یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا	کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا	(حالیؔ)

اور وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو جو مرض، تنگ نظری، منافرت اور ابن آدم کی تقسیم چاہتا ہے حقارت کی نظر سے دیکھے مولانا حالی نے انسانیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائگاں	از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس	در شبستاں تنگ دل از محنت زندان شدن
آتش قحطے کہ در کنعان بسوز دماغ وکشت	سرفراز تخت مصر از تاب وے بریاں شدن

آزاد شہری تیار کرنے کے لئے تاکہ وہ تخلیقی اعمال سے معاشرہ کی از سر نو تنظیم کر سکیں، حسب ذیل اوصاف لازمی ہیں:۔

۱۔ سماجی ذمہ داری کا احساس غالب ہونا چاہئے جس میں دوسروں کی فلاح و بہبود اور ہر انسان کی آسائش و آرام کا خیال شامل ہے۔ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ عوام کی غربت افلاس جہالت بیماری اور سماجی مشکلات کو دور کرسکیں۔ دوسروں کی خوش حالی کے لئے جدوجہد کرنا ذاتی اغراض کو پس پشت ڈالنا عوام کی فرماں برداری کے ساتھ جو اس کی اطاعت کو نظر انداز کرنا حقیقی مدنیت کے مرادف ہے۔

۲۔ قوم اور سماج کے کاموں میں پورے انہماک اور مستعدی سے حصہ لینا، فرائض کی انجام دہی میں پیچھے نہ ہٹنا اور اجتماعی ورثے سے پوری طرح استفادہ کرنا ان کا فرض ہے۔ اگر وہ اجتماعی ورثے کے عوض کوئی خدمت نہ کریں تو ان کی پرورش طفلی سے زیادہ نہ ہوگی۔

۳۔ ان کو آزادی کا سرشار ہونا چاہئے۔ وہ آزادی جو نہ صرف انفرادی ہو بلکہ سماجی اور ملی بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ حقیقی رواداری اور سچی محبت بھی ان کی سرشت کا ایک جزو ہونا چاہئے۔

۴۔ بین الاقوامی سیاست اور بین الملی مسائل پر غور و فکر لازمی ہے اس سے سلجھے ہوئے خیالات کی افزائش ترقی ہوتی ہے جدید سیاست سے کافی دلچسپی لینا، بین الاقوامی تحریکات سے خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی خوب واقف ہونا جمہوری ممالک میں ایسا ہی ضروری ہے جیسے حیات انسانی کے لئے ہوا، پانی اور روشنی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بچے کو مدنی زندگی کے لئے کس طرح سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اور اسکولوں میں کون سے ذرائع استعمال کئے جائیں کہ اچھی مدنیت کی تعلیم و تربیت ہو سکے اچھی مدنیت کے لئے مختلف سماجی اداروں کا باہمی تعاون ضروری ہے مغربی و مشرقی اسکولوں میں جہاں جہاں آزادی اور اشتراک عمل کا دور دورہ ہے وہاں مدرسے مدنیت کامیابی کے ساتھ اچھے شہری پیدا کر رہے ہیں اچھے شہری پیدا کرنے کے لئے مکمل سماج کی تشکیل بھی لازمی ہے جہاں بچوں کو ایسے مواقع بہم پہونچائے جائیں کہ وہ آزادی کے ساتھ مدنی فرائض کو عملی طور سے انجام دے سکیں

یہ اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی روح ہر عمل میں جاری و ساری ہو اور اسکولوں کا نصب العین بجائے ذاتی غرض اور شخصی منفعت کے متحدہ خدمت، جماعتی منصوبے اور معاشرتی مقاصد ہوں۔ اسکولوں میں ایسی سوراجی حکومت قائم کی جائے جس میں بچے خود حصہ لے سکیں اور جس میں قیادت، ضبط و تادیب، باہمی آمد و رفت، ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم، جماعت کے لحاظ وغیرہ کے لئے خاص طور پر مواقع دیئے جائیں۔ ان تمام اوصاف کو بیرونی زندگی میں کامیاب بنانے کے لئے بچوں کو ایسے مواقع دئے جائیں کہ وہ خارجی دنیا اور سماجی زندگی سے پوری طرح آشنا ہو سکیں۔ اس قسم کے مشاغل میں جو انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں طلبا کو نہایت قابل قدر تربیت اور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام اعتقادات، صلاحیتِ عمل اور ذوق سلیم پیدا ہوتا ہے اور وہ مل جل کر تقسیم کے اصول کام کرنا سیکھتے ہیں۔ ہر اچھے مدرسے میں اس قسم کے بہت سے مشاغل خود بخود بچوں کے اپنے شوق و اہتمام سے رائج ہو جاتے ہیں مثلاً مدرسے کا رسالہ نکالنا، مختلف قسم کی علمی ادبی انجمنیں قائم کرنا تعلیمی سیر و تفریح کا اہتمام کرنا مجلس مباحثہ کا چلانا، حکومت خود اختیاری کا انتظام، فرصت کے اوقات میں دستکاری کا شغل، اپنے شوق سے فنون لطیفہ میں سے کسی فن کی مشق،، (اصول تعلیم از سیدین)

جدید نظریہ تعلیم کو مد نظر رکھتے ہوئے طریق ڈلٹن، سیڈم مونٹسوری طریقہ تعلیم اور گیری اسکیم وغیرہ عالم وجود میں آئے ہیں۔ ان طریقوں میں، آزادی سعی و نمو کو امیازی حیثیت دی گئی ہے اور ان کی تکمیل کے لیے انواع و اقسام کے مشاغل اور طرح طرح کے سامان و آلات فراہم کئے جاتے ہیں جن کو وہ اپنے شوق سے عملی جامہ پہناتے ہیں۔ گیری اسکیم میں خاص طور پر سماجی معائنے (Social Survey) کے فرائض کو اپنے طور پر انجام دینے کے لئے ذمہ داری بچوں ہی کے سر ڈالی جاتی ہے معلم کی حیثیت صرف ایک دوست اور رہبر کی ہوتی ہے جو راستہ دکھاتا ہے لیکن اس راستہ پر چلنا طلبا پر چھوڑ دیتا ہے۔ سماجی معائنہ میں بچوں کو اپنے گاؤں یا شہروں کی

اجتماعی، اقتصادی تعلیمی، حفظان صحت وغیرہ حالات کا معائنہ کرنا پڑتا ہے اور ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کو مختلف سماجی خدمات کرنی پڑتی ہیں مثلاً شبینہ اسکولوں کا قائم کرنا، اسپتالوں کی دیکھ بھال، غربا کی امداد، صفائی کا کام، اخلاقی برائیوں کی اصلاح حفظان صحت پر لکچر اور جسمانی خدمات وغیرہ نیز اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات کا تفحص اور تنقیدی مطالعہ تاکہ بچے زندگی کے مسائل عصریہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں جو لوگ علم اور تہذیب کو قدیم روایات اور آثار تک محدود رکھتے ہیں اور علوم جدیدہ کو بے معنی خیال کرتے ہیں وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم علوم بھی ہمارے لئے اس واسطے ضروری ہیں کہ نئے علوم کی عمارت بغیر اس بنیاد کے تعمیر نہیں کی جا سکتی حقیقی تمدن میں جغرافی حدود کی ضرورت نہیں وہ ایک عالمگیر اور وسیع چیز ہے رٹر ندرسل کا خیال ہے کہ عالمگیر شہری بننے سے ہمہ گیر انسانی معاشرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اقوام کے نصب العین کے مطالعہ کا کافی موقع ملتا ہے اور حال کو ماضی اور استقبال کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے

تعلیم میں مسائل حاضرہ جدید تاریخ، سیاسی اور اقتصادی امور، اجتماعی معاملات اور سماجی اداروں کے ارتقاء شامل ہونا چاہیے نصاب میں ان مضامین کی عدم موجودگی سے ہر شہری کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اسکولوں میں ان معلومات کو دلچسپ اور آسان بنانے کے لیے رسائل و اخبارات کا مطالعہ، مکالمہ، مباحثہ کی ترویج، نیز فضلاء کے مقالات کا سننا بچوں کے لئے لازمی قرار دیا جائے تاکہ بچوں میں فطری شوق پیدا ہو اور وہ ہر مسئلہ پر گفتگو کرنے اور سمجھنے کی پوری کوشش کریں۔ اس کے علاوہ بچوں کو تاریخ محض پرانے واقعات، جنگ وجدل، قتل و خونریزی شاہانہ عظمت و جلال اور بھولے بسرے افسانوں کا مجموعہ سمجھ کر نہ پڑھائی جائے جیسا کہ عموماً ہمارے مدارس میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ تو عمرانی تربیت میں مدد ملے گی نہ اخلاقی تربیت میں بلکہ تاریخ کی تعلیم بحیثیت ارتقاء تمدن انسانی کے پیش کی جائے اور ماضی کا مطالعہ اس طرح کرایا جائے کہ اس سے موجودہ تمدنی اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے اور جس سے تاریخ، نظام معاشرت اور اس کے تمام پیچیدہ اور ترقی یافتہ اداروں کی تفسیر کا ذریعہ بن جائے۔ تاریخ کا فرض یہ ہے کہ وہ

اس عمل ارتقا کی توضیح کرے اور طلبا کو یہ بتائے کہ مسلسل انسانی سعی اور جد وجہد سے تمدن کی ہر شاخ
میں کس طرح ترقی ہوئی اگر طلبا اس کا مطالعہ غور وفکر سے اور صحیح نقطۂ نظر سے کریں گے تو وہ انسانی
ارتقا کی نوعیت، اس کی رفتار اور اس کے رجحانات کو پہچاننے لگیں گے وہ اپنے اجتماعی ومعاشی
فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیں گے اور اپنے حقوق سے اچھی طرح استفادہ کریں گے
.... بحیثیت مجموعی علم تاریخ انھیں یہ بتائے گا کہ جدید وقدیم تمدن کے رنگا رنگ تار و پود
کے ملنے سے کس طرح یہ جامہ تیار ہوا۔ وہ کون سے محرکات تھے جو مختلف ایجادات، اختراعات
انکشافات اور جغرافی سیاحتوں کا باعث ہوئے۔ اور ان چیزوں نے کس طرح زندگی کے نئے نئے
طریقوں کی بنیاد ڈالی

یہی حال جغرافیہ کا ہے علم جغرافیہ چند اصطلاحوں اور رسمی ناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی
معاملات اور ان کے باہمی ارتباط کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کے مطالعہ میں معاشرتی
اور انسانی پہلو مقدم رکھا جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ دونوں میں انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا
ہے۔ فرق یہ ہے کہ تاریخ تو انسان کا تعلق وقت اور زمانے سے دکھاتی ہے یعنی اس پر روشنی
ڈالتی ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اس کی زندگی اور تمدن میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ جغرافیہ
انسان اور اس کے طبیعی ماحول کے تعلق سے بحث کرتا اور یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی نشو ونما کس
حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہے بہرحال دونوں کو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے سروکار
ہے۔ جغرافیہ کی اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ وہ افراد اور جماعتوں کے باہمی ربط کو ظاہر کرتا ہے اور بتاتا
ہے کہ وہ کیسے عالم طبیعی کے واسطہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور کس طرح
اقتصادی اور مادی زندگی کی بقا اور اصلاح وترقی کے لئے لوگوں کا باہمی تعاون ضروری ہے
اور تقسیم عمل کے اصول پر زراعت، صنعت وحرفت اور مختلف پیشوں کی تنظیم لازم آتی ہے اسی کے
ساتھ جغرافیہ انسانی تخیل اور ہمدردی کا دائرہ وسیع کرتا ہے۔ اور اس طرح طالب علم کی عمرانی
تربیت میں مدد دیتا ہے۔

سائنس کی تعلیم جس کو عام طور پر محض مادی مفاد کے حصول اور صنعت و حرفت کی ترقی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا. دراصل اس زمانے میں اخلاقی و عمرانی تربیت کا جزو لازم ہوگئی ہے کیونکہ اس کی مدد سے طلبا موجودہ تمدن کو سمجھتے ہیں جس کی بنیاد بڑی حد تک سائنس اور اس کے استعمال پر ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے انھیں مقاصد کے لئے کام میں لاتا ہے قرآن حکیم نے سب سے پہلے یہ تعلیم دی تھی :-

وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ ط (۴۵:۱۱)	اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے (یعنی ان کی قوتیں اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دیدی گئی ہیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو)
ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً ط (بقرہ)	اسی نے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے بنایا
ہو الذی انزل من السماء ماء لکم منہ شراب ومنہ شجر فیہ تسیمون ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب من کل الثمرات ط (نحل)	اسی خدا نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا کچھ اس میں سے تم پیتے ہو کچھ درخت اگتے ہیں جس میں جانور چراتے ہو، اور وہی خدا تمہارے لئے کھیتی، زیتون اور چھوہارے اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے
وسخر لکم اللیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ط (۱۶: ۱۲)	اور اس نے تمہارے لیے رات، دن، چاند اور سورج کو مسخر کیا اور تارے اس کے حکم سے مسخر ہیں۔
وہو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحما طریا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونہا وتری الفلک مواخر فیہ	اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے گوشت کھاؤ اور اس سے زیور کی

ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ط

(۱۴:۱۲)

قیمتی چیزیں نکالو جو تمہارے پہننے میں کام آتی ہیں اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر میں موجیں چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں تاکہ تم خدا کے فضل کو ڈھونڈو، اور شاید کہ تم اس کا شکر کرو۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

سائنس کے مطالعہ سے ہر شہری پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ انسان نے دنیا میں جس قدر مادی ترقی کی ہے اس میں سب قوموں اور جماعتوں کا حصہ ہے اور جب تک تمام ماہرین سائنس اپنی اپنی علمی تحقیقات کے نتائج سے اپنے شرکا کار کو مطلع نہ کریں اور ان میں نہایت قریبی اشتراک عمل نہ ہو سائنس ترقی نہیں کر سکتی علاوہ ازیں سائنس نے انسان کو سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز سبق یہ سکھایا ہے کہ اب وہ خود اپنی تربیت یافتہ عقل کے ذریعہ اپنے معاملات کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہے۔ اب اس کی قسمت کا انحصار نامعلوم اور خوفناک قوتوں کی مرضی پر نہیں ہے ۔

اچھے شہری کو سائنس کا مطالعہ صحیح طریقہ پر کرنا چاہیئے تاکہ وہ معاشری زندگی کے ان شعبوں میں کامیابی کے ساتھ شریک ہو سکے جن کی بنیاد سائنس کے علم پر ہے جان ڈیوی لکھتا ہے۔

۔ نصاب تعلیم میں بھی سائنس کا کام وہی ہے جو اس نے نسل انسانی کے لئے انجام دیا ہے یعنی تجربہ کو اس کی مقامی اور عارضی پابندیوں سے آزاد کرنا اور عقلی ترقی کی ایسی راہیں کھول دینا جن میں شخصی عادات اور رجحانات کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اس طرح جب کوئی خیال اس مخصوص اور محدود دائرے سے جس میں وہ پیدا ہوا ہو نکال کر ایک مجرد تصور بنا دیا جائے اور اس کو زیادہ وسیع معنی دیدئے جائیں تو انفرادی تجربے کے نتائج سب لوگوں کے کام میں آ سکتے ہیں۔ اور انجام کار فلسفیانہ نقطہ نظر سے

سائنس عمرانی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے"

"ادب، انسانی خیالات وجذبات، انسانی آرزوؤں اور امنگوں، انسانی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ترجمان اور انسان کے قلب وروح کی واردات اور جدوجہد کا آئینہ دار ہے اس کے ذریعہ سے شہری نہ صرف مختلف قسم کی مفید معلومات حاصل کرتے ہیں بلکہ قدیم اور جدید خیالات وجذبات اور دنیا کے بہترین مفکرین کے شاہکاروں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ان کی نظر زیادہ وسیع ان کی ہمدردی زیادہ عام۔ ان کی قدرشناسی کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے اعلیٰ ترین ادب ایک شہری کو نہ صرف معاشری معاملات اور مسائل کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے، نہ صرف اپنی سحر آفرینی سے گذشتہ زمانوں اور شخصیتوں کو دوبارہ زندہ کر دکھاتا ہے بلکہ ان صفات کو جو انسانیت کا جوہر ہیں نشوونما دے کر اخلاقی تربیت میں معاون ہوتا ہے وہ ایک شہری کو براہ راست اخلاقی تلقین اور نصیحت نہیں کرتا بلکہ اپنے موضوع کو اس انداز سے پیش کرتا ہے اور واقعات اور افسانوں کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے کہ ان کا مجموعی اثر اس کے جذبات کی تہذیب کا باعث ہوتا ہے۔ عالی اور صالح ادب کی پہچان اور اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ غیر محسوس طریقہ پر ایک شہری کے بہترین خیالات اور جذبات کو ابھارے اور خود بخود اس کی سیرت میں سرایت کر جائے۔ ادب تربیت اخلاق کا ایک موثر ذریعہ ہے اور بقول ارسطو اس سے روحانی تنقیہ ہو جاتا ہے۔ زبان کی مشق کرانے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات وتجربات کے مطالعہ پر زور دیا جائے اور اس کی وساطت سے ہر شہری کو بنی نوع انسان کے بہترین خیالات واحساسات میں شرکت کا موقع ملے۔" (اصول تعلیم از خواجہ غلام السیدین)

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

علم تاریخ کی اہمیت

اس تجارتی زمانہ میں ہر چیز کو افادی اور مادی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تاریخ کو بھی بہت سے لوگوں نے اسی معیار پر جانچا اور یہ کہکر مسترد کر دیا کہ وہ غمِ روزگار کو دور نہیں کرتی ہماری معاشی دشواریوں کا حل نہیں بتلاتی اس لئے بیکار اور غیر مفید ہے۔ محمد تغلق ناکامیاب ہوا یا اکبر کامیاب ہوا۔ اس سے ہماری زندگی قطعاً متاثر نہیں ہوتی پھر ہمیں کیا غرض ہے کہ اس دفترِ پارینہ کو پڑھیں اور بلاوجہ سر کھپائیں؟

انسان کسی حادثہ کی پیداوار نہیں ہے آج جو اس کی شکل ہے جس میں نہ معلوم ارتقا کی کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات ظہور میں آئے، اور حیوانات نے ترقی کر کے انسانی جامہ پہنا اسی طرح انسانی ادارے بھی ماضی سے وابستہ ہیں اور محض دورِ حاضرہ کی چیز نہیں ہیں بالفاظِ دیگر انسان کوئی ہنگامی اور حیاتیاتی مظہر نہیں ہے اس کا ماضی سے تعلق قدیمی اور ازلی ہے اور اس طرح ہم ازمنہ گذشتہ کے وارثِ حقیقی ہیں ہماری کتنی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہم ان لوگوں کے کارناموں سے بے خبر رہیں جنھوں نے ہمیں یہ وراثت بخشی ہے۔ تاریخ اس وراثت کا محضر ہے اور تمام فوائد سے قطعِ نظر اگر تاریخ کو اسی معیار پر جانچا جائے تو اس کا نہ پڑھنا اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

ترقی کا انحصار ان شہریوں پر ہے جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے کما حقہٗ باخبر ہیں اور ان کا عقلی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔ کامیاب زندگی کے لئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ فرد اور ماحول کے تعلقات میں ہم آہنگی اور استواری نہ ہو۔ شہریت کا احساس اور قومی ذمہ داریوں کا شعور اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ تاریخ ماحولِ ماضیہ کی داستان اور اسلاف کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ اس کے بغیر ہم حالاتِ حاضرہ کو جو ماضی کے اثرات اور مستقبل کے امکانات کے باعث

کافی اُلجھے ہوئے ہیں، اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ علم تعلیم کی رو سے بھی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے
ایک بچہ اپنے اندر تاثر اور رد عمل کے بے شمار امکانات چھپائے ہوئے ہے تاریخ ان سب کو بروئے کار
لاتی ہے اور اس کی تمام ذہنی اور دماغی قوتوں کی صحیح تربیت میں امداد دیتی ہے بچہ کی بے ترقی یافتہ
شخصیت ماضی کی ترقی یافتہ شخصیتوں سے دوچار ہوتی ہے اور اس طرح اس کی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور سنورنے
میں سہولت پیدا ہوتی ہے تاریخ کے ذریعہ اس کی ہمدردیاں وسیع سے وسیع تر ہو سکتی ہیں سیاسی تعصبات
دور ہو سکتے ہیں تخیل میں صحت اور وسعت پیدا ہو سکتی ہے اور تحقیق و تلاش کا جذبہ بیدار ہو سکتا
ہے غرض وہ کامیابی کے ساتھ زندگی گذارنے کا اہل بن سکتا ہے۔

یہاں اس غلطی میں نہ مبتلا ہونا چاہئے کہ تاریخ کوئی مستقبل کی راہ متعین کرتی ہے یا ہمیں
زندگی بسر کرنے کے ضابطے اور قواعد فراہم کر دیتی ہے۔ تاریخ تو صرف ماضی کی روشنی میں
حال کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے وہ اقدام و عمل کی راہ مقرر نہیں کرتی۔ ہم چندر گپت موریہ
کے اصولوں کے ذریعہ ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے اور نہ اکبر کی پالیسی کے
ذریعہ موجودہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کر سکتے ہیں اس لئے کہ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے
اور موجودہ دنیا میں تو واقعات اتنی تیزی سے رونما اور تغیر پذیر ہوتے ہیں کہ اگلے روز اُن کی
صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔ تاریخی واقعات صرف حال کے پس منظر سے وابستہ ہیں
اور ہم اُن کی مدد سے حالاتِ موجودہ کو زیادہ ژرف نگاہی کے ساتھ دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔
اس لئے کہ حال کے گنجان درخت کی جڑیں ماضی کی تہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ اتنی دور
تک چلی گئی ہیں کہ اگر ہم منزل بہ منزل چلتے رہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ارتقائی سلسلہ عہد بربریت
سے بھی قبل شروع ہوتا ہے۔

یہ بھی کہنا غلط ہے کہ تاریخ درسیات اخلاق کا مجموعہ ہے تاریخ کے جدید نظریہ کے ماتحت
ہمیں اپنے مخصوص معیار اخلاق کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلے صادر کرنے کا حق ہے تاریخ
کے ذریعہ اخلاق کی جو کچھ تعلیم ہو وہ بالواسطہ ہو، براہ راست نہیں جس طرح آرٹ کا اخلاقی اثر

غیر محسوس ہوتا ہے، اسی طرح تاریخ کا اثر بھی ناقابلِ ادراک ہونا چاہئے اور طالب علموں کو غیر شعوری طور پر عظمتِ دیرینہ کا احساس، آئیڈیل کی برتری، دنیز بزدلی، فریب اور سفاکی کی برائی معلوم ہونا چاہیئے از منۂ گزشتہ کی خرابیوں کو اخلاق کی خاطر چھپانا نہیں چاہئے بلکہ اُن کو صحیح طور پر پیش کرنے کی سعی کرنا چاہیے تاکہ طلبا ارتقا کے اصول کو سمجھ سکیں اور اپنی آئندہ ذمہ داریوں کو بخوبی محسوس کریں۔

تاریخ کے فائدہ مند اور غیر فائدہ مند ہونے کا سوال یوں بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اُس کے ہمہ گیر اثرات، پہنائی اور وسعت کا صحیح اندازہ نہیں۔ تاریخ ایک بسیط مضمون ہے۔ ہر وہ چیز جس پر تغیر کا اصول اثر انداز ہوتا ہے وہ تاریخ کا موضوع بن سکتی ہے۔ موجودہ سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز "سکونیاتی" نہیں ہے اس لئے تاریخ پہنائے عالم اور اس کے ذرہ ذرہ کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو تاریخی موج نے سیراب نہ کیا ہو۔ فنِ تعمیر، تنقید، فلسفہ، لٹریچر، سیاسیات، ہر چیز میں تاریخ کا پرتو نظر آتا ہے۔ لٹریچر کے تاریخی اور ارتقائی پہلو کو نظر انداز کئے بغیر ہم شیکسپیر کے اوپر یہ اعتراض نہیں کر سکتے کہ اُس نے تمثیلی اصولوں سے کیوں روگردانی کی یا جرأت نے چاسوز اور عریاں جذبات نگاری سے کیوں کام لیا۔ جرأت کے زمانہ میں سوسائٹی پر جوش و سرمستی، اخلاقی فرومائیگی اور تصنع اور بناوٹ کا رنگ چڑھا ہوا تھا وہی عکس معاشرتی آئینہ یعنی شاعری میں بھی آگیا۔ اسی طرح معاشیاتی حالت اور ذہنی آزادی اخلاق پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ اور علم الاخلاق کا یہ مسئلہ بغیر تاریخ کی امداد کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ سوشلزم بھی تاریخی تعبیروں کا نتیجہ ہے اور بغیر تاریخی پس منظر کے اُس کے تمام پہلوؤں کو سمجھنا ناممکن ہے۔ غرض تاریخ نہایت وسیع مضمون ہے اور محض سیاسیاتِ ماضیہ کی داستان نہیں ہے۔ اُس نے اپنی ضیا پاشیوں سے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو روشن اور منور کیا ہے۔

روسو کہتا ہے کہ ہماری تاریخیں اُس جگہ ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے دراصل اُنہیں شروع

ہونا چاہیے۔ وہ محض لڑائیوں لغزشوں حماقتوں اور بدنصیبیوں کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں اور بعض اس
درجہ ناقص طور سے لکھی گئی ہیں کہ انھوں نے علم تاریخ سے کافی بدظنی پیدا کر دی ہے ان میں بہت سی
غیر ضروری نام ہیں یا سیاسی واقعات اور معرکہ آرائیوں کا طولانی بیان ہے جن کو کم کر کے اگر دوسرے اہم
اور تمدنی اور سماجی حالات کی جانب توجہ کی جاتی تو وہ ہمارے لئے کافی مفید ثابت ہو سکتے۔ ان ہی تاریخی
کتابوں میں دور از کار قصے، غیر معتبر سنائی باتیں، بادشاہوں کی بے جا تعریف اور اسی طرح کے دوسرے
لاطائل مسائل ہیں اور کام کی باتیں کم ہیں تاریخ کو جدید نظریہ کے ماتحت ترتیب دینے کی ضرورت ہے
ہماری تاریخ کو ایک بڑی داستان کا جزو معلوم ہونا چاہیے اس طرح کہ اس کے پڑھنے کے بعد انسانی
تہذیب کے تمام خدوخال نمایاں ہو جائیں اور ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ہمارے ملک نے
کس طرح زوال اور ترقی کی منازل طے کی ہیں مورخ کو روایات کے انتساب اور اسباب و نتائج کی
تصریحات کے سلسلہ میں ماخذوں کی چھان بین کرنا چاہیے اور حالات کے مرتب کرنے میں خصائص
ملکی، ماحول زمانہ، قرائن عقلی اور لسانیات، نفسیات، معاشیات اور عمرانیات کے انکشافات جدیدہ
سے فائدہ اٹھانا چاہیے یہ مورخانہ موشگافیاں بہت جگہ ہوئی ہیں اور یہ انھیں کا طفیل ہے کہ انھوں نے
تاریخ کو ہماری موجودہ ضرورتوں کے پورا کرنے کا اہل بنا دیا ہے۔

موجودہ سائنس نے تاریخ کے دامن کو بے حد وسیع کر دیا ہے اب وہ محض لڑائیوں اور جھگڑوں
کے بجائے انسانی عروج و ترقی کے مدارج و منازل کی سرگذشت ہے وہ ایک ایسے فلسفیانہ علم
میں تبدیل ہو گئی ہے جو ہمیں مثالوں کے ذریعہ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ان بے شمار خیالات
کی تو کوئی انتہا ہی نہیں جو تاریخ ہمارے ذہن و دماغ میں پیدا کر دی ہے لیکن وہ سب کارجہاں کی درازی
کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ ابھی تہذیب انسانی مکمل نہیں ہوئی — تاریخ کی اس سے
زیادہ اور کیا بڑائی ہوگی کہ وہ ہمیں عمل پیہم اور کوشش ناتمام کے لئے آمادہ کرتی ہے۔

(خواجہ احمد فاروقی، بی۔ اے)

مکاتیب مہدی

"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"

دورِ حاضر کے دو ادیبوں پر پوری طرح صادق آتا ہے ایک سجاد انصاری دوسرے مہدی افادی
ایک میں شانِ جلالی تھی دوسرے میں شانِ جمالی وہ اپنی آگ میں خود جل کر مر گیا ان کی لطافتِ طبع ایک
طویل بیماری کی گرانباریوں کی متحمل نہ ہو سکی۔ دونوں بہت مشہور نہیں عوام شاید ان کا نام بھی نہیں جانتے
دونوں بڑے اونچے پائے کے ادیب تھے مگر دونوں کا پیشہ کچھ اور تھا سجاد وکیل تھے۔ مہدی تحصیلدار
تحصیلداری کے کاموں اور کاغذات پٹواری کی جانچ پڑتال میں سر کھپانے والا ادبی دلچسپیوں کیلئے
بھی وقت نکال لیتا تھا کسی نے کہا ہے کہ "جو حسین شے ہے میری رشتہ دار ازلی ہے" مہدی کا بھی
یہی مقولہ تھا وہ حسن کے سچے پرستار تھے کوئی اچھی کتاب اچھی طرح چھپ کر آتی تو "عروسِ جمیل و لباس
حریر" لکھ کر خطاب کرتے ان کی کتابیں ان کی "نازنینانِ حرم" تھیں جہاں وہ اپنی فرصت کے سارے
اوقات صرف کرتے پڑھتے زیادہ لکھتے کم، اور لکھتے بھی تو زیادہ تر خط لکھتے۔ یہ خط دوست احباب کے
نام بھی ہوتے اور اخبار و رسائل کے لئے بھی۔ کچھ مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے یہ سب افاداتِ مہدی
کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکے ہیں۔ اب خطوط "مکاتیب مہدی" کے نام سے چھپے ہیں۔ تین سو صفحے
جامعہ سائز، قیمت ۱۲ر اور مہدی بیگم سے بسنت پور کے پتہ پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔

افاداتِ مہدی کہنے کو چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے منتشر سے خیالات، بکھرے ہوئے موتیوں
کے مانند، مگر باتوں باتوں میں مہدی افادی بڑے بڑے مسائل پر تنقید کا حق ادا کر دیتے ہیں کتاب
ادب و انشا کا چمن بھی ہے اور نقد و نظر کا معیار بھی مشرقی و مغربی تمدن کے ٹکڑے سے ایک ثمر پیدا ہوا
تھا جس میں دونوں کے اجزا ملے جلے تھے افسوس ہے یہ شرارہ شعلہ نہ بن سکا اور وقت سے پہلے بجھ گیا
مہدی کی بالغ نظری اور پر لطف اندازِ بیان کے بڑے بڑے قائل تھے۔ شبلی جیسا اونچا آدمی

جو ایک تنقیدی اونچا رکھتا تھا اور معاصرین میں سے کم کو خاطر میں لاتا تھا ایک جگہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ مضمون دیکھا جسے مہدی حسن کے دستخط تھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا مدیر اعتقاد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے کئی دن دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں، ''کاش شعر العجم کے مؤلف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے۔'' شروانی کو ان کے انداز بیان میں یونان کے سنگ تراشوں کی سی نزاکت اور مصوری نظر آتی ہے۔ یہ سب خصوصیات ان خطوط میں بھی پورے طور پر جلوہ گر ہیں۔

مہدی کا حلقہ احباب بہت بڑا نہ تھا مگر پھر بھی اس میں اس نسل کے کئی اچھے ادیب اور صاحب ذوق موجود تھے۔ اس مجموعہ میں شبلی، حالی، سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریابادی، پروفیسر عبد الباری، دلگیر، ہوش بلگرامی، ریاض خیرآبادی، میر ناصر علی (صلائے عام والے) اور بعض دیگر احباب کے نام خط موجود ہیں۔ شبلی کو انھوں نے بہت سے خط لکھے تھے اور بہت جی لگا کر مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے شبلی نے مہدی کے خطوط محفوظ نہ رکھے صرف تین خط اس مجموعہ میں موجود ہیں۔ سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریابادی اور پروفیسر عبد الباری کو مہدی نے بہت سے خط لکھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب محفوظ رکھے گئے۔

ان خطوط کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ادب کا ذوق فطرت کی طرف سے لے کر آیا تھا اور وہ بہت سے پیشہ ور ادیبوں اور تاروں سے بہتر لکھنے والا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے ٹھیک لکھا ہے کہ ان کا قلم باغ و بہار تھا ملا کی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ اچھے خاصے خشک فلسفیانہ مباحث میں وہ اپنے طرز بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے۔ بڑے بڑے مولویوں کی تقدس مآب بارگاہوں میں وہ ادب لطیف کی شمع روشن کرتے جس طرح لبریز ساغر سے شراب چھلک جاتی ہے، ان کی طبیعت کی رنگینی الفاظ میں بکھری رہتی ہے۔

خطوط نثر کے دوسرے اصناف سے ذرا مختلف ہیں کتاب سب کے لیے لکھی جاتی ہے خط صرف ایک کے لیے کتابوں میں جان ہوتی ہے اِدھر چھپیں اُدھر زمانے کی زد سے محفوظ ہو گئیں لیکن

خطوں کے لکھتے وقت اگر اشاعت کا خیال ہو تو ان کی ساری نزاکت و لطافت جاتی رہتی ہے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے تکلف خطوط ہوں دلی جذبات کا آئینہ ہوں ان میں تصنع کا شائبہ نہ ہو۔ لکھنے والے کے چہرے پر نقاب نہ ہو۔ مکتوب نویس کا آرٹ کیا ہے؟ صرف فطری ہونا جہاں بناوٹ آئی خط خط نہ رہا مضمون ہو گیا اچھا خط وہ نہیں ہے جس میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے جائیں بلکہ اچھا خط وہ ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور جس میں اس کی سیرت کا حقیقی عکس ہو۔ غالب اس گر سے واقف تھے جبھی تو وہ زبانِ قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں وصال کے مزے لیتے تھے۔ سوئفٹ بھی اس راز کو سمجھتا تھا اسٹیلا کے نام جو خط ہیں ان میں انگلستان کا یہ سنجیدہ مزاج نگار اور بے مثل طنز نگار بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ سوئفٹ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ان خطوط کو نظر انداز نہیں کر سکتا یہی ان کی قدر و قیمت ہے۔ اس طرح جو حضرات مہدی افادی کے خطوط کا مطالعہ کریں گے انھیں ایک دلچسپ شخصیت ملے گی جس میں ایک خاص شان ہے۔ مہدی کا ادبی مذاق نہایت پاکیزہ تھا۔ دوئم درجے کی چیز ان کی نظر ہی میں نہ آتی تھی۔ خیال میں بلا کی رعنائی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے الفاظ دلھن معلوم ہوتے تھے۔ نفاست و لطافت کو انھوں نے اپنی زندگی کا جزو بنا لیا تھا وہ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن کتابوں سے علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ سب ادبی خطوط ہیں۔ اکثر ادیبوں اور ادب کے جاننے والوں کے نام ہیں۔ ان کے جو دوست ہیں وہ بھی اس شراب کے مست معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں کم ہیں ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نہیں گذرا جس چیز کو ڈرامائی کہا جاتا ہے وہ ان کے یہاں مفقود تھی۔ پہلی بیوی زندگی کی دوپہر ڈھلتے وقت داغ مفارقت دے گئیں ان کی یاد میں لکھتے ہیں ؎

یہ سینہ میں تا زندگانی رہے گا ترا داغ دل میں نشانی رہے گا

کچھ دن کے بعد دوسری شادی کی۔ خوش قسمتی سے بیوی نہایت اچھی ملیں حسن سیرت و صورت دونوں سے مرصع۔ اولاد بھی نہایت صالح۔ غرض زندگی اچھی طرح گذر رہی تھی۔ مگر آدمی بڑے حساس تھے۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو پٹواری ہو جائیں تو گاؤں کی زمین پر پاؤں نہ رکھیں یہ بے چارے تحصیلدار

ہونے پر فخر فرماتے تھے نئی کتابوں کے نکلنے کا انتظار، نئی مطبوعات کا مطالعہ، دوستوں سے خط و کتابت یہی ان کی زندگی کے محبوب مشغلے معلوم ہوتے ہیں۔

مہدی کے خطوں میں مکاتیب کی سب سے بڑی خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے یہ ان کی زندگی کی پوری پوری تصویر ہیں۔ جو شخصیت ان کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے وہ کتابی نہیں ان کی زندگی کی تمام خصوصیات کی حامل ہے دوسری خصوصیت میں کچھ شبہ ہے یہ خطوط بے ساختہ اور بے تکلف خطوط نہیں مہدی کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہیں مہدی کو خط لکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے طرز کی خوبیوں سے واقف تھے۔ ایک صاحبہ کی زبان سے کہتے ہیں :۔

"ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں اس خط کو دیکھکر فرماتی ہیں تم سرسری خط میں جو کچھ لکھدیتے ہو بڑے مضمون میں بھی اس کی سمائی نہیں ہو سکتی کیا یہ سچ ہے ؟"

"مقیاس الشباب کی آپکو داد دینی ہوگی۔ نورجہاں کے ذکر کے ساتھ کیونکر ممکن تھا کہ اس کا خیال نہ آتا جسے مغربی شعراء سبترین عطیہ فطرت کہتے ہیں میں نے اس موقع پر دفینہ حسن کے لئے مقیاس الشباب لکھا ہے اور یہ خاص میری گھڑت ہے آپ دیکھیں گے کہ متانت میں کس قدر شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور گو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس ترکیب پر مجھے ناز ہے۔ تاہم لذت احساس سفارشی ہے کہ اچھی سوجھی آپ کی کیا رائے ہے کہیں اس سے میرے مذاق خاص کی غمازی تو نہیں ہوتی میں آپ کی نگاہ میں ذرا ثقہ رہنا چاہتا ہوں"

تیسری خصوصیت ان خطوط کی یہی ہے جو آخری جملہ میں بیان ہوئی۔ مہدی مولویوں کے سامنے رند اور رندوں کے سامنے مقطع بن کر آتے تھے کسی نوجوان شاعر نے اپنی محبوبہ کی اس طرح تعریف کی ہے ؎

کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی کبھی اس کی سنجیدگی میں تھی شوخی

یہی بات ان خطوط میں ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مباحث میں وہ ایسی ایسی باتیں لے آتے ہیں جو عریاں

معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی عریانی 'لالہ و گل' کے پردے میں رہتی ہے خوبصورت الفاظ کا پیکر دے کر وہ اپنے خیالات کو حسین بنا لیتے ہیں۔ اپنے ثقہ دوستوں کو ان کی مولویت پر چھیڑتے رہتے ہیں ذرا الفاظ ملاحظہ ہوں شبلی کو لکھتے ہیں :۔

۔مدت کی تلاش کے بعد وہ جنس لطیف ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی"

۔ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ دونوں صاحبوں کی مدرسیت میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے اور اس سے انشاپردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو"

یہی بزرگ نکاح کی شب اول میں بیاہتے انھیں لکھتے ہیں :۔

۔ جیسے بستر شکن ہونا تھا۔ وہ شاعری کی اصطلاح میں شکن بستر نکلا"۔

پھر فرماتے ہیں :۔

"وہ آتشہ ابھی کچی ہوئی ہو تو نشاط ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں

"نقاد" کا نام ابھی شاید پڑھے لکھے آدمیوں کو فراموش نہ ہوا ہو کس دھوم سے نکلا تھا اور کیسا اس کا انجام ہوا۔ اس کے متعلق ایک دوست کو لکھتے ہیں :۔

"نقاد میں مضامین کیا لکھوں کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں پہلے ایک خانگی بہم پہونچائی گئی تھی اب ڈنکے کی چوٹ ایک سرائے والی پیش کی گئی ہے یعنی زمانی کی جگہ ایک شگفتہ کلی نے لے لی۔ شاہ صاحب "تصوف" کے دلدادہ لغزش مستانہ سہارا ڈھونڈھتی ہے موقع ملا اور پھسلے"۔

مولویوں کے سامنے رندانہ وضع اور رندوں کی محفل میں سنجیدگی کے تیور یہ عجیب و غریب اجتماع آپ کو مہدی کے یہاں ملے گا اسی سے ملتی جلتی ایک اور چیز دیکھئے جو نہایت دلچسپ ہے۔ اوپر میں لکھ چکا ہوں کہ مشرقی اور مغربی تمدن کے ٹکرانے سے یہ شرارہ پیدا ہوا تھا ان کا دماغ مغربی تھا اور دل مشرقی انگریزی اصطلاحوں کے لئے اُردو مترادفات تلاش کرنے کی انھیں دھن تھی۔

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر الفاظ لاتے تھے اپنے دوستوں سے پوچھتے تھے خود کاوش کرتے تھے۔ اور انصاف یہ ہے کہ بعض اچھے اچھے مترادفات ان کے یہاں ملتے ہیں۔ مغربی طرزِ رہائش کا دلدادہ، انگریزیت کی بو میں بسا ہوا مغربی شائستگی و نفاست کا شیدا، سگرٹ کے لفظ کے لئے بھی "وسائل دود کشی" استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ Etiquette کے لئے "عوائد رسمیہ" کلاسکس کے لئے "ادب العالیہ" ہائر کریٹی سزم کے لئے تنقید عالیہ ماسٹرپیس کے لئے اختراع عالیہ" ان ڈوفلس کے لئے بے رنج لپ سروس کے لئے "وظیفۂ لب" ہنی مون کے لئے "عہد زفاف" یہ سب ان کی ایجادات ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ترکیبیں بھی انھوں نے اچھی وضع کی ہیں۔ غیر شائستگی، جنبشِ لب، حمیازۂ شباب، مقیاس الشباب، زہرۂ شب، محبت کا ثمر اولیں، ان سے حسن آفرینی، معنی آفرینی اور اختصار تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے اور تحریر چمک جاتی ہے۔

ان خطوط کی ادبی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں کہ یہ ایک صاحب طرز انشاپرداز کے لکھے ہوئے ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں ادبی مباحث، کتابوں، رسالوں، اور بہت سے ادیبوں پر اچھی خاصی تنقیدیں ملتی ہیں افادات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مہدی باتوں باتوں میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں یہی انداز بیاں بھی کارفرما ہے مولانا ماجد نے ایک مضمون فلسفۂ غالب کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے تعلق پروفیسر عبدالباری کو لکھتے ہیں:۔

"جو رنگ رکھا کہ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر نکات بعد الوقوع ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ حکیمانہ صداقتیں ان کے کلام میں موجود نہیں، سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں کیا شاعر بھی ہر جگہ اسی نکتہ سے واقف تھا۔ اس میں ذرا مجھ کو کلام ہے"

ریاض کے متعلق دلگیر کو لکھتے ہیں:۔

"مرحوم ریاض 'خدا اسے مدتوں جلائے' عروس سخن کا آشنائے ازلی ہے۔ آپ لٹریچر کی جن نزاکتوں پر مٹے ہوئے ہیں، وہ ریاض کے قلم کی آواز بازگشت ہے آج لٹریچر پر

طبع آزمائی کے لئے بہتیرے اٹھ کھڑے ہوں گے میں نے پہلے پہلے یہ تسلط ریاض الاخبار
میں دیکھا جب اس کے مفہوم سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا۔ موجودہ لٹریچر ارتقاء کی حیثیت
سے ریاض سے بے نیاز نہیں ہے وہ جس طرح نظم کا مالک ہے، آقائے نثر بھی ہے اور
یہی امتیاز فائقہ ہے جس کی بناء پر وہ انشاپردازی کا مسلم الثبوت ہیرو ہے۔ تاریخ آئندہ
بتائے گی صف اوّل میں ریاض کو کہاں جگہ دی جائے گی"

اس قسم کے سیکڑوں اشارے ہیں جو خطوط میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں کہاں تک دکھاؤں مگر یہ
خیال رہے کہ خطوط میں مدعی صرف تبلی وخیام کے پرستار کی حیثیت سے نہیں تحصیلدار کی حیثیت سے بھی
رونق فروز ہیں اس کے علاوہ شوہر، باپ اور دوست کی حیثیت سے بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے
ایک دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے:۔

"تم آؤ شوق سے آؤ، سچ مچ آؤ۔ ڈنکے کی چوٹ یعنی تو مدیر ہاتھ بھیٹے آؤ اور اپنی دیگر جوڑی
یعنی شیخ کو بھی لاؤ سمجھو یا نہ سمجھو، میری وطنیت یعنی دنیائے احباب تم ہی دونوں تک محدود
ہے۔ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں میٹھا بڑے بڑے جگمگاتے نظارے دیکھے عمر اسی میں
گذری لیکن قسم لے لو اگر آنکھیں خیرہ ہوئی ہوں۔ بجلی کی ہوش ربا روشنی میں ٹھیکہ بھی کبھی اپنے
سادہ چراغوں سے بے نیاز نہ ہوا"

ایک تحصیلدار جو اپنی بدقسمتی سے حسن مذاق بھی ہے اپنے حاکم ضلع کے استقبال کا سین کھینچتا ہے
کیمپ کی آرائشوں کے علاوہ ایک خاصہ کی چیز ملاحظہ ہو:۔

"شکار کے نہایت شوقین ہیں ایک روز معلوم ہوا صبح کے نکلے ۱۰ بجے واپسی کریں گے یعنی حیات
مدار دھوپ پر کسر نکالی جانے لگی دو لیڈیاں بھی ساتھ تھیں بجلی کی طرح ایک خیال آیا جنگل میں ٹھیک بارہ
بجے ایک چپراسی سادہ لباس میں ایک چھوٹی سی میز پر ضروری سامان آراستہ کر رہا ہے اور متوقع آمد کا
انتظار کر رہا ہے کہ دفعتاً شکاری ہاتھیوں پر نظر آئے جو باوجود کامیابی کے خستہ ہو رہے تھے
بٹھائے گئے اور سب کے سب مہمان ناخواندہ کی طرح میز پر ٹوٹ پڑے داد کی داد تھی کہ م۔۔۔۔۔

[illegible] تحصیلدار صاحب نے بھیجا ہے؟ چپراسی کا مودبانہ جواب یہ تھا کہ عرض کرنے کی اجازت نہیں ہے (زور کا قہقہہ) واپس آئے تو متبسمانہ چہروں نے ظاہر کر دیا کہ راز کی پردہ دری ہو چکی ایک ورخاتون کی جنبش لب تکریے گرا بار نظر آئی یہ میرا اصابہ تھا۔ (غلطی نہ کیجئے گا ہر تحصیلدار کا نہیں)

غرض یہ خطوط ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں جب کبھی گذشتہ پچاس سال کی ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو افادات اور مکاتیب والے مہدی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا بیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی کوششیں اور کاوشیں کیا تھیں رسالوں کی قدر و ناقدری کے کیا مدارج تھے ایک ادیب دوسرے ادیبوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا، یہ سب ان خطوط سے آئینہ ہو جائے گا۔

طرز بیان کی شوخی مہدی کو زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہوگی ممکن ہے کہ ادبیات میں جو نقطہ نظر مہدی تھا وہ نہ رہے اور اسے رہنا بھی نہ چاہئے۔ اس لئے کہ ادب میں قوت ٹھنے اور پھیلنے ہی سے آتی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ مہدی کی رائے بعض ادیبوں کے متعلق بدلنی پڑے جنہیں وہ اول درجہ کا ادیب کہتے ہیں انھیں دوئم درجے میں بھی جگہ نہ ملے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ مستی ہے جو شراب انگور کی ممنون نہیں وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی ہے جس پر بانکپن نثار ہے تحصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں رہ کر بھی یہ صاحب ذوق حسن کا پرستار اور پجاری رہا۔ شمع انجمن ہو یا چراغ خانہ جہاں روشنی تھی اسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کا پتہ نہ تھا وہاں بھی وہ اپنی حرارت عشق سے شعلۂ حسن روشن کر لیتا تھا۔ اس نے کتنے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی، کتنے بدمذاقوں کی اصلاح کی کتنے بے راہروؤں کو ٹوکا وہ اس میں کامیاب ہوا ہو یا نہیں لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی کافی ضمانت نہیں ہے؟

(آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے)

جادوگرنی

اب سورج ڈوب چکا تھا، افق پر آگ سی لگی ہوئی تھی جس کی لوئیں سارے آسمان پر چھا رہی تھیں جنگل و میدان پر خونی چادر سی پھیلی ہوئی تھی، سامنے ایک تالاب شفق کی سرخی سے آگ کا شعلہ ہو رہا تھا۔ اس کے ایک کنارے بڑے پرانے درختوں کا ایک گھنا سا جھنڈ جیسے کالے [illegible] دیو پرست [illegible] سے کھڑے ہوں۔

ہم نے سوچا یہیں تالاب کے کنارے تھوڑا سستا لیں لیکن شکاری [illegible] گیا

نہیں حضور وہاں نہیں۔ سورج ڈوبے وہاں کوئی نہیں جاتا۔ وہاں بھوتنیاں رہتی ہیں

بات سنی ان سنی ہو گئی اور ہم اسی طرف چلتے گئے شکاری نے بڑھ کے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔

شیروں کا مارنے والا شکاری خوف سے کانپ رہا تھا۔

"نہیں حضور! کیا کرتے ہیں آپ وہ وہ سنیے!"

لومڑی کی کیں کیں ہیں کیں اور گھگھو کی "ہو ہو گھو ہو" ہوا میں گونج رہی تھی۔

ہم وہیں میدان میں بیٹھ گئے۔

"حضور ان درختوں کے جھنڈ میں ایک کوٹھری ہے اس میں ایک بڑھیا رہا کرتی تھی معلوم نہیں کب سے، میں نے اپنے بچپن سے اسے ایسے ہی دیکھا۔ بال سن سفید، جس میں منوں گرد صورت الٹے توے سے زیادہ کالی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ٹیالی ٹیالی، بڑے بڑے دانت آگے کو نکلے ہوئے، انگلیاں پتلی پتلی سوکھی جیسے نیم کی سوکھی ٹہنیاں، ٹانگیں بس ہڈیاں جن پر سمٹی سمٹائی کھال چپکی ہوئی جیسے سوکھی جلانے کی لکڑیاں، دو چار چیتھڑے ادھر ادھر لپیٹے نیم برہنہ رال بہتی ہوئی، جدھر نکل جاتی بچے بھاگتے، گاؤں میں جس کو ترس آتا نوالہ روٹی دال سالن اس کے پیالے میں ڈال دیتا اور وہ واپس اپنی کوٹھری پر چلی جاتی۔ اس کے بعد وہ کیا کیا کرتی تھی کسی کو خبر

معلوم جو کچھ کھایا جاتا کھاتی، باقی کوٹھری کے سامنے ڈھیر کر دیتی دن بھر چڑیاں چنتی چگتیں باقی رات کو گیدڑ صاف کر جاتے۔

کہیں سے ایک کتا بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ ایک دم کے لیے اس سے علیحدہ نہ ہوتا جب وہ مانگنے نکلتی ساتھ ساتھ چلتا اور راہ چلتے گلیوں گلیاروں میں پڑی پڑائی روٹی بوٹی سے اپنا پیٹ بھر لیتا گانوں کے کتے اس کو دیکھتے دیکھتے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ وہ اس کو دیکھ کر کان بھی نہ ہلاتے، نہ وہ غریب کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا، جیسے وہ بھی اس بے چارے کو بھکارن کا کتا بھکاری سمجھ کر اس پر ترس کھاتے اور پڑا گرا ٹکڑا نوالہ کھا لینے دیتے۔

پھر لوگوں نے دیکھا اس کے ساتھ کوٹھری میں ایک عورت اور رہتی ہے وہ ایسی سوکھی نہ تھی لیکن اس سے زیادہ ڈراؤنی، اس کے بال کالے کالے، جھبڑے جھبڑے، اس کی آنکھیں لال لال انگارہ سی دن بھر تو اس کو نکلتے کسی نے دیکھا نہیں، سورج ڈوبے وہ نکل آتی، اس کے نکلتے ہی گھگھو بولنے لگتے، لومڑیاں چیخنے لگتیں، سیار ہوا ہوا کرنے لگتے، مینڈک غل مچانے لگتے سب سے پہلے پنڈت جی نے اسے دیکھا، پوتھی دیکھ کر بتایا یہ بڑی نشٹ لڑکی ہے جادو کرتی ہے اور چراغ جلے اپنا جادو جگانے نکلتی ہے

ایک دن بڑھیا وقت پر نہ آئی تھوڑی دیر میں وہی جھبڑی عورت کتا ساتھ میں لئے مانگنے نکلی پنڈت جی کے دروازے پر پہونچی تھی کہ ان کا بچہ سوتے سوتے پلنگ سے گر پڑا، بڑھیا کا کتا دروازے پر کھڑے کھڑے خلاف معمول زور سے ڈاڑھ مار کر رویا پنڈت جی اچھل پڑے موٹا سا ڈنڈا لے کر نکل ہی تو آئے۔

۔ نشٹ چانڈال کہیں کی میرے بچہ کو کھانے آئی ہے ؟

۔ مہاراج کرپا کرو دو نوالے !

"دو لوا لے! ہوں یہ لے! ------ لے!"

پنڈت جی نے دو ڈنڈے کس کس کے مارے وہ زمین پر گر گئی۔

مر گئی! ہائے مر گئی! ہائے

کتا مہاراج کی طرف دیکھ کر چاروں پیروں پہ اچھل پڑا اور بھودوں کی صدا لگانے لگا گویا کہہ رہا تھا مہاراج ہم لاچار بھکاریوں پر یہ ظلم کیوں! کہ پنڈت جی نے اس کے اس زور سے گھما کے ڈنڈا مارا کہ اگر ذرا کود نہ جاتا تو اس کا وہیں کام تمام ہو جاتا۔

اس واقعہ کو ابھی تین چار ہی دن ہوئے ہوں گے کہ پنڈت جی کے لڑکے کو بخار آیا مہاراج نے کیا علاج سے کیا فائدہ یہ اسی چڑیل ڈنڈھیا کی کارستانی ہے منتر پہ منتر پڑھنے لگے پاس گانوں میں بڑی دیوی ہیں ان پر بھی چڑھاوے پڑھائے لیکن بخار نہ اترا تیسرے دن ہچکی بھی آنے لگی۔ پنڈت جی نے دن دن بھر پوجا کی اور ہر تھوڑی دیر بعد پرشاد چڑھاتے رہے لیکن اب ہچکی بھی چلنے لگی، ہفتہ نہ نکلا تھا کہ بچہ جاتا رہا

گھر گھر اس کا چرچا ہو گیا، بھکارن سے لوگ اور دور دور بھاگنے لگے جب وہ گاؤں میں داخل ہوتی سب دروازے بند کر لیتے اب کوئی ایک ٹکڑا بھی دینے والا نہ تھا وہ دروازے دروازے روتی پکارتی "میری لڑکی ہے وہ وہ بری نہیں ہے ۔۔ اس نے مہاراج کے بچہ کو کچھ نہیں کیا پرماتما کی راہ مجھے کچھ دو میں بھوکوں مر رہی ہوں ۔۔ آج تین دن ہو گئے ہائے میری بچی! پنڈت جی نے ایسا مارا! ہائے اس سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا ۔۔ میں کیا کروں کس کے پاس دکھڑا لے جاؤں! بخار میں بھن رہی ہے، ٹانگیں سوجی ہوئی ہیں۔ پرماتما کی راہ میں، بھوک سے مری جا رہی ہوں ۔۔۔

وہ ہر جگہ کھڑی روتی بین کرتی لیکن پنڈت جی نے ایسا ڈرا دیا تھا کہ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ کواڑ کھولتا اور پنڈت جی نے کیا ڈرایا سب کو اپنے اپنے بچوں کے لالے پڑے ہوئے

تھے   سب نے پنڈت جی سے منت کرکے دروازوں پر لٹکائے۔ اس کے رونے منت سماجت کرنے پر کسی کو رحم آتا تو ٹکڑا نوالہ باہر پھینک دیتا لیکن باہر نہ نکلتا۔ وہ کہیں کوڑے کرکٹ پڑی سوکھی روٹیاں سڑی دال اٹھا لیتی کچھ وہیں بیٹھ کر کھا لیتی کچھ لے جاتی۔

اس طرح ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ایک روز وہ کوڑے پر آکر بیٹھی تو پھر نہ اٹھی۔ لوگ سمجھے وہ پڑی سوتی ہے لیکن اس کا کتا رہ رہ کر اسے سونگھتا اور ڈاڑھ مار کر روتا۔ سراسیمہ ادھر ادھر بھاگتا اور پھر یہی حرکت کرتا لوگوں کو شک ہوا۔ ڈرتے ڈرتے شام تک کہیں کسی نے جا کر دیکھا تو وہ مری پڑی تھی۔ اس طرح رات گذر گئی۔   برسات کی رات، دن کو دوپہر تک اس کا پیٹ پھولنے لگا۔ گاؤں والوں نے ایک ایک دو دو پیسے جمع کرکے دو چیڑوں کے ہاتھ دھرے کہ اس کو دور لے جا کر کہیں پھونک دیں۔ دو بانسوں میں باندھ کر وہ اسے اسی تالاب کے کنارے لے آئے کتا بھی پیچھے پیچھے آیا جب چتا کے شعلے بلند ہوئے ور اس کی بو میدان میں پھیلی تو کتا بھونکتے بھونکتے اسی آگ میں کود پڑا۔ کسی عورت کی چیخنے کی آوازیں آنے لگیں وہ سمجھ گئے بڑھیا بھوتنی ہو گئی اور اس کو ادھ جلا چھوڑ کر بھاگ آئے۔

دو روز تک رہ رہ کر چیخنے کی آوازیں آتی رہیں اور اب بھی شام کو سورج ڈوبے کبھی کبھی وہی آواز سنائی دیتی ہے وہی بھکارن اپنے کتے کے ساتھ تالاب کے کنارے گھومتی نظر آتی ہے، اور وہ سرخ آنکھ اور کالے بالوں والی جادوگرنی رات کی خاموشی میں الوؤں اور سیاروں کے ساتھ گھومتی جادو جگاتی پھرتی ہے"

لکاری ڈر سے کانپ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی   ایک گگھو ہمارے اوپر سے اڑتا ہوا نکل گیا   گھو ہو۔ ہو ہو، تالاب و جنگل پر اب ہیبت ناک سیاہی چھائی ہوئی تھی، آسمان پر گہرے گہرے بادل، سامنے تاریک جنگل، درخت معلوم ہوتے زمین سے آسمان تک لمبے لمبے دیو، بھوت ہمارے اوپر چڑھے چلے آرہے ہیں۔   ادھر جنگل سے اٹھتی ہوئی ہیبت ناک آوازیں   . ہمارے دل بھی کانپ گئے   . کہ اتنے

میں دو انگارہ سی آنکھیں نظر آئیں ہم پسینہ پسینہ ہوگئے۔ ہمارے ہاتھ غیر شعوری طور سے بندوقوں پر گئے شکاری چلایا۔ وہ آگئی ۔ ۔۔۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا، اور رات کی سیاہی میں ہماری نظروں سے گم ہوگیا۔ دوسرے آنکھیں چار ہوئیں چھوٹا سا کوئی جنگل جانور تھا۔ ۔۔۔ ہمارے اوسان بجا ہوئے۔

دوسرے دن ہم اسی جگہ واپس آئے۔ کوٹھری کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ کوٹھری پہ چھت کے بجائے چھپر تھا اور وہ اندر گر چکا تھا۔ ہم دیوار پر چڑھ گئے اندر پھوس و مٹی میں دبے ہوئے چند گودڑوں کے ڈھیر تھے دروازے سے ملا ایک گھڑا رکھا تھا اس کے پاس ۔۔۔ ۔۔۔ ایک بچہ ۔ اس بدبخت عورت کا ! ۔ جادوگرنی کا ! ..

(بجری احمد سید)

غزل

کچھ اور سادہ محبت کی زندگی ہوتی
نہ اور رنگ سے شرح غم و خوشی ہوتی

تجھے ہم ایسے جسے اہل دل بسر کرتے
وہ زندگی ہی محبت کی زندگی ہوتی

جہاں کے رنج و خوشی کا بھرم تو کھل جاتا
شراب عشق سلیقے سے تو نے پی ہوتی

سا شیوۂ تسلیم و بے سپاری حسن
مری خوشی بھی کہاں تک تری خوشی ہوتی

عجب یہ غنچۂ دل میں ہوا سمائی ہے
شگفتہ ہو کے بھی کم کم فسردگی ہوتی

جہاں بھی جستجوئے دوستاں ٹھہر جاتے
یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

تمہیں تو اہل ہوس امتحاں سے بھاگ چلے
یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

بس اس قدر ہے شکایت غم محبت میں
شریک تو نہ ہوا تیری دوستی ہوتی

اب اس کے بعد محبت کی زندگی معلوم
تری نگاہ نے اس دم کمی نہ کی ہوتی

سمجھ میں آئے نہ آئے معمۂ دنیا
تری نگاہ سے دنیا بدل گئی ہوتی

یہ سوچتا ہوا دنیا سے اٹھ گیا کوئی
تری نگاہ بھی ہوتی تو کیا ابھی ہوتی

کچھ انتظار کا عنوان تو بدل جاتا
جو غم کی شام ہوئی تھی تو صبح بھی ہوتی

یہ اختصار بڑی چیز ہے محبت میں
تری نگاہ مری شرح خامشی ہوتی

اگر وہ ہوتا جسے ہم نے تم نے سوچا تھا
تو حسن و عشق کی دنیا کچھ اور ہی ہوتی

ہزار غم ہو نہیں چاہتا کوئی دل سے
کہ اس کے بدلے کوئی اور زندگی ہوتی

فراق زندگی عشق کو بھی کیا کہیے
اگر یہ موت نہ ہوتی تو زندگی ہوتی

(فراق گورکھپوری)

شیخ سے خطاب

آخر تری جبیں پہ شکن در شکن ہے کیوں — اے شیخ کچھ بتا تو خلاف وطن ہے کیوں
شہکار ہیں ترے ہی روایات غزنوی — تنگ سلف یہ دغدغۂ برہمن ہے کیوں
تو تو وہ ہے کہ جس کی رسائی ہے عرش تک — آخر تجھے یہ شکوہ چرخ کہن ہے کیوں
وہ ولولہ وہ گرمیٔ منصور ہے کہاں — تجھکو یہ خوف سختیٔ دار و رسن ہے کیوں
کیا تجھ کو پاس سنت ضرب حسین نہیں — تو شکوہ سنج تلخیٔ کام و دہن ہے کیوں
نان شعیر پر ہے ترے زور کا مدار — یہ تجھ کو جہد پرورش جان و تن ہے کیوں
سراج دل میں سوزن عیسیٰ ہے نبض قلب — اپنی خودی کا آپ ہی خود راہزن ہے کیوں
اس قید میں ہے کون سا اعزاز یوسفی — مرغوب یہ غلامی اہل وطن ہے کیوں
خوابیدہ کیوں ہے سبزۂ بیگانہ کی طرح — رہ کر چمن میں غافل فکر چمن ہے کیوں
اوروں کے کہنے سننے پہ جاتا ہے کس لئے — آخر بتا تو بندۂ تخمین و ظن ہے کیوں

جامہ میں اس کے خسرو پرویز ہے چھپا
اسے سادہ لوح معتقد پیرزن ہے کیوں

(ارشاد ہندی)

باتیں

وہ سرد و سبک چاندنی راتوں کی فضائیں — خوشبوئے محبت سے مہکتی ہوئی باتیں
آتے ہوئے آغوش تمنا میں سمٹ کر — رکتے ہوئے الفاس جھجکتی ہوئی باتیں
بکھری ہوئی زلفوں سے الجھتے ہوئے اکثر — نشّے میں محبت کے بہکتی ہوئی باتیں

اللہ بھلائی نہیں جاتیں

یہ ترش و تنگ نفرت و تحقیر کا لہجہ — شعلوں کی طرح گرم بھڑکتی ہوئی باتیں
نشتر رگ احساس محبت میں چبھوتی — کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی ہوئی باتیں
چڑھتی ہوئی تیوری کبھی بدلی ہوئی نظریں — انگاروں کی مانند دہکتی ہوئی باتیں

واللہ! بھلائی نہیں جاتیں

(سعید ٹونکی)

اپنی اصلاح

محفل میلاد النبی

۱۰ جولائی کے جامعہ میں جمعہ اور عیدین کے خطبہ کو اردو زبان میں بیان کرنے کے لئے ایک میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ علمائے دین اس موقع کو جانے اس لئے کہ کارآمد بنایا جائے اپنی بے توجہی اور صرف [illegible] کھوتے چلے جاتے ہیں اور زمانے کی رفتار کا ساتھ نہ دے کر اب بھی کھو رہے ہیں۔ ایک دوسرا موقع ہے جس کو بھی اسی طرح ہمارے رہنمایان دین نے بجائے اس کے کہ کارآمد بنایا جاتا، اوہام پرستی کے قربان کر دیا ہے۔ میرا مطلب میلاد النبی کی محفلوں سے ہے جو سارے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً اور کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور منعقد ہوتی ہیں۔ منشا اس محفل کا تو یہ ہے کہ آنحضرت کی سیرت بیان کی جائے اور مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی تکمیل کے لئے اس سے سبق لئے جائیں جو علاوہ باثر ہونے کے صحیح مشعل راہ ہوں مگر حقیقت میں کیا ہوتا ہے؟ آنحضرت کے پیدائش سے لیکر آپ کی وفات تک کے حالات میں ایسی ایسی روایتیں پڑھی جاتی ہیں جو علاوہ غیر مستند ہونے کے جن اصول پر آنحضرت نے اسلام کی تبلیغ کی اس کے بالکل خلاف ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ان معجزات یا خرق عادات سے ہے جو آنحضرت کی طرف پیدائش بلکہ قبل پیدائش کے زمانے سے منسوب کی گئی ہیں۔ اس قسم کی روایتیں ان کتابوں میں جو محفل میلاد میں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں بھری پڑی ہیں۔ ان روایتوں نے عام مسلمانوں میں ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی ہے کہ وہ آنحضرت کی ذات باصفات کے ساتھ خرق عادت کا ہونا لازمی سمجھنے لگے ہیں۔ یہ اصول بالکل تبلیغ اسلام کے خلاف ہے جس کے ثبوت میں قرآن پاک کی آیات پیش کرتا ہوں۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ — کہتے ہیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں

يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ — تک تو زمین سے ہمارے لئے ایک چشمہ جاری

فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ — کرے یا تیرے لئے کھجور اور انگور کا باغ ہو

پ ۱۵

عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا
اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى
فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ
كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

اور اس میں نہریں جاری ہوں یا تو اپنے دعویٰ
کے مطابق آسمان کے ٹکڑے ہم پر گرائے یا
تو خدا اور فرشتوں گواہ سا کر لائے یا سونے کا
ایک مکان ہو یا تو آسمان کی طرف چڑھ جائے
اور تیرے چڑھ جانے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے
یہاں تک تو ہمارے لئے کتاب اتار لائے
جسے ہم پڑھیں۔ تو کہہ دے میرا رب پاک ہے۔
میں تو صرف اس کا بھیجا ہوا ایک بشر ہوں۔

اب ذرا غور سے دیکھا جائے کہ آنحضرت کے پہلے کے پیغمبروں کو تو اللہ تعالےٰ ان کی
تبلیغ کے ثبوت میں معجزہ یعنی خرق عادات کا اظہار کراتا ہے مگر حضرت محمد صلعم سے ایسی عادات کے اظہار
ہونے کا موقع نہیں دیتا صرف ایک لفظ بشر پر کفار کے مطالبہ کا جواب دے دیا یہ کیوں؟ آپ سے
پہلے جتنے پیغمبران ہوئے ہیں وہ صرف اپنی ہی قوم کے ہادی تھے اور اسی کے لئے بھیجے گئے تھے اور ان کے
معجزات ایسے ہوئے ہیں جو اس قوم کی عام ذہنیت کے باہر نہ تھے۔ اور جس کو وہ آسانی سے سمجھ سکتے
تھے اور اس سے متاثر ہو سکتے تھے۔ آنحضرت کا مشن دوسرا تھا آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی تبلیغ کا
دار و مدار ایسی چیز پر ہے جس کو نہ صرف عرب بلکہ سارا عالم اس کو قبول کرے اس میں زمانہ کی قید
نہ ہے وہ چیز کیا ہے یعنی عقل جس کو بشر سے تعلق ہے۔ قرآن پاک کو لیجئے۔ اس میں عقلی دلائل ایسے ہیں
جو آج تک سائنس و فلسفہ سے رد نہیں ہو سکے۔ بلکہ جوں جوں سائنس کی ترقی ہوتی جاتی ہے اللہ پاک
کا کلام پایہ ثبوت پر پہنچتا جاتا ہے مثلاً لیجئے۔ دنیا کے اور جتنے مذاہب ہوئے ہیں ان میں ایسی کوئی
ہدایت نہیں ہے کہ نیچر کی جتنی طاقت ہے اس کو انسان اپنے کام میں لائے بلکہ برعکس اس کے
ان مذاہب کے پیروں نے انہیں پرستش کرنا شروع کیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ صاف ہدایت
کرتا ہے کہ نیچر کی طاقتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔ هُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ

وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (النحل)

کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے اور نیز غیر مسلمانوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور اس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور مثالیں لیجئے۔ طائف میں آنحضرت پر اس قدر پتھر برسائے گئے کہ آپ لہولہان ہو گئے آپ کے ساتھیوں نے کہا ان کے لئے بد دعا کیجئے آپ نے یہ نہیں کیا بلکہ یہ کہا ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو ایمان دے یہاں معجزہ کیا تھا۔ جذبہ انتقام جو فطرتی ہے اوس کو اظہار کا مطلق موقع نہ دیا جس سے ایک عمدہ مثال پیدا ہو گئی کہ ملت و مذہب کی بہبودی کے لئے اس جذبہ کو زیر کرلیا فتح مکہ کے بعد آپ نے کل دشمنوں کو معافی عطا کی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ یہاں بھی آپ نے جذبہ انتقام سے کام نہیں لیا بلکہ ایسی فراخ دلی دکھائی جس سے کفار مکہ متاثر ہو گئے۔ کیا تاریخ میں کوئی ایسا بھی جنرل ہوا ہے جو لڑائی میں فتح یابی کے بعد ایسی نرمی سے پیش آیا ہو کیا یہ خرق عادت نہیں ہے اور بشریت کے ارتقائی مدارج کا سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں ہے؟ ایک اور مثال لیجئے غار ثور میں جب آپ تنہا حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ تھے اور دشمن ان کے درپئے تھے۔ اس وقت کے واقعہ پر ذرا غور کیجئے دو ہستیاں ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ہم صرف دو آدمی ہیں اور دشمن ہمارے پیچھے ہیں دوسرا کہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں ایک تیسرا یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے یہاں کیا چیز تھی آنحضرت کا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر اور اس کی امداد پر اس قدر مضبوط اور اٹل تھا کہ وہ ساری دنیا کی مشکلات اور مصیبتوں سے متاثر نہیں ہوتے تھے یہ ایک ایسی مثال ہے جس کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے یہی چیز تھی جس سے آپ کی تبلیغ کو کامیاب کیا اور کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا اس کو بشریت سے تعلق نہیں ہے؟

ایک اور مثال لیجئے۔ بہتوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت نے اپنی رسالت کی ابتدا کیسے کی اور تئیس سال کے اندر سارے عرب میں اسلام کو پھیلا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے اختیارات کو سمجھانے کے "کن فیکون" کہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام کو بھی کن فیکون کے ذریعہ پھیلاتا اور سارے عرب کے قلب کو اس کی طرف پھیر دیتا

اس نے ایسا نہیں کیا کیوں؟ یہ بشریت کے خلاف ہوتا جب اس کو یہ کام ایک بشر کے ذریعہ کرانا تھا تو ایسا نہیں کر سکتا تھا عقل کے خلاف یہ بات ہے پھر بھی اک قلیل مدت میں محض بے سروسامانی کے باوجود اس نے اس کو ایسا مکمل کیا جس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ کہیں یہ ہوا ہے کیا یہ معجزہ نہیں تھا عقل یہی ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں اگر پوری طرح سے مستحکم ہو اور عدا پر صبر و شکر کرے تو ہر مشکل کو سر کر سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا سبق ہے جس سے مسلمانوں کو اپنی زندگی میں فائدہ اٹھانا چاہئے آنحضرت کی سیرت میں ایسی مثالیں بہت ہیں جن سے مسلمان مستفید ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو با اثر طریقہ سے سنایا جائے اور سمجھایا جائے۔ خانگی معاملات میں آپ کی زندگی کی مثالیں اگر پیش کی جائیں تو اس سے مسلمان اپنے معاملات کو خوشگوار بنا سکتے ہیں میرا مطلب اس مختصر مضمون سے یہ ہے کہ محفل میلاد میں بجائے اس کے کہ غیر مستند کہانیاں سنائی جائیں آنحضرت کی سیرت اور اسلامی تاریخ سے مثالیں سنائی جائیں جو سامعین کے بہترین جذبات کو بیدار کریں اور جس سے وہ اپنی عملی زندگی میں مستفید ہو سکیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ایسے واعظ جو اس کام کو کر سکیں ہر جگہ نہیں ملتے عام طور سے محفل میلاد میں پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے تھوڑی اردو پڑھ لی اور اپنے لحن سے زیادہ کام لیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے خدا کے فضل و کرم سے دار المصنفین جیسے ادارے ہمارے ملک میں ہیں منجملہ اس کے ندوۃ جامعہ ہے اگر عام فہم اردو زبان میں میلاد کی کتابیں ایسے اصول پر جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے تیار کریں اور کم قیمت پر اس کی اشاعت کرائیں تو انشاء اللہ مجھے امید ہے کہ لوگ اسے پسند کریں گے اور رفتہ رفتہ آنحضرت کی سیرت سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

(عطاء الرحمٰن صاحب ایم۔ اے)

تنقید و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

[illegible]اد حیدرآباد: ناشر و مرتب جناب مرزا مظفر بیگ صاحب مالک، مکتبہ ابراہیمیہ"
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۲ ضخامت ۸۰ صفحات، طباعت و کاغذ معمولی قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

ریاست حیدرآباد ہندوستان کی ان چند مخصوص ترقی یافتہ ریاستوں میں ہے، جس نے گذشتہ ربع صدی میں تعلیمی، معاشی اور اقتصادی حیثیت سے نمایاں طور پر قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ اور یہ ترقی بیر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جامعہ عثمانیہ، کی وسیع تعلیم نے رعایا حیدرآباد کو ایک آزادی خواہ روشن خیال شہری بنا کر والی حیدرآباد کے ان گنت احسانات اور وسیع النظری کے باعث آج کے حیدرآباد کو برطانوی ہندوستان کی طرح خوش حال، تعلیم یافتہ زرخیز اور صنعت گر بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کے زمانہ میں جبکہ شاہ پرستی زمانہ قدیم کی ایک فرسودہ رسم خیال کی جاتی ہے رعایا، حیدرآباد بلا تخصیص قوم و مذہب بادشاہ پرستی کو اپنے لئے باعث فخر اور ذریعہ ترقی و عافیت خیال کرتی ہے۔

زیر نظر مجموعہ مضامین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جو نواب بہادر یار جنگ بہادر، صدر مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد اور کل ہند ریاستی مسلم لیگ کے "تاثرات" اور "کلمہ ناشر" کو چھوڑ کر مختلف حضرات کے اٹھارہ مختلف سیاسی مضامین پر مشتمل ہے جو اس سے قبل مختلف اخبارات و کتب میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب کا آغاز خسرو دکن و برار کی اس شاہی تقریر سے کیا گیا ہے جو اعلیٰ حضرت نے گذشتہ دو صد سالہ جشن خود مختاری سلطنت آصفیہ کے موقع پر کی تھی۔ ابتدا میں بادشاہ حیدرآباد و برار کی مختصر سوانح حیات پیش کرنے کے بعد حکومتی معاہدات کی روشنی میں ریاست حیدرآباد کی آئینی حیثیت پیش کی گئی ہے ساتھ ہی ساتھ وسیع رقبہ ریاست، خارجی تعلقات، خاص

ریاست حیدرآباد کا ڈاکخانہ کرنسی نوٹ، حکومت خود اختیاری اور مختلف برطانوی اعلانات و معاہدات کی روسے آزاد حیدرآباد کے تخیل کو پیش کر کے رعایا حیدرآباد کے مخصوص تاثرات کو خاتمہ کتاب پر مجلس تحاد المسلمین یادداشت کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے جو مجلس مذکور نے رعایا حیدرآباد کی جانب سے صدر اعظم حکومت سرکار عالی کی خدمت میں پیش کی تھی کتاب کے شروع میں ریاست حیدرآباد کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے جس میں خاص طور پر اس کی تشریح کی گئی ہے کہ قدیم حیدرآباد کا رقبہ کیا تھا اور اب موجودہ حیدرآباد کا کیا ہے۔

اس مجموعہ مضامین آزاد حیدرآباد کو دیکھنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ جس طرح دوسری ریاستوں میں سیاسی تحریکات کو کچل کر رعایا کو اسکے حقیقی جذبات و احساسات کے پیش کرنے سے روکا جاتا ہے اور ان کو ان ریاست میں کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اور جس کے باعث عام ریاستی رعایا موجودہ نظام سے سخت نالاں و بیزار رہتی ہے۔ اس کے برعکس رعایا حیدرآباد کو برطانوی ہند کی طرح بہت کافی شہری اور کافی آسانیاں حاصل ہیں جس کی کہ ایک آزاد شہری کو ضرورت ہوتی ہے۔

غرضکہ اس مختصر مجموعہ مضامین کو دیکھنے سے ریاست حیدرآباد کی تاریخی و آئینی حیثیت اور باشندگان حیدرآباد کا وہ نصب العین جو انھوں نے اپنے لئے متعین کیا ہے کسی نہ کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ گو بعض مضامین تشنہ اور غیر مکمل ہیں اور طرز تحریر بعض جگہ ضرورت سے زیادہ جاہ پرستانہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ مجموعہ مضامین ان لوگوں کے لئے جو حیدرآباد سے دلچسپی رکھتے ہیں معلومات حاصل کرنے کا مفید ذریعہ ہے۔ (ہادی نقشبندی)

مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میگزین (ستمبر ۱۹۳۸ء) یہ رسالہ علیگڈھ اسکول سے حسب عادت وقتاً فوقتاً نکلتا تھا لیکن اب کی سید محمد صاحب ٹونکی کی زیر نگرانی اس میں کچھ جان پڑگئی ہے اڈیٹوریل نوٹ اور شذرات بھی ہمت نیز زیادہ تر مضامین لڑکوں کے لکھے معلوم ہوتے ہیں جن میں بعض خاصے اچھے ہیں ایک خاص بات اور یہ ہے کہ نونہالوں کے بہت چھوٹے بچوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی ہے ہر جماعت کے جو قلمی رسالے نکلتے ہیں ان کے اچھے مضمون بھی اس میں شامل کر دئے گئے ہیں پھر بھی ابھی اس میں چند خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ مثلاً غزلیں اس مجموعے میں نہ ہونا چاہئے تھیں دسویں درجہ تک کا زمانہ غزلوں کا نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے نظمیں رکھنا چاہئے تھیں اور معصوم شرارت، کی قسم کے افسانوں کا تو اس میں قطعی گذر نہ ہونا چاہئے۔ نونہالوں کے سمجھے قارئین کے لئے بھی ان کی دلچسپی کی چند لوریاں یا طفلی نظمیں ہونا چاہئے تھیں ہمیں امید ہے سید محمد صاحب ان امور کا ضرور لحاظ رکھیں گے

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

ترجمانِ سرحد

۱۔ ۱۹۲۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے زیر ادارت ملک امیر عالم خاں (اعوان) ہتر آزادی (جامعی) شائع ہوتا ہے۔

۲۔ آزادی وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔

۳۔ صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاسیات کا آئینہ ہے۔

۴۔ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد کی قومی تحریکات کا ہمیشہ آرگن رہا ہے۔

سرحدی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور سے آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد، علاقہ آزاد، افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دہندوں کے لیے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے

رعایتی چندہ سالانہ للعمر

المشتہر

منیجر ترجمانِ سرحد پشاور

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ عوام کے طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبۂ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنز چار مینار حیدرآباد (دکن) سے دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صرف پانچ روپے

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانہ کی تیار شدہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانہ نے [illegible] سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیزیں [illegible] کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے، وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے مال سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی خاص عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو دو چار انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ لے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر [illegible] ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

المشتہر

مینیجر کارخانہ صغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ۔ لکھنو

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی چند نئی مطبوعات

معمار اعظم جدید یورپ کے نامور تمثیل نگار اِبسن کے مشہور ڈرامے (The Master Builder) کا ترجمہ جو عزیز احمد صاحب (استاد جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) نے نہایت سلیس زبان میں تحریر کیا ہے۔ یہ ڈرامہ پڑھنے کے لائق ہے۔ فاضل مترجم نے ابتدائی چالیس صفحوں میں مصنف کے سوانح حیات اور اس کی تصانیف پر ایک پُرمغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔ حجم ۱۷۶ صفحے قیمت بلا جلد ۱۲؍ مجلد عہ

اضافیت آئن سٹائن کی نظریہ اضافیت کی عام فہم تشریح از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ عام طور پر نظریہ اضافیت کو ایک دقیق مسئلہ سمجھا جاتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف دس بارہ ریاضی داں ایسے ہیں جو اس انقلاب انگیز نظریہ کو سمجھنے کے قابل ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بالکل مہمل نظریہ ہے۔ لائق مصنف نے یہ کتاب لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ ہر وہ ریاضی داں جو ریاضی کی اس شاخ کا باضابطہ مطالعہ کرے اس نظریہ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ طرز بیان سادہ اور عام فہم رکھا گیا اور اصطلاحات سے حتی الوسع گریز کیا گیا ہے۔ حجم تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحے قیمت ۱۲؍ مجلد عہ

اقبال انجمن کا رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۸ء نمبر "اقبال نمبر" کے نام سے شائع کیا گیا تھا یہ اس قدر مقبول ہوا کہ جلد ہی دور میں اس کی اشاعت ختم ہو گئی لیکن فرمائشیں برابر آتی رہیں اس لئے ارباب ذوق کے اصرار پر اس نمبر کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۲×۱۸ کے ۲۷۶ صفحوں پر چھپی ہے۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عـہ) غیر مجلد دو روپے (عہ)۔ رسالہ شاہکار لاہور کے مدیر کی رائے اقبال نمبر کے متعلق ملاحظہ ہو:

"آج کل کافی تعداد میں اقبال نمبر نکل چکے ہیں اور اقبال کی شاعری کے متعلق مضامین تو عام طور پر رسائل میں نکلتے رہتے ہیں لیکن رسالہ اردو کے اقبال نمبر نے تمام پر فوقیت حاصل کر لی۔ آج تک اس قسم کے سیر حاصل مضمون شائع نہیں ہوئے۔"

ملنے کا پتہ: **منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی**

بچّوں کی کتابیں

بچوں کی دلچسپی کا لوگ بہت کم خیال کرتے ہیں، اور شاید یہی ذخیرہ اردو زبان میں ایسی کتابیں بھی بہت کم ہیں جنھیں بچے دلچسپی اور شوق سے پڑھیں تاہم انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے چند کتب خاص طور پر بچوں کے لئے چھاپی ہیں۔ جن کو بچوں کی دلچسپی کا سامان کہا جا سکتا ہے

الف بے کا کھلونا۔ یہ پیاری کتاب ننھے منے بچوں کے لئے ہے کھیل ہی کھیل میں وہ حروف تہجی سے آشنا ہو جاتے ہیں ہر حرف کے لئے ایک رنگین تصویر اور ایک شعر ہے، زبر زیر اور پیش وغیرہ کا بھی خیال رکھا گیا ہے چھپائی رنگین اور بہت صاف ۲۲ عکسی تصویریں اگر آپ کے یہاں کئی بچے ہوں تو متعدد نسخے طلب فرمایئے ورنہ بچے آپس میں لڑیں جھگڑیں گے۔ قیمت صرف ۴ر

انوکھی کہانیاں۔ یہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے۔ گیارہ نصیحت آمیز کہانیاں اس میں درج ہیں۔ زبان بہت آسان۔ ممکن نہیں کہ کوئی بچہ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دے ہر کہانی کے ساتھ ایک تصویر ہے۔ خوبصورت کتاب ہے بچے اس کو دیکھتے ہی مچل جاتے ہیں سرورق پر تین رنگ کی تصویر ہے۔ قیمت ۴ر آنہ

ایجادات کی کہانی۔ یہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب اردو میں اپنی وضع کی بالکل انوکھی تصنیف ہے اور مفید معلومات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے کتابت طباعت اور سرورق بے انتہا نفیس ہے۔ اس قدر اچھے اہتمام سے بہت کم کتابیں اردو میں چھپی ہیں۔ تشریح مطالب کے لئے جا بجا بیشمار تصویریں دی گئی ہیں قیمت علاوہ محصول ڈاک ۔۔۔

ایسپ کی کہانیاں۔ ایسپ ایک مشہور حکیم گزرا ہے بقول مورخین کے بیان کے مطابق حضرت مسیح سے ۔۔۔ برس قبل پیدا ہوا تھا حکیم ایسپ انسان کی پند و نصیحت کیلئے مختلف قسم کی فرضی حکایات اور ۔۔۔ بیان کیا کرتا تھا انہیں کہانیوں کی وجہ سے دنیا میں اس کا نام اب تک زندہ ہے۔ اس مجموعہ میں ایسپ کی تین سو کہانیاں یکجا شائع کی گئی ہیں چھپائی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں جن سے

جامعہ

زیر ادارت ۔ نور الحسن ہاشمی ایم ۔ اے

جلد ۴۴ ۔ نمبر ۱۲ | بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء | چندہ سالانہ ۶ فی پرچہ ۸ آنہ

مضامین

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

اسلامی ہندی تمدن

ہندی اسلامی تمدن کا درخت تین سرزمینوں کا رہین منت ہے۔ اس کی بنیادوں نے سرزمین عرب میں جڑ پکڑی، ایران میں اس نے حسن وہم آہنگی کا جامہ پہنا اور ہندوستان میں یہ برگ وبار لایا۔ اس تمدن کی ماہیت اصلی کا اسی وقت ٹھیک طرح علم ہو سکتا ہے جب ہم اُن تمام اثرات کا مطالعہ کریں جن کا اثر اس تمدن پر اس کی تاریخی تشکیل کے ایام میں بہت زیادہ مرتب ہوا ہے قبل اس کے کہ ہم ان تاثرات اور ان کے عناصر کا تجزیہ کریں یہ ضروری ہے کہ ہم "تمدن، اسلامی اور ہندی" کی اصطلاحات کے معانی واضح کریں تاکہ بعد میں ان کے باہمی ربط سے جو مفہوم اور معانی پیدا ہوتے ہیں اس کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔

تمدن کے گہرے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی پہلو کو ہم اس وقت نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس طرح ہمارے مباحث بہت طویل ہو جائیں گے۔ ہم اس وقت فلسفہ تمدن کے اُن مختلف نظریوں کی طرف بھی اشارہ کرنا نہیں چاہتے جو افلاطون سے لے کر ابن خلدون ہیگل اور عہد جدید میں اشپنگلر نے پیش کئے ہیں تمدنی مسائل سمجھنے کے لئے ان نظریات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے، اور صرف اسی علم کی روشنی میں کسی تمدن پر ایک جامع نظر ڈالی جا سکتی ہے لیکن اس کے لئے تو تمدن کی ماہیت پر ایک مستقل بحث کی ضرورت ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے ہم اس وقت صرف تمدن کی ایک مختصر تشریح پر اکتفا کریں گے تاکہ ہم اپنے اصل عنوان یعنی "اسلامی ہندی تمدن" کی ماہیت کو واضح کر سکیں۔

تمدن جس طرح عام طور پر سب ہی جانتے ہیں مدن اور مدنیت سے نکلا ہے اس کا بڑا گہرا تعلق شہر اور شہریت سے ہے۔ تمدن کی ابتدا شہری زندگی سے ہوئی اور اس وسیع اصطلاح میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو شہری زندگی میں پائی جاتی ہیں مثلاً شہریوں کا رہنا سہنا، اس رہنے سہنے کا طریقہ رسوم ورواج معاشی وسیاسی جدوجہد اخلاق ومذہب وغیرہ یہ سب ہی کچھ تمدن میں شامل ہے اور اس سے بہت کچھ تمدن کے مفہوم کی تشریح بھی ہو جاتی ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں تمدن کے صرف خارجی پہلو پر زور دیا جا رہا ہے

جس کے داخلی اور باطنی پہلو کو اس تعریف سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ رسم و رواج طریقۂ بود و باش، معاشی اور سیاسی نظامات، اخلاقی اور مذہبی ادارے بہرحال نفس انسانی کی داخلی قوتوں کے مظاہر ہیں جنھوں نے خارجی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تمام خارجی زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا اگر یہ داخلی قوتیں نفس انسانی میں موجود نہ ہوتیں۔ افلاطون کی نظر جب وہ اپنی ریاست میں خارجی نظامات کی تشکیل کر رہا تھا اس بنیادی حقیقت سے نہ ہٹی۔ تمدن سے بہتر اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جرمن اور انگریزی زبان میں اصطلاحات موجود ہیں جرمن میں اسے (KULTUR) اور انگریزی میں اسے (CULTURE) کہتے ہیں۔ دونوں کے معنی تربیت نفس کے ہیں اور ان کا تعلق لازماً انسان کی داخلی قوتوں سے ہے۔ اردو میں اس مفہوم کو بہت کچھ تہذیب کی اصطلاح سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ نفس انسانی کو مہذب کرنا دراصل تمدن انسانی کی بنیاد ہے اس طرح مہذب کرنا کہ وہ داخلی اور خارجی طور پر ہم آہنگ نشو و نما کر سکے۔ غرضکہ ہم اس وقت جب تمدن کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں تو اس سے ہمارا مقصود صرف تمدن کا خارجی پہلو نہیں ہے جسے انگریزی میں سولزیشن (CIVILISATION) کہتے ہیں۔ بلکہ اس کا داخلی پہلو بھی ہے۔ نفس انسانی کی تربیت کے بغیر ایک صالح تمدن کا قیام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کوئی تمدن جو نفس انسانی کی پائدار چٹانوں پر استوار نہ ہو مستقل نہیں ہو سکتا۔ ان مختصر تشریحات سے اصطلاح تمدن کے معنی واضح ہو گئے یعنی ہماری اس تعریف میں نفس انسانی کی اصلاح اور اس کے خارجی اظہار کے باعث جو نظامات اور ادارے پیدا ہوتے ہیں وہ سب شامل ہیں۔ اس میں قوم کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال شریک ہیں جن کا اظہار اس کے طریق بود و باش، رسم و رواج، معاشی اور سیاسی نظامات اور اخلاقی جمالی اور مذہبی اداروں میں ہوتا ہے۔ ہر تمدن کی ایک مخصوص نفسی مرکزیت ہوتی ہے جس سے وہ وابستہ ہوتا ہے اور جس کے گرد اس کا نظام تمدن گھومتا ہے۔ اس مرکزی نقطہ کی اس تمدنی نظام شمسی میں وہی حیثیت ہوتی ہے جو آفتاب کی اپنے نظام شمسی میں ہے۔ یہ تمام نظام اس آفتاب سے روشنی اور حرارت حاصل کرتا ہے اور اس کی زندگی اور نشو و نما اسی مرکز کے نفس آتشیں کی رہین منت ہوتی ہے۔ اسلامی ہندی تمدن میں یہ مرکزی آفتاب اسلام کی روحانی اور اجتماعی تعلیمات ہیں۔

اسلامی ہندی تمدن کی بنیادیں اسلام پر استوار ہیں۔ اسلام ہی کے باعث یہ وجود میں آیا اپنے تاریخی نشوونما کے دور میں اس نے اسی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے جو اسلام کا ہے گو کہ بسا اوقات نامکمل طریقہ پر۔ اسلام اسلامی ہندی تمدن کے رگ و ریشہ میں سرایت کیا ہوا ہے بغیر اس کے وہ ایک بے جان لاشہ ہے جس کی نہ پھر کوئی روح ہو سکتی ہے اور نہ زندگی۔ اس وقت ہم ان تمام نفسی عناصر کا تجزیہ نہیں کر سکتے جو اس کی تعلیمات کے باعث اسلامی ہندی تمدن میں داخل ہو گئے ہیں بلکہ ہم صرف ان چند خاص عناصر کی طرف اشارہ کرنے ہی پر اکتفا کریں گے جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا مفہوم توحید اور اخوت انسانی کی ان اعلیٰ قدروں سے ہے جو اسلام نے مہیا کی ہیں اور جو اسلامی ہندی تمدن کے لئے بھی بمنزل بنیاد کے ہیں۔

توحید تمام نظام کائنات کو ایک وحدت میں منسلک کر دینے کا نام ہے اس کے ذریعہ کائنات کے ہر ذرہ میں ایک ربط اور نظم پیدا ہو جاتا ہے اور اسے ایک اعلیٰ ترین نصب العین ہاتھ آ جاتا ہے ایک ایسا بلند و بالا نصب العین جو زندگی اور اس کے عناصر میں معانی اور فہم پیدا کر دیتا ہے یہ انسان کو اس کی مادی حیوانی بنیادوں سے بلند کر کے اسے انسانیت اور ملوکیت کے درجہ پر لا کھڑا کر دیتی ہے وہ انسان کی نظر زندگی اور اس کی کثافتوں سے ہٹا کر اس کے روشن پہلو کی طرف موڑ دیتی ہے وہ افراد میں نا امیدی کی جگہ امید اور اقوام میں قنوطیت کی جگہ رجائیت غالب کر دیتی ہے۔ وہ انسانیت کو صرف عالم جمادات اور نباتات حتیٰ کہ حیوانات میں بھی محدود نہیں کرنا چاہتی وہ اس کی نشوونما کے لئے لاانتہا امکانات پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے امکانات جن کا تصور بھی انسان کی محدود نظر نہیں کر سکتی روح انسانی جو ذات الٰہی کا پرتو ہے ہمیشہ مادی قید و بند کی پابند نہیں رہ سکتی اس کی نظر بلند و بالا ہے اس کی پرواز ستاروں کیا آسمانوں سے بھی اونچی ہے وہ لافانی ہے وہ اپنے ارتقاء کے دوران میں ہزار قسم کے جامے پہنتی ہے اور اتارتی ہے۔ اسے رنگ و بو کا اختلاف بہت ہی مرغوب ہے لیکن ہر رنگ و بو میں وہ ایک نئی شان اور انداز سے جلوہ نما ہوتی ہے۔ ایک ازلی ابدی روحانی طاقت کے مابعد الطبیعاتی تعین کے باعث جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اور انفرادی نفوس جس کے مظاہر ہیں لازماً منطقی طور پر چند اخلاقی اور اجتماعی

نتائج مرتب ہوتے ہیں جو تعلیمات اسلامی کا دوسرا اہم پہلو ہیں توحید کے مابعد الطبیعاتی تعین کا اخلاقی پہلو اخوت انسانی ہے۔

اسلام نے اخوت انسانی کا صرف نصب العین ہی پیش نہیں کیا بلکہ اُسے مکمل طور پر موثر بنانے کے لئے ایک اجتماعی قانونی شکل بھی دیدی نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر اسلامی احکامات کے ذریعہ نہ صرف نفس انسانی کی روحانی نشوونما مدنظر ہے جو دراصل ایک صالح جمیعۃ کے قیام کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ بیش از بیش اخوت انسانیہ کی تربیت بھی مقصود ہے اس اخوت انسانیہ کے تصور کے باعث حرمت انسانی نے اسلام میں ایک بہت اہم شکل اختیار کرلی۔ انسانی ضمیر کو مقدس اور دین میں ہر قسم کے جبر و اکراہ کو ممنوع قرار دیا گیا تمام انسانیت کو ایک جسم واحد اور ہر فرد کے خلاف کسی قسم کا گناہ انسانیت کے خلاف گناہ قرار دیا گیا اخلاقیات میں اس روح نے مساوات انسانی کا جامہ اختیار کیا تو سیاست میں جمہوریت کا اور حقیقت میں ایک ایسے نظام کا جو تمام افراد انسانی کی مادی احتیاجات کا کفیل ہو مظلوم افراد اور اقوام کی حمایت، اسلام کا شروع ہی سے طرہ امتیاز رہا ہے چنانچہ تمدن اسلامی کا دھارا شروع ہی سے اخوت انسانی آزادی ضمیر، جمہوریت، نظم، اطاعت امیر، درمیانہ روی، رجائیت، علم کی آزادانہ تحقیق، حمایت مظلومیں وغیرہ جیسی اخلاقی خوبیوں سے شروع ہوا یہ دھارا جہاں جہاں پہونچا وہاں کم یا زیادہ یہ خوبیاں موجود رہیں اقوام اور ممالک کے خصائص مثبت اثر انداز ہوتے رہے یہ ہر جگہ اسی قدر بارآور ہوا جس قدر قوموں کی صلاحیت وہاں موجود تھی مثلاً عرب بالطبع آزاد تھے اس لئے عرب ایران کے مقابلہ میں جو شہنشاہیت پرست تھے زیادہ کامیاب ہوئی عرب کا سادہ اخلاق ایران میں قائم نہ رہ سکا لیکن اسلام کی علمی روح اس وقت تک مکمل طور پر برگ و بار نہ لا سکی جب تک کہ ایرانیوں نے اس کی پرداخت بغداد کے دربار عباسیہ میں نہ کی۔

ہندوستان میں، اسلامی تمدن کا ہندوستان کے قومی اور ملکی خصائص سے اثر پذیر ہونا ایک لازمی امر تھا اسلام ہندوستان میں دو راستوں سے داخل ہوا اولاً جنوبی ہند کے ذریعہ جہاں عرب تاجر بغرض تجارت آیا کرتے تھے۔ یہ تاجر خالص مذہبی روح سے معمور تھے اور ان کے اثرات اہل ہند پر بہت ہی اچھے مرتب ہوئے اسی سلسلہ میں محمد بن قاسم سندھ میں فاتحانہ طریق پر داخل ہوا مظلوم رعایا نے اس کا

استقبال کیا خالص سیاسی نقطۂ نظر سے یہ کوششیں زیادہ کامیاب تھیں لیکن خالص مذہبی نقطۂ نظر سے
یہ اثرات بہت ہی موثر اور دیرپا ثابت ہوئے اسلام کو یہاں خود عربوں نے بہت کچھ اس کی اصلی شکل و
صورت میں پیش کیا تھا یہ لوگ خود مساوات کے حامل تھے اس لیے مساوات کا سبق انھوں نے اہل ہند کو دیا
جو ذات پات کی تفریق سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس لیے سندھ کے باشندے کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے مذہبی
نقطۂ نظر سے کامیاب کوششیں ان بزرگان دین کی بھی تھیں جنھوں نے اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت
سے اہل ہند کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا اور مساوات صداقت اور نیکی کی طرف ان کی رہنمائی کی تھی یہ اسلام
اور ہندوستان کا بلاواسطہ تعلق تھا لیکن بعد میں ایک زبردست بالواسطہ تعلق بھی پیدا ہو گیا اس تعلق کے
پیدا کرنے والے ایرانی اور مغل تھے۔

اسلامی ہندی تمدن نے جہاں مذہبی اور اخلاقی عناصر عرب سے حاصل کئے وہاں ادبی اور جمالی
عناصر اس نے ایران سے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز تعمیر، مصوری، نقاشی اور موسیقی پر ایرانی
اثرات بہت زیادہ مرتب ہوئے فنون لطیفہ کے ان مظاہرات نے اپنے اصلی ہندی خصائص کو ترک
تو نہ کیا لیکن ایرانی اثرات کا اس قدر غلبہ رہا کہ شروع میں ایک ہم آہنگ توازن قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔
بالآخر ایرانی اور ہندی عناصر کی ترکیب سے ایک ہندی مسلم فن تعمیر، مصوری اور موسیقی پیدا ہو گئی فن تعمیر
میں اس کا بہترین نمونہ حسین و جمیل تاج ہے جس میں اس زمانہ کی ہم آہنگ تمدنی روح کا اظہار ہے جو چیز
اس زمانہ کی سب سے دلکش یادگار ہے وہ زبان اردو ہے اردو نے شروع شروع میں تو فارسی نظم و
نثر کے زیر سایہ نشو و نما پائی لیکن بالآخر اس نے اپنا آزادانہ رنگ اختیار کر لیا۔ اولاً نثر نے یہ آزادی حاصل کی
پھر نظم کی باری آئی لیکن اس وقت بھی ہماری شاعری فارسی سے پورے طور پر آزادی حاصل نہیں کر سکی
ہے وہ ہنوز گل و بلبل کی مصنوعی فضا میں پرورش پاتی ہے خیالات بیشک ہندی روح کے حامل ہیں
لیکن اس کا جامہ ہنوز ایرانی ہے اردو کی جدید شاعری کے ساتھ جس میں عوام کے جذبات اور احساسات
کی ترجمانی کی جا رہی ہے غالباً یہ نقص بھی دور ہو جائے گا۔ آریہ النسل ایرانیوں نے جہاں ہمارے تمدن کو
ادب، شاعری، موسیقی، مصوری اور فن تعمیر کے ذریعے حسن و جمال سے مالا مال کر دیا وہاں مغلوں نے ریاست

اور نظم کے تصور کے باعث ہماری قومی زندگی میں ارتباط پیدا کر دیا۔ انھوں نے ہندوستان میں ایک منظم،
مضبوط اور واحد زندگی کی بنیاد رکھی، اپنی سیاست دانی، تدبر، میانہ روی، رواداری، بہادری اور فراخ حوصلگی
کے باعث ایک ایسی مرکزی حکومت کی بنیاد رکھی جس نے ہندوستان کے بہت ہی متضاد عناصر کو باہم ایک
سررشتہ میں پرو دیا۔ پرامن اور عادلانہ ریاستی نظام کے سایہ میں ہندی تمدن کا درخت سرسبز ہونے لگا۔
عرب ایرانی مغل اور ہندی نژاد قوموں کی ذہنی عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تمدن وجود میں آیا۔ یہ تمدن
اپنی نشوونما کی منزلیں طے کر ہی رہا تھا کہ ہندوستان مغربی اقوام کا شکار گاہ بن گیا۔ حاکم قوم کو اس تمدن سے دلچسپی
کا کم ہی واسطہ نہ تھا۔ اس نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر ایک ایک کر کے ان سررشتوں کو کاٹنا شروع کیا جو
اس تمدن کو باہم مربوط کئے ہوئے تھے حتیٰ کہ یہ تمدن آزاد سیاسی اور اس کے اپنے نفسی سرچشموں سے
غذا نہ ملنے کے باعث سوکھ کر مرجھا گیا زندگی اور نمو کی اس میں قوتیں باقی نہ رہیں۔

سلامی ہندی تمدن پر اس کی آج کل کی زبوں حالت دیکھ کر بے جا تنقید کی جاتی ہے آج کل
کے زندہ تمدنوں کے مقابلہ میں اس کا معیار بہت پست ہے لیکن اپنی تاریخی ترقی کے دور میں وہ انسانیت
کی عظیم الشان خدمت انجام دے چکا ہے اسلام کی مذہبی روحانی قدر کا وہ ہمیشہ حامل رہا مساوات
اور جمہوریت کی اخلاقی قدور کا اجتماعی طور پر زیادہ اظہار نہ ہو سکا اس کا بہت بڑا سبب یہ تھی قومیں تھیں
جنھوں نے ہندوستان میں حکومت صرف مذہبی مقاصد کے لئے قائم نہ کی تھی بلکہ دنیاوی مقاصد کا حصول
ان کو زیادہ مطلوب تھا باوجود اس کے بھی عدل و انصاف کا تصور بعض مستثنیات کے علاوہ جماعتی زندگی پر
حاوی رہا سیاسی طور پر اس عہد میں ملک کو ایک واحد نظام ریاست میسر آیا۔ علوم و فنون میں یہ عہد عباسیہ
کے عربی تمدن کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ فنون لطیفہ میں ایران کا تاہم ان شعبوں میں بھی اس کا حصہ کچھ بہت
کم نہ تھا اسلامی ہندی تمدن نے ہندی اثرات کے باعث اس ملک میں ایک قسم کا داخلی رنگ اختیار کر لیا۔
تصوف کا ورثہ اسے بہت کچھ ایران ہی سے ملا تھا۔ اس ملک کے ماحول اور ہندی نژاد قوموں کے نفسی
خصائص کے باعث یہ رنگ یہاں اور بھی بہت گہرا ہو گیا۔ خانقاہیں عام طور پر تمام ملک میں قائم ہو گئیں۔
اور باطنی تربیت پر ظاہری اعمال سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس داخلیت پر قدرے جمالی رنگ بھی

چڑھ گیا جس کے باعث جذباتی انسانوں کے لیے اس تمدن میں بڑی کشش پیدا ہوگئی اس داخلی حالی اسلامی ہندی تمدن کی بہترین مثال امیر خسرو کی ذات میں ملتی ہے اسلام کبھی بھی ہندوستان میں ایک سخت خارجی اخلاقی نظام کی صورت نہ اختیار کر سکا جس طرح کہ اس نے عرب میں کیا تھا اور جب اہل حدیث کی تحریک نے اس کی یہاں کوشش کی تو وہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔

اسلامی ہندی تمدن پر ایک سرسری تاریخی تنقیدی نظر ڈالنے سے ہمیں اس کی ماہیت اصلی کا پتہ چل گیا ہے ہمیں ان عناصر کا بھی پتہ چل گیا ہے جن سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ وہ حضرات کس قدر سطح بین ہیں جو اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے یا جو اس کی بقا اور تحفظ کے ہر وقت بلند بانگ دعوے کرتے رہتے ہیں لیکن نہ اس کی ماہیت اصلی سے واقف ہیں اور نہ اس کے ان عناصر سے جن سے اس کی تعمیر ہوئی ہے نہ ہی ان کی زندگیوں میں اس کا اثر پایا جاتا ہے جس کے بغیر تمدن کی اصلی روح سے واقف ہونا ناممکن ہے۔ اسلامی ہندی تمدن کی وضاحت کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی عہد حاضر میں کیا قدر و قیمت ہے وہ جو ہندی مسلمانوں، ہندوستان، عالم اسلامیہ اور تمام عالم انسان کے لئے کس قدر مفید یا مضر ہے اس کی مستقبل میں کیا حیثیت ہوگی؟ عہد حاضر کی تمدنی کشمکش میں وہ کس حد تک اپنی حیثیت باقی رکھ سکتا ہے؟ دنیا کی دیگر تحریکات مثلاً مغربی وطنیت فسطائیت روسی اشتراکیت اور ہندو تحریک قومیت کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس پر ان تحریکات کا کیا ردعمل ہوگا؟ وہ کس حد تک اپنی داخلی روح اور خارجی مظاہر کے باعث ان تحریکات کو رد کرے گا یا قبول کرے گا یا وہ کوئی ایک معتدل مطابقت کا راستہ اختیار کرے گا، قطعیت سے ان سوالات کا جواب دینا بہت مشکل امر ہے تاریخ مستقبل کی آغوش میں پوشیدہ ہے ہم صرف ان سوالات کا یہاں ایک محدود جواب دینے کی کوشش کریں گے

جدید مغربی قومیت کی تحریک عہد وسطی کے کلیسا کے تشدد کے خلاف ایک بغاوت تھی اس لئے آزادی اور بغاوت کے جراثیم اس میں شروع ہی سے موجود تھے وہ مذہب اور سیاست میں مرکزیت کے خلاف ایک لامرکزیت کی تحریک تھی اس لئے نہ تو وہ کسی عالمگیر مذہب کو تسلیم کرتی تھی اور نہ ہی ایک عالمگیر ریاست کو یورپ میں اس تحریک کے باعث جہاں رومن کلیسا کے خلاف پروٹسٹنزم، کالونیزم، اور

اینگلو سیکسن چرچ وغیرہ قائم ہوگئے وہاں ہر ملک کی ایک جداگانہ حکومت بھی قائم ہوگئی قومی جذبات، ور جداگانہ
ریاستوں کے باعث ہر قوم میں ایک نئی روح دوڑ گئی اور علوم فنون، صنعت و حرفت نے بے انتہا ترقی کی
اس تحریک کا لیکن دوسرا نتیجہ بھی مرتب ہوا، بین الاقوامی کی جگہ قومی اخلاق نے لے لی یعنی قوم کے حدود
کے اندر تو کسی حد تک اخلاقی معیار کو تسلیم کیا گیا لیکن دوسری اقوام کو اپنی قومی اغراض کے لئے تباہ و برباد
کرنا نہ صرف روا خیال کیا گیا بلکہ مستحسن قرار دیا گیا اسی زمانہ میں مغرب کی زندہ اور قوی اقوام نے مشرق کی
مضمحل اور کمزور اقوام کو سیاسی اور معاشی لحاظ سے غلام بنالیا اسلامی ہندی تمدن کو مغرب کی اس ہیئت تمدنیہ
سے سخت نقصان پہونچا وہ یکایک اب ایک ایسی حکومت کا تابع فرمان ہوگیا جو اس کو آزادانہ
ترقی اور نشو و نما کا موقعہ نہیں دینا چاہتی تھی معاشی اور سیاسی نظام کی تباہی کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور تمدنی
نظام بھی منتشر ہوگیا تعلیمی شعبہ میں کچھ کوشش اس تمدن کو بچانے کی کی گئی مگر ضرب اس قدر کاری تھی
کہ خاطر خواہ نتائج مرتب نہ ہوئے ہم اس وقت بھی تمدنی تباہی کے اسی گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مغربی قومی تصور بھی دو قسم کا تھا ایک اخلاقی جسے اس کے فلسفیوں اور قومی رہنماؤں مثلاً روسو
فشتے، مینزینی وغیرہ نے پیش کیا تھا۔ اس میں قومیت کا تصور انسانیت کے خلاف نہ تھا بلکہ قوم کو انسانیت
کی خدمت کے لئے ایک زینہ قرار دیا گیا تھا۔ اس قسم کا تصور اسلامی ہندی تمدن کی بنیادی روح کے
خلاف نہ تھا جو انسانیت کے تصور کی حامل تھی لیکن اس قومیت کا ایک جارحانہ پہلو بھی تھا جو قوم کو سب سے
اعلیٰ نصب العین قرار دیتا تھا اور ہر جائز اور ناجائز طریق پر صرف اپنی ہی قوم کا فائدہ کرنا چاہتا تھا اس جارحانہ
قومیت کے تصور کے باعث انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ میں شہنشاہیت کا جذبہ پیدا ہوا اور دوسری
اقوام کو ان اقوام نے خوب ہی تباہ و برباد کیا اور یہ سب ہی کچھ اخلاق اور تہذیب و تمدن کے پھیلانے
کے بہانے سے کیا گیا اس قسم کا قومیت کا تصور ہمارے تمدن کی بنیادی روح کے خلاف ہے اور
ہم اسے بغیر اپنے تمدن کو سخت نقصان پہونچائے کبھی بھی قبول نہیں کرسکتے مغربی قومیت کے تصور
کا اثر دیگر اسلامی ممالک مثلاً ترکی ایران اور مصر پر بہت پڑا۔ اس کے باعث ان میں دوبارہ زندگی اور
قوت پیدا ہوگئی۔ مگر وہ اپنی بعض قابل قدر خصائص کھو بیٹھے۔ اس نقالی کے خلاف لیکن ان ممالک

میں بھی اب ردعمل شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد وہاں صحیح توازن قائم ہو جائے گا ہندوستان میں مغربی تمدن چونکہ شہنشاہیت کے ذریعہ پہونچا اس لئے بدقسمتی سے یہاں وہ خوشگوار نتائج بھی نہ مرتب ہوئے جو اس تمدن کا نتیجہ ہیں مثلاً جذبۂ آزادی، علوم و فنون کی آزادانہ تحقیق، ملک و قوم کی محبت وغیرہ یہاں تو صرف وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دوسروں کی غلامی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے یعنی احساس کمزوری فقدان عمل، مایوسی، کم ہمتی، نقالی، تعصب، فرقہ پروری، غلامی پر قناعت، تنگ نظری قوم فروشی جیسی مہلک اخلاقی بیماریاں اس ملک میں پیدا ہو گئیں۔ افسوس ہے کہ مسلمان بھی جو اعلیٰ اخلاقی خوبیاں رکھتے تھے جلد ہی ان تمام امراض کا شکار ہو گئے مغرب کی علمی روح مسلمانوں کے اُن اثرات کے باعث پیدا ہوئی تھی جو یورپ پر اسپین جنوبی اٹلی سسلی وغیرہ کے ذریعہ مرتب ہوئے تھے یہ علمی روح (Scientific Spirit) مسلمانوں کی روح کے عین مطابق تھی فطرت کے آزادانہ مطالعہ اور تحقیق کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسی تعلیم سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے علوم فطری میں بہت کچھ کام انجام دئے جب یورپ نے مسلمانوں ہی کے لگائے ہوئے پودے کو ایک ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا تو مسلمانوں نے اس سے اپنی لاعلمی اور کوتاہ نظری کے باعث غیریت ظاہر کی غرضکہ بہت جزوی فائدوں کے علاوہ مسلمانوں کے لئے مغربی تمدن ہندوستان میں مضرت رساں ثابت ہوا۔ وہ جاپان اور ترکی کی طرح یہاں ایک نئی زندگی نہ پیدا کر سکا مسلمانان ہند میں تھوڑی بہت نئی زندگی مغربی تمدن کے باعث پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کے خلاف ردعمل کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اسلامی ہندی تمدن مغرب کے اخلاقی تصور قومی کو جس کے مد نظر قوم کے ذریعہ انسانیت کی خدمت ہے قبول کر سکتا ہے مگر وہ اس کے جارحانہ تصور قومی کو مطلق بھی تسلیم نہیں کر سکتا جہاں تک مغرب کی آزادانہ علمی روح کا تعلق ہے دراصل وہ اور اسلامی علمی روح ایک ہی نفسی کیفیت کے مظاہر ہیں اور دونوں تاریخی لحاظ سے بھی باہم مربوط ہیں اسلامی ہندی تمدن کو مغربی تمدن کے اس عنصر کو فوراً اپنے آپ میں جونکہ وہ اس کی فطرت کے مطابق ہے جذب کر لینا چاہئے۔

جس طرح جارحانہ قومیت کو جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی شکل میں ظاہر ہوتا

سے اسلامی ہندی تمدن قبول نہیں کر سکتا اسی طرح وہ عہد جدید کی فسطائیت کی تحریک جس کے نمائندے جرمنی اور اطالیہ ہیں قبول نہیں کر سکتا۔ فسطائیت دراصل جارحانہ قومیت کی ایک سب سے زیادہ شدید شکل ہے جس میں نسل و قوم کو ایک دیوتا تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی بلا چون وچرا اطاعت ہر ریاست کے شہری پر لازم ہے۔ اس کی بنیاد نسل و خون کی برتری پر استادہ ہے جو اسلامی تصور کے خلاف ہے۔ عسکریت کا نتیجہ بھی بالآخر قتل و خونریزی اور شہنشاہیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے مناظر ہم یورپ میں دیکھ رہے ہیں۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد فسطائیت جمہوریت کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ جمہوریتیں دراصل جمہوریتیں نہ رہی تھیں بلکہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اپنی ذاتی اغراض حاصل کرنے کے لئے آلۂ کار ہو گئی تھیں۔ حکومتوں پر عوام کا کچھ بھی اثر نہ تھا اس لئے وہاں جو بھی قوانین بنتے تھے ان کا مقصد امراء کے مفاد کا ہی تحفظ تھا۔ ایسے فرسودہ نظام کے خلاف ردعمل ہونا لازمی امر تھا۔ پھر جنگ عظیم نے اطالیہ اور خصوصاً جرمن کے قومی وقار کو جو صدمہ پہنچایا اس کو یہ قومیں فراموش نہ کر سکتی تھیں۔ ان اقوام نے سرمایہ دارانہ شہنشاہی پرست اقوام سے ہٹلر اور موسیولنی کی رہنمائی میں بالآخر بدلہ لینا شروع کیا۔

ایک رہنما پر یقین اور اس کی کلی اطاعت فسطائی تعلیمات کا ایک بہت اہم جزو ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت جمہوریتیں ناکارہ ہو جائیں عوام الناس میں نہ قومی مسائل سمجھنے کا مادہ ہو اور نہ ان کے حل کرنے کے لیے وہ کوئی عملی موثر قدم اٹھا سکیں، سرمایہ دار اپنے ذاتی اغراض کے لئے عوام کو ان کی جہالت کے باعث خوب ہی لوٹیں ملک کی مختلف پارٹیاں اپنا تمام وقت بجائے ملکی مفاد کے حصول کے صرف آپس کی خانہ جنگی میں صرف کریں بلکہ بسا اوقات وہ خارجی ریشہ دوانیوں کے لئے آلۂ کار ثابت ہوں، ایسی صورت میں ملک کو جلد از جلد تباہی اور بربادی سے بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ ملک کے سب سے قابل، بہادر اور عقلمند شخص کو بشرطیکہ خوش قسمتی سے کسی ملک کو ایسا رہنما مل جائے تمام اختیارات تفویض کر دیے جائیں۔ اس طرح قومی مسائل کے حل کے لئے جلد از جلد عملی اقدام اٹھائے جا سکیں گے۔ لیکن اس کا ضرور خیال رہے کہ اس رہنما کو قوم کے سامنے جوابدہ

صرور ہونا چاہئے اور تمام ملک کی ایک بڑی اکثریت کو اسے برضا و رغبت اپنا راہ نما تسلیم کر لینا چاہئے۔
دعایت کے رہنما کا تصور اسلامی تصور ایسے بہت ملتا جلتا ہے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا تمام عمر کے لئے انتخاب کر دیا گیا وہ امت کے سامنے ضرور جواب دہ تھے مگر ہر چند برس کے بعد انتخاب کا خطرہ ان کی قومی اور ملکی پالیسی کی راہ حائل نہ تھا۔ ہمارے لئے یہ امر بہت زیادہ غور طلب ہے کہ قومی کارکردگی بڑھانے کے لئے ہم کس حد تک دوبارہ اصول امارت کو زندہ کر سکتے ہیں تاکہ قومی زندگی کا انتشار ختم ہو اور موثر عمل کے لئے ایک راستہ کھل سکے۔

روسی اشتراکیت بھی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے خلاف جنھوں نے شہنشاہی رنگ اختیار کر لیا تھا ایک ردعمل ہے اس تحریک کا محرک لیکن فسطائیت کی طرح نسل و قوم کی برتری کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ عوام الناس کی محبت ہے۔ یہ تحریک انسانیت کو اس کی موجودہ غربت اور جہالت سے نجات دلانا چاہتی ہے۔ اس کا نقطہ نظر قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے وہ دولت کے سرچشموں کو عوام کے قبضہ تما ان کی حکومت کا ذریعہ کر دینا چاہتی ہے تاکہ سرمایہ دارانہ نظام دوبارہ پیدا ہی نہ ہو سکے یہ تحریک ایک زبردست اخلاقی احساس کا نتیجہ ہے جو قوم، نسل اور ملکی تعصبات سے بالا ہو کر انسانیت کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کر دینا چاہتی ہے جہاں تک اس تحریک کے ان مندرجہ بالا ثبوتی پہلوؤں کا تعلق ہے اسلامی ہمدری تمدن کی روح اس سے کلیتاً متفق ہے۔ اسلام بھی سرمایہ دارانہ نظام کا سخت مخالف ہے وہ یہ نہیں چاہتا کہ دولت صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہو جائے اور باقی تمام رعایا مفلوک الحال ہو جائے وہ غریبوں کی کفالت اور ان کے لئے کام مہیا کرنا ریاست کے سپرد کرتا ہے۔ وہ افراد کو صرف اسی حد تک دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے جس حد تک کہ وہ اجتماعی مفاد کو نقصان نہ پہنچائے وہ اس امر کو مستحسن نظر سے نہیں دیکھتا کہ انسان اپنی مادی احتیاجات سے زیادہ اپنے پاس دولت جمع کر رکھے وہ اپنے قانون وراثت زکوٰۃ بیت المال اور دیگر ٹیکسوں کے ذریعہ ایک ایسا نظام معاشی پیدا کرتا ہے جس میں سرمایہ داری کا وجود ہی نہ ہو سکے۔ حضرت عمرؓ جو مسلمانوں کے خلیفہ تھے بیت المال سے اپنے لئے بھی صرف اسی قدر روزینہ لیتے تھے جس قدر کہ کوئی دوسرا مسلمان اس مسئلہ پر یہاں تفصیل سے بحث

کرنے کا موقع نہیں ہے (اس سلسلہ میں ناظرین "اسلام کا اقتصادی نظام" از مولانا حفظ الرحمن صاحب ملاحظہ فرمائیں۔ ناشر ندوۃ المصنفین نئی دہلی) اسلام یقیناً صرف ایک ایسے ہی نظام معاشی کی تشکیل چاہتا ہے جس میں دولت پر عوام الناس کا قبضہ ہو اور وہ اسے اپنے فائدہ کے لئے استعمال کریں اس کی عملی شکل وہ خلفائے راشدین کے عہد میں پیش کر چکا ہے۔ افسوس ہے کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں اجتماعی طور پر کبھی بھی اسلام کی اصل معاشی روح کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی باوجود اس کے بھی یہ نصب العین آنکھوں سے اوجھل نہ رہا صوفیوں کی خانقاہوں میں محدود طریقہ پر اس کو عملی جامہ پہنایا گیا بعض بعض بادشاہوں نے اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا مثلاً اورنگ زیب علیہ الرحمہ جو صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے اور نہایت سادہ زندگی گذارتے تھے۔

اسلامی نظام معاشی کا مقصد لیکن صرف سرمایہ داری اور اس کے مضر اثرات کو ختم کرنا ہے لیکن ہر قسم کی معاشی میدان میں ذاتی جدوجہد اور اُپج کا خاتمہ نہیں کر دینا چاہتا ہر قسم کی ذاتی اُپج کے ختم کر دینے سے انسان میں عمل کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام تجارت اور دیگر معاشی اعمال میں ذاتی جدوجہد کی اجازت تو دیتا ہے لیکن اس کی برابر وقت ریاست نگرانی کرتی ہے تاکہ وہ جماعت کے لئے مضر ثابت نہ ہو۔ روس میں بھی ابتداً اشتراکیت کی انتہائی شکل کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی مگر عملی اعمال انسانی فطرت کی مجبوریوں کے باعث اس میں انہیں بہت کچھ تبدیلی کرنی پڑی ہے اور ذاتی معاشی جدوجہد کے لئے مواقع دیے پڑے ہیں۔

انسانیت کے نصب العین اور غربا کی محبت میں اشتراکیت سے اسلام کی روح ہم آہنگ ہے لیکن وہ اس کے اس مادی فلسفہ کو یکسر رد کر دیتا ہے جس پر اس کی مبادیں قائم ہیں اسلام کائنات کی حقیقت مادہ کو نہیں بلکہ روح کو قرار دیتا ہے اس کے نزدیک یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ یہ بھی زندگی کی مسلسل منازل میں سے ایک منزل ہے وہ صرف اسی منزل تک انسان کی نظر محدود کر دینا نہیں چاہتا بلکہ ارتقا کی انتہائی چوٹی تک اسے لیجانا چاہتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے تمدنی ترقی اور تنزل کے آخری عوامل معاشی نہیں ہیں جس طرح کارل مارکس دعویٰ کرتا ہے بلکہ نفسی ہیں نفس انسانی میں تغیر انقلابات کا موجب ہوتا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر اس معاملہ میں خارجی پہلو کے بجائے داخلی پہلو پر زور دیتا ہے لیکن اسلام صرف داخلیت ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ داخلی انقلاب کے ذریعہ وہ ایک خارجی انقلاب بھی پیدا کرنا چاہتا ہے غرضکہ روسی اشتراکیت اور اسلامی ہندی تمدن میں جہاں تک

معاشی مسائل کا تعلق ہے بہت کچھ مطابقت ہو سکتی ہے لیکن دونوں کے نفسی عوامل، محرکات، مقاصد اور نصب العین ایک دوسرے سے کلیتاً متضاد ہیں۔ انسانیت کا نصب العین دونوں میں مشترک ہے لیکن اشتراکیت انسانیت کی معاشی ترقی یا زیادہ سے زیادہ ذہنی ترقی چاہتی ہے لیکن اسلام انسانیت کی معاشی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی اور روحانی ترقی پر بھی بیحد زور دیتا ہے بلکہ وہ انسان کی معاشی اور ذہنی ترقی صرف اس لئے چاہتا ہے کہ انسانیت اپنی اخلاقی اور روحانی ترقی کرے

مغربی تحریک قومیت کی طرح روسی اشتراکیت کا بھی مسلم نوجوانوں پر کچھ کم خراب اثر مرتب نہیں ہو رہا ہے عوام کی شدید غربت کا احساس انہیں اشتراکیت کی آغوش میں لیجا ڈالتا ہے اور وہاں جاکر وہ اپنی متاع عقل و ہوش اور دین و ایمان کھو بیٹھتے ہیں حتیٰ کہ بیجا جذبہ آزادی سے سرشار ہوکر وہ اخلاقی قیود سے بھی آزادی حاصل کر لیتے ہیں جو ہیئت اجتماعیہ کی بقا کے لئے ازبس ضروری ہیں اسلامی ہندی تمدن کو اس شدید حملے سے بچانے کی صرف ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ وہ خود قرآن اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اپنے اعلیٰ معاشی نصب العین کی عملی تفسیر پیش کرے وہ اپنے آپ کو مسلم سرمایہ داروں سے اسلامی تعلیم کے خلاف وابستہ نہ کرے ورنہ یہاں بھی اسی قسم کا ردعمل ہونا ضروری ہے جس طرح روس میں کلیسا کے خلاف ہوا تھا جس نے اپنا مفاد زار روس کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ مسلمانان ہند یہ اجتماعی معاشی نظام جو عدل و مساوات پر مبنی ہو ہندوستان میں علیحدہ قائم نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں دیگر اقوام بھی آباد ہیں لیکن وہ ہمیشہ ترقی پرور رہنما کا ساتھ دے کر اس اجتماعی نظام کے حصول میں بہت زیادہ ممد ہو سکتے ہیں۔ دراصل اسلامی ہندی تمدن کے مستقبل کا بہت کچھ انحصار اس پر ہے کہ وہ کس حد تک عوام کے جذبات، خیالات، امیدوں اور نصب العین کا ترجمان بنتا ہے امرا، روسا، شہنشاہ پرستوں اور سرمایہ داروں کے خلاف روح عصری کام کر رہی ہے اور جو بھی اپنے آپ کو ان سے وابستہ کرے گا اس کا مستقبل یقیناً تاریک ہے اسلام کی تعلیم رسول اللہ صلعم کا اسوہ حسنہ، تاریخ اسلامی کا عہد زریں یعنی خلافت راشدہ کی تاریخ اس کے بالکل خلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ اسلامی ہندی تمدن اب دوبارہ ان سرچشموں سے غریب اور مظلوم انسانیت کی محبت کا جذبہ حاصل کرے اور اس کو اسلام کی عملی روح سے متاثر ہو کر ایک اجتماعی قانونی شکل دے۔

ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی
دہرلن

(باقی آئندہ)

عربوں کا مستقبل

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
(علامہ اقبالؒ)

ذیل کا مضمون رسالہ ایشیا کے تازہ ترین نمبر سے ماخوذ ہے۔ یہ ترجمہ ہے (L. Farago) کے مضمون (The Future of The Arabs) کا ایک غیر مسلم کی زبان سے عربوں کے مستقبل کی نسبت ان امیدوں کا اظہار علامہ اقبالؒ کی دلپذیرانہ بصیرت پر سب سے بڑی گواہی ہے (مترجم)

آج سے تیس سال قبل جب میں امیر عبداللہ کے محل میں ان کا مہمان تھا امیر موصوف نے ایک ایسی بات کہی جس پر مجھے بڑا تعجب ہوا یہ بات جتنے یقین و اعتماد کے ساتھ کہی گئی تھی وقت و حالات کو دیکھتے ہوئے اتنی ہی حقیقت سے دور معلوم ہوتی تھی امیر موصوف تاریخ کے تمدنی اور شہنشاہیتی دوروں پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم تاریخ کے اس دور تک آگئے ہیں جہاں ملک گیری اور فرمانروائی کے تخت پر عربوں کا ایک بار پھر قابض و متصرف ہو جانا بالکل یقینی ہے یہ بات انھوں نے کچھ اس انداز سے کہی کہ گویا ان کے دل میں یکایک ایک انوکھے خیال نے کروٹ لی تھی لیکن ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ امیر موصوف نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ اس کے لئے ابھی سو پچاس سال کا عرصہ درکار ہے۔

چونکہ عرب شہنشاہیت کے متعلق یہ پہلا ادعا تھا جو میرے کانوں نے سنا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گویا امیر عبداللہ اس وقت نیند میں زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہی خیال میرے سامنے مختلف اوقات میں کئی جگہ دہرایا گیا بغداد کے ایک عرب وکیل تھے جنھوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی میں نے یہی بات سنی اسکندریہ کے ایک اخبار نویس نے زیادہ مدلل طور پر میرے سامنے اسی خیال کا اظہار کیا اور جدہ کے ایک افسر کے مکان پر بھی اس سے زیادہ توثیق کے ساتھ میں نے یہی بات دہرائے جاتے سنی

یہ صحیح ہے کہ ان تمام مقامات پر جو آوازیں میرے کانوں میں پڑیں ان میں یقین کی پختگی کے ساتھ

امید و آرزو کی جھلک تھی لیکن جہاں کہیں میں نے اس مسئلہ کی بابت کچھ سنا اس میں اعتماد کی روشنی صاف طور سے نظر آتی تھی۔ اس خیال کا حقیقی سبب عربوں کا یہ ایمان و یقین ہے کہ ان کی ملی زندگی کے نقوش کا یکسر معدوم ہو جانا بالکل غیر ممکن ہے شجاعت و بسالت عربوں کا قومی ورثہ ہے وہ ایک عظیم الشان تمدن کے حامل بھی رہ چکے ہیں اس لیے قدرتاً انھیں اس بات پر اصرار ہے کہ اندلس سے اخراج کے بعد بھی تاریخ میں ان کا حصہ محفوظ ہے کسی نہ کسی طرح یہ اعتقاد عربوں کے ذہن میں راسخ ہو گیا ہے کہ اگر ان کی ذہنی قوتیں بیدار ہو جائیں اور فکر و نظر کے ایوان میں وہ ایک مرتبہ پھر مسند نشین ہو جائیں تو ان کی قومی قوت کا دوبارہ زندگی حاصل کر لینا بالکل قرین قیاس ہے۔

موجودہ حالات میں جبکہ مغربی شہنشاہیت کا کریہ المنظر دیوتا اپنے پورے جلال و جبروت کے ساتھ انسانیت کو پامال کر رہا ہے اور پوری دنیا کو اپنی ملک بنانے کے لئے مصروف جہاد ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عربوں کی یہ امیدیں اور حوصلے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ رکھتے ہیں۔

اِدھر اطالیہ عربوں کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے اُدھر جرمنی اور روس توسیع مملکت پر تلے بیٹھے ہیں ایسی حالت میں عربوں کے لیے آزادانہ زندگی کا کیا مستقبل ہو سکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شہنشاہیت پسندوں کے نقطۂ نظر سے بھی عربوں کا ملک ایک بے برگ و گیاہ ریگ زار اور چند خانہ بدوش قبائل کے وطن مالوف سے کہیں زیادہ اہمیت سیاسی رکھتا ہے کیونکہ وہ صرف ایک جغرافیائی وحدت ہی نہیں بلکہ ایک روحانی مملکت ہے جس کی مذہبی اہمیت سیاسی قوت کی طرح کروڑوں میلوں خام پیداوار اور صنعتی وسائل کے پیمانہ سے نہیں ناپی جا سکتی ہے۔ جس تک مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کی معنوی حکومت قائم ہے عرب کا چھوٹا سا ملک ایک مستقبل رکھتا ہے یہ عرب صرف اس جزیرہ نما تک محدود نہیں ہے جو تین طرف بحر ہند، بحرہ احمر اور خلیج فارس سے گھرا ہوا ہے، بلکہ اس کے حدود مملکت اگر ایک طرف ہندوکش کے پہاڑوں اور شمالی ہند کے میدانوں تک پھیلے ہوئے ہیں تو دوسری جانب زنجبار سے لے کر وادی نیل بلکہ ٹینجیر کے واسطے سے جنوبی یورپ سے لگے ہوئے ہیں یہ روحانی مملکت اشتراک نسل، اشتراک زبان اور سب سے بڑھ کر ایمان و اعتقادات کی وحدت پر قائم ہے یہ اسلامی

وفاق ایک مضبوط اور ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کا مماثل تاریخ یورپ کے صفحات میں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اس میں تمام و لبنان فلسطین، سعودی عرب، یمن عمان، بحرین حضر موت مدن تینوں ممالک شرقی حبشہ، مصر لیبیا، تیونس الجیریا مراکش، افغانستان، ایران جمہوریہ روس کی بعض نیم آزاد ریاستیں اور ہندوستان میں شمالی مغربی سرحدی صوبہ پنجاب کشمیر اور سندھ تک شامل ہیں یہ مملکت عظیم تیس کروڑ مسلمانوں کا وطن ہے اس کا ایک بڑا حصہ جس میں کروڑہا نفوس آباد ہیں مغرب کی نئی ملوکیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس جاندار اور زندگی سے معمور شہنشاہیت کو جس نے اب یورپ سے سر نکالا ہے مغربی یورپ کی نیم جان جمہوریتوں کا سامنا نہیں ہوگا جن کی شاخ حیات شاداب بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مرجھا گئی عربوں کے ملک میں اس نئی شہنشاہیت کا مقابلہ ہوگا۔ اسلام کے نظام جمہوریت سے جو اخلاق و سیاست کا ایک انوکھا مجموعہ ہے اور مادیت و روحانیت کے اضداد کی ایک عجیب و غریب وحدت ہے۔

یہ تو یقینی ہے کہ عربوں کو خواہ انہیں یہ چیز کتنی ہی ناگوار ہو یورپ کے لیڈروں اور دماغوں کے سامنے چار و ناچار سر اطاعت خم ہی کر دینا ہوگا۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ اس فوجی اطاعت کے بعد بھی وہ قرآن کو لے کر اپنی لڑائی جاری رکھیں گے کیونکہ بلاشبہ قرآن مارکس کے سرمایہ اور ہٹلر کے صحیفہ "میری جدوجہد" دونوں کا جواب ہے اگر ایک طرف ہٹلر کے اصول عمل (یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے لیے دانت) کا داعی اور مبلغ ہے تو دوسری طرف مارکس کے معاشی اور عمرانی نظریات کا بھی توڑ رکھتا ہے

غرضکہ ادھر ہٹلر یورپ کو مغلوب کرنے کے لئے اٹھا ہے اور ادھر عربوں کا ملک نہضت و ارتقاء کے ایک نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوا جب برطانیہ نے ابن سعود کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا کئی ایک حیثیتوں سے ابن سعود عربوں کا ہٹلر ہے اس نے بھی ہٹلر کی طرح آہستہ آہستہ رک رک کر احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانا شروع کیا ایک ایک دشمن سے الگ الگ معاملہ نپٹایا اور اپنی تمام چالوں میں بالآخر کامیاب رہا۔

ابن سعود کی برق آسا فتوحات عربوں کی حالیہ تاریخ کو اسی طرح روشن کئے ہوئے ہیں جس طرح وہ
عربوں کے مستقبل کی ضمانت دے رہی ہیں ۱۹۱۳ء میں اس نے ترکوں کو نجد سے نکال باہر کیا ۱۹۲۱ء
میں اس نے شمار فتح کیا ۱۹۲۵ء میں حجاز کا الحاق کیا ۱۹۲۶ء میں وہ عسیر پر قابض ہو گیا جزیرہ نمائے
عرب میں اگر اب بھی بعض نیم آزاد ریاستیں باقی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعود اپنی فتوحات کو
مستحکم، وہاں سے حاصل ہونے والے منافع کو دیرپا بنانا چاہتا ہے اور اپنی سلطنت کو روز روز کی
لڑائیوں سے کمزور کرنا نہیں چاہتا ہے۔ ابن سعود کی فوجی مہمات کی روح، وہاں اس کا مکمل معاشی
اور عمرانی نظام عمل ہے یہاں بھی ہٹلر کے نظام عمل سے اس کی مشابہت نمایاں ہے خانہ بدوش
قبائل کی توطین پوری ملک کی مکمل کارکردگی میں اضافہ قدرتی وسائل کا صحیح استعمال اور تعمیرات
کا ایک خاکہ یہ ہیں اس نظام عمل کے بعض اہم اجزا ابن سعود کی وہابیت میں بھی جس میں اب تھوڑی
ری پیدا ہو گئی ہے نازیوں کے فلسفہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

لیکن ہٹلر اور ابن سعود میں ایک بہت بڑا فرق ہے یہ حسیات کا اختلاف ہے اپنی ظاہری
درشتی تحکم اور ہیجانی کیفیت کے باوجود ابن سعود کا دل انسانی ہمدردی سے معمور ہے وہ ایک صحیح
اور توانا ذہن رکھتا ہے جس میں ہٹلر کے احساس کمتری کا نام و نشان تک نہیں ہے یہ چیز ممکن ہے
کہ اس کی اعلیٰ نسبی اور خاندانی شرف و افتخار کا نتیجہ ہو یا اس کے ذہنی اور جسمانی قویٰ کی پختگی اور بالیدگی
کا اثر ہو۔ بہرحال ابن سعود بڑے دل کا آدمی ہے اور ہٹلر کی طرح اسے تیرہ باطنی سے نجات حاصل کرنے
کے لئے طرح طرح کی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے اس کی انسانیت مختلف طریقوں
سے اپنے لئے اظہار کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ جدہ میں اسے ایک قیدی کو رہا
کرتے ہوئے دیکھا جس نے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے صرف اتنی سی بات پر قیدی کو رہا کر دینے
کا حکم دیا تھا کہ جو گواہی دی گئی تھی اس سے قیدی کے گذشتہ کردار پر کوئی بری روشنی نہیں پڑتی
تھی میں نے اسے کئی بار اپنے چھوٹے بچے کو پیار کرتے ہوئے دیکھا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ
اپنی ایک مرحوم بیوی سے سچی محبت کرتا تھا۔ آج تک اس کی یاد ابن سعود کے دل سے نہیں گئی ہے

اپنی موجودہ بیویوں سے بھی وہ حسن سلوک اور لطف و محبت سے پیش آتا ہے ابن سعود اور ہٹلر کے درمیان اور بھی نمایاں اختلافات ہیں ابن سعود کی شخصیت اپنے اہل وطن پر اس طرح چھائی ہوئی ہیں ہے جیسے ہٹلر کی شخصیت جرمنی پر چھا گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعود قدیم عربی نسل کی پیداوار ہے اور موجودہ جرمنی ہٹلر کی پیداوار ہے۔ اگر ہٹلر کو فتح ہوئی تو وہ جرمنی کے مستقبل کا نوا بردار ہوگا لیکن ابن سعود عربوں کی گذشتہ تاریخ کا نمائندہ ہے۔

ابن سعود کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہے وہ اس وقت قوت و اقتدار کا مالک ہوا جب اس کی زندگی بہار ختم ہو گئی تھی۔ ابن سعود کی تمام کامیابیاں اس کی دوسری جوانی کی قوتوں سے حاصل کی ہیں ابن سعود اس وقت فرمانروائی کی مسند پر جلوہ آرا ہوا جب دوپہر کی آگ اور روشنی ڈھیمی پڑ چکی تھی جس میں عقل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں۔ جوانی کا جوش سر پر سے گذر چکا تھا ڈھلتے دن کی روشنی میں فہم و تدبر کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے اپنا راستہ صاف نظر آگیا۔ اس کے ہاتھ کا وار جتنا سخت ہوتا تھا اس کی چارہ گری اور مرہم سازی اتنی ہی موثر ہوتی تھی۔ اس کی وجہ مہمات تباہی اور موت کے زلزلے نہیں ہوتے تھے جو کچھ نقصان ہوتا تھا اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے جیسے کسی سرجن کا چاقو زخم سے مواد خارج کرتا ہے ایسے بہت سے زخم عربوں کے قومی جسم پر اب بھی موجود ہیں خصوصاً اس تیز و تند مخالفت کے زخم جو ابن سعود کے وہابی تبعین اور عام عربوں کی عیش پسند آبادی پر مسلسل عرصہ تک جاری رہی لیکن یہ زخم بھی اب مندمل ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ابن سعود نے اپنے تبعین کے مذہبی غلو اور دینی امور میں وہابیوں کی سخت مزاجی کو بہت کچھ نرم کر دیا ہے

عرب کا مستقبل سعودی دور کی اصلاحات پر تعمیر ہوگا ابن سعود کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عربی اقوام کے نیم خوابیدہ قومی شعور کے لئے ایک اخلاقی تحریک شروع کر دی۔ عربوں کے اس قومی احیاء کی بابت برٹرم ٹامس لکھتا ہے۔ "مسلمانوں کی تجدد پسندی کا ایک مذہبی پہلو بھی ہے تعلیم یافتہ حلقوں میں بیدینی اور مذہبی بیزاری کے ایک دور کے بعد اب مذہبی احیا کا وقت آیا ہے عربی النسل نوجوانوں میں اب ایسی تحریکیں پیدا ہو چلی ہیں۔ جو اس اعتقاد پر مبنی ہیں کہ کسی جماعت یا قوم کے جسد سیاسی میں

اس وقت تک صحت و توانائی پیدا نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ سیاست کی جڑیں مذہبیت کی زمین سے نہ پھوٹیں اور عالمگیر صلح و امن کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ اقوام عالم میں باہمی اخوت کا احساس رواداری اور فراخدلی کے جذبات پیدا نہ کر دے"

میں بہت سے عرب ڈاکٹروں انجینیروں، وکیلوں اور معلموں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں جو اپنے روزمرہ کے کام چھوڑ کر نماز کے لئے پانچ وقت اٹھ پڑتے ہیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وقت آنے پر وہ اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنے اور جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے میں نے دیکھا کہ قرآن کا مطالعہ اب بھی ان کا محبوب ترین شغلہ ہے حالانکہ وہ ہمارے مغربی ادب سے بخوبی واقف ہیں ان کا مذہبی جوش اور مذہبی فرائض کی پابندی ان کے لئے کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ اس مذہبی ورثہ کے تحفظ سے وہ ایک ایسی قوت کی تخلیق میں مصروف ہیں جس کے لئے موجودہ زمانہ ہری طرح سے حاجتمند ہے۔

شمال کے ان مہذب مسلمانوں کی انسانی عظمت اس بات کو گوارا نہیں کرتی ہے کہ وہ سعودی عرب کو صرف اس لئے حقیر جانیں کہ وہاں تار برقی یا اسی طرح کے دیگر لوازم تہذیب ناپید ہیں مجھے ابھی تک اس تعلیم یافتہ اور روشن خیال عرب کی تلاش ہے خواہ وہ کتنا ہی تجدد پسند ہو جو پرانی روش کے مولوی یا درویش پر ہنسے یا ان کا مذاق اڑائے کہ وہ اپنی عبا خود بنتے ہیں اور بازار جاکر اپنا جوتا خود خریدتے ہیں۔

اس طرح مکہ اور مدینہ کو اور جو بھی ان شہروں پر حکمراں ہو اس کو مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی روحانی سیادت حاصل رہتی ہے اور دوسری طرف شمال کی عرب قوموں کا مادی تسوق بھی برقرار رہتا ہے یہ چیز بجائے اس کے کہ نزاع و اختلاف کا سبب ہو عرب اقوام کے اتحاد کو اور مضبوط کر دیتی ہے۔ یورپ کی موجودہ جنگ اس اتحاد کی پہلی بار آزمائش کرے گی۔

لیکن عربوں کے مستقبل پر تاریکی کا ایک بادل بھی نظر آتا ہے۔ ابن سعود بوڑھا ہو گیا ہے اور موت کے دروازہ سے بہت قریب ہے عربوں کا دوسرا بڑا حکمراں امام یحییٰ ہے جس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہے۔ ان دونوں نے عربوں کے مستقبل کی تعمیر کے لئے بہت کچھ

کام لے ہیں اور اگر انھیں ایک زندگی اور دیدی جائے تو وہ اس تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہونچا دیںگے لیکن ان کی اولاد سے یہ امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کام کو جاری رکھے گی۔

سودی عرب اور یمن میں جانشینی کی بابت دو متوازی فتنے سر اٹھا رہے ہیں ابن سعود اور امام یحییٰ دونوں کثیر العیال ہیں۔ اس لئے ان کی جانشینی کا مسئلہ آسانی سے طے نہیں ہو سکے گا۔ ابن سعود نے پہلے ہی اس مشکل کا اندازہ کر لیا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے بیٹوں میں سے دو بڑے بیٹوں کا انتخاب کر کے ان میں سے ایک کو حجاز کا اور دوسرے کو نجد کا وائسرائے مقرر کر دیا ہے تا ان دونوں میں دوستی اور محبت کا رشتہ قائم کر دیے میں بھی اسے کامیابی ہوئی ہے۔ شاہزادہ سعود اور امیر فیصل دونوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ثانی الذکر سے مجھے معلوم ہوا کہ اس کو اپنے بھائی کی جانشینی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ شاہزادہ سعود انتظامی صلاحیت رکھنے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا مدبر اور ماحول شناس ہے شجاعت اور بہادری کے ساتھ اس کی شخصیت بھی بہت موثر ہے اور ان تمام خصوصیات کی بنا پر وہ اپنے عظیم المرتبت باپ کا حقیقی جانشین ہو سکتا ہے۔

لیکن ان بیدار مغز بھائیوں کے پیچھے آل سعود کا ایک اور بیٹا امیر محمد ہے جس کے نمایاں اوصاف اس کی ضد، قدامت پرستی اور اس کا حسد ہے راسخ العقیدہ وہابیوں پر اس کا بہت زیادہ اثر ہے عرب میں بعض رجعت پسند عناصر بھی امیر محمد کے مداح اور حامی ہیں موٹر پر بیٹھنے اور ٹیلیفون پر بات کرنے سے اجتناب اس کی بڑی اعلیٰ صفت خیال کی جاتی ہے وہ عرب کے قرون وسطیٰ کا نمائندہ ہے جس کے علائم و آثار سے عرب کو پاک کرنے میں ابن سعود زندگی بھر مصروف رہا۔

امیر محمد کی مخالفت اطالیہ کے مفید مطلب ہے۔ اطالوی ایجنٹ ہر لمحہ اس کے جلو میں رہتے ہیں اور بھائیوں کے خلاف آنے والے جھگڑے میں اس کی اعانت و نصرت کا دم بھرتے ہیں اگر جانشینی کی جنگ ایک طرف شاہزادہ سعود اور امیر فیصل اور دوسری طرف امیر محمد کی متقابل قوتوں پر چھوڑ دی جائے تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شاہزادہ سعود کی مسلح موٹریں امیر محمد کے اونٹوں کو شکست دیدیں گی۔ لیکن اگر اطالیہ امیر محمد کی حمایت پر کمر باندھ لے اور عرب میں اس کے عقب سے گھس آئے تو امیر محمد کی فتح اور عرب

کی خود مختاری کا خاتمہ یقینی ہے۔

امام یحییٰ کے تیرہ لڑکے ہیں یہ لڑکے باپ سے بہت مختلف ہیں بعض متقی پرہیزگار اور پابند شریعت ہیں بعض چالاک اور بعض جاہل ہیں دو لڑکے سیف الاسلام حسین اور سیف الاسلام قاسم تخت نشینی کے دعویدار ہیں حسین نہایت متقی اور پارسا ہے اس کے ساتھ ہی وہ ایک چالاک سیاستداں بھی ہے اور لندن پیرس، ڈکیو اور روم میں اپنے باپ کی نمائندگی کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دے چکا ہے۔ بھائیوں میں صرف ایک اس کا مدمقابل ہے یہ شاہزادہ قاسم ہے جو تلوار کا دھنی اور پرانی طرز کا فوجی لیڈر ہے اگر باپ کے مرنے کے بعد ان دونوں میں تخت نشینی پر جھگڑا ہوا تو اطالیہ یقینا، اعلت کرے گا اور ابن سعود موقع سے فائدہ اٹھا کر یمن کو اپنی سلطنت میں ضم کرلے گا

یہ فرض کرتے ہوئے کہ شاہزادہ سعود اور حسین بالآخر فتحیاب ہو گئے اور عربوں کا ملک ایک بہتر مستقبل کی طرف قدم اٹھانے لگا تو سوال یہ ہے کہ عرب شہنشاہیت کے مقاصد کیا ہونگے اس سوال کا جواب ہر عرب کے ذہن میں موجود ہے اور وہ ایک لفظ میں ظاہر کیا جاسکتا ہے یعنی اتحاد عرب معنوی حیثیت سے یہ جزیرہ نمائے عرب میں ایک نسل ایک زبان اور مذہب رکھنے والی قوموں کا اتحاد ہوگا جغرافیائی حیثیت سے یہ موجودہ ترکی کی جنوبی سرحد سے لے کر مشرق میں خلیج فارس تک پھیلی ہوئی ایک سلطنت ہوگی۔

عربی اتحاد کی تحریک ایک خالی خولی خواب نہیں ہے اگرچہ یہ بات ابن سعود کی غیرمعمولی فراست پر شاہد ہے کہ وہ اس اتحاد کے حصول کے لئے ابھی وقت اور موقع کا منتظر ہے مغربی سلطنتوں اور ان کی مشرقی مقبوضات کا انتشار عربی اتحاد کو بہت جلد ممکن العمل بنا سکتا ہے یا ان سلطنتوں کی مسلسل باہمی پیکار اور ہٹلر کی فتوحات کی غیرمستحکم حالت بھی اس تحریک کو جلد بارآور کرسکتی ہے تاریخی واقعات کی طبعی رفتار ہی بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ ابن سعود نے ایک بار مجھ سے کہا کہ جب ایک مرتبہ عربی النسل قوموں کا وفاق قائم ہو جائے گا تو عرب شہنشاہیت کی توسیعی جدوجہد کی کوئی حد و انتہا نہ رہیگی یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اس حقیقت پسند اور ریت کا حکمراں کو خواب وخیال کی دنیا میں پرواز کرتے دیکھا اس کا خیال ہے کہ اسپین پھر ایک مرتبہ عربوں کی نوآبادی ہوگی۔

اس زمانہ اوران حالات میں عرب شہنشاہیت کا تذکرہ کرنا اور اس کی کامیابی کے امکان پر بحث کرنا۔
خیال آرائی کے محل میں بیٹھکر ہوائی قلعے تیار کرنا ہوگا لیکن سچ یہ ہے کہ حالات کی رفتار اس شہنشاہیت کو بہت
جلد ایک زندہ حقیقت بنا سکتی ہے فرانس کی شکست کے بعد جنرل میکل ہارس کا لڑائی جاری رکھنے سے انکار کردینا
ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس نے شام اور لبنان کو ایک لاوارث ملک بنا دیا ہے اٹلی، ترکی اور برطانیہ تین طرف
سے موقعہ کے منتظر ہیں۔ ادھر جنرل موصوف نے شام کی آبادی سے استصواب نہیں کیا اس ہنگامہ میں شامی عرب
اپنی تیاریاں الگ کر رہے ہیں وہ جو کچھ کرینگے اس کیلئے انھیں عراق ترکی اور پوری عربی دنیا کی تائید حاصل ہوگی
حالات جیسے کچھ ہیں انھیں دیکھتے ہوئے اور فرانس کی شکستہ حالی کا لحاظ کرتے ہوئے شام کی آزادی ناممکنات میں نہیں ہے
یہ آزادی، اتحاد عرب کا ہراول ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی دنیا شامی عربوں سے متوقع ہے کہ وہ اس راہ میں
پہلا قدم اٹھائیں گے کیونکہ شامی عرب سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر ہیں شام کی
حقیقی آزادی سے عراق پر برطانیہ کی گرفت ڈھیلی ہوجائیگی اور اعراب فلسطین خاموش نہیں بیٹھیں گے طوعاً وکرہاً
برطانیہ کو ان کا حق دینا ہی ہوگا خصوصاً جبکہ وہ دوسری طرف مصروف جنگ ہوگا یہ ہیں امکانات جو موجودہ جنگ سے پیدا
ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ابن سعود کا خیال ہے کہ ابھی اتحاد عرب کیلئے پچاس سال اور درکار ہیں۔ ابن سعود
نے اپنے ایک دوست کو ایک بار خط میں لکھا خارجی دباؤ سے آزادی حاصل کرلینا ہی حصول مدعا کے لئے
کافی نہ ہوگا ہمیں پہلے خود اپنے اوپر فتح حاصل کرنی ہوگی۔
یہ فتح خاموشی کے ساتھ جاری ہے برٹرم ٹامس لکھتا ہے۔ اس طرح تقدیر کا پہیہ پورا چکر کاٹ چکا ہے
ایک ہزار برس قبل عرب لوگ یورپ کو تہذیب کا درس دے رہے تھے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے عرب
یورپ سے تہذیب کا درس حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں ٹامس برٹرم نے جس پہیہ کا اشارہ کیا ہے وہ ایک اور
چکر کاٹ سکتا ہے عربوں کی روح امکانات سے لبریز ہے عربوں کی آخری فتح میں ان کی دو صفات فیصلہ کن
ہوں گی جو ہماری نسائی تہذیب میں ناپید ہیں یعنی ان کی سچی شجاعت اور ان کی حقیقی فراخدلی ممکن ہے یہ صفات
عربی اقوام کو ایک بار پھر زمیں کا وارث بنا دیں اور شجاعت و فراخدلی جو فی زمانہ مردہ ہوچکی ہے انسانوں
کے سینوں میں زندہ اور مجسم ہو جائے۔

مترجمہ محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

"اخلاق الرحمن صاحب قدوائی نے ایک طویل مقالہ "اردو ادب میں تنقید نگاری اور مولانا عبدالحق" کے عنوان سے ترتیب دیا تھا یہ مضمون اسی طویل مقالے کا دوسرا جزو ہے" (مدیر)

مولانا عبدالحق جس مستعدی، انہماک اور خلوص سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اس کی مثال ہندوستان میں مشکل سے ملے گی یہ واقعہ ہے کہ مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے۔ اردو کی خدمت کا جذبہ ان کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گیا ہے کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اسی کی خدمت کے لئے زندہ ہیں اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ورنہ اس پیری کے زمانے میں جبکہ لوگ صرف عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں کوئی وجہ نہ تھی وہ سرتاپا جوش، اور قوت عمل کا مجسمہ ہوتے سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اسی طرح ان کو اپنے اس معشوق مجازی (اردو) سے بھی محبت بڑھتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ان کی علمی و عملی سرگرمیوں میں بھی روزافزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے مولانا اگر ایک طرف زبان و ادب میں اصلاح اور اس کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے اور اپنی تنقیدی و تحقیقی تحریروں کے اس کی خدمت کر رہے ہیں تو دوسری طرف مخالفین اردو سے بھی نبرد آزما ہیں جو اردو کی جگہ ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے ہیں جہاں اردو کی بقاو تحفظ کے لئے مخالفین کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں وہاں اردو کے تمام خدمت گاروں کی فوج منظم کرنے کے لئے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے چپہ چپہ کی خاک چھان رہے ہیں اور اپنی مسلسل اور انتھک کوششوں سے تمام ملک کو اردو زبان کے مسئلہ میں متحد اور ہم آواز کرنے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ ان کی تگ و دو اور سرگرمی کو دیکھکر سروجنی نائیڈو نے کہا تھا۔

"مولوی عبدالحق کی کوشش ہے کہ تمام دنیا کی زبان اردو ہو جائے" -

بظاہر یہ مبالغہ ہے لیکن ہندوستان کی حد تک اس میں حقیقت کی جھلک ضرور موجود ہے اور شاید اسی لئے یہ مشہور قول ہے کہ:- اردو اور عبدالحق مترادف الفاظ ہیں۔

جہاں ابعد و زبان و ادب کی ترقی کے لئے مولانا کے یہ علمی و عملی کارنامے ہماری تاریخ ادب میں غیر فانی قدر و منزلت کے مستحق ہیں وہاں مولانا کی وہ ادبی خدمات بھی جو انھوں نے اس کے معیار ادب کو بلند کرنے اور اسے زمانے کی دستبرد سے بچانے کے لئے انجام دیں ہمیشہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔

مولانا عبدالحق نے اقلیم تنقید نگاری میں اس لئے قدم نہیں رکھا تھا کہ وہ ایک دن اس سلطنت کے بادشاہ ہوں گے بلکہ ان کی دور بیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس وقت اردو زبان کو سب سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے حالی و شبلی نے جس کی داغ بیل ڈالی تھی اسے تکمیل تک پہونچانے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس بار گراں اور مشکل ترین فرض کو اپنے ذمہ لیا مولانا کی حساس طبیعت نے جب محسوس کیا کہ ہماری زبان و ادب کے موجودہ دور ارتقا میں گرد و پیش کے رجحانات اور زبان کے تخلیقی امکانات سے متاثر ہو کر اہل قلم اظہار خیال کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کر رہے ہیں اور ادب اردو کو طرح طرح کے افکار و خیالات سے مالا مال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ ایسی حالت میں رطب و یابس حسن و قبح، اصل و نقل میں امتیاز کرنے کے لئے سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تنقید کی اشد ضرورت ہے ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے ادیب اس دشوار گذار منزل میں صحیح راہ چھوڑ کر غلط راہ نہ اختیار کر لیں اور گھٹیا چیزوں کو قابل قدر چیزوں پر ترجیح نہ دینے لگیں۔ مولانا نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس وقت جبکہ زبان و ادب کی ترقی کے لئے تمام قوموں اور ملتوں اور تمام صوبوں کی متحدہ کوشش اور ان کے اتحاد و یگانگت کی ضرورت ہے کہیں بے جا اختلافات نہ پیدا ہو جائیں اور ہمارے ادب کی ترقی کا یہ بہترین موقع ان کے بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ انھوں نے سمجھا اور بالکل صحیح سمجھا کہ اس وقت اعلیٰ تنقید نگاری ہی اردو ادب کی بہترین خدمت ہو سکتی ہے چنانچہ مولانا نے اپنی جولانیٔ طبع کو اسی میدان کے لئے مخصوص کر لیا ہمارے اس خیال کی تائید بالواسطہ طور پر مولانا عبدالحق خود اپنے انڈین اورنٹیل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس طرح کرتے ہیں۔

تنقید کی ابتدا مولوی حالی نے کی اور اب اس فن پر متعدد لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں ۔
حال کے انقلابات اور تغیرات سے ہمارا ادب بھی متاثر ہوا ہے اور اس میں طرح طرح کی
جدتیں پیدا ہو رہی ہیں ان کے جانچنے کے لئے پرانے اصول کام نہیں آ سکتے ان نئی چیزوں
کے پرکھنے کے لیے ہمیں نئے اصولوں سے کام لینا پڑے گا۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

حق تو یہ ہے کہ اس دور تغیر و تبدل اور ادب اردو کی ترقی کے اس نازک وقت میں مولانا کی
تنقیدوں نے ان تمام حالات کے مقابلہ میں سپر کا کام دیا اور ہماری زبان کو دست برد سے بچا کر ترقی کی
صحیح راہ پر گامزن کر دیا۔ علاوہ ازیں مولانا کی تنقیدوں نے جہاں ہمارے ادبی معیار کو بلند کرنے میں مدد
دی وہاں وہ مولانا جیسی قابل شخصیت اور پختہ کار صاحب قلم کے ہاتھ میں آ کر تنقید ہمارے ادب کی جان اور
اس کی ایک اعلیٰ صنف ہو گئی اور مولانا عبدالحق اس اقلیم کے بلا شرکت غیرے شہنشاہ ہو گئے۔ ایسے
نازک وقت میں یہ رہبری ضرور تاریخی حیثیت اختیار کرے گی۔

مولانا کی ادبی، در تنقیدی زندگی کی ابتدا | مولانا عبدالحق علی گڈھ کالج کے اُن ہونہار فرزندوں میں سے ہیں جن
پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اگرچہ بی۔اے میں آپ کے مضامین میں فلسفہ اور تاریخ تھے لیکن اردو
زبان و ادب سے آپ کو ابتدا ہی سے ذوق تھا چنانچہ آپ چھٹیوں میں گھر جانے کے بجائے سر سید
کے ساتھ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف رہتے تھے جب مولانا حالی علی گڈھ تشریف لائے تو ان سے
بھی پوری طرح استفادہ حاصل کیا اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے دل میں اردو زبان و ادب کی
خدمت کا شوق سر سید نے پیدا کیا اور تحقیق و تجسس اور تنقید نگاری کا وہ جذبہ جس نے مولانا کو اس عروج
و کمال تک پہونچایا حالی کی مخلص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس بیان کی تائید مولانا حالی کے خط سے ہوتی
ہے۔ جس میں انھوں نے مولانا عبدالحق کے اس ارادے پر مسرت ظاہر کی تھی جب انھوں نے ایک
خط میں اس امر کا ذکر کیا تھا کہ وہ جدید اردو لٹریچر کے ناموران پر تنقید لکھنا چاہتے ہیں چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں

"۔۔۔ اس پر ضرور لکھئے کہ اردو لٹریچر میں درحقیقت اب تک کوئی نمونہ یورپین کریٹیزم کا موجود نہیں"
(مکاتیب حالی صفحہ ۱۳۳)

اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں حالی اور سرسید کی خدمات اردو کے سلسلے میں اس عظیم الشان کارنامے کو بھی شامل کرنا پڑے گا کہ انھوں نے مولانا عبدالحق جیسا اردو کا محسن ادیب اور نقاد پیدا کیا۔

ہمارا یہ خیال محض قیاس آرائی پر نہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہے چنانچہ دوران تعلیم میں مولانا کے خدمت میں ڈوبے ہوئے مضامین اردو زبان و ادب کی ترقی کے متعلق "تہذیب الاخلاق" اور "علیگڈھ میگزین" میں شائع ہوتے رہے پھر ۱۸۹۵ء میں جبکہ آپ ابھی طالب علم ہی تھے صرف ین ہکی کے کتھا ـ کی تلاش میں علی گڈھ سے اورنگ آباد تک کا سفر کیا علاوہ ازیں مولانا کا مذاق۔ ان کے خیالات اور اسلوب بیان پر مولانا حالی کا اثر اور حالی سے ان کی غیر معمولی عقیدت و نیازمندی جو ان کے تمام مضامین میں نمایاں اور ممتاز ہے ہمارے خیال کے بین ثبوت و واضح شواہد ہیں۔

۱۸۹۴ء میں جب مولانا نے بی۔ اے کی سند حاصل کی تو اورنگ آباد میں انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے ایک تو آپ کا ذوق علمی اور پھر حیدرآباد کی پرسکون اور علمی فضا ان دونوں نے آپ کو اپنے ان ارادوں اور منصوبوں کو جن کا اظہار طالب علمی کے زمانہ میں کرتے تھے اور جن کا عہد و پیمان حالی اور سرسید کے اثر سے کیا تھا اب عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ مولانا نے ملازمت کے دو سال بعد ہی ۱۸۹۶ء میں رسالہ "افسر" جاری کیا اسی سے آپ کی تنقید نگاری کی ابتدا ہوتی ہے اس رسالے کے جہاں اور بہت سے ادبی مقاصد تھے اور ان پر ملک کے بلند پایہ ادیب خامہ فرسائی کرتے تھے وہاں اس کا ایک اہم مقصد تنقید نگاری بھی تھا جسے خود مولانا لکھتے تھے چنانچہ شیخ چاند مرحوم لکھتے ہیں:۔

> "اردو چونکہ اس وقت قصہ کہانیوں کی سرحد سے نکل کر علمی میدان میں قدم رکھ رہی تھی اس لئے اس کی دیکھ بھال اور رہنمائی کے لئے تنقید بھی رسالہ (افسر) کا مقصد قرار دیا گیا اور غالباً یہ پہلا اردو رسالہ ہے جس نے کتابوں پر تنقید کرنے کو اپنا فرض قرار دیا۔"
>
> (رسالہ، نورس، عبدالحق نمبر)

افسر پانچ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت اور تنقیدی کام انجام دیتا رہا اور اس کے بعد بند ہوگیا۔ مولوی صاحب صرف شوق علمی اور مطالعہ کتب کے لئے زندہ ہیں اور بس۔ اس لئے آپ نے

افسر کے بند ہونے بعد بھی علمی اور ادبی مشاغل کو جاری رکھا اس زمانے میں اردو زبان کے بہت سے نایاب نسخے جمع کئے اردو ادب کے قدیم ترین ماخذوں کی تلاش وجستجو میں مصروف ہوئے انھیں نہایت ہی محنت اور جانکاہی سے جمع کرتے اسی کے ساتھ مقدمے بھی لکھتے تھے جن میں سے بعض نہایت ہی مبسوط اور طویل ہیں مقدمے درحقیقت کتاب اور مصنف پر بہترین تنقید ہوتے تھے مولانا کے مقدموں کی اہمیت اسی وجہ سے زیادہ ہے ورنہ اردو زبان میں مقدمہ نگاری قدیم اور عام ہے کبھی کبھی کتاب کے آخر میں قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی تیار کرکے شامل کرتے تھے غرضکہ آپ کے یہ ادبی کارنامے جو ایک طرف بہت ہی تحقیقی اور علمی ہوتے تھے تو دوسری طرف آپ کی تنقیدیں انھیں چار چاند لگا دیتی تھیں جس سے نہ صرف اس کی قدر ومنزلت بڑھ جاتی تھی بلکہ ادب کا معیار بھی ان تنقیدوں کی بدولت بلند ہو رہا تھا۔

اس وقت جبکہ ہمارے ادیب لاکسی منزل مقصود کے بھٹک رہے تھے اور بلاکسی مقصد ومنہاج کے اپنی تحقیقی قوتوں کو بیکار اور کھوکھلی شاعری، بے ربط اور بےمقصد نثر نگاری میں صائع کر رہے تھے ان کی توجہ مولانا کے اچھوتے اور بلند پایہ کام کی طرف ہوئی اور رہنمایان قوم نے سنہ ۱۹۱۲ء میں آپ کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں میں اپنی زبان اور ادب کی صحیح ترقی کا راز مضمر سمجھ کر انجمن ترقی اردو کو جو کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک معمولی شعبہ تھی مولانا کے سپرد کر دیا اس کے متعلق شیخ چاند مرحوم لکھتے ہیں:۔ مولوی صاحب کا۔

"فراغ تعلیم سے لے کر سنہ ۱۹۱۲ء تک جو زمانہ گذرا ہے اس میں آپ نے نہایت بلند پایہ مضامین لکھے۔ اعلی درجہ کی کتابوں پر نہایت ناقدانہ اور مبصرانہ مضامین لکھے اردو ادب میں مغربی طرز کا تنقیدی عنصر داخل کرنے کی کوشش کی اور چند ہی دنوں میں اپنی مشہور تنقیدی قابلیت، ادبی ذوق اور علمی تشغف سے قدیم وجدید طرز کے عالموں، ادیبوں اور انشاپردازوں کو قائل کر دیا اور بہت جلد شہرت اور ناموری حاصل کر لی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ آپ سنہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد منتخب ہوگئے"

(رسالہ اردو، عبدالحق نمبر)

حق تو یہ ہے کہ مولانا عبدالحق کی ادبی زندگی کا مطالعہ زبان وادب کی ترقی اور نقاد کی اہمیت اور اس کی قدر و منزلت کا ایک بین ثبوت اور روشن دلیل ہے نقاد کی حیثیت سے آپ نے اپنی شخصیت اور مرتبہ کو جس طرح دوسروں کی نظروں میں بلند کیا زبان میں جس طرح ترقی کی اور اس کے ادب میں جو اضافہ کیا اور اس کے معیار کو جتنا اعلیٰ کیا یہ سب ایسی کامیابیاں ہیں جو ایک ناقد کو ادیب سے ممتاز کرتی ہیں انھیں صلاحیتوں کی بنا پر زبان وادب کو ترقی دینے کا عظیم الشان بیڑا آپ نے اٹھایا اگر ایک طرف انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کو منظم طریقے پر ترقی دینے کی کوشش کی تو دوسری طرف دارالترجمہ حیدرآباد کے ناظم کی حیثیت سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ نقاد زبان کی استعداد، ادب کی وسعت اور جدید خیالات پھیلانے کی خدمت بھی کس طرح انجام دے سکتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی میں مولانا عبدالحق اور انجمن ترقی اردو نے جو کوششیں کیں انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا اس کے تمام کام مولوی صاحب کی سرگرمی کا نتیجہ ہیں اور اس کی موجودہ ترقی ان کی مسلسل اور انتھک کوششوں کی رہین منت ہے۔

اردو زبان کے تنقیدی کارناموں میں انجمن ترقی اردو کے ترجمان رسالہ "اردو" کو بھی مولانا کی طرح غیر فانی شہرت حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ صرف نئی کتابیں اور ان کے ساتھ مقدمے شائع کر دینے سے تنقید نگاری کا پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا بلکہ ہماری زبان میں جس قدر بھی کتابیں شائع ہوں ان کو بھی ادب کا معیار بلند کرنے کے لئے تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے اور زبان کی اصلاح اور معیار مقرر کرنے کے لئے ایک ایسے ادبی رسالہ کی ضرورت ہے جو صرف اردو ادب کے متعلق ہو اور جس کا مقصد "تنقید یعنی زبان وادب کی خوبیوں کا معیار قائم کرنا اور اس معیار پر پرانے اور نئے لکھنے والوں کی کتابوں کو پرکھنا" ہو چنانچہ "اردو" کے پہلے پرچے جنوری ۱۹۲۱ء میں آغاز کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں:-

"تنقید جو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلے میں ہے اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے اس کے بغیر ادب کی

خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔

مولانا نے اردو کے ذریعہ اب اپنے میدان تنقید کو بہت وسیع کرلیا ہے، اور اقلیم اردو پر چھا گئے ہیں۔ اس رسالہ میں مولوی صاحب نے اردو زبان کی جدید مطبوعات پر تبصرے لکھنا شروع کئے جس سے اردو کتابوں کا معیار بہت بلند ہو گیا اور صنف تنقید کو بھی صحیح رنگ میں دکھا کر کمال عروج تک پہونچا دیا چنانچہ شیخ چاند مرحوم رسالہ اردو کی تنقید نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"انجمن کے مقاصد میں تنقید بھی ایک مقصد تھا مولوی صاحب کا وہ قدیم خیال اور پختہ ہو گیا اور 'اردو' میں اس کے لئے ایک حصہ وقف کر دیا ہے اس سے قبل اردو زبان میں تنقید کا عنصر اس قدر کمزور تھا کہ وہ کسی شمار او رکسی لحاظ کے لائق نہیں، 'اردو' نے اس خصوص میں بڑی قابل قدر خدمتیں انجام دی ہیں آئندہ تنقیدی ترقی اس کی ممنون رہے گی۔"

(نورس، عبدالحق نمبر صفحہ ۱۴۳)

یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ رسالہ 'اردو' کی تنقیدیں زیادہ تر مولانا عبدالحق صاحب کے قلم کا نتیجہ ہوتی تھیں اس لئے مذکورہ بالا بیان میں اردو کی تنقید نگاری کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ فی الحقیقت مولوی صاحب کی تنقیدوں کے متعلق ہے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب فرماتے ہیں:۔

"رسالہ اردو کے تنقیدی مضامین اس قدر متین ہیں کہ اردو زبان کیا دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان مضامین کے علاوہ رسالے نے تنقید و تبصرہ کا ایک مستقل باب کھولا ہے جس میں نئی کتابوں اور رسالوں پر اور کبھی کبھی علمی انجمنوں کے جلسوں اور علمی اداروں پر فاضلانہ اور محققانہ تنقید کی جاتی ہے۔ نو سال کے عرصے میں اکثر تبصرے ایسے نکلے ہیں جو کہانے جو ادبی نکات اور معلومات کے مخزن ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر عبدالحق صاحب اور کمتر دوسرے نقادوں کے لکھے ہوئے ہیں مولوی صاحب کا کمال یہ ہے کہ تنقید کے اعلیٰ اور پاکیزہ معیار کو بھی قائم رکھتے ہیں

سلہ یہ مضمون ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔

اور مبتدیوں اور نوشتوں کی ہمت افزائی میں بھی دریغ نہیں کرتے موصوف کی تبصرہ نگاری پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ ان کی تنقیدوں نے ملک میں یہ مقبولیت اور وقعت حاصل کی ہے کہ لوگ انھیں ملوا فسانوں کی طرح شوق سے پڑھتے ہیں اور شرعی عدالت کے فیصلہ کی طرح ادب سے تسلیم کرتے ہیں۔"

(نورس، عبدالحق نمبر صفحہ ۱۴۵)

اگرچہ اب اردو زبان و ادب کی ترقی کے سلسلے میں مولانا کے عملی مشاغل میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی خدمات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے لیکن اب بھی مولانا تنقید کو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح رواں سمجھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر تنقید کو صحیح رنگ میں نہ دکھایا گیا تو بے راہروی سے بچنا مشکل ہوگا اس لئے اگر ایک طرف وہ اردو کی بقا و قیام کے لئے ہندی کے دعویداروں سے دست و گریبان ہیں اور اس کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانے کے لئے شب و روز مصروف رہتے ہیں تو دوسری طرف اس کے باوجود اب بھی آپ کی زندگی کا اہم ترین مقصد تنقید نگاری ہے جس کے ذریعہ آپ اردو زبان کی استعداد اور خیالات میں وسعت پیدا کر رہے ہیں اور اس کے معیار کو روز بروز بلند تر کر رہے ہیں اس لئے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تنقید نگاری آپ کی زندگی کا جزو اور ایمان ہوگئی ہے جس سے آپ کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔

مولانا عبدالحق کے تنقیدی کارنامے | قبل اس کے کہ مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کی خوبیوں سے بحث کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کارناموں کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیا جائے تاکہ ان کی تنقیدات کی نوعیت اور ان کی قسموں سے واقفیت ہو جائے۔

مولانا عبدالحق کے ادبی مشاغل کا ہر لمحہ تحقیق و تجسس اور تنقید نگاری میں گذرتا ہے اسی لئے آپ کی تقریباً تمام ادبی خدمات تاریخ و تنقید اور نقد و نظر پر مشتمل ہیں یہ آپ کا بہت بڑا کمال ہے کہ ابتدا میں جن فرائض کو اپنے ذمے لیا تھا ان کے علاوہ کسی دوسری چیز کے لئے قلم نہیں اٹھایا۔ اس سے جہاں آپ کو اپنے مقرر کردہ مقصد سے سچا لگاؤ اور جذبہ خدمت میں خلوص ثابت ہوتا ہے

وہاں اولوالعزمی، ولولہ اور پختگی ارادہ کا بھی ثبوت ملتا ہے مولوی صاحب نے اپنی چالیس سالہ ادبی وعلمی زندگی میں مفکر، ادیب اور صاحب قلم ہوتے ہوئے بھی ان تمام ارادوں، حوصلوں اور محرکات کو جو انسانی طبیعت کو شاعر، ڈرامہ نویس، افسانہ نگار اور مصنف بننے کے لئے اکساتے ہیں دل و دماغ میں بالکل جگہ نہ دی یہ ایسا ہی مشکل کام ہے جیسے نفس کشی جو ہر شخص کے لے ممکن نہیں نفس کشی صرف وہی شخصیتیں کر سکتی ہیں جو کسی سچے نصب العین کے لئے اپنی زندگی کو تج دیں اور اس کا رہنا، سہنا اور مرنا، جینا سب اسی بلند مقصد کے لئے ہو چنانچہ مولوی صاحب کے ادبی کارناموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو علمی کارناموں اور تحریروں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ملتا ہے جس کا ہر صفحہ اور ہر ورق اپنے مقرر کردہ جادۂ راہ سے الگ نہیں۔ اس کا ہر لفظ و ہر جملہ تحقیق و تفتیش اور صحیح تنقید کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

مولانا کے ادبی کارناموں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ تصانیف، مضامین اور مقالے خطبات تنقیدات اور مقدموں پر مشتمل نظر آئیں گے جن میں سے ہر ایک کا مفصل ذکر حسب ذیل ہے۔

(۱) **تصانیف**: "صرف و نحو اردو" اور "قواعد اردو"، مولانا عبدالحق کی دو اہم تصانیف ہیں جن کا بظاہر مولانا کی تنقید نگاری سے کوئی تعلق نہیں لیکن اگر ان کی نوعیت پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان تصانیف کے پیش نظر بھی اصول تنقید تھے اور مولانا نے وسیع النظر ادیب اور بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے ان تصانیف میں کمال پیدا کر دیا ہے صرف و نحو اور قواعد زبان کے مسائل پر یہ کتابیں مسلم الثبوت ہیں۔ مولانا نے ایک نقاد کی حیثیت سے ضروری سمجھا کہ جس زبان کی اصلاح کی جائے اور جس پر تنقید کی جائے اس کے متعلق مسلمہ اصول بھی ہونے چاہئیں اسی لیے آپ نے بڑی محنت اور جانکاہی سے ان کتابوں کی تصنیف کے فرائض انجام دیئے۔

(۲) ۲- مضامین: مولانا کی تصانیف کو چھوڑ کر ان کے تمام مضامین خواہ وہ سیرت سے متعلق ہوں یا تاریخ سے وہ کسی حد تک تنقیدی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے مولانا کے علمی اور ادبی مضامین کو ان کے تنقیدی کارناموں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان تنقیدوں

کا تعلق اگرچہ کسی کتاب سے نہیں ہوتا مگر وہ لوگوں کی سیرت ان کے کلام اور ان کے کارناموں پر ایک ناقدانہ بحث ہوتی ہے۔ آپ کے بہترین مضامین کا مجموعہ "چند ہمعصر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر ان شاعروں، ادیبوں اور قومی لیڈروں کے حالات ہیں جو آپ کے ہمعصر تھے اور ان میں سے اکثر سے آپ کا قلبی اور جگری تعلق تھا اس کے مطالعہ سے مولانا کی صناعی اور قدرت بیان کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے اور چرچل کی مشہور کتاب (my contemporaries) یاد آجاتی ہے اس کتاب "چند ہمعصر" میں مضامین کی تعداد کل چوبیس ہے جن میں سے خاص خاص مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، سید علی بلگرامی، محسن الملک، مولانا محمد علی، اور مولانا حالی ہیں۔ اور ان سب میں گدڑی کا لعل نور خاں ہے جو کہ خوبی زبان اور جوہر قلم کے اعتبار سے بہت ہی لاجواب ہے۔ بعینہ تمام مضامین جہاں ان بزرگ ہستیوں کا صحیح ترین خاکہ ہیں وہاں ان میں ان کے ادبی کارناموں، کلام اور زبان پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اس لحاظ سے آپ کے مضامین دوسری سیرتوں سے جو کہ ان بزرگ ہستیوں کے متعلق لکھے گئے ہیں بہت ہی بلند پایہ اور مسلم الثبوت ہیں۔

(ب) مقالے: آپ کے علمی مقالے بھی مستقل تصنیفات ہیں جو کہ تحقیقی اور تنقیدی لحاظ سے مہتم بالشان ہیں اس حیثیت سے یہ مقالے اردو ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان مقالوں میں آپ نے جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ انتہائی صحیح اور مسلم ہیں۔

"اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" لکھ کر آپ نے ہماری تاریخ ادب کی ایک گمشدہ کڑی کا پتہ چلایا ہے۔ دوسرا اہم مقالہ جو تحقیق و تنقید کے لحاظ سے بہت اہم ہے، "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" کے نام سے شائع ہوا ہے یہ وسعت نظر اور عالمانہ تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔

"مرحوم دہلی کالج" بھی آپ کا نہایت ہی معرکہ آرا مقالہ ہے جس میں مولانا نے اس کالج کی اردو زبان و ادب کی ترقی میں اہمیت اور اس کی کوششوں کو خوب سراہا ہے اور اس کے کارناموں پر تنقیدی بحث کی ہے ان مقالوں کے علاوہ آپ نے دکنی مصنفین، شعرا اور ان کی تصنیفات کے متعلق بہت ہی اہم اور معرکہ آرا مقدمے لکھے ہیں جن میں سے قدیم اردو اور دوسرے مقالے بہت ہی

قابل قدر ہیں اور ان کی وجہ سے دکن کے اکثر ادیبوں کو قدیم دکنی ادب سے دلچسپی ہوگئی ہے اور ان پر کام کیا۔

(۳) خطبات :- مولانا عبدالحق کے ادبی کارناموں میں خطبات کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نہ صرف اس لئے قابل قدر ہیں کہ علمی اور ادبی جلسوں میں پڑھ کر مقبول ہوئے بلکہ اس لیے بھی کہ زبان و ادب کی خوبیوں سے مملو ہیں اگرچہ یہ خطبات تنقیدی رنگ سے الگ ہٹ کر لکھے گئے ہیں اور انھیں ایسا ہونا بھی چاہیے لیکن اس قسم کے خطبات کو بھی ماہر فن اور مسلمہ نقاد کی تنقید نگاری کا جزو سمجھنا چاہئے اس لئے کہ نقاد کے کلام و بیان میں بھی ناقدانہ شان پائی جاتی ہے ان میں وہ جہاں زبان و ادب کی خامیوں اور خوبیوں کا محاکمہ کرتا ہے وہاں اصلاحی اور عملی تجاویز بھی سامعین کے سامنے رکھتا ہے جو کہ نقاد کا فرض ہے اس لئے کسی نقاد کا اس مرتبہ پر پہونچ جانا کہ وہ مسلم الثبوت ہو جائے اور بڑی بڑی محفلوں اور مجلسوں میں صدارت اور اصلاح و مشورہ کے لئے طلب کیا جائے اس کے کمال تنقید کی دلیل سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ مولانا کی تنقیدوں نے جس وقت سے اردو داں حلقہ میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے اور نقاد کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں کو ملک میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت سے مختلف زبان و ادب کے جلسوں میں مولانا عبدالحق مسند صدارت کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں چنانچہ آپ کے دس خطبات کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس میں سے ہر خطبہ پڑھنے کے قابل ہے اور یہ تمام خطبات مولوی صاحب کی عام مقبولیت کی دلیل ہیں ان خطبات میں انجمن حمایت اسلام، انجمن ترقی پسند مصنفین، بہار اردو کانفرنس، ہندوستانی اکیڈمی اور انڈین اورنٹیل کانفرنس کے خطبات بہت ہی پرمغز ہیں۔

(۴) تنقیدات :- یوں تنقیدات مولوی صاحب کے ادبی کارناموں کا بہت ہی اہم جزو ہیں کتابوں کے تبصروں میں مصنف اور کتاب کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہوتی ہے جس کی بنیاد انصاف پر ہوتی ہے۔ ان میں تحقیق کی شان بھی پائی جاتی ہے مولانا کی تنقیدیں تحقیقی واقعات اور کبھی کبھی ظرافت آمیز جملوں سے مملو ہوتی ہیں۔ تنقید کیا ہوتی ہے کتاب کا نچوڑ ہوتا ہے جس میں اصل کتاب کے پڑھنے سے زیادہ

لطف آتا ہے ساتھ ہی ساتھ سادگی زبان اور زور بیان سے بھی آراستہ وپیراستہ ہوتی ہیں اس لئے لوگ انھیں صرف ادبی معلومات کے لئے ہی نہیں بلکہ دلچسپی اور زبان کی چاشنی کے لئے بھی پڑھتے ہیں چنانچہ گذشتہ سالوں میں آپ کی تنقیدات کے دو مختصر مجموعے "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہوکر مقبول عام ہوئے ہیں آپ کی مشہور تنقیدوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

•سرگذشت الفاظ، بہت ہی پر لطف تنقید ہے جس میں الفاظ کی تاریخی سرگذشت اور ان کی شکل ومعانی کی تبدیلی پر مولانا نے جہاں مصنف کی کوششوں کی داد دی ہے وہاں چند الفاظ کی مضحکہ خیز تشریح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور خامیوں کی خود تصحیح کی ہے۔

•مکاتیب امیر مینائی، پر نہایت منصفانہ اور بے لاگ تبصرہ ہے۔ مشہور شاعر کے محاسن ومعائب کو بلا روک ٹوک بیان کیا گیا ہے۔

•اصلاح سخن، پر مولانا کی تنقید دوسری تنقیدوں سے مختلف نوعیت کی ہے جہاں مصنف کی شوخی کی داد دی گئی ہے وہاں ان کی اخلاقی غلطی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے انداز بہت ہی ظرافت آمیز اور دلچسپ ہے۔

•فیضان شوق، کا تبصرہ بھی بہت ہی باکمال ہے حضرت شوق جیسے مستند زباں داں اور مسلم الثبوت استاد کی شاعری کی خامیاں دکھانے کے ساتھ ساتھ زبان دانی کی غلطیاں بھی چنی گئی ہیں۔ ان کے کلام کا مختصر انتخاب اور ان کی شاعری پر تبصرہ بھی ہے۔

•اردو لٹریچر پر تبصرہ بھی انتہائی دلچسپ ہے اس کا انداز تنقید بھی جدا ہے مولانا کی وسعت نظر اور تاریخ وزبان پر عبور اور واقفیت کا بہترین نمونہ ہے۔ نہایت ہی دلچسپ غلطیاں مثالاً پیش کی گئی ہیں اگرچہ فاش غلطیوں کی فہرست بہت لمبی چوڑی ہے جس کی کہ کتاب یقیناً مستحق تھی لیکن پھر بھی لب ولہجہ میں کسی قسم کی سختی کا شائبہ نہیں پایا جاتا ہے اور ان خامیوں کے باوجود آخر میں مصنف کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔

غرضکہ مولانا کے مختلف تبصرے انداز تنقید کے لحاظ سے مختلف اور بہت ہی دلچسپ ہیں جنکے

پڑھنے سے صرف صحیح تنقید نگاری کا رنگ ہی سامنے نہیں آتا بلکہ زبان کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے
اور ادبی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے مولانا کی تنقیدوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں
پڑھ کر کتاب کا بالکل صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور کتاب کا نچوڑ سامنے آجاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ مولانا
کی تنقیدوں کے دونوں مجموعے مختصر اور ناکافی ہیں اس لیے تمام تنقیدات کو ایک جگہ جمع کرنے کی ضرورت ہے

۳۔ مقدمات :۔ مولوی عبدالحق صاحب مقدمہ باز مشہور ہیں اور ہونا بھی چاہیئے مگر بازمیں ذم کا پہلو
حذف کرنے کے بعد کیونکہ مولانا جیسا مفکر اور ادیب جس کی زندگی کا مقصد ہی عالمانہ اور تنقیدی مقدمے
لکھنا ہو اور جس کے تحقیقی و تنقیدی مقدمے علمیت زبان اور اعلیٰ معیار کی وجہ سے چار دانگ میں مشہور ہیں۔
اگر وہ نہ مقدمہ باز کہلائیں گے تو کون ؟ مقدمہ نگاری تنقید نگاری ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس سے
بلند تر اس کا لکھنا اس سے زیادہ مشکل اور کٹھن ہے مقدمہ نگاری کے لیے زیادہ علمیت اور صلاحیت
کی ضرورت ہے تنقید صرف معیار پرکھنے کی کسوٹی ہے لیکن مقدمہ کتاب کی حد سے نکل کر موضوع
بحث مصنف اور خود کتاب پر تنقید ہوتی ہے مولانا عبدالحق کے مقدمے نہایت ہی محققانہ اور مبصرانہ
ہوتے ہیں اور ان میں تحقیقی رنگ بھی شامل ہوتا ہے اپنی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے مولانا کے مقدمے
دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں کے بہتر سے بہتر مقدموں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں مولانا
کا تبحر علمی اور ان کی وسعت نظر جہاں ان کے مقدموں کو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کرتی ہے
وہاں ان کی قدرت زبان اور اسلوب بیان زیورات علم کو جلا دیتے ہیں۔ اسی لئے ان مقدمات کو پڑھنے
سے اگر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو طبیعت کو سرور بھی حاصل ہوتا ہے مولانا کے مقدمے اکثر و بیشتر
صورتوں میں اصل کتاب سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں اور جس کتاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اسے
چار چاند لگا دیتے ہیں۔ مولانا کے مقدمات کتاب کے پڑھنے میں بہت ہی مفید ثابت ہوتے ہیں اور
کتاب کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے اور موضوع کتاب کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مولانا
کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر مقدمے لکھ سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ سب بلند پایہ
ہوتے ہیں۔ لیکن زبان و ادب کے مسائل میں ان کی رائے قطعی اور ان کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

مذہب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، زبان وادب اور سماجی مسائل کے متعلق کتابوں پر ان کے مقدمات بہت بلند پایہ ہیں مقدمات کی تعداد سینتیس سے اوپر ہے جن میں سے چند کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے تاکہ ان کے مقدموں کی نوعیت اور طرز مقدمہ نگاری کا ایک خاکہ ذہن میں قائم ہو جائے۔

مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس، ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب مذہب و سائنس پر نہایت ہی عالمانہ مقدمہ ہے بلکہ اس کتاب کے مقابلہ میں اس مقدمے کو ایک مستقل تصنیف سمجھنا چاہئے جس میں مذہب کی حقیقت اس کی اہمیت اور سائنس پر نہایت ہی فلسفیانہ اور منطقی بحثیں کی گئی ہیں نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ وجود باری تعالیٰ اور مذہب کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے یہ مقدمہ آپ کے دوسرے مقدموں سے اس حیثیت سے مختلف ہے کہ اس میں تمام تر علمی بحث ہے جو کہ زبان اور خیالات کی خوبیوں کی وجہ سے بہت ہی دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے

مقدمہ حیات النذیر دوسرے مقدموں سے مختلف نہیں بلکہ آپ کے خاص رنگ میں ہے جس میں مولانا نذیر احمد کے حالات زندگی پر بہت اچھی اور صحیح بحث کی گئی ہے ابتدائے مقدمہ میں آپ نے ان لوگوں کا جو کہ تاریخی شخصیتوں کی سیرت لکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے دور کی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھتے ہیں۔ دونوں کے فرائض اور مشکلات کا محاکمہ کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا نذیر احمد کی زندگی کو جس سبق آموز انداز میں پیش کیا ہے ان کی قابلیت اور علمی صلاحیتوں کو جس قدر سراہا ہے اس کی توقع بہت کم لوگوں سے کی جا سکتی ہے آخر میں اجابۃ الامہ کے سلسلہ پر بلا خوف و خطر پوری وضاحت اور زور بیان کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مقدمہ تمدن ہند میں سید علی بلگرامی کے حالات زندگی بہت خوش اسلوبی کے ساتھ قلمبند کئے ہیں اس کے بعد تمدن ہند پر نہایت ہی فاضلانہ طور پر تنقید کی ہے اس میں جہاں ایک ادیب اور عالم کی حیثیت سے بے لاگ تنقید کی ہے وہاں اپنی تاریخ دانی کے جوہر بھی خوب دکھائے ہیں۔

مقدمہ ذکر میر میں جس قدر بہتر طریقہ پر اور جتنے صحیح حالات موجود ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے میر صاحب کے متعلق تمام غلط فہمیوں کا بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ازالہ کیا گیا ہے۔ میر صاحب اور خان آرزو

کا رشتہ اور ان کے باہم تعلقات پر اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے ہیں۔

مقدمہ انتخاب کلام میر، عبدالحق صاحب کے معرکہ آرا مقدموں میں سے ایک ہے اس میں جہاں میر کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں وہاں ان کے کلام پر بہت ہی بلند پایہ اور وقیع تبصرہ بھی ہے اگرچہ تشنۂ تکمیل ہے۔

مقدمہ خطوط عطیہ بیگم، اپنی نوعیت کا بالکل جدا مقدمہ ہے کیا بہ اعتبار طرز بیان اور کیا بہ اعتبار مقدمہ نگاری۔ اس میں اصل رنگ کو چھوڑ کر طنز آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے مولانا شبلی کے وہ خطوط جو انھوں نے عطیہ بیگم کو لکھے تھے ان کے ذریعہ ان کی زبان کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کیرکٹر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ مقدمہ اگرچہ دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس میں مولانا اپنے انصاف اور سنجیدگی کو قائم نہ رکھ سکے۔

مولانا کے جس قدر بھی مقدمے ہیں سب کسی نہ کسی حیثیت سے اہم اور معرکہ آرا ہیں اس لئے یہ مشکل ہے کہ کس کو کس پر ترجیح دی جائے۔ ابھی ابھی ہم صرف چند مختلف النوع مقدموں کا ذکر ان کی مقدمہ نگاری کے انداز کو سمجھنے کے لئے کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مقدمہ، باغ و بہار، مقدمہ سب رس، مقدمہ مثنوی خواب و خیال، ''نصرتی'' اور مقدمہ دریائے لطافت بہت ہی بلند پایہ اور قابل قدر ہیں۔

(باقی آئندہ)

(اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی)

تربیت، تہذیب، امن عام

کیا تربیت وحشت و بربریت کا خاتمہ کر سکتی ہے؟

وحشت و بہیمیت، جنگ و جدال، خونریزی و سفاکی یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے سنتے ہی ہمارے ذہن کے سامنے ایک مکروہ منظر آجاتا ہے اور یہ بھی بلاشک و تردید واضح ہے کہ یہ مناظر انسانیت کے لئے ننگ ہیں چنانچہ ہمیشہ مصلحین انسانیت کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان باہم خونریزیوں اور وحشتناکیوں کا خاتمہ کر دیا جائے تاریخ کے صفحات بھی بتلاتے ہیں کہ انسانی اقوام کے ہر ہادی نبی، پیغامبر اور ریفارمر کا درد مند دل اس سلئے مضطرب رہا ہے کہ اس طلسم سرائے عالم میں ایک امن اور عالمگیر امن و سلامتی کا دور دورہ ہو اور یہ دنیا محبت اور انسانیت کی ایک سچی راہ پائے۔

ایک انسان کے ذہن میں یہ خیالات چکر لگاتے ہیں اور کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچتا ہے کہ آخر انسان اپنے بھائیوں سے کیوں لڑتا ہے؟ کیا ان ہولناک سفاکیوں کا استیصال کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا کوئی ذریعہ ہے کہ ان افراد اور جماعات کے دلوں سے جذبۂ حرب و قتال دور ہو سکے؟ یہی وہ کھٹکتے ہوئے سوالات ہیں جو ہمیشہ سے مفکرین کے سامنے ہیں اور اس پر غور و فکر ابتدا سے جاری ہے لیکن اس کی سرگرمیاں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء تک بہت زیادہ ہو گئیں تھیں اور داعیان امن و سلامتی کی مجاہدانہ کوششیں کہہ رہی تھیں کہ وہ جدال و بربریت کو مٹا کر دنیا کو ایک نئی زندگی بخشنے والے ہیں جسے "تجدید شباب عالم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ——— اس وقت اس کی بڑھتی ہوئی ترقی بہت امید افزا تھی اور اس کی عظمت دیکھ کر خوش آئند مستقبل کی ایک جھلک سی نظر آجاتی تھی مگر آج یاس و ناامیدی کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں اور آج گذشتہ کی رجا و امید ایک مضحکہ ہے ——— لیکن پھر بھی امید ناامیدی سے بہرکیف بہتر ہے فتح کے لئے اقدام کی جد و جہد شکست کی پشت زنی سے محمود اور لائق احترام ہے گو شکل اول عیب ہی ——— لہذا یہ بے محل امر نہ ہوگا اگر اس بحث پر ایک سرسری نظر ڈالی

جائے اور نفسی و اجتماعی تحلیل کے بعد گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے اب تک کے قیام امن کی کوششوں اور اس کے طلبا و مدارس اور کانفرنسوں کے کچھ حالات سنائے جائیں۔

محرکات جنگ علم النفس پر بحث کرتے ہوئے ہمیں دو نفسیتیں بیان کرنی ہوں گی پہلے افراد اور پھر جماعت کی۔ افراد میں جنگ کا محرک "محافظۂ نفس" کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ انسان اور حیوان میں بالکل یکساں ہے کہ جب وہ اپنے ارد گرد ناساعد حالات دیکھتا ہے تو ان تمام چیزوں کے ساتھ جو ممکن ہیں اپنی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایسی چمکتی ہوئی بجلی ہے بادلوں کی اس گھنگھور تیرگی و ظلمت کو کافور کردے اس فطرت کو وہ جذبے جو فطرت ثانیہ بن کر راسخ ہوتے ہیں اور تقویت پہنچاتے ہیں۔ غیظ و غضب، خوف و ہراس، بد اخلاقی و کج خلقی یہ جذبات جو بالعموم حیوانات و انسان میں آ جمع ہوتے ہیں ان کا اتصال فطرت محافظت کو نامعلوم حدوں تک دوبالا کر دیتا ہے تہذیب کا کام یہ ہے کہ وہ ان جذبات کی اصلاح اور انسانی طبیعتوں کو ان کی کثافت سے پاک و صاف کرے لیکن بدقسمتی سے تمام اصحاب علم و عمل اس پر متفق ہیں کہ گذشتہ پچیس سالوں میں تہذیب اور امن کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں ان کا صرف یہ نتیجہ نکلا کہ انسانی طبیعت پر ایک سنہری سی پالش ہو گئی اور حال یہ ہے کہ اگر ہلکی سی بھی ہوا چلی تو حیوانیت کی دبی دبائی آگ بھڑک اٹھے گی اور وہ تمام بہیمیت صادر ہو گی جس پر آج سے مدتوں پہلے ہمارے آبا و اجداد تھے جبکہ انھیں تہذیب و تمدن کی ادنیٰ جھلک بھی نہیں پہونچی تھی۔

اب ہمیں اس سے الگ ہو کر جماعت کی نفسیات سے خفیف سا تعرض کرنا چاہئے جماعتی نفسیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جماعت کے پاس صرف جذبہ ہی جذبہ ہوتا ہے وہ عقل و فکر سے ایک دم عاری ہوتی ہے اور اس کے نزدیک یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں تلون مزاجی استعمال پسندی اور برانگیختگی کے جذبات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک ذرا سی حرکت پر ابل پڑنے کو تیار رہتے ہیں گویا ایک پیمانہ ہے جس کے چھلکنے میں ایک ٹھیس کی دیر تھی۔ اسی لئے اگر جماعت کو اس کا علمبردار و ہادی کسی بہتر کام میں مصروف نہ رکھے تو لازم ہے کہ جماعت کے جذبات وحشت و تخریب کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

جماعتی خصائص کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ افراد جو تہذیب و تربیت کے پروردہ ہیں اور جنہوں نے تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ منزل طے کر لی ہے اور جو منفرد اً ضبط نفس اور فطرت حیوانی کے انسداد پر پوری طرح قادر ہیں یہاں تک کہ اگر ایک دم حکومت (کنٹرول) کا وجود نہ ہو تو وہ بالانسداد امن وسلامتی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں، وہ بھی جب جماعتی ستیشہ میں ڈھل جاتے ہیں تو منظر بالکل بدلا سا ہوتا ہے اور یہی صاحبان ضبط و تربیت جماعت کے ساتھ بڑی بڑی خونریزیوں، سفاکیوں، قتل و غارت اور دنیا کے ارذل ترین جرائم کے ارتکاب میں مصروف رہتے ہیں ———— اس کے دلائل و شواہد بے شمار ہیں اس کا ہم ایک معمولی سا قیاس ایک جنگجو وج سے کر سکتے ہیں جو فتح و نصرت کے جھنڈوں اور ترانوں کے ساتھ دشمنوں کے شہر میں فاتحانہ اور حقارت کی نظریں ڈالتے ہوئے داخل ہوتی ہے، اس کا انسانی معیار آتنا پست ہوتا ہے اور اتنے بہیمی اور حیوانی گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں سے کتنے یونیورسٹی اور کالج کے فارغ شدہ ہیں اور بہر علم و انسانیت کے سیراب کردہ ہیں اسی طرح جب پارٹیوں میں اختلافات کے مظاہرے ہوتے ہیں تو کیا وہ مناظر نہیں دیکھے جب جلیل القدر، وزراء، اور ممبران مکروہ ترین تصادم پر اتر آتے ہیں لیا اس وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ بالا تعداد آزمبل وزیر کے لئے شایاں اور اس کو زیبا ہے اسی طرح اب تاریخ کے بڑے بڑے انقلابات پر ایک نظر ڈالئے اور بتایئے کہ وہ کون انقلاب ہے کہ جس کی روح اور جس کی مشنری کے پرزے انسانیت کے اعلیٰ پتلے نہیں ہیں اور ان انقلابوں کو بھی شمار کر لیجئے جو مساوات واخوت کے لئے ظاہر ہوئے مگر کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کونسی حیوانیت تھی جس سے وہ انقلاب پاک اور وہ کون سی ناموزونیت تھی جو بر سر عمل نہ آئی ———— یہ ہے جماعتی ذہنیت اور خصائص نفسی کا ایک معمولی سا پہلو یا ایک ادنیٰ خاکہ جو اشارہ کا کام دے سکتا ہے اور ایک ناظر جماعتی نفسیات کے مناظر دیکھ سکتا ہے۔

اجتماعی نظام کی پیچیدگیاں بالکل اقتصادی اور سیاسی نظام کی سی ہیں جو ہمیشہ کینہ پروری اور اختلافات کے گنا ہوں میں ملوث رہتا ہے اور علماً اجتماع ان جغرافیائی اور اقتصادی و سیاسی مسائل کے حل میں ہمیشہ

قاصر رہے ہیں جو باہم قوموں کے تعلقات اور رشتہ کو خراب بنا کر انہیں جنگ کے آتشیں میدان میں بالمقابل لا کھڑا کر دیتے ہیں اور اس عالم ترقی و ایجاد میں حکومتوں کے بدترین تعلقات اور اجتماعی مشکلات کو دیکھ کر ایک انسان صرف حیرت میں کھڑا تکتا رہتا ہے اسی سلسلہ میں پانچ باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں

سب سے پہلے یہ کہ انسانی تاریخ کا اہم ترین واقعہ انسان کی وہ عقلی و علمی ترقی ہے جس نے دنیا کو علوم و ایجادات اور تمدن کے لئے مادی ذرائع کے سیلاب میں لا ڈبویا اور جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی

دوسرے یہ کہ اب تک انسانی طبیعت اس کی غریزت و وجدان اور عواطف و احساسات اپنے اس مقام سے ایک قدم بھی آگے نہیں ہٹ سکے ہیں جس پر کہ ہمارے اسلاف تھے جبکہ وہ اپنے چار پاؤں سے چلا کرتے اور درختوں پر کود پھاند کرتے تھے اس وقت انہوں نے انسانیت کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا

تیسرے یہ کہ عقل انسانی کی یہ غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی اور اس کے بالمقابل جذبات انسانی کی ناگوار پستی کا شدید ترین اختلاف، توازن کی پراگندگی اور نظام کائنات کو مختل کرنے میں پیش پیش ہے اور اگر آج اس علم و ترقی کی بدولت امن و سلام کے ایام میں گو یہ بالانفرادیین کی زندگی بسر کر لیتے ہیں تو اس کے مقابل میں جنگ کا وہ منظر بھی ہے جبکہ جماعتوں کی ہماروں جانیں بیک وقت مذراجل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد قوموں میں باہم تعلقات ناممکن کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ علماء اجتماعیات جو دور جدید کی پیداوار ہیں وہ جماعتوں کے عقل و جذبات میں تناسب پیدا کرنے سے ایک دم قاصر ہیں جس طرح کہ اب تک علماء اخلاق و مذہب افراد میں ان کی باہم توفیق نہیں دے سکے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ان مذکورہ باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء تہذیب کے سامنے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدید ذرائع تربیت اور اصحاب تہذیب کی حسن نیت کے باوجود اجتماعی امن ممکن ہے؟ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اصلاح و تربیت کا تعلق زمانہ اور سالوں سے نہیں ہے بلکہ ہر تہذیب کے آثار آنے والی نسلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ اس سبیل میں جو بھی کوشش

کی جائے گی اس کا نتیجہ اگر فی الفور نہ ظاہر ہو تو ممکن ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر پشتوں اور صدیوں کے بعد یقیناً ظاہر ہو کر رہے گا چنانچہ آج ہم جس وحشت و بہیمیت پر نالہ کن ہیں اگر اس کا مقابلہ گزشتہ تاریخ سے کیا جائے تو یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے یہ سب ثمرہ گزشتہ تہذیب و تمدن کا ہے گو حقیر سہی۔ اسی لئے آج امن کی جو بھی کوشش کی جائے گی اس کا نتیجہ آگے چل کر یقیناً ظاہر ہوگا اور اس وقت اس تہذیب امن وسلام کی فتح عیاں ہو جائے گی۔

تعلیمی درسگاہیں اور سیاسی خواہشات ہم یہاں پر افسوس کے ساتھ اس بات کا ذکر کر دینا چاہتے ہیں کہ سیاسی خواہشات جس طرح ہر شئے پر چھا گئیں اسی طرح تعلیمی درسگاہیں بھی ان کے دسترس سے محفوظ نہ رہ سکیں جنگ عظیم کے بعد درسگاہوں میں قیام امن کی کوششیں پورے زور و شور سے شروع ہو گئیں لیکن عجیب بات ہے کہ ایک طرف طلبا کو امن کی تربیت دی جا رہی تھی اور دوسری طرف ان میں قومیت کی زہریلی روح پھونکی جا رہی تھی حتیٰ کہ اس سے بڑی بڑی جمہوری حکومتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں چنانچہ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک شخص ولیم ہال ٹوماس نے امریکہ کے تاریخی کورس کیلئے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے انگلستان پر بڑے زبردست حملے کئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابھی اسے کورس میں کچھ ہی مدت ہوئی تھی کہ انگلستان اور ولایات متحدہ (واشنگٹن) کے درمیان عظیم الشان ناچاقی کا مظاہرہ ہو گیا اس کتاب کو لکھنے کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کا مصنف آئرلینڈ کا باشندہ تھا اور آئرلینڈ و انگلینڈ کے درمیان جو تعلقات ہیں وہ لائق ذکر و تفسیر نہیں۔

جرمنی بھی اپنے جمہوری عہد میں یعنی نازی ازم کی حکومت سے پہلے امن وسلام کا بڑا دلدادہ تھا۔ جرمنی حکومت نے اس روح کو تقویت پہونچانے کے لئے اس کے اداروں اور کمیٹیوں کی معاونت میں حصہ لیا تھا چنانچہ مشہور امریکی آل کارنیجی نے ۱۹۲۷ء میں برلن میں حکومت کی طرف سے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کا مقصد امن عام کو رواج دینا اور قوموں کے باہم تعلقات کو خوشگوار بنانا تھا مگر جوں ہی ہٹلر نے زمام حکومت سنبھالی اسے ایکدم بند کر دینے کا حکم نافذ کر دیا اس لئے کہ اس کے مبادی و اغراض نازیت کی موجزن عسکری روح سے متصادم ہو جاتے تھے۔ اور ابھی چند سال بھی نہیں گذرے تھے کہ

جونئی کورس کی تمام کتابیں خواہ وہ تاریخ ہو یا جغرافیہ، ریاضی ہو یا گرامر، ادب ہو یا شعر و شاعری تمام ایک فاسد زہر سے بھر دی گئیں یہاں پر ان کے نمونے درج کرنا تطویل ہوگا۔ اس لئے اسے چھوڑتے ہیں۔

طلبائے امن | اس قومیت پرستی و عسکریت پسندی کے باوجود بہت سے ممالک میں لاتعداد ادارے قائم ہوئے جن کا مقصد تبلیغ امن تھا۔ یہیں اس کا ایک عظیم الشان منظر نیویارک میں نظر آتا ہے جہاں دریائے ہڈسن پر ایک جلیل القدر اور عظیم الشان محل کھڑا ہوا ہے قریب پہونچنے کے بعد جو چیز اور اس کی عظمت کو دوبالا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے صدر دروازے پر یہ عبارت منقوش ہے: یہاں تک کہ امن و اخوت کا دور دورہ ہو۔ یہ عمارت جان روکفلر کی سخاوت اور امن و تہذیب پسندی کا نتیجہ ہے جسے انہوں نے غیر ملکی طلبا کے لئے تعمیر کرایا ہے اس میں امریکیوں کی تعداد دس فیصدی ہے۔ طلبا کی کل تعداد ڈیڑھ سو ہے جو مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس درسگاہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ مختلف قبائل قوموں میں ارتباط پیدا کیا جائے اور انہیں ایک دوسرے سے قریب بنایا جائے۔ جان روکفلر نے اس طرح کی اور دوسری عمارتیں برکلی (کیلیفورنیا) اور پیرس وغیرہ میں بھی بنوائی ہیں لیکن یہیں یہاں بھی افسوس کے ساتھ وہ چیز ظاہر کرنی پڑتی ہے جسے ہم ابھی پہلے بیان کر چکے ہیں کہ باوجود ان تمام کوششوں کے کہ ان مختلف القومیت طلبا کو باہم قریب تر اور ایک بنا دیا جائے قومیت کے آثار مٹ نہیں سکے ہیں اور یہ چیز پیدا نہیں ہوسکی ہے چینیوں، جاپانیوں اور انگریزوں، ہندوستانیوں میں عداوت کی آگ برابر مشتعل ہے اور ہر طلبہ قوم دوسری قوم کو حقیر نظروں سے دیکھتی ہے جیسا کہ آج اس قسم کے واقعات ہمارے سامنے رونما ہیں۔

میونخ کے منافقات | اس طرح کا ایک دوسرا منظر میونخ (جرمنی) میں ہے جسے تقریباً ہر سیاح دیکھتا ہے کہ وہاں ایک بہترین پارک میں جو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سبزوں اور پھولوں سے آراستہ ہے ایک طرف ایک فرشتہ کا مجسمہ ہے جس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے ہیں گویا فضا میں بلند ہو رہا ہے یہ اس سلام کا فرشتہ ہے جو جرمنوں اور فرانسیسیوں کے عہد نامہ امن کی یادگار ہے جو ۱۸۷۱ء میں منعقد ہوا تھا لیکن عجیب دلچسپ بات ہے کہ یہی مجسمہ جو کسی وقت مقدس دونوں کے ساتھ نصب کیا گیا ہوگا آج اس کا حال یہ ہے کہ اسی پارک میں آپ کو اہل میونخ کی بڑی تعداد ملے گی جو اس پر باہم ایک تبصرہ اگر تبسم کا

اظہار کرتی نظر آتی ہے اور اس تبسم کا مطلب لوگوں سے مخفی نہیں جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء اور آج کل کے حالات و رفتار سے باخبر ہیں۔

اب اس منظر کو چھوڑیے اور میونخ کی علمی نمائش گاہ پر ایک نظر ڈالئے دنیا کی سب سے بڑی علمی نمائش کہی جاتی تھی یہاں جس چیز کا وجود سراسر چھایا ہوا تھا وہ سب آلات گیس اور بجلیوں کا تھا۔ ہر جگہ صرف آگ، ہوا، بجلی، گیس، مقناطیس، شعاع، آواز وغیرہ کے نظریات و اکتشافات کی تشریح تھی اور عملی مظاہرہ!
اس سے اور آگے بڑھیے تو آلات حرب کی متوحش اور حیرت انگیز کثرت تھی دنیا کا کوئی تباہ کن آلہ نہ ہوگا جس سے کہ اس علمی نمائش گاہ کو آراستہ نہ کیا گیا ہوگا گویا دنیا کو دکھلایا جا رہا تھا کہ اب تک کی ترقی اور علم کا جو کچھ نتیجہ اور اس علمی جد و جہد کا جو کچھ حاصل ہے وہ یہی مخرب انسانیت آلات ہیں جن سے انسانیت کی گردن پر خونی وبال آنے والا ہے۔

امن کی کوششیں لیکن اس کے باوجود مدعیان تہذیب مختلف ممالک میں مختلف ذرائع سے تبلیغ امن میں منہمک رہے ہیں، اس سلسلہ کی دلچسپ بحث تہذیب عالم کی کانفرنس کے وہ اجلاس ہیں جن میں اس مسئلہ پر تقریریں اور غور و خوض ہوا تھا۔ یہ جلسے جنیوا میں آخر جولائی اور اوائل اگست ۱۹۲۹ء میں منعقد ہوئے تھے
فرانس کے نمائندے پروفیسر تلفار نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ وہ ۱۹۱۹ء سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ فرانس میں درس سے ان تمام رسائل اور کتابوں کو خارج کر دیا جائے جن سے باہم اختلافات کا خدشہ ہو اور جو کسی طرح بھی طلبا میں ایک گندی روح بھر سکتے ہوں اور ان میں انسانیت کے بجائے جذبہ حیوانیت کو برانگیختہ کرتے ہوں اور اس کے برخلاف ایسی کتابیں اور ایسی چیزیں طلبا کو پڑھائی جائیں جن سے اخوت و محبت کا جذبہ پیدا ہو اور ہمدردی و غمگساری کی روح منتقل ہو اور دوسرے یہ کہ تاریخ میں طلبا کے سامنے علمائے عالم اور ان کی خدمتوں اور کارناموں پر حقیقی معلومات پیش کئے جائیں اور طلبا کو ان سے حقیقی طور پر واقف بنایا جائے اور اس میں جنسیت اور قومیت کی بو ایک دم نہ آنی چاہئے چنانچہ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ تھوڑی مدت کے بعد طلبا کو جیمس واٹ، گوئٹے، شکسپیر، ڈانٹے، شوپنہار، اڈیسن روسو، ابراہام لنکن وغیرہ کا اچھا خاصہ علم ہے۔

ڈاکٹر فریڈرک جابزرا جو برلن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے انھوں نے اپنے مقالہ میں جو اجلاس میں سنا گیا تھا بتایا تھا کہ جرمنی کی جدید جمہوری وزارت نے طے کیا ہے کہ جرمنی کے کورس کو ان تمام آلائشوں سے پاک کرے گی جن سے کہ وہ اب تک بھرے پڑے ہیں چنانچہ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا۔ درسگاہوں کی تعلیم کی غرض صرف اخلاقی شخصیت پیدا کرنا ہے اور قومی اجتماعی احساس کو تقویت پہونچانا ہے اور اس سب سے بڑھ کر تعلیم کا مقصود ایک امن اور عالمگیر امن کا قیام اور حکومتوں میں خوشگوار تعلقات کا پیدا کرنا ہے۔ آگے چل کر یہ کہا کہ اس وقت جرمنی حکومت ہر اُس ممکن وسیلہ کو استعمال کر رہی ہے جس سے کہ باہم حکومتوں میں اچھے تعلقات مستحکم ہو سکتے ہیں چنانچہ جو کیٹیاں اس وقت امن عام کی کوشش میں مصروف ہیں ان کے نظام اور حالات سے ہم اپنے طلبار کو باخبر رکھتے ہیں اور جب بھی کوئی قومی مسئلہ آجاتا ہے جس میں دیگر مجالس شرکت کرتی ہیں تو ہم بھی اپنے طلبا کی نگاہیں اس طرف پھیرتے ہیں اور ان سب کے علاوہ ہمارے طلبا ہر سال دوسرے ممالک کی سیر کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے اور حسن فہم اور صداقت پیدا ہو سکے دوسرے یہ کہ ہم نے مراسلات کا سلسلہ بھی قائم کیا ہے تاکہ غیر ملکیوں سے اچھے تعلقات پیدا ہو سکیں اور یہ سب ان تعلیمی کوششوں کے علاوہ ہے جس میں کہ ہم پوری طرح منہمک ہیں۔

یہاں پر موقع نہیں ہے کہ بحثوں اور تقریروں کا خلاصہ پیش کیا جائے مختصر کہ یہاں وہ تمام زبان سے کہہ ڈالا گیا جو کہ اس سبیل میں ممکن ہو سکتا تھا۔ جلسہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ افتتاح سے پہلے جنیوا کے ہر مقام پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں تھے جس پر لکھا ہوا تھا۔ جنگ کا خاتمہ تعلیم و تربیت کر سکتی ہے" اس سے جلسہ کی دھوم دھام اور تزک احتشام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح کی مفید کتابیں شائع کرنے کے لئے پیرس میں جان رُوکفلر کی درسگاہ کی طرف سے ایک ادارہ تالیف و تصنیف قائم ہوا تھا۔ اس کی تالیفات تحریک تہذیب و امن کے مقاصد کو پوری طرح پورا کرتی تھیں اور ان تمام خبائث سے ان میں احتراز کیا جاتا تھا جو کہ باہم اختلاف و جنگ کا سبب بن سکیں اسی لئے اس کی کتابیں اپنے حلقہ میں کافی مقبول ہوئیں اور ان کتابوں کو پبلک اور یونیورسٹی لائبریریوں نے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

قیام امن کی کوششوں میں سرمایہ داروں اور اصحاب ثروت نے جو حصہ لیا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ امریکہ کے لاتعداد اصحاب ثروت نے اس سبیل میں اپنی دولت کو جس فراخدلی سے خرچ کیا ہے دنیا اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں آل کرنیجی کا نام سرفہرست جلی حرفوں سے لکھا جائے گا جنہوں نے جنگ عظیم کے حدسے حال تک امن و تربیت کے لئے اپنی دولت کا دروازہ پوری طرح کھول دیا تھا اور غیر محدود ادارے قائم کئے ——— ماہرین تعلیم کی جدوجہد کے علاوہ مصلحین اور پیمبران امن بھی ہمیشہ محترم شخصیتوں کے نام سے یاد کئے جائیں گے جس میں برنارڈ شا اور ڈاکٹر یوکمان وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی حسن نیت کے باوجود اپنی تحریک امن کے ذریعہ ایک دنیا پر ایک مصیبت مسلط کر دی ہے اس لئے کہ اس تحریک نے جن ممالک میں رسوخ پایا اور وہاں کے باشندوں کی رنگ آلودہ طبیعت کو صیقل کیا وہ سب جمہوری تھے اور ان کے برخلاف دوسری طرف ایسے ممالک تھے جہاں انھیں اوقات میں جنگ کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی اور نونہالان وطن کو جنگ کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ فرانس، بلجیم، ڈنمارک، ناروے وغیرہ میں وہاں کے نوجوانوں کو سکون وامن کے اتنے خواب دکھائے گئے کہ ان کی طبیعتیں سکون پسند ہو گئیں اور جنگی توجہ ہٹنے کے ساتھ جنگی قوت بھی ان سے مٹتی رہی حتیٰ کہ انھوں نے اپنی مدافعت کی بھی طاقت کھو دی اور دوسری طرف جاپان، روس، جرمنی، اٹلی نے اپنے نوجوانوں کی جس ماحول میں تربیت کی وہ سراسر جنگی اور وحشیانہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بھیڑیوں نے ان بکریوں کو کھا ڈالا اور ابھی تک یہ بھیڑیے آزادانہ خونخواری کر رہے ہیں ——— یہ ہے تربیت، تہذیب و امن کی پچھلی کہانی ——— ! (اقتباس)

(ترجمہ صدر الدین الحسنی)

تاریخی نظریہ کا ارتقا

تاریخ کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی اور اس کا شاید سبب یہ ہے کہ تغیرات زمانہ
کے ساتھ اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ یہ اس وجہ سے کہ مورخین کی نیتیں مختلف رہیں۔
اُن کے ذرائع معلومات میں تفاوت پیدا ہوتا گیا اور ان کے نظریے تبدیل ہوتے گئے۔ یوں تو
تاریخ کی ایک عمومی اور وسیع ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی اعمال و افعال کی داستان ہے۔
کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ اپنی پوری تاریخ کا حامل ہے ہمارے نظریے اور ادارے بھی کسی حادثہ
کا فوری نتیجہ نہیں ہیں اور نہ وہ جابرانہ قواعد و ضوابط میں محبوس رہے ہیں بلکہ زمانہ کے تغیرات کے
ساتھ ان میں بھی تغیر ہوا ہے اسی لیے ہمارا کوئی خیال و عمل سکونیاتی نہیں ہے اس میں ایک
ارتقائی شان پوشیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ اپنے وسیع دامن میں انسان کے ہر اس
خیال یا عمل کو جگہ دے سکتی ہے جو اس سے کبھی بھی سرزد ہوا ہے

ہمارے تاریخی نظریہ نے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کی ہیں اور مختلف ادوار میں اس کے مفہوم
میں ایک گونہ تبدیلی ہوتی گئی ہے۔ ایک زمانہ میں تاریخ علم الاصنام سے وابستہ تھی اور بہت
سے خرافات قصے اس کے عناصر ترکیبی تھے چوتھی اور پانچویں صدی کے لوگ اس کو مشائے
ایزدی کا مظہر سمجھنے لگے اس کے بعد کچھ لوگوں نے اس کی اساس اخلاقیات پر رکھی بعض نے
اُسے محض افسانۂ یاران کہن سمجھا اور بعض نے اُسے ادبیات کا جزو اور سیاسیات گذشتہ
کی داستان قرار دیا غرض مورخین کے نظریوں کے ساتھ ساتھ تاریخی ترتیب میں بھی تغیر و تبدل ہوتا گیا۔
تاریخی مواد کو سب سے پہلے رزمیہ نظموں میں پیش کیا گیا ان شعرا کو تنقید کے اصولوں سے
بحث نہیں تھی انھوں نے اپنی نظموں کے لئے صرف ایسا مواد مہیا کیا جو ان کی نظر میں دلچسپ یا
پبلک کے لئے جاذب توجہ ہو سکتا تھا ہرڈوٹس صحیح معنوں میں تاریخ کا ابوالآبا کہا جا سکتا ہے

اس نے اپنی تحریروں میں تحقیق وتلاش کو ایک مقتدر جگہ دی اور بعض اوقات مختلف بیانات کا خلاصہ پیش کر دیا تاکہ قاری یا سامع خود حق و صداقت تک پہنچ جائے لیکن اس کے باوجود ہیروڈوٹس کی شہرت ایک بلند پایہ ناثر اور قصہ گو سے زیادہ نہیں ہے اس کو ہم بیانیہ تاریخ کا پیش رو کہہ سکتے ہیں اور حقیقتاً اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا۔

اس کے بعد تھیوسائیڈس (جو جنگ پونیپیا کا مورخ ہے) ایسے واقعات ضبط تحریر میں لایا جو اس نے خود دیکھے تھے یا دوسروں نے دیکھے تھے اور جن کے متعلق اس نے کافی تحقیق کرلی تھی۔ یہ کام بڑا مشکل تھا اس لیے کہ مشاہدہ کرنے والوں کے بیانات میں تضاد تھا۔ کیونکہ وہ فریقین کی لڑائی سے خود دلچسپی رکھتے تھے۔ تھیوسائیڈس کا خیال تھا کہ سیاسی واقعات و حالات کا صحیح مرقع سیاسی اصولوں کی ترویج میں بے حد مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لئے اس کا مقصد خالصتہً ناصحانہ و معلمانہ تھا اور اس نوع کی تاریخ لکھنے میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

اہل روما نے زبان و بیان پر بہت زور دیا اور ان کے عہد حکومت سے ایک ایسی تاریخ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں خطیبانہ بلند آہنگی غالب ہے اس دور کی بہترین پیداوار سسرو ہے اسی زمانہ میں ٹیسی ٹس نے تاریخی صنعت گری کے حسین نمونے دکھلائے۔

عیسائیت کے آغاز سے تاریخ میں مذہبیات بھی شامل ہوگئی اور عہد متوسط کی تاریخوں میں مافوق الفطرت حالات بھی داخل ہوگئے۔ عربوں نے تاریخ نگاری کا بالکل ایک نیا ڈھنگ نکالا انھوں نے وہ واقعات لکھے جو عینی شاہدوں نے دیکھے یا وہ جو ان کے ہم عصروں کے ملاحظہ سے گذرے اور تاریخ لکھنے والوں نے یہ واقعات جو مختلف راویوں سے ہوکر ان تک پہونچے تھے نہایت احتیاط کے ساتھ قلمبند کر دئے گئے۔ یہ گویا شہادتوں کی فراہمی و موازنہ اور نیتوں کی جانچ اور تحقیق کی ابتدا تھی اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ سائنٹفک طریقۂ تاریخ نگاری کی جڑیں ہمیں دور عربیہ میں ملتی ہیں۔

دور نہضت دنیا کی تاریخ میں بڑا اہم باشان زمانہ ہے اس وقت ہر چیز کو شوک بجا کر دیکھا جارہا

تھا ہر شعبہ کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس کے اوپر تنقید و تنقیح کے اثرات نے کام نہ کیا ہو۔ اس زمانہ کے رومی و یونانی علم و ادب اور تاریخ قدیم کے ماہروں نے تاریخی مواد کو تولنا، پرکھنا چاہا لیکن چونکہ اس وقت قدما کی تقلید کا زور تھا۔ اس لیے مورخین افلاطون اور ارسطو کے کھینچے ہوئے دائروں ہی میں گردش کرتے رہے۔ تاریخ ادب العالیہ کا ایک جزو بن گئی۔ متقدمین کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ضمنی تعلیم ہوتی تھی لیکن چونکہ مقصد ادبی و لسانی تھا اس لئے اس نے ہمارے تاریخی شعور کو پوری طرح بیدار نہیں کیا۔ تاریخ کو "غیر مذہبی" بنانے کا کام میکاولی (اطالوی مفکر) نے شروع کیا اور اٹھارویں صدی میں گبن، والٹیر، ہیوم اور رابرٹسن وغیرہ نے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔

مذہبی اصلاح کے زمانہ میں تاریخ میں سائنٹفک تحقیق کا اضافہ ہوا۔ یہ زمانہ شدید تحقیقی مباحثوں اور مناظروں کا تھا اس لئے تاریخی معلومات کی دریافت و تلاش بھی ممکن ہو سکی۔ اٹھارویں صدی میں ہیگل نے تاریخ سے دینیات کو بالکل خارج کر دیا۔ اور اس اصول پر زور دیا کہ فطرت کا ارتقاء تدریجی ہوتا ہے یہ یک بیک اور بے سلسلہ اس طرح گویا ہیگل نے تاریخ میں "قانون تسلسل" کی ابتدا کی اور موجودہ تاریخی تصور کا سنگ بنیاد رکھا۔

انیسویں صدی سے سائنس کا دور شروع ہوتا ہے اس وقت علوم جدیدہ کو فروغ حاصل ہو رہا تھا ان سب نے تاریخ اور فن تاریخ نگاری پر بڑا اثر ڈالا سائنس نے تفتیش و تجسس، احتساب و تنقیح کے جس جذبہ کو ابھارا تھا اس نے صدیوں کے الجھے ہوئے روابط علت و معلول کی عقدہ کشائی کی اور ہمیں تاریخ کے جدید ترین تصور سے قریب تر کر دیا۔ اب تاریخ کا معیار یہ ہو گیا کہ مواد گذشتہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس سے محض عہد متعلقہ ہی کی ایک صحیح تصویر ہمارے سامنے نہ آ جائے بلکہ عہد موجودہ کے بھی سمجھنے میں امداد حاصل ہو۔ تاریخ کے قانون تسلسل کا یہی اقتضا ہے کہ ہم ماضی کے ذریعہ حال کو سمجھنے کے اہل ہو جائیں۔

تاریخ میں ارتقاء اور تسلسل کا خیال کوئی نیا نہیں ہے یہ چیز قدماء کے بھی پیش نظر تھی لیکن

علوم جدیدہ نے اس کو ایک خاص شکل اور فن تاریخ نگاری میں اس کو سب سے ممتاز درجہ عطا فرمایا ارتقا کا نتیجہ تدریج اور تسلسل ہے اور تسلسل کا نتیجہ وحدت اور تمام اجزائے تاریخی کا ربط و اتحاد ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ کو ہم انسانی ارتقا کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ اب تاریخ نویس کا فرض یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کسی قوم کی تاریخ نے موجودہ دور کی خلاقی اور تہذیب حاضرہ کے بنانے میں کس حد تک مدد دی ہے ارتقائی زنجیر کی یہ متواتر و مسلسل کڑیاں ہم کو ان انکشافات سے قریب کر دیتی ہیں جن پر آئندہ تقدیرات کا انحصار ہے ماضی نے حال کو پیدا کیا ہے اور یہی وہ حال مستقبل کو پیدا کریں گے۔ اس لئے علم التاریخ کے ذریعہ ہم حالات موجودہ کی صحیح واقفیت اور مستقبل کا اشاراتی اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ ہماری زندگیوں کے سدھارنے اور کامیاب بنانے کے لئے بیحد ضروری ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تاریخ ہمیں اقدام و عمل کے لئے سندیں اور نمونے فراہم کرتی ہے کہ ہم انہیں خطوط پر اپنی زندگیوں کو چلانے لگیں تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں دہراتی اس کا ہر واقعہ ایک خاص نوعیت کا حامل ہے وہ حالات جنھوں نے ایک واقعہ کی تخلیق کی ہے وہ ہر واقعہ کے ساتھ مشترک نہیں ہیں اس لئے تعمیم نہیں کی جا سکتی اور چند واقعات کی بنا پر کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا مہاتما بدھ کے اسباب کامیابی سے لیوتھر فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور نہ ولنگٹن کے فوجی انتظامات جنرل فرانکو کے لئے مفید ہو سکتے تھے ہٹلر نپولین نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح بابر اور نپلین کے اسباب فتحیابی دوبارہ کبھی نہیں پیدا ہو سکتے انقلاب فرانس ہمیشہ انقلاب فرانس ہی رہے گا اس لئے کہ ہر تاریخی واقعہ اپنی جگہ بے مثال اور مخصوص نوعیت کا مظہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں بکل نے جب تاریخ کو سائنس بنانا چاہا تو وہ کامیاب نہ ہو سکا اسی طرح ڈریپر کا خواب بھی شرمندہ عمل نہ ہو سکا اور وہ نفسی و طبعی قواعد و ضوابط دریافت نہ ہو سکے جو اعمال انسانی کے ذمہ دار ہیں تاریخ کبھی طبعیات کی طرح سائنس نہیں بن سکتی وہ تمام علوم جدیدہ سے امداد لیتی ہے لیکن ان کی پابند نہیں ہو سکتی نتائج اور شہادتوں کی تحقیق و تنقیح کے لئے تاریخ علوم مروجہ سے کسب ضیا کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی متاع گرانمایہ کو کبھی ان علوم کے سپرد نہیں کر دیا۔

اسی طرح تاریخ نگار پر تو ہر ہر علم میں جلوہ گر ہے لیکن یہ نور مستعار، انھیں تاریخ کا درجہ نہیں دلوا سکتا۔
گذشتہ اسّی برس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تاریخ نویسی کا طریقہ سائنٹفک ہوتا جا رہا ہے
اور اس کے قانون تسلسل کو سائنس اور فلسفہ کے اصولوں سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی
جا رہی ہے تاریخ میں تنقید و تبصرہ کی گنجائشیں نکالی گئی ہیں۔ ذاتی عصبیت کو خارج کر کے اسے زیادہ
سے زیادہ واقعی اور معروضی بنانے کی سعی کی جا رہی ہے دیانتداری اس کا اصل اصول قرار پایا ہے۔
موجودہ تاریخی تصور کی بنیادیں قوت آخذہ تنقید مسوی جامعیت اور کمال اجتہاد پر قائم ہیں بعض اوقات
تو محض ممکنات کا موازنہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی نتیجہ مستنبط نہیں کیا جاتا اسی کے ساتھ ساتھ مواد
گذشتہ کو اس طرح حسن ترتیب سے جلوہ گر کیا جاتا ہے کہ ماضی کے آئینہ میں حال و مستقبل کا خاکہ نظر آجائے
واقعات موثر کی تفصیل چھوٹنے نہ پائے۔ اور امور غیر موثر سے بحث نہ ہو۔ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل
بھی ہے پتھروں کے بے پناہ انبار سے جواہر ریزوں کو منتخب کرنا آسان نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ ہمیں
صحیح علم اور معقول زندگی کی خاطر کرنا ہے۔ زندگی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا نام ہے اور یہ اس
وقت تک کامیاب نہیں کہلائی جا سکتی جب تک کہ فرد اور ماحول میں مناسب تعلقات نہ ہوں۔ یہ اسی
وقت ممکن ہے جبکہ فرد حالات موجودہ اور وراثت ماضیہ سے پوری طرح باخبر ہو۔ تاریخ بنی نوع انسان
کا "حافظہ" اور اس کے تجربات کا خلاصہ ہے۔ انسان جتنا اس سے فائدہ اٹھائے گا اتنا ہی اپنی آئندہ
زندگی کو کامیاب بنا سکے گا اس لئے ضرورت ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کو ارتقا کی ایک کڑی سمجھا جائے اور
تاریخی مواد کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ تہذیب انسانی کے خط و خال ہمارے سامنے آجائیں تم
ہم اپنی زندگی کو ایک بڑے کل کا جزو سمجھیں اور اپنی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے پوری طرح
آگاہ ہو جائیں۔ یہ مقصد جو تاریخ کے تصور جدید نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے نہایت ارفع و
بلند ہے۔ اس لئے کہ ہم اس کے ذریعہ مستقبل کی شاندار تعمیر کر سکتے ہیں اور حیات لفنی کی بھی رونق
بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(خواجہ احمد صاحب فاروقی بی اے)

بہار کی گمنامی کا اصلی سبب

صوبہ بہار اطرافِ دلی کی طرح اُردو کا مولد تو نہیں ہے مگر اطرافِ لکھنؤ (صوبہ اودھ) کی طرح اس کا قدیم مسکن ہے۔ یوں تو دلی کی تباہی کے بعد مقامی امرا اور روسا کی سرپرستی اور علم دوستی کی وجہ سے علم و ادب کے بہت سے مرکز قائم ہو گئے تھے مگر اودھ میں لکھنؤ اور بہار میں عظیم آباد پٹنہ نے اس وقت دیگر مرکزوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دلی کے بعد اردو کے نامی گرامی شاعر اور ادیب بیشتر ان ہی دو شہروں کی خاک سے اٹھے گو حسبِ مقدور سب نے جو ڈھونڈا ویران دہلی سے اپنا مقسوم پا کے اسی پر اس نے ناز کیا مگر دلی نے خاص طور سے ان دو شہروں پر اپنے تمام خزانوں کے منہ کھول دئے، دونوں نے اپنی بساط بھر کسبِ فیض کیا لکھنؤ نے تو گویا دلی کو اپنے قالب میں سمو لیا مگر عظیم آباد پٹنہ بوجوہ چنداں متمتع نہ ہو سکا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب لکھنؤ ہر طرح مالا مال ہو گیا اور اپنے تمام خزانوں کو اس نے معمور دیکھا تو ببانگِ دہل بغاوت کا اعلان کیا اور مدِ مقابل بن کر دلی کی طرح اہلِ زبان کہلانے کا مدعی ہوا اور اس کی ٹکسال کے سکے بے چون و چرا پچھم سے پورب تک رائج ہو گئے۔

عظیم آباد پٹنہ بھی دلی کے گنج ہائے گراں مایہ سے فیض یاب ہوا مگر اسی حد تک کہ یہ زباں داں کہلانے کے رتبہ سے آگے نہ بڑھ سکا اس کے زباں دانوں اور ماہرینِ فن کا غلغلہ یہاں سے وہاں تک بلند ہوا مگر اس کی زبان پایۂ استناد کو نہ پہنچ سکی[1] اس نے اسی پر اکتفا کیا اور جب یہ شہر اردو علم و ادب کا تیسرا مرکز تسلیم کر لیا گیا تو اس نے اپنا رخ بجز دلی اور لکھنؤ کے سوا ہندوستان کے کسی شہر کی طرف نہ کیا ان ہی دو شہروں کی

---

[1] اس موقع پر یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اربابِ عظیم آباد میں ایسے افراد بھی ہیں جنہیں یہ تسلیم نہیں خصوصاً قدیم خاندانوں کے بزرگوار کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنے ہی گھرانے کی زبان کو مستند سمجھتے ہیں نواب حیال مرحوم نے تزک حیال (مطبوعہ رسالہ جادو ڈھاکہ) میں اور جناب شاد مرحوم و مغفور نے اپنی کتاب فکرِ بلیغ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے (م احمد)

تحسین اور سکوت کو قائل ، اتنا سمجھا لکھنؤ کی طرح اس نے دلی سے بغاوت تو کبھی نہیں کی مگر لکھنؤ کو ہمیشہ رشک و رقابت سے دیکھا کیا بات یہ ہے کہ قدامت کے اعتبار سے عظیم آباد پٹنہ کی مرکزیت دیگر شہروں سے کہیں زیادہ اہم ہے جب شمالی ہند میں اردو شعر و شاعری کسر شان سمجھی جاتی تھی اور اہل علم فارسی کو اپنی شاعری کی جولانگاہ سمجھتے تھے اس وقت اس شہر نے فارسی کے عظیم المرتبت شاعر اور ادیب پیدا کئے۔ پھر اردو میں بھی یہاں جس وقت راسخ عظیم آبادی اور جوشش عظیم آبادی وغیرہ شاعری کے جوہر دکھا رہے ہے اس وقت ذرد میر تقی میر اور حسرت جیسے اہل کمال دلی ہی کی محفل ادب کے چراغ تھے۔ یہی تمام سرمایہ روایات لکھنؤ سے رشک و رقابت کا سبب تھا۔ مگر لکھنؤ نے گھٹنوں اور پاؤں پاؤں چلنے کے بجائے پیدا ہوتے ہی بولنے اور صاف بولنے کا معجزہ دکھا کے زمانے کو حیرت میں ڈالدیا تھا۔ اس لئے عظیم آباد پٹنہ نے بھی اس کے اس اعجاز کے آگے سپر ڈالدی۔

یہ سب کچھ سہی مگر آئیے دیکھیں کہ مورخین اردو کی موجود تحقیقات صوبہ بہار اور خاص عظیم آباد کے متعلق کیا ہیں اردو زبان و ادب کی چھوٹی بڑی متعدد تاریخیں اب تک لکھی جاچکی ہیں میں صرف تاریخ ادب اردو "(مؤلفہ جناب رام بابو سکسینہ و مترجمہ جناب مرزا عسکری لکھنوی) کو لیتا ہوں صوبہ بہار اور عظیم آباد کی خدمات ادب کے متعلق فاضل مورخ کی جو تحقیقات ہیں ذیل میں درج کئے دیتا ہوں

(عظیم آباد "مہاراجہ شتاب رائے جو اس زمانے میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے شاعروں کے قدردان اور خود بھی شاعر کیا تھے۔ ان کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے میر ضیاء الدین ضیا معاصر سودا کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علی خاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہونچ گئے تھے اور ان کی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے میر باقر حزیں شاگرد مرزا مظہر جان جاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعراے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا"

بہار کی خدمات زبان و ادب کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں اس کے

پیشِ نظر فاضل مورخ کی تحقیقات میں کوتاہی اور تشنگی نظر آتی ہے۔ آبِ حیات (مؤلفہ جناب مولانا محمد حسین آزاد دہلوی) کی لغزشیں اس لئے درگذر کی جاتی ہیں کہ وہ اپنی نوع کا پہلا تذکرہ تھا، اس زمانہ میں معلومات کے ذرائع کم تھے اور کتابوں کی فراہمی دشوار تھی مگر اس زمانے میں جبکہ پہلے کے مقابلے میں کچھ آسانیاں ہوگئی ہیں ایسی باتیں یقینی قابلِ توجہ ہوں گی۔ خدماتِ بہار کا جہاں تک تعلق ہے اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آبِ حیات، اور تاریخ ادبِ اردو، دونوں ایک ہی منزل میں معلوم ہوتی ہیں باوجودیکہ موخر الذکر کتاب بہت بعد کو لکھی گئی ہے اس پر بھی کچھ فرق یا اضافہ نظر نہیں آتا جس طرح مؤلف آبِ حیات نے دہلی کے اکثر شعراء کو عظیم آباد میں پہنچا کے چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح اس فرض کو مؤلف تاریخ ادبِ اردو نے بھی سر انجام دیا ہے۔ اسی لئے یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یو۔پی، پنجاب اور دکن کی خدماتِ زبان کے معلوم کرنے کے لئے تو یہ پر از معلومات کتاب ہے اور اسے ضرور پڑھنا چاہئے مگر خدماتِ بہار کے نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کا مطالعہ مفید نہیں معلوم ہوتا نہ صرف یہاں کی ادبی اور علمی تحریکوں کے ذکر سے اس کے اوراق خالی ہیں بلکہ جن چند نامور شعراء اور ادباء کا اس میں ذکر ہے ان کو بھی مرتبہ کے مطابق مناسب جگہ نہیں ملی ہے۔ مگر چونکہ تاریخ زبان و ادب کی یہ آخری کتاب نہیں ہے بلکہ بعضوں کو کو اس کا اختصار گراں بھی گذرا ہے اس لئے اس امر کا اظہار بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ایسی کتابیں جو مجموعی حیثیت سے اردو کے تمام مرکزوں سے تعلق رکھتی ہوں ان میں تحقیقات کا یہ معیار نہیں ہونا چاہئے جس طرح دکن، مدراس، گجرات اور پنجاب کے اردو کارنامے ہمارے سر آنکھوں پر ہیں اور ان کا ذکر ہمارے لئے حوصلہ افزا ہے اسی طرح بہار اور عظیم آباد کی ادبی اور علمی کاوشوں اور کوششوں کا علم بھی خواہاں اردو کے لئے تقویت کا باعث ہوگا صرف اسی خیال سے اس قابلِ قدر کتاب (تاریخ ادبِ اردو) پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے

آج صوبہ بہار اور اس کے صدر مقام عظیم آباد پٹنہ کے متعلق اربابِ اردو کو جو کچھ واقفیت ہے وہ آپ کو معلوم ہوگیا اور صورتِ حال سے آپ مطمئن نہیں ہوئے بلکہ کسی قدر مایوسی ہوئی پچاس ساٹھ سال پیچھے لوٹ کے دیکھنا چاہئے کہ اس وقت اس علمی اور ادبی مرکز کے کارناموں کا زمانہ کو اعتراف تھا یا آج کی طرح اس عہد میں بھی ؎

ان محنتوں سے بھی یہ مرا ہو رہا تھا حال
لڑکوں کی تھی سند یہ میر مستند

شاد عظیم آبادی

کا عالم تھا یہ وہ زمانہ تھا جب دلی کی قید سے لکھنؤ تازہ تازہ رہا ہوا تھا رات دن کی زور آزمائیوں کے بعد پاؤں ملکی کی بیڑیاں کٹ تو گئیں تھیں مگر ایام اسیری کے کچھ داغ ہنوز موجود تھے بغاوت کا اعلان تو ہوتا تھا مگر مصلحت دیکھ کے کسی دبی زبان سے اور موقع پا کے کسی کھل کر اس کا اظہار ہوتا تھا دلی، لکھنؤ کے اس فعل کو اپنی شان میں گستاخ آمیز حرکت سمجھتی اور اس کو فرق مراتب کی طرف تصور کرتی مگر آخری داو بھی لکھنؤ کو معلوم ہو چکا تھا اس لئے دلی کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ اور جو جوا لکھنؤ اتار چکا تھا پھر اسے چڑھا نہ سکی۔ یہی زمانہ تھا جب عظیم آباد اور اس کے مضافات کے اہل علم لکھنؤ کی اس قدر و منزلت کو دیکھکر رشک کرتے تھے اور دلی کے طرفدار دلی کی صفوں میں نظر آتے تھے۔ چونکہ یہ موضوع سے ہٹی ہوئی بحث ہے اس لئے اس کو یہیں چھوڑتا ہوں اسی زمانے میں اخباروں میں ایک بحث چھڑ گئی تھی مولانا آزاد دہلوی کی کتاب "آب حیات" پر صاحب مہتمم دلگداز نے "ہمارا لٹریچر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں "آب حیات" کی کوتاہیوں کا ذکر تھا اور صاحب آب حیات پر لکھنؤ کے مٹانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور اسی سلسلہ تحریر میں انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا۔

"دلی والوں کو لکھنؤ کا احسان ماننا چاہئے تھا جو ہونہار بچہ ان کے شہر میں پیدا ہوا تھا اس کی وہ ذرا تربیت نہ کر سکتے تھے لکھنؤ کے رؤسا اور بادشاہوں نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور پوری ترقی دلا دی بخلاف اس کے اکثر دیکھا گیا ہے کہ حضرات دہلی اپنی تحریروں اور کارساریوں کے ذریعہ سے لکھنؤ پر حملہ کر جاتے ہیں، اگرچہ لکھنؤ کے شعرا جو ہمارے سرمایۂ ناز ہیں ان کو ان رکیک حملوں کی ذرا پروا نہیں ہوتی"

اس کا جواب مولوی محمد خاں تپش نے اپنے اخبار "مشیر قیصر" لکھنؤ (۵ فروری سنہ ۱۸۹۱ء) میں "اردوئے معلیٰ کا مالک کون ہے" کے عنوان سے دیا تھا۔ میں اس کا ایک حصہ پیش کرتا ہوں :-

"اے حضرات! اس ترقی اور اس گمنامی زبان سے تو کاش لکھنؤ ترقی نہ کرتا تو بہتر تھا یہ ترقی اس کے حق میں تنزل ہے کیا معنی کہ اور صوبجات ہند میں جو اردو بولی جاتی ہے وہ سب دہلی کے نام لیوا ہیں اور وقتاً فوقتاً تازہ تازہ محاورات اور ترقیات زبان کے فائدے اٹھاتے رہتے ہیں بخلاف لکھنؤ کے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ چن کے خود ترقیات زبان یعنی خاص الخاص اردوئے معلیٰ سے محروم رہا اگر کہیئے تو کہ لکھنؤ کا بھی تو نام بڑا ہے بیشک انیس دبیر وغیرہ یہاں کے اتنے بڑے شاعر گذرے ہیں کہ جن کا جواب نہیں

مگر درحقیقت یہ فخر دہلی کو ہونا چاہیے کہ لکھنؤ کو کیونکہ آئیں میر حسن دہلوی کی اولاد سے ہیں اور آج تک اس خاندان کی زبان اہل لکھنؤ سے اکثر محفوظ رہی ہم یہ نہیں کہتے کہ لکھنؤ کے بعض شاعر اور بھی اچھے نہیں گذرے نہیں اچھے اور بہت اچھے مگر وہ فن کے اعتبار سے اچھے سمجھے جائیں گے اور کسی قدر زبان کے اعتبار سے بھی نا اہل زبان ہونے کے اعتبار سے ایسے حضرات اپنی زبان کی نظم و نثر میں اعلیٰ درجہ کا مذاق پیدا کر لیا اور بات ہے اور اہل زبان ہونا اور بات پس لکھنؤ پر کیا منحصر ہے ہندوستان کے ہر شہر میں ایک دو شاعر نامور گذرے ہیں مگر سب مقلد رہے مراد آباد میں ذکی مراد آبادی اور مرشد آباد و بنگلہ وغیرہ میں اختر اور راسخ وغیرہ کیا کم تھے اردو پر کیا منحصر ہے ہند کے شعرا فارسی گو مثل خسرو، بیدل، فیضی، غالب وغیرہ بہت سے شعرائے ایران سے کہیں بڑھ کر گذرے ہیں مگر اہل زبان نہ ہونے سے مقلد کہلائے انھوں نے اہل زبان ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا پس کوئی وجہ نہیں کہ لکھنؤ خلاف اہل دہلی کے خود مجتہد و مطلق العنان ہو جائے بلکہ مثل اور صدہا مقامات ہند کے دہلی ہی کا مقلد اس کو بھی رہنا چاہیے دعویٰ بے معنی سے کچھ حاصل نہیں گو وہ اپنے آپ کو کتنی ہی دور کھینچے مگر سمجھنے والے خوب سمجھتے ہیں اور خوب قہقہے لگاتے ہیں اگر اجتہاد زبان کا حق پہونچتا تو میرٹھ وغیرہ بعض آس پاس کے شہروں کو پہونچتا جو دہلی سے بہت نزدیک ہیں مگر درحالیکہ زبان کا کوچہ ایسا ٹیڑھا ہے کہ عرب سرائے محل پورہ بلکہ پہاڑ گنج تک کے باشندوں نے کبھی ایسی بیہودہ بات زبان سے نہیں نکالی جو شہر پناہ کے زیر سایہ رہتے ہیں تو کسی غیر ملک والے کو کیونکر حق زبان پہونچ سکتا ہے صرف شعرائے دہلی کے لکھنؤ آجانے اور نوکر ہو جانے سے اگر ایسا ہے تو رام پور، حیدر آباد، بھوپال اور وغیرہ کو سب سے پہلے اجتہاد کا قصد مناسب ہے بلکہ میرے نزدیک پٹنہ سب سے زیادہ اس دعویٰ کا حق ہے جہاں صدہا شاعر محقق و کامل آج کل لکھنؤ اور دہلی دونوں سے زیادہ موجود ہیں اور خوش گو بھی انتہا کے ہیں۔"

اس اقتباس سے ایک ہلکا سا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے کہ پچاس برس ادھر عظیم آباد پٹنہ کی اہل ادب میں کیا اہمیت اور وقعت تھی اس زمانے میں اس شہر کی زبان دانی کا طوطی سارے ہندوستان میں بول رہا تھا یہی زمانہ تھا کہ جب علامہ شوق نیموی، مولانا فوق شاگرد شوق، جناب شدید، جناب احد الزمان

اور دیگر اہل قلم نے اپنا اور اپنے شہر کی زباندانی کا وہ لوہا ملک سے منوا لیا تھا اور سارا زمانہ ان کو تسلیم کرتا تھا۔ عہد ماضی اور زمانہ حال کی صورتوں کو سامنے رکھئے تو حالات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کہاں اسلاف کے علم و فضل کا وہ شہرہ اور کہاں اخلاف کی یہ کس مپرسی کہ محفل ادب میں ان کے وجود تک کا یقین نہیں۔ ان کی نیک نامیوں میں اضافہ تو کیا ہوتا ان نیک ناموں کو اخلاف کی غفلت نے پردہ گمنامی کے اندر ڈال دیا۔ درحقیقت موجودہ صورت حال دوسروں کی کوتاہیوں اور سہل انگاریوں سے زیادہ اپنی غفلت، جمود اور تعطل کا نتیجہ ہے۔

تمام اہل اردو دکن کے پکے نہ سہی کسی حد تک غافل ہی سہی گر پھر منچلے جیالوں اور مدہوشوں میں اہل ہوش بھی نظر آتے ہیں۔ تقریباً اردو کے تمام مرکزوں کی انجمنیں قائم ہیں، ادارے زندہ ہیں، رسالے نکل رہے ہیں، اخبارات نکل رہے ہیں اور حوصلے والے بڑھ بڑھ کے کام کر رہے ہیں مگر ذرا بہار اور عظیم آباد کے دعوے داروں کا جوش و خروش اور ان کی سرگرمیاں ملاحظہ کیجئے تو بعض باقیات صالحات کے متعلق معلوم ہوگا کہ آپ کو اپنی "کسمپرسی" پر ناز ہے اور اردو عام کے سہل سے بیزار ہیں۔ بعض تارک جہاں گوشہ نشیں منہ پھیر کے دبائیں گے ع مشتاق تماشا آنکھ نہیں کیا خاک دکھائیں جوہر ہم۔ بعض طبیعت داروں کی بارگاہ میں حاضری دیجئے تو "رسالہ ہماری" کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سرے سے اس سرے تک دیکھ جائیے۔ ایک غفلت اور جمود کا عالم ہے۔ نہ انجمنیں ہیں نہ ادارے نہ اعلیٰ رسالے ہیں نہ عمدہ اخبارات۔ پورے صوبہ میں ہیں ان چار یا پانچ اداروں کی خبر ہے معلوم نہیں اس وقت ان میں کون زندہ ہے اور کون سدھار چکا (خدا مغفرت کرے)۔

انجمن ترقی اردو پٹنہ (شاخ مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی) ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کے کرتا دھرتا جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ہیں۔ بیرسٹر صاحب بحیثیت محقق زبان کے اہل اردو میں کافی شہرت رکھتے شاید اسی انجمن کے ذریعہ "کلام شاد" کی طباعت ہوئی تھی پھر اس کے بعد "معیار" نام کا رسالہ قاضی صاحب کی ادارت میں نکلا تھا شاید اسی انجمن کا آرگن ہو۔ پھر بعد میں شاید بند ہوگیا۔ قاضی صاحب نے رسالہ "اردو" اورنگ آباد کے ذریعہ جوشش عظیم آبادی کے کلام کے شائع کرنے کا اعلان کیا تھا کہ یہ ۱۹۳ء میں شائقین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ معلوم نہیں یہ کام سرانجام ہو سکا یا رہ گیا ہم کو اس ادارہ کے

کارناموں کے متعلق دور رہنے کے سبب سے بس اتنا ہی معلوم ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے اس انجمن سے بھی بہت سی توقعات رکھنا بے جا نہیں ہے۔

طاق بستاں آرہ | یہ ادارہ جناب مولانا عبدالمالک صاحب آروی نے قائم کیا ہے۔ جناب عبدالمالک صاحب کی ذات گرامی اہل ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے آپ نے اس ادارہ کے سلسلہ مطبوعات کے متعلق اعلان شائع فرمایا تھا (۱) اقبال کی شاعری (۲) خواب کی دنیا، شائع ہو چکی ہیں (۳) الہامات شاد (۴) نیا زمانہ زیر طبع ہیں کسی رسالہ میں ان کتابوں پر ریویو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اب تک یہ کتابیں شائع نہ ہو سکیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ انجمن ہنوز زندہ ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم ہے خدا کرے یہ ادارہ اپنی کارگزاریوں کے ذریعہ اہل علم میں اعتبار کی نظر سے دیکھا جائے۔

انجمن طلبائے قدیم ندوہ صوبہ بہار پٹنہ | اس ادارہ کی خبر حال میں اخباروں کے ذریعہ معلوم ہوئی تھی بڑی خوشی ہوئی کہ کام کرنے والوں کی ایک جماعت کام کرنے کے لئے آمادہ ہو رہی ہے چنانچہ اس کی ایک کانفرنس غالباً پھلواری شریف جیسے مقدس مقام میں ہوئی اور ایک رسالہ غالباً "ندوی" نام کا نکالنے کی تجویز بھی منظور ہوئی۔ مسرت ہوئی تھی کہ ایک سنجیدہ علمی رسالہ کا اضافہ ہوگا مگر معلوم نہیں اس راہ میں کیا کیا دشوار گھاٹیاں آئیں کہ پورے کا پورا قافلہ مدتوں سے نظروں سے اوجھل ہے حالانکہ ان ندوی حضرات پر پورے صوبہ کو ناز ہے کہ ان فاضل بزرگوں کے ذریعہ صرف بہار ہی کی علمی خدمت نہیں ہو رہی ہے بلکہ ہندوستان کے دوسرے باوقار ادارے بھی ان کی علمی ادبی خدمتوں کے رہین منت ہیں۔ خدا کرے یہ پھر اکٹھے ہوں اور کسی ادارے کی بنیاد ڈالیں۔ جو کالج اور یونیورسٹی والوں سے نہ ہو سکا یہ کر دکھائیں۔

(۱) ادارہ ندیم گیا | یوں تو جناب اکرم صاحب گیاوی کا نام صوبہ کی ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت خاص الفاظ میں لکھا جائے گا مگر جب سے ان کے جاری کئے ہوئے رسالہ ندیم کی ادارت جناب مولانا سید ریاست علی ندوی جیسے فاضل اور پختہ کار اہل علم کے ہاتھوں آئی ہے اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ رکنیت دوامی کے ذریعہ ایک ادارے کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور اس کے

فارسی کی دلچسپ کتابوں کے شائع کرنے کا اعلان بھی ہو چکا ہے خدا کرے یہ ادارہ پھولے پھلے ۔
اور اس کے ذریعہ صوبہ کی علمی نمائندگی ہو سکے ۔

رسالہ سہیل گیا | ہرچند رسالہ سہیل گیا کے پیش نظر کسی ادارہ کے قیام کا تخیل نہیں ہے پھر بھی اس کی کوشش صوبہ بہار میں ادبی زندگی پیدا کرنے میں محرک ثابت ہو رہی ہیں اس لئے یہ بھی قابل ستائش ہے اس کے بعض پچھلے نمبروں میں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کے تعلقات اپنے شہر کے ہم عصر رسالہ سے اچھے نہیں ہیں مدیر زندگی کے مراحل طے کرنے میں کافی نشیب و فراز کا مقابلہ کرنے کے بعد اب قابل ہوا ہے کہ آج اس کی آواز صوبہ کی آواز ہے اور جس کی رسائی ملک کے مقتدر اداروں اور سنجیدہ مذاق اصحاب تک ہوئی ہے ضرورت ہے کہ جس کے ذریعہ ایک اہم کام انجام پا رہا ہو اس کو کمزور نہ کیا جائے یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے جانب داری نہیں بلکہ بربنائے خلوص و محبت ہے امید ہے کہ رسالہ سہیل (جس کی ترقی کا میں خواہاں ہوں) کے موقر ارباب ادارہ اس کو ایسا ہی سمجھیں گے ۔

اول تو ہمارے نہیں جو ہیں ان کے کارنامے پیش کر دئے گئے ان اداروں کا ذکر ارباب ادارہ کو خوش کرنے یا ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونکنے کی نیت سے نہیں کیا گیا ہے درحقیقت ان کو قائم اور مستحکم کرکے ان سے بڑے بڑے کام لینے ہیں جو انفرادی کوششوں سے کبھی سرانجام نہیں پا سکتے ۔

اہل اردو اس بات کے معلوم کرنے کے لئے مشتاق ہیں کہ یہاں کی رہنے والی اردو نے حسب قلعہ معلےٰ سے بے سروسامانی میں باہر قدم نکالے تو پورب آنے کے بعد اس کے چہرے مہرے اور رنگ روپ پر کیا اثر پڑا اور اس کی کیا گت بنی اس کے معلوم کرنے کے لئے تاریخ ماضی کے اوراق کو الٹنا ہوگا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اردو نے یہاں کون کون سے اور کہاں کہاں نقوش چھوڑے ہیں ابتدا سے لے کر آج تک اس کو ارتقا کی کیا کیا منزلیں طے کرنی پڑی ہیں کہاں کہاں اس کا چہرہ بگڑا پھر کیسے کیسے اس کی مانگ پٹی سنواری گئی ۔ یہ اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم کے تمام اردو کارنامے قدیم دکنی نسخوں کے طرز پر چھاپ دئے جائیں مگر طباعت سے پہلے ان نسخوں کی فراہمی کا سوال سامنے آتا ہے ۔ تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ بایں ہمہ تعطل صوبہ کے بعض محققین اس قسم کے نسخوں اور کارناموں کا کھوج لگا رہے ہیں ممکن ہے بعض حضرات پہلے سے بھی اس قسم کی

دلچسپی رکھتے ہوں مگر جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس سلسلے میں جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ
ہی نے اپنے بزرگوں کے ایک قدیم مخطوطہ کا ذکر چھیڑ کے اس کی طرح ڈالی جس وجہ سے محققین کا رجحان
اس طرف ہوا اور ان چھپے اور ڈھکے ہوئے نسخوں کے متعلق بیش قیمت معلومات بہم پہنچیں خصوصاً جناب وفا
ابدالی صاحب کا مضمون، اردو نثر کی ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ (ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء) قیمتی معلومات
کا حامل تھا جناب معروف کی تحریر سے معلوم ہوا کہ بہت سے قدیم نسخے ان کی نظر سے گذر چکے ہیں جو خانقاہوں
میں محفوظ ہیں۔ خدا اپنے حفظ و اماں میں رکھے ایسے صدہا شعرا ہیں جن کا کلام اپنے عہد کی زبان کا نمونہ ہے۔
نام سے ہیں مگر کلام دیکھنے میں نہیں آتا تذکرے ہیں کہ تحت طلب مسئلے بنے ہوئے ہیں کہ یا تو چھپے ہی نہیں یا
چھپے تو اب معدوم ہیں یا پھر یہاں نہیں لندن کی لائبریریوں میں ہیں یہ جناب مختار الدین صاحب آرزو
نے پتہ لگایا کہ وہ بعض ہماری اہل ذوق کے پاس موجود ہیں۔ ایسی باتیں پایۂ تحقیق کو جب پہنچیں گی کہ ان کا
صحیح صحیح علم ہو جائے تاکہ کوئی فیصلہ قطعی کیا جا سکے جب یہ تمام قدیم نسخے جو کہیں مطبوعہ ہیں کہیں قلمی ہیں کہیں کرم خوردہ
دستبرد ہیں اور کہیں بزرگوں کے تبرک کی حیثیت سے ہیں انفرادی اور اجتماعی اداروں کے ذریعہ کوشش
کے ذریعہ دستیاب ہو جائیں گے تو پھر ان کی طباعت کا کام ان اداروں کے ذمہ ہوگا۔ اگر زیادہ غفلت اور
بے اعتنائی برتی جائے گی اور ان کے شائع کرنے کا کام شروع نہ کیا گیا تو آج جس طرح بہت سے نسخے
ضائع ہو چکے ہیں اسی طرح یہ رہے سہے نسخے بھی نایاب ہو جائیں گے۔ ان مراحل کے طے کر لینے کے بعد کہیں
ایسی کتاب مرتب ہو سکے گی جس میں پورب میں سرگذشت اردو کا پورا پورا بیان ہوگا۔ درحقیقت بہار میں
سرگذشت اردو کے مرتب کرنے کا وقت وہی ہوگا اور اس سے پہلے جو کتاب بھی مرتب کی جائے گی موجودہ
معیار تحقیق سے فروتر ہوگی اور اس کو ان ہی کتابوں کے ڈھیر میں رکھ دیا جائے گا جن میں چند شعرا کا ذکر اور
ان کے کچھ پھڑکتے ہوئے شعر (یا درد انگیز نالے) بدیتاً درج کر دئے جانے میں۔ ایسی کتاب کے شائع کرنے سے
کہیں بہتر ہے کہ کوئی صاحب ذوق ان ہی نسخوں میں سے کسی ایک کو مرتب کرنے کے لئے منتخب کر لیں کیونکہ
یہ کوشش پھر بھی اس کارآمد اور طویل زنجیر کی ایک مفید اور مضبوط کڑی ثابت ہوگی۔ جیسا کہ ابھی حال
میں جناب پروفیسر سید حسن عسکری صاحب نقوی نے بہار کی ایک قدیم مثنوی "گوہر جوہری" کو مرتب کرنے

کا وعدہ رسالہ "اردو" دہلی (اپریل ۱۹۴۰ء) میں فرمایا ہے۔ اسی طرح جناب حمید عظیم آبادی نے میخانۂ الہام (دیوان شاد عظیم آبادی) مرتب کرکے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور اب مدیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء کے ذریعہ انتخاب کلام راسخ عظیم آبادی کے شائع کرنے کا قابل خیر مقدم اعلان کیا ہے۔ ایسے اہل علم کے ایک دو اور بھی نام یاد ہیں جن کے وعدوں کے ایفا کے لوگ منتظر ہیں مثلاً جناب عبدالباقی صاحب نے ماہ نو بہار نمبر ۱۹۴۰ء میں ایک قدیم کتاب "شجر الامد" کے شائع کرنے کا وعدہ فرمایا ہے یا ہمارے عزیز محترم محب گرامی جناب پروفیسر سید مظہر الحق صاحب دسنوی جنھوں نے اعلان تو نہیں کیا ہے مگر خطوں کے ذریعہ آگاہ کیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا موضوع "بہار کی مثنویاں" ہے آج کل چونکہ ایسے تمام بیار مسدودں سے خفا ہیں اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ اس راہ میں کس منزل تک ان کے قدم پہونچے۔

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عظیم آباد کے کسی شاعر کے کلام میں خارجیت پائی جائے تو اس کو لکھنؤ اسکول کا پیرو بتانا یا اگر داخلیت کا غلبہ ہو تو اس کو دہلی اسکول کا مقلد سمجھنا مولانا عبدالمالک صاحب آروی کی تحقیق کے مطابق صحیح نہیں۔ ان کی تحریر[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم آباد اسکول کی انفرادیت کے قائل ہیں اور اس موضوع پر شاید کام بھی کر رہے ہوں یہ ایک دلچسپ بحث ہے عظیم آباد اسکول کی خصوصیات شاعری پر اسی وقت مکمل بحث ہو سکتی ہے جب یہاں کے شعرا کا کلام سامنے ہو اس لحاظ سے بھی ان کی جستجو لازم آتی ہے۔

بہار کا مشہور اخبار الپنچ بانکی پور ۱۸۸۵ء ایک عمدہ اخبار تھا اس وقت کے تمام بہاری ادبا اور شعرا اس کی بزم میں شریک تھے اودھ پنچ کو لکھنؤ اور اس کے اطراف میں جس وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا الپنچ بانکی پور کو بھی اطراف بہار میں وہی اہمیت حاصل تھی ضرورت ہے کہ "گلدستۂ پنچ" "انتخاب اودھ پنچ" کی طرح اس کا بھی ایک انتخاب شائع کیا جائے ان کے خاص نامہ نگاروں کے مختصر سوانح حیات اور ان کی خصوصیات تحریر پر بحث کی جائے ان بزرگوں کی ستھری ستھری ڈھلی ہوئی زبان اور ان کی مفید اور کارآمد بحثیں موجودہ نوجوان ادبا کے لئے درس کا کام دے سکتی ہیں پھر ان کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوگا

---

[1] دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری، (نگار جون ۱۹۳۰ء) از عبدالمالک صاحب آروی

کہ ٹھیٹھ بہاری الفاظ اور محاورے کہاں تک اردو میں داخل ہو گئے تھے۔ ارباب اودھ کی تحریروں میں مقامی الفاظ کافی موجود ہیں جس سے اطراف دہلی کے اہل قلم پہلے بھڑکتے تھے مگر یہ بعد میں مقبول ہو گئے اسی طرح یہاں کے ذخیرہ الفاظ بھی اگر سامنے آجائیں تو ان کے رواج اور ترک پر غور کیا جا سکے گا۔ غرض سرگرمی عمل دکھلانے کے لئے میدان کا میدان سامنے ہے صرف کمر ہمت باندھ کے طیار ہونے کی ضرورت ہے ورنہ یوں اپنی ،، خاموش سنجیدہ علمی خدمت ،، کا راگ آپ الاپتے رہنا کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اوپر کی سطروں میں جس کام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی کوششوں کا محتاج ہے اور اس کے لئے کسی نہ کسی ادارے کے قیام اور اس کے استحکام کی فکر کرنی ہی پڑے گی۔ اسی کے ذریعہ یہ آرزو پوری ہوگی۔ ایسی کوششیں اہل اردو کے لیے خدمات بہار کے معلوم کرنے کے لیے صحیح اور قابل اعتبار ماخذ ثابت ہوں گی اور پھر وہ داغ گمنامی جو اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے مٹ سکے گا۔

آخر میں ایک بات عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صوبہ کے کسی ادبی گروہ سے کسی طرح کا تعلق نہیں۔ جس شخص یا جس ادارے کے متعلق میری جو کچھ معلومات ہیں اُن ہی کی روشنی میں میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے ہو سکتا ہے کہ کسی خدمت گذار ادارہ کی اس میں حق تلفی ہو گئی ہو تو امید ہے کہ اسے محض میری لاعلمی سمجھ کے قابل معافی سمجھا جائے گا۔

(شاہ مقبول احمد صاحب ایم۔ اے)

غزلیں

سکوتِ ناز ہے تصویرِ خوش بیانیِ حُسن — رہے گی یادِ محبت کو بے زبانیِ حُسن
سلوکِ دوست وفا و جفا کی چیز نہیں — سمجھ سکی نہ محبت بھی مہربانیِ حُسن
بس ایک درد کا اٹھنا ہے اور چمک جانا — وہی شباب محبت وہی جوانیِ حُسن
شدہ شدہ یہ خبر اہلِ دل تک آئی ہے — کہ کچھ اداس سی رہتی ہے شادمانیِ حُسن
نشاطِ عشق بھی عکسِ جمال ہے تیرا — یہ کامرانیِ دل بھی ہے کامرانیِ حُسن
کسی کا عذرِ خطا اس طرح قبول نہ ہو — کہاں گئی وہ محبت سے سرگرانیِ حُسن
کیا ہے کام تبسم سے سو تکلم کا — عجیب رنگ سے تھی آج کم سخنیِ حُسن
یہ کامیاب نظر اور یہ تبسم دوست — کہ کھل کے بھی نہ کھلے عشق پر معانیِ حُسن
صدائے سازِ انا البحر ہے کہ طوفاں ہے — یہ جزر و مدِ محبت یہ ساز و پائیِ حُسن
زفرق تابقدم سوز و ساز کا عالم — یہ کس کے غم کی ہے تصویر شادمانیِ حُسن

نوید آمدِ مہماں ہے ہر در و دیوار
فراقؔ تجھ کو مبارک یہ مہربانیِ حُسن
(فراقؔ گورکھپوری)

جب محبت کا ذکر آتا ہے — دلِ مایوس کانپ جاتا ہے
اس کو مجھ سے حجاب کیا معنی — جراتِ شوق آزماتا ہے
ہائے وہ عہدِ وصل کی راتیں — چاند میری ہنسی اڑاتا ہے
تم کو مجھ سے کبھی محبت تھی — یہ تصور ہی کھائے جاتا ہے

دل خانہ خراب اے اشعرؔ
دیکھئے اور کیا دکھاتا ہے
(حبیب اشعرؔ دہلوی)

سنا ہے ایک جہاں اس جہاں سے پہلے تھا — عجب جہاں تھا اگر آسماں سے پہلے تھا
اگرچہ سجدے ہیں ممنونِ آستاں لیکن — مذاق سجدہ مجھے آستاں سے پہلے تھا
تمہیں کو کبھی تم سے سا تھا جو تس ہو کر — تمہارا ذکر جو میرے بیاں سے پہلے تھا
قبولِ خاطرِ عشاق ہو کے رہ نہ گیا — ترا فسانہ مری داستاں سے پہلے تھا
نہ شوقِ رہبریِ دل، نہ ذوقِ غارتِ جاں — عجب طریق مرے کارواں سے پہلے تھا
بہار تھی نہ خزاں برق تھی نہ تھا صیاد — چمن نہ تھا جو مرے آشیاں سے پہلے تھا
اسی جہاں کو انکار رہتا قیامت کا — یہی جہان جو اک نوجواں سے پہلے تھا
کچھ اس طرح ہے مجھے دردِ عشق کا احساس — یہ جیسے مجھ کو یہی جسم و جاں سے پہلے تھا
وہ ناز بن کے پھر آخر سپار رہو کے رہا — انھیں غرور جو میری فغاں سے پہلے تھا
نہ ہے وہ بزم کہ ہوتا ہے روز یہ محسوس — کہ جیسے کوئی تعلق یہاں سے پہلے تھا

ہنوز دل میں اسی شد و مد سے ہے بسمل
وہ حوصلہ جو مجھے امتحاں سے پہلے تھا

(بسمل سعیدی ہاشمی)

کیوں ہم سے کہا جاتا ہے تقدیر کا غم کیا — یہ چال زمانے کی سمجھتے نہیں ہم کیا؟
آزادیٔ افکار سے بھی جو ہوئی محروم — سچ یہ ہے کہ اس قوم کے جینے کا بھرم کیا؟
بیدادِ زمانے کو مٹانے جو اُٹھے ہیں — وہ خود بھی اٹھائینگے زمانے کے ستم کیا؟
دل پر مجھے اک نقشِ تجلّے کا یقیں ہو — ثابت نہ ہوا اس سے ترا نقشِ قدم کیا؟
کعبے میں ہے پتھر کی پرستش ابھی موجود — ہو سکتا ہے ورنہ سببِ طوفِ حرم کیا؟
سائل کوئی طامع ہی ہے صاحبِ الطاف — اتنے یہ بدل جاتا ہے اندازِ کرم کیا؟

زندہ ہے ابھی زیبِ محبت رازِ ہے ورنہ
اک کافرِ لعنت کی سراہت سے کم کیا؟

(زیب عثمانیہ لودھیانوی)

تنقید و تبصرہ

تبصرہ کے لئے یہ کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے

گناہ کا خوف ۔ مؤلفہ چودھری محمد علی ردولوی، نیا سسار لکھنؤ، قیمت ۱۲، صفحات ۲۹۹، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

یہ چودھری محمد علی صاحب ردولوی کے افسانوں کا مجموعہ ہے چودھری صاحب ردولی کے تعلقدار ہیں لیکن رہتے زیادہ تر لکھنؤ میں ہیں لکھنے والے تو پرانے ہیں "صلاح کار" ان کی ایک مستقل تصنیف ہے۔ اور درمیان میں بھی ان کے مضامین چھپتے رہے لیکن اب نیا رنگ اختیار کیا ہے جو کافی مقبول ہو گیا ہے کچھ تو اس لئے کہ چودھری صاحب اب کم رہ گئے ہیں کچھ اس لئے کہ اب لوگوں میں پہلا سا کٹر مولوی پن نہیں رہا ہے۔

چودھری صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی نظر زندگی کے جزوی حصوں پر نہیں پڑتی بلکہ زندگی کو بہ تمامہ دیکھتے ہیں اور جس جزوی حصے کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کو گرد و پیش کے حالات اور اس کا گذشتہ سے ربط اتنا واضح اور گہرا دکھاتے ہیں کہ اگر یہ جزوی حصہ سماج کے اقدار کے لحاظ سے لائق ملامت ہو تو ماحول اور گذشتہ کے سلسلوں کے نتیجہ کے طور پر وہ حرکت بے اختیاری لائق ملامت نہیں معلوم ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے یہ عمل مجبوراً ظہور پذیر ہوا انسان اسباب کا غلام نظر آتا ہے اس لئے بے قصور ہے۔ اس قسم کا فلسفیانہ مطالعہ چودھری صاحب کے افسانوں میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے۔ حالانکہ معلوم ہوتا ہے یہ چیز وہ دانستہ نہیں کرتے بلکہ بوجہ اپنی داستان گوئی کے ان سے سرزد ہو جاتی ہے۔ امیری کی بو، گناہ کا خوف، تیسری جس میں یہ بات واضح طور پر نمایاں ہے یہ ان کے طرز کا کمال ہے

چودھری صاحب کا طرز ایک داستان گو کا طرز ہے جن لوگوں کو چودھری صاحب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کو اس کا کس قدر ملکہ ہے اور انھیں دوسروں کو خوش کرنے کے کیسے کیسے گر یاد ہیں ان کے افسانے تقریباً تمام تر ان کے برتے یاد دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

اور یہ بھی ان کی خوبی نگارش پر دال ہے موصوف کی زندگی بھی ایسی ہے کہ اگر وہ اپنا روزنامچہ ہی لکھا کریں تو ہر زور کی داستان افسانہ نظر آئے۔ اس لحاظ سے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کاش وہ لکھنے کی طرف زیادہ مائل ہو جائیں تو اردو ادب بڑے فائدے میں رہے گا۔ اور اب اس عمر میں ان کو اس طرف مائل بھی ہونا چاہیے۔

چودہری صاحب کی نظر بہت تیز ہے حالانکہ بہت گہری نہیں۔ خاتمے اکثر امید کے موافق زوردار نہیں ہوتے "آنکھوں کی زبان"، "آنکھوں کی سوئیاں"، "امن مہری کے فلسفیانہ خیالات" دلچسپ حاکے ہیں جس خلوص کے ساتھ انھوں نے نیچے طبقے کی زندگی کی تصویریں کھینچی ہیں اگر اسی طرح اس اونچے طبقے کی بھی افسانے پیش کریں جس میں وہ زندگی گذارتے ہیں تو مجھے امید ہے اس میں بھی وہ کم کامیاب نہیں ہونگے اور اگر وہ افسانوں کے بجائے سال بھر میں ایک ناول لکھدیا کریں تو مجھے امید ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی ان کو اسی میں ہوگی۔

چودہری صاحب کا فن داستان گوئی بہت پرلطف ہے ان کے افسانے ہمیں ہماری اپنی زندگی کی سچی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں نہ اس میں مغربی فن افسانہ نگاری کی چالیں ہیں نہ ان کے افراد میکانکی قسم کے انسان۔ یہ ہمارے مشرق کے سچے نمونے ہیں اور ان کا بیان اس طرح ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ہماری توجہ کو زبردستی کھینچنا چاہتا ہے بلکہ ہم خود اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں یہی داستان گوئی کا کمال ہے۔ بہ لحاظ زبان لکھنؤ اور اس کے گرد و پیش کے مشہور قصبوں کی زبان ہے۔ آج کل لکھنوی زبان کے نمونے خواجہ عشرت مرحوم کی وفات کے بعد اگر ہم کسی میں دیکھ سکتے ہیں تو وہ چودہری صاحب ہیں مگر چونکہ یہ اودھ کی یہ زبان باہر کے لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے تلفظ ضرور غلط ہو جائے گا اس لئے ایسے الفاظ پر اعراب ضرور لگا دینا چاہیے تھا۔

عاصمہ: مصنفہ مولوی ابوالمظفر مؤید الدین صفحات ۱۹۶ کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۱۲؍ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ ناول لکھی گئی ہے کہ ملک کے مسلمان دہقانوں اور کاشتکاروں کی کیفیت، عمال دیہی کی حالت، زمینداروں اور ساہوکاروں کا عمل، دیہی انتظامات طبی، پروردہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، تعلیم نسواں، قومی انجمنوں کا انتظام، دار الیتامیٰ کی ضرورت، محبت اولاد کے حقیقی معنی، پروردہ لڑکیوں کا درجہ، کنیز کا غلط مفہوم، مطالعہ اور بیوہ کا مرتبہ، امیروں کی ڈیوڑھیوں کی حالت، سلیقہ مند اور بدسلیقہ گھروں کا موازنہ، کرایہ کی گاڑیوں کی کیفیت، تعلیم و تربیت، شادی، برات، جہیز وغیرہ کا حال پیش کیا جائے جو اپنی جگہ مستحسن ہے لیکن ناول نگار کے سامنے یہ مقصد اس قدر زیادہ رہا ہے کہ کتاب بس ان حالتوں کی ایک اچھی فہرست ہو کر رہ گئی ہے ناول پن نہیں آنے پایا۔ مدیر احمد کے ناولوں کی طرح پلاٹ کی ایک کمزور ڈور میں واقعات و اصلاحات کے گٹھر باندھ دیے گئے ہیں ناول لکھنے کے بھی ڈھنگ ہوا کرتے ہیں یہ کتاب اس سے معرا ہے البتہ جن حضرات کو مندرجہ بالا حالات کا اچھا نقشہ دیکھنا ہو اور حیدرآباد کی سماجی کمزوریوں کو سمجھنا ہو ان کے لئے یہ کتاب بہت کارآمد ہوگی۔

اسلام زندہ باد:۔ مرتبہ جناب عبدالحمید صاحب قریشی، سائز ۲۰+۳۰/۱۶ ضخامت ۲۰۸ صفحات کاغذ طباعت عمدہ، قیمت عمر۔ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور،

مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور گذشتہ بارہ سال سے خاموش طور پر عملی تبلیغی کام کر رہی ہے اور ہر سال سستے قسم کا اعلیٰ اصلاحی لٹریچر شائع کرتی رہتی ہے امسال کی شائع شدہ کتابوں میں زیر نظر تالیف "اسلام زندہ باد" ہے

مرتب نے یہ مجموعہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے مقصد تبلیغ اسلام کے پیش نظر ان کی تحریک کے دس سال بعد شائع کیا ہے جو دو ابواب میں تقسیم ہے باب اول میں بہ تحت عنوان "اسلام کی شان" بارہ نومسلم حضرات کے ان بیانات کو قلمبند کیا گیا ہے جن کے باعث ان اصحاب نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ ان میں سے بعض حضرات قبول اسلام کے بعد اسلام کے زبردست مبلغ ثابت ہوئے ابتدائی چار واقعات داؤد آلبین مرحوم ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، لاہور، لیڈی بارلس، ایک ہندو جج کی بیوہ اور ایک ہندو

کے قبول اسلام کے واقعات بالترتیب حضرت علامہ مرحوم کے بیان کردہ ہیں۔اسی سلسلہ مضامین میں جناب خالد لطیف گابا کی وہ تقریر بھی درج ہے۔جو موصوف نے قبول اسلام کے بعد شاہی مسجد لاہور میں کی تھی جس میں ممدوح نے مختصراً اپنے قبول اسلام کی حسب ذیل چار وجہ بیان کی ہیں (۱) اسلام کی سادگی اور ہدایت (۲) اسلام کی جمہوریت اور مساوات (۳) اخوت اسلامی (۴) اسلام دور حاضر کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔

باب دوم میں "مسلمانوں کی شان" کے تحت پندرہ مضمون درج ہیں جن میں پیغمبر اعظم کے عنوان کے تحت آنحضرت صلعم کی حیات مبارکہ دی گئی ہے بعد میں بالترتیب حضرت علیؓ کے سبق آموز منتخب حالات، حضرت عمر بن عزیز کی سوانح عمری ایک چینی وزیر سید عمر اجل کے حالات سلطان صلاح الدین ایوبی گیلی پولی کے ہیرو مصطفے کمال اور غازی انور بے کے کارنامے وغیرہ درج ہیں جن کے ذریعہ صحیح اسلامی تعلیم پیش کی گئی ہے۔تاکہ دنیا سمجھ سکے کہ مذہب اسلام، امن پسند اس دوستی، سادگی تعلیم مساوات اور شرافت نفس میں آپ اپنی نظیر ہے اور اس کے ماننے والوں کی قومی خصوصیات، سیاسی تدبر، بہادرانہ کارنامے کمزوروں اور مظلوموں کی دستگیری اور محافظت ہے اور اسلام دنیا کی غلامی کو آزادی میں بدلدینے کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

اس طرح اس مجموعہ مضامین کو تبلیغ اشاعت کا کارآمد ذریعہ بنایا گیا ہے اور یہ کتاب موجودہ دور میں نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی، اگر سیرت کمیٹی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کا بھی مختلف زبانوں میں ترجمہ کراکے شائع کرے تو زیادہ انسب ہوگا (ہادی نقشبندی)

روح اسلام یا جیل واذان :- مولفہ جناب مولوی سید حسن آرزو صاحب سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۴۷ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ و دیدہ زیب قیمت ۸ ر پتہ سید حسن آرزو صاحب پھلواری شریف ضلع پٹنہ

مؤلف نے اس مختصر رسالہ میں، اسلامی تعلیمات، ارکان، اخلاقیات اور فلسفہ عبادت وغیرہ اس مسئلہ کو جو کہ عام طور پر غیر دلچسپ اور خشک سمجھا جاتا ہے مصنف نے اپنے خاص طرز نگارش سے

دلچسپ بنا دیا ہے، گو بعض جگہ مصنف سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو غالباً نظر ثانی میں دور ہو جائیں گی بہر طور آج کل کے مذہب سے ناواقف نوجوان طبقہ کے لئے یہ کتاب ہر طرح مفید ہے (بادی نقشبندی)

دستور الاصلاح :۔ مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی مکتبہ قصر الادب آگرہ قیمت ۱۲ صفحات ۴۴ اچھوتا سائز

زیر نظر کتاب میں سیماب صاحب اکبرآبادی نے متقدمین، متاخرین اور موجودہ اساتذہ کی اصلاحات کے مختصر نمونے مختلف کتابوں سے جمع کئے ہیں شروع میں اصلاح زبان، ادبی اصلاح، اصلاح خیال، مجلسی اور اجتماعی اصلاح نیز اصلاح لینے دینے کے طریقوں پر بھی مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے سیماب صاحب آگرہ میں جو کچھ اردو زبان اور فن شعر کی خدمت کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں اور نہ کسی کو اس سے انکار ہو سکتا ہے لیکن اب آپ کی تصانیف میں جیسی کہ زیر نظر کتاب ہے انانیت اور ذاتی پروپاگنڈے کی قسم کی چیز پیدا ہو چلی ہے اگر اس نظر سے قطع نظر کر کے یہ مختصر کتاب دیکھی جائے تو اپنے موضوع کا اچھا احاطہ ہے۔

نئے مسائل :۔ مرتبہ و مترجمہ جناب محمد مرغوب الدین صاحب بی۔ اے بی ٹی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۱۲ صفحات کاغذ و طباعت عمدہ قیمت ۸ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

زیر نظر کتاب ایک انگریزی کتاب "آؤٹ لائنز آف ماڈرن فالج فار بوائز، گرلز اینڈ پیرنٹس" کے ایک مستقل باب کا ترجمہ ہے اس میں چند اچھے اخلاقی قسم کے مضامین ہیں جو موجودہ دنیا کی ناروا ظلم اور مصائب سے بچنے کے لئے مشہور مفکرین کے خیالات کے مطابق ترتیب دئے گئے ہیں اور لڑکوں اور جوانوں کو ان کے اجتماعی اور ذاتی فرائض بتائے گئے ہیں مثلاً تمہیں کس طرح کی دنیا مطلوب ہے؟ انسانی نسل کی بہتری کی تدبیریں کیا ہیں، دنیا کی نسبت ہمارے محسوسات کیا ہونے چاہئیں وغیرہ ترجمہ اچھا ہے لیکن کچھ اور آسان ہوتا تو بہتر ہوتا بہر حال مفید مضامین نوجوان طلباء کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

یادگار نصیر:۔ مرتبہ ظہیر الدین احمد صاحب علوی شروانی بکڈپو، شروانی پریس علی گڈھ قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ صفحات ۱۲۴، سائز

یہ مجموعہ انتخاب کلام نصیر الدین صاحب علوی مرحوم منصف علی گڈھ کا ہے رشید احمد صاحب صدیقی جگر مرادآبادی کے تعارف نامے بھی شامل ہیں مرحوم علی گڈھ کے بڑے معروف لوگوں میں سے تھے اور بہ حیثیت انسان بڑی اعلیٰ صفتوں کے مالک تھے۔ شعر و شاعری سے کافی شغف تھا اور ان کا مکان اکثر بزم مشاعرہ بنا رہتا تھا حسن مارہروی مرحوم اور جگر مرادآبادی وغیرہ ان کے دوستوں میں تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

روئے جاناں نقاب کیا جانے — شمع روشن حجاب کیا جانے
تیری زلفیں سکھائے دیتی ہیں — ورنہ دل پیچ و تاب کیا جانے
عفو و عصیاں میں کیا توازن ہے — محتسب یہ حساب کیا جانے
میری ہستی ہے کامیاب الم — عیش ناکامیاب کیا جانے

دل نہیں کیا ہو پاسداری دل — بیدلی اب ہے یادگاری دل
آپ لے جائیے مگر یہ غلط — آپ اور پھر نگاہداری دل
بن گیا جوشش اضطراب سکوں — اللہ اللہ پردہ داری دل

رسالے:۔

مجلہ عثمانیہ:۔ جلد ۲۱، شمارہ سوم و چہارم قیمت عہ صفحات ۲۸۰

عثمانیہ یونیورسٹی کا زیر نظر مجلہ اس کا مدیر نمبر ہے جس میں تمام گذشتہ مدیروں کے مضامین ملک عبدالعلی خاں مدیر مجلہ نے بڑی کاوش سے فراہم کئے ہیں۔ اس میں اکثر مضامین بہت اچھے اور قابل مطالعہ ہیں: عہد سلطان العلوم سے قبل کا آصفی ادب، میں وہ شعرا اور ادیب جو دربار آصفیہ

سے وابستہ رہے ان کی فہرست اچھی دی گئی ہے۔ ادارا ایک ڈرامائی نظم یا غنائی ڈرامہ بھی جو بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ، ہندی تھیٹر، پرلیس اور مملکت، جدید روسی تھیٹر شیخ چاند مرحوم کا مطبوعہ مضمون زبان کی تشکیل و توضیح و اشاعت و ترویج میں سودا کی کارگزاری، مسئلہ طلاق، ہندو سماج میں عورت کی حیثیت، ترقی نسواں میں تعلیم یافتہ جماعت بہت اچھے مطالعے ہیں۔ عبدالعلی صاحب اس نمبر کی کامیابی پر قابل مبارکباد ہیں۔

مجلہ عثمانیہ:۔ جلد ۱۳، شمارہ ۱ و ۲، صفحات ۲۹۰ قیمت۔*

یہ نمبر احمد خاں صاحب بی۔ اے عثمانیہ کی زیر ادارت مرتب ہوا ہے۔ ادبی مقالوں میں اندر سبھا سے پہلے اور سنسکرت شاعری میں محبت کا عنصر، معاشیاتی مضامین میں رنڈی میر عالم، موضع کیل ماڑی کی معاشی تحقیق، قابل قدر مضامین ہیں۔

مندرجہ بالا ہر دو رسالے دفتر مجلہ عثمانیہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتے ہیں۔ چندہ سالانہ عام طور سے تین روپے ہے لیکن ویسے بہت سے ورقے ہیں جو خط لکھ کر معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا:۔ مترجمہ محمد عبدالمقیت صاحب نیموی صفحات ۸ قیمت فی نمبر ۸، چندہ سالانہ ۶ روپے ناشر جدید پریس بیگم پور پٹنہ سٹی

مشہور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جو مستشرقین نے ابھی حال ہی میں ہالینڈ سے انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی تینوں زبانوں میں شائع کی تھی اب عربی میں ماہوار قسط کے طور پر مصر سے شائع ہونا شروع ہوئی ہے عبدالمقیت صاحب نے یہ بڑا مفید کام اپنے ذمے لیا ہے کہ اس کا اردو ترجمہ ہر دو ماہ کے فصل سے کرنا شروع کر دیا ہے زیر نظر اس کی پہلی قسط ہے نیموی صاحب نے ترجمہ کے ساتھ اس میں کچھ اضافے بھی کر دیئے ہیں جو بہت مفید معلومات ہے۔ بہتر یہ ہو کہ اس معاملہ میں ملک کے دیگر مستند عالموں سے بھی مشورہ لیتے رہیں تاکہ یہ کام اور بھی بہتر ہو سکے

دعا ہے کہ ایسی مفید اور کارآمد چیز سے اردو جلد مالا مال ہو جائے نیموی صاحب اس ہمت

پر لاتی سار کباد ہیں

شاہین:۔ مدیر مصطفیٰ نعمانی ایم۔اے، زیر نگرانی رشید احمد صاحب صدیقی صفحات ۸۰ چندہ سالانہ ۲ روپے پتہ بالائے قلعہ علی گڑھ

یہ ایک سہ ماہی علمی ادبی رسالہ علی گڑھ سے نکلنا شروع ہوا ہے، شاعری میں خرافات، سلطنت اودھ کی ابتدا اور شعر و شاعری کی محفل کا قیام ہم اور وہ وغیرہ اچھے مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ کاغذ، طباعت و کتابت عمدہ ہے اس ارزاں اور اچھے پرچے کی طرف امید ہے لوگ زیادہ سے زیادہ توجہ کریں گے۔

معاصر:۔ زیر ادارت عظیم الدین احمد صاحب۔ چندہ سالانہ للعہ رفی پرچہ ۲ر صفحات ۷۰، پتہ نیا سنسار کتاب گھر، بانکی پور پٹنہ، کاغذ، طباعت و کتابت عمدہ۔

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو نومبر سے جاری ہوا ہے نمونہ مضامین یہ ہے ادب و تنقید پر ایک نظر، میر تقی میر کی شاعری پر ایک نظر، کلام فغان، ٹی ای براؤن، زبان کی تاریخ، دیوان ہمایوں بادشاہ وغیرہ۔ بہار سے ضرورت ہے زیادہ سے زیادہ پرچے نکلیں اور نکلتے رہیں۔ امید ہے یہ رسالہ بھی وہاں کے دیگر مشہور رسائل میں جلد اپنی جگہ بنا لے گا۔

کتب موصولہ جن پر آئندہ مہینے تبصرہ ہوگا

۱۔ سریلے بول:۔ مجموعہ کلام عظمت اللہ صاحب مرحوم

۲۔ اقبال اور قرآن:۔

۳۔ رحمت عالم:۔

۴۔ ہندو مسلم اتحاد کی تدابیر:۔ ایک مختصر کتابچہ، مصنفہ منشی رام پرتاد ماتھر بی اے (علیگ) مختار ۱۶۔ سردھنی دیبی لین، لکھنؤ۔

(اپنی اصلاح)

مسلمان اور شعروشاعری

شاعری پیٹ بھرے کا سودا ہے اور ایک ذہنی تعیش ایک کو اپنا ذہن تعیش میں رکھنے کا کب مجاز
جب اس کے افراد مانتے کر رہے ہوں اور جب اس کی بنیادیں بیخ و بن سے متزلزل ہو رہی ہوں
اور تنزل کی جاری ہوں تعیش کا حق اسی وقت ہوتا ہے اور اس کا موقع اسی وقت جائز ہے جب
اپنی بنیادیں مضبوط کر لی گئی ہوں دشمنوں سے پناہ اور امن ہو اور پھر اس تعیش میں بھی اسی قدر پڑنے
کی ضرورت ہے جس سے ہمارے قوی تازہ ہو سکیں مفلوج نہیں۔ بدقسمتی سے ہماری ہی مسلمانوں
کی قوم میں جس میں شاعری اس کے بادشاہوں اور نوابوں کے طفیل سے رچی اور پروان چڑھی تمام
مسلمانوں میں اتنی جاری و ساری ہو گئی کہ ایک طرف تو ان کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو کمزور کر دیا
دوسری طرف ایسا نشہ چڑھایا کہ جس نے ان کی آنکھیں بند کر دیں، اور ایسی بند کیں جواب تک باوجود
دشمنوں کی کامیابیوں کے پوری طرح نہیں کھل سکی ہیں۔

شاعری زندگی اور حقیقت سے گریز کا نام ہے ہم شخصی یا قومی طور سے جب زندگی سے بھاگتے
ہیں تو فسق و فجور، مے نوشی اور شاہد پرستی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں فرانس کی قوم کی مثال سامنے
ہے یہ حالت تو عوام کی ہوتی ہے خواص شاعری اور موسیقی کی طرف پڑ جاتے ہیں ہوتی گریز وہ بھی ہو
اگر ایک جسمانی ہوتی ہے تو دوسری ذہنی مسلمانوں کی ابتری اور زبوں حالی بہت کچھ اسی ذہنی اور مادی
تعیش کی وجہ سے ہے خلفائے عباسیہ کے زمانے سے لے کر ہندوستان کے سلاطین مغلیہ۔ ترکی کے
خلفا۔ ایران کے شاہوں غرضکہ ہر جگہ اسی گریز کے مظاہرے ہوئے۔ عوام الناس نے سلاطین سے
سبق لیا چنانچہ وہ بھی اسی قسم کی ذہنی اور جسمانی کاہلیوں میں مبتلا ہو گئے اور ابھی تک مبتلا ہیں۔

شاعری فائدہ اسی وقت کرتی ہے جب زندگی کی ممارست اور ان میں حد سے زیادہ انہماک
ہمارے قویٰ اور ذہن کو خشک اور میکانکی بنا دے۔ شاعری اس وقت ان میں لطافت اور لچک پیدا

کردیتی ہے لیکن زندگی سے بھاگ کر شاعری کرنے میں یا بغیر زندگی میں حد سے زیادہ مہارت کے شاعری میں پڑ جانے سے کسی طرح فائدہ نہیں یہ شخص اور قوم دونوں کے قوائے ذہنی کو دنیا کے سنجیدہ کاموں کے لائق نہیں رکھتا۔ انھیں بس لذت کی تلاش ہوتی رہتی ہے یہ لذت کوشی بدقسمتی اور قومی انحطاط کی علامت ہے۔

ہندوایران کی سرسبز وادیوں کا برا ہو جنھوں نے مسلمان قوم کو عیش پرست بنا دیا وہ یہاں کے نغمہ و رنگ میں ایسے پھنس گئے کہ آگے بڑھنا تو درکنار انھیں اپنے یہاں کے قیام و بقا کی فکر نہیں رہی ہر آنے والی مصیبت کو دیتے رہے حتیٰ کہ غرق ہو نا کہ کے اسے ممول جانے کی کوشش کرنا ہے تعیش کی حد جب پیٹ بھرا ہوتا ہے تو انسان کی روح آسودہ ہو جاتی ہے اور روح کی آسودگی ترقی کے لئے سم قاتل ہے روح تو کسی حال میں اور کبھی آسودہ ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ قومی ترقی کی خاطر مواقع تراشنے چاہئیں کہ کسی طرح روح کو آسودہ نہ کیا جائے افسوس مسلمانوں کے ساتھ یہی سبب ہوا وہ سیلاب دریاؤں کی ستان سے اٹھے اور ہندوعجم کے مرغزاروں میں آسودہ ہو کر رہ گئے۔ کاش یہ ذہنی آسودگی یہ روحانی طمانیت انھیں نہ حاصل ہوتی تو صرف ہندوایران ان کی سرحدیں ہو کر نہ رہ جاتیں۔

ہمارے ہند کا مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کس قدر ادبیات اور شعر و شاعری کا دلدادہ ہے شعرا کی کس قدر عزت، توقیر اور آؤ بھگت کرتے ہیں کیسے کیسے انھیں سر پر چڑھاتے ہیں یہ باتیں بظاہر بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں کہ ہماری قوم ہمارے ادیبوں اور ہمارے شاعروں کی عزت افزائی اور ہمت افزائی کر رہی ہے ہاں واقعی یہ بات بظاہر بڑی اچھی ہے لیکن ذرا اندر کی طرف بھی دیکھئے تعیش شعری کا حق ہمیں اس وقت پہنچتا ہے جب ہم میں قوت ہو استحکام ہو اور ہم اپنی بقا کی طرف سے مطمئن ہو گئے ہوں۔ ہم نے محنت و مشقت کر کے تکلیفیں اٹھا کے جد و جہد کر کے اپنی بقا و استحکام کے لئے اتنا کچھ کما لیا ہو کہ ہم اس میں سے تھوڑا سا تفریح طبع کے لئے خرچ کر سکیں اور وہ بھی اس لئے خرچ کر سکیں تاکہ ہمارے ذہن اور ہمارے قویٰ دوسرے دن کی محنت و مشقت کے لئے ترو تازہ

ہو جائیں تفریح کا افادی پہلو بھی محض اسی قدر ہے کہ آئندہ کی مشقت کے لئے پھر سے چستی پیدا کی جا سکے لیکن تفریح میں بقدر قلیل پڑتا تو درکنار خود تفریح کو مقصد زندگی بنا لیا گیا ہے یہ سمجھا تو الگ رہا کہ تفریح کا [illegible] محنت کے بعد ہوتا ہے ہم نے تفریح ہی کو محنت کے معنوں میں سمجھ لیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم صرف خرچ ہی کرنے پر تلے ہیں۔ جمع کچھ نہیں کرتے ایسی قومیں یقیناً فنا کے دروازے اپنے آگے کھول رہی ہیں اور [illegible] نہیں کہ ہماری ہندی مسلمانوں کی قوم ان میں سے ایک ہے۔

[illegible] ہماری شاعری پیدا دار ہی ہے ایک انحطاطی دور کی۔ اورنگ زیب کے بعد ہم دہلی کی سڑکوں پر [illegible] افواج کی نقل و حرکت کے ہنگامے اتنے نہیں دیکھتے جتنے قوالوں اور شاعروں کی نغمہ سرائیوں کے چرچے، محفلوں اور مشاعروں کے غلغلے۔ نادر شاہ یہاں تک آ جاتا ہے لیکن محمد شاہ کو راگ راگنیوں سے [illegible] محبت۔ دکن بنگال اودھ سب خود مختار ہوتے جا رہے ہیں لیکن بزم کے سرور میں رزم کی [illegible] کو وہاں کیا معنی رکھتی ہیں شاعر مصاحب ہیں اور مصاحب شعرا اور آخر کار یہ شاہ ہند محض شاہ اقلیم سخن اور تاجدار قلمرو خالی رہ جاتا ہے۔

آج کل ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا اگر کچھ فرض ہو سکتا ہے تو ہم میں قوت، خود اعتمادی اور آگے بڑھنے کے جذبات مشتعل کرانے کی کوشش کریں ہماری ذلیل حالت کا ہم کو احساس کرائیں اور پھر آگے بڑھنے کی صورتیں اور ان پر عمل کیلئے اکسائیں۔ آج کل تو ان کی خدمت یہی ہو سکتی ہے عشق و محبت کی داستانیں ہمارے پاس اتنی کافی ہیں کہ آئندہ بھی کام دے سکتی ہیں مگر اس وقت عشق کو بھلا دینے کی ضرورت ہے۔ آجکل مسلمانوں پر تو ایسی آفت ہے کہ بہتر تو یوں ہو اگر کچھ عرصہ شاعری فی الحال ملتوی کر دی جائے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو محض وہ افراد [illegible] اپنے کو ڈالیں جو محسوس کرتے ہیں کہ وہ فطرتاً مجبور ہیں بلکہ بیحد مجبور ہیں باقاعدہ شاعری کے اکھاڑوں یا مدرسوں کی سی جو شکلیں بن گئی ہیں ان کو فوراً ختم کر دیا جائے۔

ہم اب تک محض ترانوں اور غزلوں میں پھنسے رہے ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ ایسے دھنوں اور ایسی روحوں کو نرم و لطیف خیالات و استعارات میں لوریاں دیتا رہا اب وقت وہ آگیا ہے کہ ہم انہیں لوریوں کو فوجی ترانوں اور جنگی گیتوں میں تبدیل کر دیں ہمارا معشوق عورت کے بجائے فی الحال اپنی قوم ہو جائے کاش ہم اور ہمارے شعرا و ادبا اس پر عمل کر سکیں

(م حسین)

ہندوستانی کھیل

مصنفہ، الطاف علی صاحب، نگران تربیت جسمانی، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو اُن بچوں میں ملتی ہے جنہیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۲ سے لے کر ۳ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہئے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی ترتیب کر سکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایہ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا۔ مصنف نے انہیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت عہ

مرقع فطرت

مصنفہ، ڈاکٹر پریم ناتھ صاحب

اس کتاب میں مصنف نے ابتدائے کائنات سے لے کر انسان کے پیدا ہونے تک کی قدرتی داستان بیان کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ زمانے کے ساتھ انسانی خیالات میں کیسے تبدیلی ہوئی۔ بعض حقیقت خیالات کیوں قائم رہے اور بقیہ کیسے فنا ہوگئے لیکن وہ انسان کی عادت کیوں کر بن گئے۔ سائنس کی رہنمائی میں انسان نے کائنات کی حقیقت کو کہاں تک سمجھا ہے۔ دنیا اور جانداروں کی پیدائش کیسے ہوئی۔ دیوی دیوتا، خدا اور مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ نیکی اور بدی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کو سادے اور آسان طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے، جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے [illegible] معقول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع [illegible] ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے خط و کتابت کی جائے۔ اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنز چار مینار حیدرآباد دکن سے دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صرف [illegible]

گذارشِ احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار [illegible] ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانہ نے ۱۸۶۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص [illegible] پیش کی زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی [illegible] لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے، وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں [illegible] پھیلائیں تاکہ ایسی تیار کردہ ان اشیا کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو لو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ سے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں کو فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر، حنا بلڈنگ لکھنؤ

دسمبر ۳۶ء

مختصر تاریخ ادب اردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لیکچرار شعبہ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی

اردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب امیر و داغ کے واقعات تک پہونچتے پہونچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھے بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی۔ اور ایسی تو اس وقت کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ [illegible] کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو [illegible]

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اردو کے قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات جلد معہ گرد پوش۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (۲ عہ)

ملنے کا پتہ

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد

اخبار "خالد" سرینگر

"خالد" کی خصوصیات

۱۔ خبریں تازہ بتازہ
۲۔ مقالات مدلل و سنجیدہ
۳۔ مضامین عالمانہ و فاضلانہ
۴۔ تنقیدات بےلاگ و منصفانہ
۵۔ منظومات ادبی معیاری
۶۔ زبان سلیس و عام فہم
۷۔ پالیسی حمایت حق و رد باطل
۸۔ نصب العین اتحاد و ترقی
۹۔ اظہار رائے جرأت مندانہ
۱۰۔ لکھائی چھپائی دلکش و [illegible]
۱۱۔ حلقہ اشاعت وسیع ترین

اخبار "خالد" کشمیر میں واحد پرچہ ہے جو وسیع ترین اشاعت رکھتا ہے اس پرچہ کی سنجیدگی اور مقبولیت کی وجہ سے تمام ادبی حلقے اور اہل علم لوگ اس کی ناظرین کی فہرست میں شامل ہیں ریاست کے تمام جج نصف۔ کلکٹر اور دیگر بڑے بڑے عہدیدار "خالد" کا مطالعہ پابندی سے کرتے ہیں۔ خالد کی گوناگوں خصوصیات کے باعث اب اس پرچے کو ریاست کے محکمہ تعلیم کے صاحب ڈائرکٹر نے ریاست کی تمام سکول لائبریریوں کے لئے منظور فرمایا ہے۔

خالد میں جن کتابوں پر تنقید و تبصرہ لکھا جائے ہزاروں شائقین کی نگاہ سے گزرتا ہے اس لئے آپ بھی اپنی جدید مطبوعات ہمارے ہاں تبصرے کے لئے بھیجکر فائدہ اٹھائیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں "خالد" تجارتی مال و اشیاء کے لئے بہترین ذریعہ تشہیر ہے۔ ریاست میں تجارت کو فروغ دینے کے لئے "خالد" سے بہتر کوئی ذریعہ ممکن ہی نہیں۔ اجرت اشتہارات نہایت کم اور واجبی ہے۔ اس لئے آپ سے التماس ہے کہ آپ اپنی فرموں اور دیگر تجارتی مال و اشیاء کا اشتہار اخبار "خالد" سرینگر میں دے کر اپنی تجارت کو بڑھائیں

ملنے کا پتہ

اخبار "خالد" سرینگر (کشمیر)

دعوت عام

دارالاشاعت سیاسیہ کا قیام

دارالاشاعت سیاسیہ دکن کے مایۂ ناز لایرین کے زیر سرپرستی قائم کیا گیا ہے۔ علاوہ دیگر مقاصد کے اس وقت کارکنان ادارہ کے پیش نظر پہلا اہم مقصد یہ ہے کہ ایسا اسلامی سیاسی لٹریچر پیش کرے جس کا تعلق ملکی سیاست سے ہو، جس سے نوجوانوں کے جذبات کی صحیح تربیت ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ ملکی سیاست کو سمجھ کر اپنی بھلائی اور برائی میں تمیز کر سکیں۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے ادارہ کو دیگر ملکی لایرین کے اشتراک اور تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم آپ سے متمنی ہیں کہ آپ ہمیں اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔

کارکنان دارالاشاعت آپ سے متوقع ہیں کہ جلد از جلد آپ اپنی حمایت رائے سے مطلع فرمائیں گے۔ آپ کی رائے بالکل آزادانہ اور مدلل ہونی چاہیئے۔

جملہ خط و کتابت مندرجہ ذیل پتہ پر فرمائی جائے تو مناسب ہے

مینجنگ ڈائرکٹر دارالاشاعت سیاسیہ

حیدرآباد

دکن

حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ چودہویں صدی میں

یا

ماہنامہ الفرقان بریلی کا

ولی اللہ نمبر

جو ۲۰×۲۶ سائز کے تین سو صفحات پر انشاء اللہ آخر دسمبر میں شائع ہوگا۔

پوری کیفیت تو مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکے گی لیکن کچھ اندازہ غالباً آپ اس سے بھی فرما سکیں گے کہ ادارہ الفرقان کے علاوہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولینا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا سید علی ندوی پروفیسر ندوۃ العلماء و اڈیٹر الندوہ" لکھنؤ اور مولینا سعید احمد اکبر آبادی (ایم اے) ایڈیٹر برہان دہلی جیسے ارباب تحقیق نے بھی اس نمبر کی تیاری میں خاص حصہ لیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں الہامی نظریوں اور آپکے انقلاب انگیز فلسفہ کے متعلق اس نمبر میں قریباً بیس مشاہیر اہل قلم اور ممتاز علماء کرام کے بصیرت افروز مقالے تین سو صفحات پر ہیں نیز بلند پایہ شعراء کرام کی کیف آور نظمیں اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کی لکھی ہوئی بعض نہایت اہم اور تاریخی تحریرات کے فوٹو بھی آپ اس نمبر میں ملاحظہ فرمائیں گے کثرت اشاعت کیلئے قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) رکھی گئی ہے لیکن الفرقان کے مستقل خریداروں سے اس کی علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائے گی۔ بشرطیکہ اس کا سالانہ چندہ تین روپے (عہ) اس کی اشاعت سے پہلے وصول ہو جائے۔

ناظم دفتر الفرقان بریلی (یوپی)

اگر آنکھیں کمزور ہیں

آنکھیں تھوڑی دیر کے بعد تھک جاتی ہوں' ان کے سامنے اندھیرا آجاتا ہو' حروف دھندلے نظر آتے ہوں، پانی بہتا ہو۔ سر میں خفیف درد کی شکایت ہو۔ ابتدائے نزول الماء یا موتیا بند ہو تو مدنی دواخانہ کا خصوصیت کے ساتھ تیار کردہ "کحل الجواہر مشکی" فوراً استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ دو چار دن کے بعد ہی آپ کو اس سرمہ کی خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔ قیمت فی تولہ چھ روپئے علاوہ محصول ڈاک۔

دانتوں کی بیماریوں سے بچئے

اگر مسوڑھوں سے پیپ نکلتی ہے۔ اگر مسوڑھے متورم ہو جاتے ہیں

اگر منہ سے بدبو آتی ہے اگر دانتوں سے خون نکلتا ہے۔

اگر دانتوں پر سردی اور تری کا اثر ہوتا ہے۔ اگر منہ سے بدمزہ رطوبت جاری رہتی ہے

اگر دانت گندے اور میلے رہتے ہیں تو

فوراً پائیوری استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ ورنہ معدہ خراب ہو کر تندرستی بالکل خراب ہو جائے گی۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ، علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

شربت اطفال

شربت اطفال لطیف اور خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بیحد مفید ہے نمونیہ یعنی ڈبا یا پسلی چل جانا۔ موتی جھرہ، خسرہ، چیچک، قبض، دستوں کا آنا، آنکھیں دکھنا۔ دانتوں کے نکلنے میں تکلیف ہونا ان سب امراض کے لئے شربت اطفال اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

ملنے کا پتہ: منیجر مدنی دواخانہ۔ مدرسہ منزل بجنور

حلوائے مغزی

ضعف دماغ ایسا مرض ہے جو ابتداء میں مریض کو کسی خاص تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا لیکن رفتہ رفتہ اسکے اثرات زندگی دوبھر کر دیتے ہیں یہ مرض بالعموم تعلیم یافتہ طبقہ کو اور بالخصوص دماغی محنت کرنے والے لوگوں کو لاحق ہوتا ہے رفتہ رفتہ اعضاء میں کمزوری اور بینائی میں کمی واقع ہو جاتی ہے زیادہ دیر تک لکھنے پڑھنے سوچنے سمجھنے اور دھوپ میں رہنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے اگر اس مرض کے مریض خواہ وہ ابتدائی اسٹیج پر ہوں یا مذکورہ بالا تمام خرابیوں کا شکار ہو چکے ہوں "مغزی" کا استعمال کریں گے تو اس سلسلہ کی ہر شکایت دور ہو جائیگی مغزی دماغ کے لئے ایک ایسا ٹانک ہے جو ہر حال میں بے انتہا مفید ثابت ہوتا ہے اور اسکے استعمال سے اعضاء رئیسہ کو بھی کافی تقویت پہنچاتی ہے۔ قیمت فی سیر صشہ روپئے علاوہ محصول ڈاک۔ خوراک ایک تولہ

اکسیر معدہ

فی زمانہ ننانوے فیصدی اشخاص ریاحی امراض میں مبتلا ہیں خصوصاً وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو دماغی کام بھی کرتا ہو اور مرغنیات زیادہ استعمال کرتا ہو ان لوگوں پر یہ اکسیر ننانوے فیصدی کامیاب ثابت ہوئی ہے چنانچہ درد معدہ ریاحی۔ درد گردہ ریاحی۔ بواسیر ریاحی چند یوم کے استعمال سے زائل ہو جاتی ہے۔ قیمت فی شیشی ۲۴ قرص آٹھ آنے (۸) علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ روانہ ہوگا۔

آب شفاء

یہ آب شفاء بے شمار امراض کے لئے نہایت زود اثر اور قابل اعتماد دوا ہے اسکی ایک شیشی ہر انسان کو سفر و حضر میں اپنے پاس رکھنا گویا ایک طبیب یا ڈاکٹر کو ساتھ رکھنا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸) علاوہ محصول ڈاک۔ ایک درجن کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ روانہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ: منیجر مدنی دواخانہ مدینہ منزل بجنور

ندوۃ المصنفین کی نئی کتابیں

غلامانِ اسلام: تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم اے مدیر "برہان" اس کتاب میں ان بزرگانِ اسلام کے سوانح حیات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اصلاحی اور سیاسی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی نام نہاد غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق حاصل ہے اور جن کو اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے

حالات کے جمع کرنے میں پوری تحقیق و کاوش سے کام لیا گیا ہے، اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی محققانہ مفید، دلچسپ اور معلومات سے لبریز کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ صفحات ۵۵۲ تقطیع ۲۲×۲۰ قیمت مجلد سنہری صہ غیر مجلد للعہ رعایتی غیر مجلد للعہ

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق تالیف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی علمِ اخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اسلام کے نظامِ اخلاق کی تفصیلات کو ایسے دلپذیر انداز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری دنیا کے تمام اخلاقی نظاموں کے مقابلہ میں روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف اسلام کے ابوابِ اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور اس موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب سامنے آگئی ہے۔ صفحات ۵۰۰ قیمت مجلد سنہری صہ غیر مجلد للعہ۔ رعایتی غیر مجلد للعہ

ملنے کا پتہ

ندوۃ المصنفین۔ قرولباغ۔ نئی دہلی

مطبوعات جامعہ

خطوط محمد علی۔ مولانا محمد علی کی زندہ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے، مرحوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ خطوط محمد علی میں دیکھئے۔

بزرگوں کا وفادار اور نیاز مند، دوستوں کا جاں نثار اور عاشق زار، بے باک اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرا، حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پروا نہ کرنے والا، اور مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم محمد علی ——— یہ خطوط اسی محمد علی کی تصویر ہیں

قیمت مجلد عہ

ناموران سیاست۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے ہر شخص کو سیاسی معاملات سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے ہٹلر، مسولینی، روزولٹ، اسٹالن، چرچل اور عصمت انونو ہر شخص کی زبان پر رہتے ہیں ان کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر معاملات صحیح طور پر سمجھنے میں کبھی کبھی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ایشیا اور یورپ کے اکثر مسلمہ سیاسی رہنماؤں کے حالات درج ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے حالات بھی ملیں گے جو غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اپنی ہمت کی رہنمائی سے آج بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہیں اور چھوٹی سلطنتوں کی آزادی ان کے رحم و کرم پر موقوف ہے قیمت حصہ اول ۶ر حصہ دوم "مشاہیر عالم" زیر ترتیب ہے

ٹروٹسکی: مترجمہ ایم ایم جوہر ٹروٹسکی کو کون نہیں جانتا۔ موجودہ روسی حکومت نے اسے باغی قرار دے دیا تھا اس کے جو ساتھی اب تک روس میں موجود تھے ۱۹۳۶ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا ان مجرموں نے اپنے جرم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ڈال دی ٹروٹسکی کی صفائی اور غداری کی خاطر امریکہ میں ایک کمیشن بنایا گیا جس نے ٹروٹسکی کے بیانات لئے۔ یہ کتاب انہی بیانات کا خلاصہ ہے اس میں ان تمام کارناموں کا کچا چٹھا ہے جو روس میں اشتراکیت کے پردے میں کئے جا رہے ہیں شروع میں روسی انقلاب کی مختصر سی تاریخ بھی آ گئی ہے زبان اتنی صاف اور سہل ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اچھی طرح ذہن نشین کر سکتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

ہندوستانی کھیل۔ مصنفہ الطاف علی صاحب نگران ورزش جسمانی، جامعہ۔ ان کھیلوں کو ترتیب دیتے وقت مصنف کے پیش نظر وہ ہندوستانی بچے ہیں جن کی عمر سات اور چودہ سال کے درمیان ہے اور جو نئی تعلیمی اسکیم کے ماتحت تعلیم پا رہے ہیں ان میں سے بیشتر کھیل ایسے ہیں جن کے لئے کسی خاص ساز و سامان کی ضرورت نہیں ہے اور جو بہت معمولی سامان کے ساتھ کسی جگہ بھی کھیلے جا سکتے ہیں یہ کھیل بچوں کے لئے جسمانی اور ذہنی ہر لحاظ سے بہت مفید ہیں۔ قیمت [illegible]

بنیادی دستکاریاں۔ اوٹنا۔ دھننا۔ یہ کتاب دفتر "نئی تعلیم" دہلی سے شائع کی گئی ہے مصنف نے اختصار کے ساتھ اوٹنے اور دھننے کے بارے میں بہت مفید اور کام کی باتیں [illegible] ہیں۔ کتائی کرنے والوں کے لئے اس کا جاننا ضروری ہے۔ قیمت [illegible]

بت تراش۔ از پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک بت تراش کی نفسی کیفیات کی تصویر گری کی ہے اور اسی سلسلے میں حسن و عشق اور دنیا کی تخلیق میں رنج و مسرت کے وجود پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے انداز تحریر اس قدر دلکش ہے کہ پڑھنے والا مصنف کی نظر سے دیکھتا اور اسی کے دماغ سے سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قیمت [illegible]

بچوں کی کتابیں

مزے دار پہیلیاں۔ از محمود علی خاں جامعی ہندوستان میں اس کے وقت پہیلیاں بوجھنے کا رواج شاید ہمیشہ سے ہے۔ ان پہیلیوں کی بدولت بچوں اور بڑوں کو چیزوں کی حقیقت جاننے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اس کتاب میں پہیلیاں اور اس قسم کی تمام چیزیں مکرنیاں دو سخنے، نسبتیں، انمل ڈھکوسلے وغیرہ جمع کردیئے گئے ہیں پہیلیوں کی بوجھ آخر میں ہے۔ مشکل لفظوں کے معنی بھی آخر میں [illegible]

بچوں کا البم۔ از محمود علی خاں صاحب جامعی۔ تصویریں جمع کرنا بچوں کو سب سے زیادہ مرغوب ہے اور اس کا تعلیمی فائدہ بھی سب سے زیادہ ہے اسی خیال سے یہ البم شائع کیا جا رہا ہے اس کے ذریعے سے ہندوستان کی تمام ضروری اور خاص خاص چیزوں سے بچوں کو روشناس کردیا ہے قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ۔ قرولباغ نئی دہلی

OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت
حاصل کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک مینشن دہلی گیٹ